كشف المحجوب
حضرت داتا گنج بخش
علی بن عثمان الہجویریؒ

۷۸۶

اسلام ایک ھمہ گیر نظامِ زندگی ہے۔حیات انسانی کا کوئی ایک گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جو اس کی اعلی وارفع تعلیمات سے بہرہ ور نہ ہوا ہو۔عائلی زندگی کی بہتری اور اس میں سکون واطمینان کا ہونا انسانی معاشرے میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔اس اہم ترین گوشہ سے بھلا اسلام کیسے صرفِ نظر کر سکتا ہے۔

اسلام نے ہر انسان کو اپنے دائرۂ عمل، اور دائرۂ اثر میں ''راعی'' قرار دیا ہے۔اس کی ذمہ داریوں کے حوالے سے مسئولیت کی بات ہے۔اولاد کی تربیت کے حوالے سے اسلام نے ایک مکمل منہاج عمل متعین کیا ہے اور بڑی وضاحت وصراحت سے اس کی بابت ھدایات عطاء فرمائی ہیں۔

زیر نظر مقالہ ہمیں اس شعبے میں ایک مبسوط رہنمائی دے رہا ہے۔اسلام کی ان تعلیمات کا معاشرے میں از سر نو احیاء بہت ہی زیادہ ضروری ہے۔ہمارا معاشرہ مغربی اثرات کے باعث جس طرح شکست وریخت کا شکار ہو رہا ہے۔اعلیٰ اخلاقی ومعاشرتی اقدار جس طرح پس منظر میں جا رہی ہیں۔ان پر ہر صاحب بصیرت انسان تشویش واضطراب کا شکار ہے۔اور اس کا حل صرف اور صرف اسلام کی آفاقی تعلیمات میں مضمر ہے۔

زیر نظر مقالہ کے مصنف علامہ خالد محمود صاحب ہمارے از حد شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے زندگی کے ایک اہم پہلو کی طرف بصیرت افروز رہنمائی کی ہے۔اس مقالے کا ہر گھر میں ہونا اور جملہ والدین کی نظر سے گزرنا ازبس ضروری ہے۔

(علامہ) خالد محمود ایک وسیع المطالعہ عالم دین ہیں۔عہد حاضر کی ممتاز روحانی اور علمی شخصیت حضرت ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمتہ اللہ علیہ سے انھیں نسبت بیعت وتلمذ حاصل ہے۔اور انھیں کی دانش اور ژرف نگاہی کا عکس ان کی تدریس وتحریر میں نظر آتا ہے۔

زاویہ نشین

معاملات کو عام انسانوں پر قیاس کرنے لگیں محض اس بناء پر کہ نص سے ان کی بشریت کا اثبات ہوتا ہے۔ انبیاء کرام کی بصر اور بصیرت کے معاملات، ان کی روحانی رفعتیں، پروردگارِ عالم اور اس کے متعین کردہ کارکنانِ قضاء وقدر اور ملائکہ مقربین سے ان کے روابط اور راز و نیاز کو ہم اپنی بے بصری اور محدود علمی پرواز کے ذریعے کیسے سمجھ سکتے ہیں۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ اور دوسرے انبیاء کرام کی حیات و موت اور بعد از وصال ان کے تصرفات کی نوعیت بھی ایسی نہیں کہ ہم اسے عام افراد بلکہ معاذ اللہ کفار پر قیاس کریں۔

اعتقادات کی بحث کوئی معمولی اور سطحی بحث نہیں ہوتی جیسا کہ بعض کم فہم گمان کرتے ہیں۔ بلکہ اعتقادات انسانی شخصیت کی تعمیر میں ایک گہرا اور مؤثر کردار ادا کرتے ہیں۔ اسی لیے علماء اسلاف نے اعتقاد کے خالص اور قرآن وسنت پر مبنی رہنے پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔

"حیاتِ جانِ کائنات (ﷺ)" کتنا خوبصورت عنوان ہے اور علامہ خالد محمود نے کتنے جاندار علمی دلائل اور مضبوط استدلال سے اپنے مؤقف کا اثبات کیا ہے۔ جس کے انفاسِ طاہرہ کی برکت سے کائناتِ انفس و آفاق میں حیات کی رو دوڑ رہی ہے بھلا اس کی موت و بے بسی کا عقیدہ کیسا؟

آج کے دور میں ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ رفیع کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اس کا عقیدہ توحید سے کوئی علاقہ نہیں اور نہ ہی کمالاتِ رسالت کا انکار کرنے سے عقیدہ توحید کا تحفظ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ کمالاتِ رسالت کا انکار تو خداوند رحمٰن و رحیم کی عطاء کا انکار ہے۔ اور اللہ کی عطاء کا انکار یہودی کرتے ہیں مسلمان نہیں۔

یہ دراصل نژادِ نَو کو اپنے سرچشمہ ھدایت اور منبع قوت و حشمت سے دور لے جانے کی سازش ہے۔ اور مسلمانوں کو اس سے باخبر رہنا چاہیے۔

زاویہ نشین

محمد رضاء الدین صدیقی

۷۸۶

تصوف کے معروف روحانی سلسلہ چشتیہ کا برصغیر پاک وھند میں نہایت ہی اہم کردار ہے مشائخ چشت نے برصغیر میں بھرپور اور منظم طریقہ سے تبلیغ اسلام کی، اسلامی تمدن کی داغ بیل داغ ڈالی، تہذیب وثقافت کی آبیاری کی۔ اسلامی معاشرت کی اقدار کو مروج اور مستحکم کیا۔ ادب وفنون پر اپنے انمٹ نقوش مرتسم کیے۔ تصوف وتزکیہ کا ماحول پیدا کیا اور انسان دوستی کی ایسی فضاء پیدا کی کہ کسی اور مذہب سے اس کا جواب نہ بن پڑا۔

چشت اہل بہشت کے اس گروہ پر نظر ڈالتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک، علم عشق اور بصیرت کا مرقع نظر آتا ہے۔

حضرت محب النبی مولانا فخر الملت والدین فخر جہاں دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سلسلہ عالیہ چشتیہ کے گل سر سبد ہیں اور چشتیوں کی حسین روایات کا عکس جمیل ہیں۔ مغلوں کے دور اواخر میں آپ کے اصلاحی کارناموں کے اثرات بڑے نمایاں ہیں۔ آپ کو دلی بلکہ پورے برصغیر میں بڑی محبوبیت اور مقبولیت نصیب ہوئی۔ آپ کی جاذبیت نے زمانے کی نادر روزگار شخصیات کو اپنے گرد مجتمع کر لیا وہ کیسا زمانہ تھا کہ لوگ خیر آبادیوں سے معقولات پڑھتے، شاہ عبدالعزیز سے اکتساب حدیث کرتے اور حضرت فخر جہاں دہلوی سے بیعت وارادت کا شرف حاصل کرتے۔

جہاں ایک طرف آپ حضرت شاہ کلیم اللہ جہان آبادی اور حضرت شاہ نظام الملت والدین کی خلافت ونیابت کا حق اداء کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہیں پر حضرت قبلہ عالم نور محمد مہاروی، حضرت شاہ نیاز بے نیاز بریلوی اور حاجی لعل صاحب رحمۃ اللہ علیہم جیسے اولیاء کے مرشد ومربی کی صورت میں فیض رسان وفیض بخش نظر آتے ہیں۔

یہ وہی سلسلہ ہے جس میں بعدہ حضرت خواجہ شاہ سلیمان تونسوی، حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی، حضرت خواجہ غلام فرید چاچڑوی حضرت خواجہ غلام حیدر جلال پوری، حضرت خواجہ پیر مہر علی شاہ گولڑوی، حضرت خواجہ محمد قمر الدین سیالوی اور حضرت خواجہ پیر محمد کرم شاہ صاحب جیسے نادر روزگار افراد پیدا ہوئے اور انشاء اللہ قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے۔

زیر نظر مجموعہ میں حضرت خواجہ فخر جہاں کے مکتوبات عالیہ ہیں۔ یہ مجموعہ اگرچہ مختصر ہے لیکن اپنے دامن میں عرفاں وآگہی کا سامان لیے ہوئے ہے۔

زادیہ نشین

(محمد رضاء الدین صدیقی)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دیباچہ

از

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے رسول خدا ﷺ کی خدمت اور ہم نشینی سے جو شرف حاصل کیا تھا اور جس قدر شرف اندوز ہوئے تھے اور تزکیہ نفس کی جس منزل پر پہنچے تھے اس کی بشارت خود قرآن پاک نے دی ہے اور ہم نشینی رسول خدا کے فیضان کو اس طرح ظاہر فرمایا وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ۔ کتاب وحکمت ہی کی تعلیم کا یہ اثر تھا کہ خلفائے راشدینؓ اور دیگر حضرات صحابہؓ میں سے ہر متنفس اور ہر ہستی پاکیزہ کردار اور اعلیٰ اخلاق سے متصف تھی اور ان میں سے ہر ایک کمالات انسانی کے منتہا کو پہنچ گیا تھا۔

اصحاب صفہ میں سے ہر ایک پاک دیدہ و پاک بیں، توکل و رضا کا پیکر اور صدق وصفا کا ایک مرقع تھا، تاریخ اسلام میں انہی نفوس قدسیہ کو صوفیائے کرام کا پہلا گروہ کہا جاتا ہے۔ یعنی تصوف اسلام کا پہلا دور انہیں حضرات پر مشتمل تھا۔ تصوف کے بنیادی اصول یا ارکان تصوف، استغراق عبادت (یاد حق) توبہ، زہد، ورع، فقر، توکل اور رضا، شریعت میں بھی اسی اہمیت کے حامل ہیں جس طرح طریقت میں تھے اور تصوف کے ابتدائی دور میں رہے۔

صحابہ کرامؓ اور اصحاب صفہ میں سے ہر ہستی انہی اوصاف حمیدہ اور فضائل کی آئینہ دار تھی، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایثار تاریخ اسلام آج بھی فخر سے پیش کرتی ہے کہ گھر میں جس قدر اثاثہ تھا وہ تمام وکمال رسول خدا ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اور جب

رحمت عالم ﷺ نے فرمایا کہ اے صدیقؓ اہل وعیال کے لئے کیا چھوڑا؟ تو جواب دیا اُن کے لئے اللہ اور اس کا رسول کافی ہے۔ اسی کا نام کمال ایثار اور کمال توکل ہے۔ آپ کے زہد وتقویٰ اور خوف ورجاء کا یہ حال تھا اور آپ کے فقر اختیاری کی صورت یہ تھی کہ آپ ہمیشہ یہ دعا فرماتے تھے اَللّٰھُمَّ ابْسُطِی الدُّنْیَا وَ زُھْدَنِی عَنْھَا (اے اللہ دنیا کو میرے لئے فراخ فرما پھر مجھے اس سے بچا) آپ نے اپنی زندگی میں یہ پاکیزہ صفات حضور ﷺ کی حیات طیبہ سے اخذ کئے تھے اور معرفتِ خداوندی کے تمام اسرار ورموز آپ ہی سے سیکھے تھے اسی بنا پر حضرت شیخ علی ہجویری قدس سرہٗ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو مسلک تصوف کا امام گردانتے ہیں اور اکثر سلاسل تصوف آپ ہی پر منتہی ہوتے ہیں۔

یہی حال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تھا زہد وفقر کی یہ حالت تھی کہ لوگوں نے آپ کے جسمِ مبارک پر کبھی کوئی ایسا کپڑا نہیں دیکھا جو پیوند دار نہ ہو، دنیا کے بارے میں آپ کا مشہور مقولہ ہے۔ ''جس گھر کی بنیاد مصیبتوں پر رکھی گئی ہو اس کا بغیر مصیبت کے ہونا محال ہے۔''

صبر وتوکل میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آپ اپنی مثال تھے۔ عظیم سے عظیم تر مصیبت پر بھی آپ نے صبر وتوکل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ایثار وانفاق فی سبیل اللہ کا بھی یہی حال تھا۔ مدینہ منورہ میں بئیر عثمانؓ آج بھی آپ کے اس فضل کی نشانی موجود ہے، آپ بارہ سال تک خلیفہ رہے اس مدت کے ساٹھ ہزار درہم وظیفہ خلافت سے آپ نے ایک درہم بھی لینا قبول نہیں کیا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے ایثار کا یہ عالم تھا کہ شب ہجرت میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے شب بھر بستر رسالت پر دراز رہے اور آنحضرت ﷺ کی زندگی عزیز کو اپنی جان پر مقدم سمجھا۔ سادگی، فقر، رضائے الٰہی اور معرفت الٰہی میں بھی آپ بڑے ممتاز تھے۔ حضور ﷺ کے اس ارشاد گرامی انا مدینۃ العِلمِ وَعَلِیٌّ بَابُھا کی بنیاد پر تصوف کے بہت سے سلاسل آپ پر منتہی ہوتے ہیں چنانچہ سرخیل ارباب تصوف حضرت جنید بغدادی فرماتے ہیں شیخنا فِی الْأُصولِ وِالْبَلَاءِ علی المرتضیٰؓ یعنی اصولِ معرفت اور آزمائش میں ہمارے مرشد (شیخ) علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے استغراق عبادت کا یہ عالم تھا کہ جب آپ نماز پڑھتے تو آپ کو دنیا کی کچھ خبر نہیں رہتی، حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ غنیۃ الطالبین میں سورۃ الفتح کی ان آیات مُحمّد رسول اللّٰہِ والذین معَہٗ...... تا...... اَجراً عظِیماo کی تفسیر ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ آیات حضرات عشرہء مبشّرہ کی شان میں نازل ہوئی ہیں اور تَراھُم رُکعاً سے مراد حضرت علی کرم اللہ وجہ کی ذات والا ہے۔

خلفائے راشدین اور عشرہء مُبشّرہ کے بعد اصحاب صُفّہ ان صفاتِ ستودہ کا مظہر کامل تھے یہ وہ غریب ونادار حضرات تھے جو محض اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں مکہ سے اپنا گھر بار چھوڑ کر دیارِ رسول ﷺ میں آ گئے تھے، رہنے کا کہیں ٹھکانہ نہ تھا رسولِ خدا ﷺ نے مسجد نبوی کے قریب ایک چبوترہ (صُفّہ) تعمیر کروا دیا تھا اس چبوترے پر ان حضرات کے شب روز تنگدستی اور عُسرت میں بسر ہوتے تھے اور یہ حضرات عبادت، ذکر الٰہی اور مجاہدہ نفس میں اپنے شب و روز بسر فرماتے تھے۔ قرآن پاک اور حدیث شریف میں ان کا ذکر بڑی تفصیل سے آیا ہے۔ یہی حضرات دور اوّل یا دور رسالت وخلافت راشدہ کے ارباب تصوّف ہیں، خاص طور پر اصحاب صُفّہ کی زندگی تو صوفیائے کرام کی زندگی اور ان کے صوفیانہ خصائل کی صحیح تصویر تھی۔ یہی صوفیانہ خصائل و کردار بعد کے ارباب حال اور اصحاب تصوّف کے لئے نمونۂ تقلید بن گئے۔ رسول خدا ﷺ نے ان کے حالات کا مشاہدہ فرمانے کے بعد اس طرح ان کو خوشخبری اور بشارت دی۔

> ''اے اصحاب صُفّہ! تمہیں بشارت ہو! پس میری اُمت میں سے جو لوگ ان صفات سے متّصف ہوں گے۔ جن سے تم متصف ہو اور ان پر رضامندی سے قائم رہیں گے تو بیشک جنت میں میرے ہمنشین ہوں گے''۔

سرور کائنات ﷺ کی یہی بشارت اور حضرت والا کا یہی ارشاد تصوّف کی عملی زندگی کا بنیادی نقطہ ہے۔ تصوّف کے دور عروج تک صوفیائے کرام کی پاکیزہ زندگیاں اور ان کے پاکیزہ نفوس حضور ﷺ کے اس ارشاد گرامی کو منتہائے مقصود بنائے رہے اور یہی بے سرو سامانی ان کا سرمایہء زندگانی تھا اور الفقر فخری ان کا تاج شاہانہ۔

دَورِ تابعین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین:

تصوف کے دَورِ اوّل کے سلسلہ میں مختصراً عرض کر چکا ہوں تصوّف کا دوسرا دورِ تابعین کا دور ہے۔ یہ دَور تقریباً ایک سو سال کی مدت پر پھیلا ہوا ہے یعنی ۴۱ھ سے ۱۵۰ھ ہجری تک اس دورِ تابعین میں اصحاب تصوف میں دو۲ بزرگ ہستیاں بہت نمایاں ہیں ایک حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ جن سے سلوک میں نظریۂ اویسی کی بنیاد پڑی) اور دوسری بزرگ ہستی حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کی ہے! حضرت اویس قرنیؓ قرن کے رہنے والے تھے اور عہد رسالت مآب ﷺ میں بحیات تھے لیکن شرف دیدار حاصل نہ کر سکے، محبت رسول کا یہ عالم تھا کہ رسول اکرم ﷺ کا سلام بُہ عظمت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حج کے موقع پر آپ کو پہنچایا۔ آپ کے متعلق بہت سے واقعات تاریخ تصوف میں موجود ہیں۔ محبت رسول اور یادِ الٰہی میں آپ کی وارفتگی کا یہ عالم تھا کہ آپ جنگلوں اور ویرانوں میں پھرتے رہتے تھے جب لوگ روتے تھے تب آپ ہنستے تھے اور جب یہ لوگ ہنستے تھے تو آپ رونے لگتے تھے۔ آپ مدتوں تک بادیہ گردی کرنے کے بعد کوفہ چلے گئے۔ اور وہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں شامل ہو گئے۔ ۳۷ھ میں جنگ صِفین میں جام شہادت نوش کیا۔ (۲) حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کا صحیح سال پیدائش تو تحقیق نہیں ہو سکا البتہ آپ کا سال وفات ۱۱۰ھ مطابق ۷۲۸ء ہے آپ مشہور تابعین سے ہیں آپ کو بھی بکثرت صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کا فیض محبت حاصل ہوا۔ زہد، ورع، صبر اور خشیت الٰہی آپ کے خاص اوصاف تھے۔ خضوع و خشوع کا یہ عالم تھا کہ آپ فرماتے تھے جس نماز میں دل حاضر نہ ہو وہ نماز عذاب سے زیادہ قریب ہے تابعین میں آپ کے علاوہ اور بھی صوفیائے کرام موجود تھے لیکن تاریخی اعتبار سے مذکورہ حضرات زیادہ نمایاں شخصیت کے مالک ہیں، تصوف کے بہت سے سلاسل آپ سے شروع ہوتے ہیں۔

دورِ تبع تابعین:

تبع تابعین میں جو صوفیائے کرام گزرے ہیں ان میں دور ۱۵۱ھ مطابق ۷۶۸ء سے ۳۵۰ھ مطابق ۹۶۱ء تک متعین کیا گیا ہے اس دو صد سالہ دور میں اسلامی تصوف کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں مختصراً یہ کہ، یہ دور تصوف کا دورِ زریں کہلاتا ہے، اس دور کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ زھّاد، عبّاد اور نسّاک حضرات کو صوفی کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔ لفظ صوفی کا سب سے پہلے استعمال (صوفی) ابوالہاشم

رحمتہ اللہ علیہ (المتوفی ۱۵۱ھ مطابق ۷۶۸ء) سے ہوا وہ دنیائے تصوف میں سب سے پہلے صوفی سے مخاطب کئے گئے۔ حضرت ابو ہاشمؒ کوفہ کے رہنے والے تھے لیکن ان کا انتقال شام میں ہوا۔

مسجدیں اس دور میں خونریزی اور سفاکی کی آماج گاہ بن گئی تھیں سکونِ قلب اور خضوع وخشوع کے ساتھ ان مسجدوں میں ذکر الٰہی ممکن نہ تھا اس لئے ابوالہاشم کوفی نے شام کے مقام رملہ میں عیسائیوں کے صومعہ کی طرح روحانی تربیت اور ذکر الٰہی کے لئے سب سے پہلے خانقاہ تعمیر کرائی۔ دنیائے تصوف میں یہ سب سے پہلی خانقاہ ہے۔ تبع تابعین کے دور میں نظری اور عملی تصوف میں بہت سی تبدیلیاں وجود میں آئیں۔ ترک دنیا کا مفہوم عہد رسالت مآب ﷺ میں صرف اس قدر تھا کہ کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّكَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِر سَبِیْل لیکن اس کے ساتھ یہ حکم بھی موجود تھا کہ اَلدُّنْیَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَة، یعنی دنیا آخرت کی کھیتی ہے گویا دست بکار و دل بہ یار!! لیکن تبع تابعین کے دور میں ترک دنیا کا مفہوم یکسر بدل گیا۔ بادیہ پیمائی۔ صحرا نشینی اور ترک تعلقات کا نام ترک دنیا رکھا گیا اور اس کا سبب وہی ملکی انتشار اور سیاسی ابتری تھا۔

حُبِ الٰہی کا نظریہ پہلے بالواسطہ تھا یعنی اتباع رسول ﷺ کو حُبِ الٰہی کے حصول کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آپ فرما دیجئے کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھنا چاہتے ہو تو تم میری اتباع اور پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔) اب یہ نظریہ بلاواسطہ ہو گیا۔ اب بذریعہ ذکر و مراقبہ اللہ تعالیٰ سے محبت کی جانے لگی۔ حضرت رابعہ عدویہ (متوفی ۱۸۵ھ مطابق ۸۰۱ء) سے یہ نظریہ وجود میں آیا۔ یہ محترمہ بھی بصرہ کی رہنے والی تھیں۔ حضرت ذوالنون مصریؒ (متوفی ۲۴۵ھ مطابق ۸۵۹ء) نے نظریہ وحدت الوجود کو پیش کیا۔ حضرت بایزید بسطامی (المتوفی ۲۶۱ھ مطابق ۸۷۵ء) تبع تابعین کے دور کے مشائخ عظام میں شمار ہوتے ہیں۔ حضرت جنید بغدادی (متوفی ۲۹۷ھ مطابق ۹۱۰ء) تبع تابعین میں بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ ان کو شیخ المشائخ طریقت میں اور امام الائمہ شریعت میں تسلیم کرتے ہیں، آپ بھی نظریہ وحدت الوجود کے زبردست ہم نوا تھے۔ حسین بن منصور حلاج (المتوفی ۳۰۹ھ مطابق ۹۳۶ء) یہ فارس کے شہر بیضا کے رہنے والے تھے۔ مدتوں مرشد کی تلاش

میں سرگرداں رہے آخر کار پھرتے پھراتے بغداد پہنچے اور حضرت جنید بغدادیؒ کے مرید ہوئے، نظریہ وحدت الوجود میں توغل اور انتہا پسندی کی بدولت ان کو ۹۲۲ء میں سولی پر چڑھا دیا گیا۔ حضرت ابوبکر شبلی (المتوفی ۳۳۴ھ مطابق ۹۴۹ء) تبع تابعین کے دور کے مشہور صوفی اور سرخیل سلاسل طریقت ہیں۔ آپ بھی حضرت جنید بغدادیؒ کے مرید تھے، اور نظریہ وحدت الوجود کے زبردست اور عظیم داعی تھے، دورِ تبع تابعین میں ان مشاہیر صوفیائے کرام کے علاوہ اور دیگر حضرات اور ان حضرات کے مریدین اطراف واکناف ممالک اسلامیہ میں پھیلے ہوئے تعلیم طریقت اور اس کی اشاعت میں مصروف تھے۔

دورِ متاخرین: تبع تابعین میں عملی تصوف نے علمی تصوف کی شکل بھی اختیار کر لی تھی دور متاخرین میں بھی چند اکابرین صوفیاء ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے مرشدین و اسلاف کرام کی طرح تصوف کے مشکل اور اہم نظریات کی علمی تشریح کی طرف خاص طور پر توجہ فرمائی وران علمی تشریحات کی بدولت (جن کو تصوف میں ان کی تصانیف کہنا چاہئے) ان کے نام تاریخ تصوف میں تابندہ پائندہ ہیں، دور متاخرین کے ایسے اکابر صوفیا میں حضرت شیخ علی بن عثمان جلابی ہجویری (متوفی ۴۶۵ھ مطابق ۱۰۷۲ء) حضرت امام غزالیؒ (المتوفی ۵۰۵ھ مطابق ۱۱۱۱ء) حضرت شیخ محی الدین ابن اکبرؒ (متوفی ۶۳۸ھ مطابق ۱۰۷۲ء) اور حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ (المتوفی ۶۷۲ھ) خاص طور پر بہت نمایاں ہیں اور ان کے علمی کارنامے دنیائے تصوف ہی میں نہیں بلکہ دنیائے اسلام میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ یہاں میں حضرت شیخ علی بن عثمان ہجویری معروف بہ داتا گنج بخشؒ کے سلسلہ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، باقی حضرات کے سلسلہ میں انشاء اللہ کسی اور موقع پر تفصیل سے لکھوں گا، ان چند صفحات میں حضرت علی بن عثمان الجلابی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ کا تذکرہ آپ کے نظریات اور آپ کے علمی شاہکار، کشف المحجوب، کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہی اس دیباچہ کی نگارش کا اصل مقصود ہے۔

حضرت شیخ علی ہجویری معروف بہ داتا گنج بخش قدس سرہ

آپ کا اسم گرامی خود آپ کی تحریر کے مطابق ''علی بن عثمان جلابی یا علی بن عثمان بن علی الجلابی الغزنوی ہے، آپ غزنین (غزنی) کے قریہائے جلاب و ہجویر کے رہنے والے تھے اسی مناسبت سے کبھی آپ خود کو جلابی اور کبھی ہجویری تحریر فرماتے ہیں آپ نے ''کشف المحجوب'' میں متعدد جگہ اپنا نام نامی تحریر فرمایا ہے

اور اس کی توجیہہ بھی فرمائی ہے، (قارئین ترجمہ میں اس کی توجیہہ ملاحظہ فرمائیں) اب برصغیر پاک و ہند میں داتا گنج بخش کے لقب سے مشہور و معروف ہیں۔ گنج بخش کا لقب حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے مزار فائز الانوار پر چلّہ کشی کے بعد بوقت رخصت ایک الوداعی منقبت میں پیش کیا تھا۔

آپ کا سلسلہ نسب: آپ کا سلسلہ نسب جس پر آپ کے اکثر سوانح نگاروں نے اتفاق کیا ہے یہ ہے۔ حضرت علی ہجویریؒ بن عثمانؒ بن سید علیؒ بن عبدالرحمٰنؒ بن شجاعؒ بن ابوالحسن علیؒ بن حسن اصغر بن زید بن حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ بن حضرت علیؓ بن ابی طالب اس طرح آپ ہاشمی سید ہیں اور آپ کا سلسلہ نسب آٹھویں پشت میں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے ملتا ہے۔

سالِ ولادت اور وطن کاش داتا صاحبؒ نے 'کشف المحجوب' میں جس طرح اپنا مؤلد و مسکن اور اپنے والد و جدِ گرامی کے نام بیان فرمائے ہیں اور ان حضرات کے بعض احوال زندگی بھی ضمناً بیان فرما دیئے ہیں اسی طرح اپنا سالِ ولادت بھی جو آپ تک روایتاً یقیناً پہنچا ہوگا بیان فرما دیتے تو آپ کی سال ولادت کے تعین میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ ختم ہو جاتا۔ مستشرقین کا ہمیشہ سے دستور رہا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں بھی تحقیق کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتے اور تجسس کا کوئی پہلو فرو گزاشت نہیں کرتے لیکن اس سلسلہ میں وہ بھی ناکام رہے ہیں عام طور پر آپ کا سال ولادت ۴۰۰ھ تسلیم کیا گیا ہے، آپ کے مولد و وطن کے سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے تمام سوانح نگار اس پر متفق ہیں کہ جلاب و ہجویر جو غزنی کے قریے یا محلے تھے۔ آپ کا مولد و مسکن رہے ہیں۔ کچھ عرصہ آپ جلاب میں رہے اور کچھ مدت ہجویر میں۔ کشف المحجوب میں آپ نے اپنے اسم گرامی کے ساتھ وطن کی صراحت اس طرح فرمائی ہے۔ "علی بن عثمان بن علی الجلابی الغزنوی ثم الہجویری۔

جلاب و ہجویر کے سلسلہ میں صاحب سفینۃ الاولیا نے اس طرح تشریح کی ہے کہ جلاب و ہجویر غزنی کے دو محلے تھے آپ پہلے جلاب میں مقیم تھے پھر ہجویر منتقل ہو گئے۔

حضرت ہجویری قدس سرہ کے اساتذہ: حضرت داتا گنج بخش قدس اللہ سرہٗ کے اساتذہ کرام کے سلسلہ میں مشرقی سوانح نگارانِ قدیم نے کسی خاص توجہ سے کام نہیں لیا حضرت داتا گنج بخش قدس اللہ سرہٗ نے خود کشف المحجوب میں حضرت ابوالعباس محمد شقانی رحمتہ اللہ علیہ کا

ذکر کیا ہے تو بڑے ادب سے ان کا نام لیا ہے اور ان کی مہربانیوں اور عنایتوں کو یاد فرماتے ہوئے آپ سے اکتساب علم کا ذکر اس طرح فرمایا ہے کہ ''در بعضے علوم استاد من بودہ۔'' علوم اسلامی یعنی تفسیر و حدیث و فقہ پر آپ کو جو کامل دستگاہ حاصل تھی اور جس کا اظہار ''کشف المحجوب'' کے بلند پایہ علمی مقالات اور مباحث سے ہوتا ہے وُہ اس امر کے شاہد ہیں کہ آپ نے اپنے وقت کے بعض دوسرے صاحبان علم و فضل سے بھی استفادہ کیا ہوگا اس لئے کہ آپ صرف عارف کامل ہی نہیں بلکہ ایک بلند پایہ عارف و عالم ہیں۔ 'کشف المحجوب' میں آپ جس طرح طریقت و شریعت کے مباحث پر بحث فرماتے ہیں اور استدلال لاتے ہیں اور قرآن و حدیث و خبر سے جس طرح سند پیش کرتے ہیں اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو علوم متداولہ پر دستگاہ کامل حاصل تھی اور آپ علوم شریعت کے بھی شناور نہیں بلکہ غواص تھے اور علم تفسیر و حدیث پر آپ کو عبور حاصل تھا اور آپ ان علوم پر بھی گہری نظر رکھتے تھے اور یہ سب کچھ فیضان تھا آپ کے مرشد کامل کا۔ حضرت داتا قدس اللہ سرہٗ خود اپنے مرشد والا کے بارے میں فرماتے ہیں کہ میرے مرشد شیخ ابوالفضل محمد بن حسن الختلیؒ ہیں جو علم تفسیر و روایات (حدیث) کے عالم تھے۔'' (کشف المحجوب)

پس جہاں ان شیخ طریقت کی نظر کیمیا اثر نے آپ کو طریقت میں اس بلندی پر پہنچایا وہ اگر علوم دینی یعنی تفسیر و حدیث میں بھی آپ کو ایسی بصیرت عطا کر دیں جو اقران و امثال سے ممتاز بنا دے تو کیا تعجب۔ ''حضرت ابوالفضل حسن الختلیؒ کے علو مرتبت کے سلسلہ میں حضرت داتا گنج بخش قدس سرہ فرماتے ہیں کہ

> ''وہ صوفیائے متاخرین میں زینت اوتاد اور شیخ عباد ہیں طریقت میں میری اقتدا (بیعت) ان ہی سے ہے تصوف میں حضرت جنیدؒ کا مذہب رکھتے تھے، حضرت شیخ حصری کے راز دار مرید تھے۔''

اپنے مرشد گرامی سے جو تعلق خاطر حضرت علی ہجویریؒ کو تھا اس کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ حضرت ابوالفضل الختلیؒ کا جب وصال ہوا تو ان کا سر حضرت علی ہجویری قدس اللہ سرہٗ کی گود میں تھا اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مرشد کو بھی اپنے مرید خاص سے کس درجہ محبت تھی۔

حضرت داتا گنج بخشؒ کا شجرہ طریقت

آپ کا شجرہ طریقت اس طرح ہے،
شیخ علی ہجویری مرید حضرت شیخ ابوالفضل الختلیؒ مرید حضرت شیخ حُصریؒ مرید شیخ ابوبکر شبلیؒ مرید حضرت جنید بغدادیؒ مرید حضرت شیخ سری سقطیؒ مرید حضرت داؤد طائیؒ مرید حضرت حبیب عجمیؒ مرید حضرت علی رضی اللہ عنہ۔

حضرت داتا گنج بخش قدس سرہٗ نے بھی عمر کا بڑا حصہ صحرا نوردی اور بادیہ پیمائی میں بسر کیا عراق شام لبنان، آذر بائیجان، خراسان و کرمان، خوزستان، طبرستان، ترکستان اور ماوراالنہر کے شہروں اور قریوں میں تلاش حق کے لئے سرگرداں رہے تب کہیں دامن مقصود ہاتھ آیا مگر یہ وضاحت کہیں نہیں ملتی کہ آپ اپنے مرشد والا مرتبت کے ساتھ کتنا عرصے رہے اور ان کی صحبت میں کن کن مقامات کی سیر کی۔

حضرت داتا گنج بخشؒ کے ہمعصر مشائخ

ارباب حقیقت و طریقت اپنے دل کی لگی بجھانے اور تشنگی باطن کو دُور کرنے کے لئے شہروں اور قریہ بہ قریہ پھرا کرتے تھے۔ اس کا ایک عظیم مقصد یہ بھی ہوتا تھا کہ ارباب حال کی صحبتوں میں پہنچ کر زندگی کے کچھ دن بسر کریں کہ ان کی صحبت کیمیا اثر بھی فیض سے خالی نہیں ہوتی۔ حضرت داتا گنج بخشؒ نے بھی اس سیر و سیاحت میں اپنے معاصرین کرام اور صوفیائے عظام کی صحبتوں سے استفادہ کیا، ان معاصرین میں حضرت ابوالقاسم بن علی بن عبداللہ گرگانی، حضرت امام ابوالقاسم قشیری صاحب رسالہ القشیریہ قدس سرہٗ، حضرت شیخ احمد حمادیؒ سرخسی قدس سرہٗ حضرت محمد بن مصباح حضرت ابوسعید ابوالخیر رحمتہ اللہ علیہ، شیخ ابواحمد المظفر بن احمدؒ اور دیگر اکابرین شامل ہیں، ان معاصرین میں سے آپ حضرت ابوالقاسم بن علی گرگانیؒ اور جناب ابوالقاسم القشیری کا ذکر بڑے اہتمام سے کرتے ہیں اور ان سے استفادہ کا بھی اعتراف فرماتے ہیں۔

حضرت داتا گنج بخشؒ کا مسلکِ طریقت

حضرت داتا صاحبؒ نے جس طرح اپنے پیر طریقت کے مسلک تصوف کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ وہ تصوف میں حضرت جنید قدس

سرہٗ کا مذہب رکھتے تھے چنانچہ حضرت داتا صاحب تصوف و طریقت میں جنیدیؒ مسلک کے متبع تھے اسی طرح وہ شریعت میں سنی حنفی المذہب تھے۔ چنانچہ جہاں جہاں وہ حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ کا نام نامی لیتے ہیں وہ وہاں کمال احترام کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ کشف المحجوب میں ایک جگہ امام اعظم رضی اللہ عنہ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔ ''امام اماماں، مقتدائے سُنیاں، شرف فقہا، اعز علماء ابوحنیفہ نعمان بن ثابت الخراز رضی اللہ عنہ''(کشف المحجوب)

حضرت داتا گنج بخشؒ کی ازدواجی زندگی: حضرت کی ازدواجی زندگی کے سلسلہ میں ''کشف المحجوب'' یا کسی اور تذکرے میں کوئی صراحت نہیں ہے۔ کشف المحجوب سے صرف اس قدر ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے ایک شادی کی اور جب کچھ مدت کے بعد اُن سے مفارقت ہوگئی تو پھر آپ نے تا زیست دوسری شادی نہیں کی۔

لاہور میں ورود مسعود اور اس کے پاکیزہ اثرات

حضرت داتا گنج بخش قدس سرہٗ کی عمر کا کافی حصہ سیر و سیاحت میں بسر ہوا۔ آپ کا تجرد اور توکل اس سیاحت میں آپ کا ممد و معاون تھا چنانچہ اسی سیاحت کے دوران اپنے مرشد کے اشارے پر یا اپنی طبیعت کے اقتضا سے آپ نے لاہور کا قصد فرمایا۔ اس سلسلہ میں بہت سی دلآویز حکایتیں ہیں جن کی تردید کی بہت گنجائش ہے اس سلسلہ میں بس اتنا کہا جاتا ہے کہ آپ نے جب لاہور میں ورود فرمایا تو سلطان مسعود بن سلطان محمود غزنوی (۴۳۱ھ) لاہور کا حاکم تھا لیکن سال ورود کا تعین دشوار ہے۔ آپ کے ورودِ مسعود نے لاہور کے قالب میں ایک نئی جان ڈال دی، آپ کے قیام کے دوران ہزاروں گم گشتگانِ بادیہ ضلالت و گمرہی نے آپ سے ہدایت پائی اور ہزاروں مشرکوں کے دلوں سے کلمہء توحید پڑھا کر زنگِ کفر و شرک کو دور فرمایا۔ حضرت داتا صاحب قدس سرہٗ نے لاہور میں ورود فرمانے کے بعد اپنا تمام وقت تبلیغ اسلام اور تصنیف و تالیف میں صرف فرمایا۔ دربار شاہی سے آپ کا کسی قسم کا تعلق نہیں تھا۔ تبلیغ اسلام کا جو کام آپ نے شروع فرمایا تھا اس کو بعد میں آنے والے اکابرین صوفیائے اپنے پاکیزہ اور اعلیٰ کردار سے اسلام کی سچی اور پاکیزہ تصویر پیش کر کے پایہء تکمیل کو پہنچایا۔

حضرت داتا گنج بخشؒ کے علمی کارنامے

حضرت داتا گنج بخش قدس سرّہ جس طرح بحر طریقت کے شناور تھے اسی طرح آپ قرآن وحدیث اور فقہ پر بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے اور رموز و اسرار شریعت سے بھی اسی طرح آگاہ تھے، جیسا کہ میں اس سے قبل عرض کر چکا ہوں اسلامی تصوف کے دور تبع تابعین میں نظری تصوف نے علمی تصوف کی شکل اختیار کر لی تھی۔ تصوف نے جب علم کی دنیا میں قدم رکھا تو رموز طریقت اور اسرار حقیقت پر بھی قلم اٹھایا گیا لیکن اس دور میں اس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا وہ عربی زبان میں تھا۔ حضرت داتا گنج بخش قدس سرّہ کے معاصرین میں سے امام ابوالقاسم قشیری نے تصوف کے رموز پر جو رسالہ قشیریہ مرتب کیا اس کی زبان بھی عربی تھی فارسی مفتوحین نے جب تصنیف کی دنیا میں قدم رکھا تو انہوں نے بھی اسی زبان عربی کو اختیار کیا جس کی تقدیس کا قرآن و احادیث کی زبان سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ مذہبیات میں عربی کے سوا کسی اور زبان کو استعمال کرنا تقدیس کے منافی خیال کیا جاتا تھا۔ فارسی نژاد علماء و فضلائے اسلام کی گراں بہا تصانیف میرے اس دعوے پر شاہد ہیں، حضرت داتا گنج بخشؒ کی مادری زبان بھی فارسی تھی اگرچہ آپ کو عربی زبان پر بھی کامل عبور حاصل تھا لیکن کشف المحجوب عوام کے افادہ کے لئے آپ نے فارسی زبان میں تصنیف فرمائی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کی باقی تصانیف یعنی کتاب (۱) فنا و بقا۔ (۲) اسرار الخرق و المؤنات۔ (۳) الرعایت بحقوق اللہ تعالیٰ۔ (۴) کتاب البیان لاہل العیان۔ (۵) نحو القلوب، (۶) منہاج الدین، (۷) ایمان، (۸) شرح کلام منصور حلاج اور (۹) دیوان اشعار۔ کس زبان میں تھیں۔ آج ان تصانیف میں سے کسی کا وجود نہیں ہے صرف کشف المحجوب کی بدولت یہ نام باقی رہ گئے ہیں۔ کشف المحجوب زمانے کی دستبرد سے محفوظ ہے۔ اور اس کے متعدد قلمی نسخے کتب خانوں میں موجود ہیں اور برصغیر پاک وہند میں مطابع کے وجود میں آنے کے بعد اس کے ہزاروں

مطبوعہ نسخے دلدادگان شریعت وطریقت کے لئے نظر فروز ہیں۔ کشف المحجوب کہاں لکھی گئی لاہور میں یا ہجویر میں اور کب لکھی گئی یعنی سال تصنیف کیا ہے اس کی نشان دہی بھی محال ہے البتہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بڑے پرسکون ماحول میں لکھی گئی ہے اور کشف المحجوب کی ایک وضاحت کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا تکملہ لاہور میں ہوا۔ یہ تعین کرنا بھی دشوار ہے کہ آپ کے رفیق و معاصر ہموطن ابو سعید ہجویریؒ نے کب اور کہاں آپ سے یہ سوالات کئے تھے جن کے جوابات بصورت کشف المحجوب آپ نے دیئے۔ ان سوالات کے سلسلے میں حضرت داتا صاحب قدس سرّہ صرف اتنا فرماتے ہیں کہ۔ ''قال السائل وھوابوسعید الھجویری بیان کن مرا اندر تحقیق طریقت و تصوف وارباب تصوف و کیفیات مقامات ایشاں و بیان مذاہب ومقالات آں واظہار رموز واشارات ایشاں۔

شیخ محمد اکرام مرحوم بڑے وثوق کے ساتھ تاریخ ملّی میں علی ہجویری لاہوری کے تحت عنوان لکھتے ہیں کہ ''فارسی نثر کی سب سے پہلی مذہبی کتاب جو برصغیر پاک و ہند میں پایہء تکمیل کو پہنچی کشف المحجوب ہے اور حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری قدس سرّہ نے قبتہ اسلام لاہور میں مکمل کیا۔'' (تاریخ ملّی ص ۷) بہر حال کشف المحجوب اپنے موضوع اور مباحث کے اعتبار سے جسقدر بلند پایہ کتاب ہے وہ تعریف و توصیف سے مستغنی ہے۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء قدس سرّہ کا ارشاد گرامی اس سلسہ میں ملاحظہ فرمایئے، فرماتے ہیں ''اگر کسی کا پیر نہ ہو تو ایسا شخص جب اس کتاب کا مطالعہ کرے گا تو اس کو پیر کامل مل جائے گا۔ میں نے اس کتاب کا مکمل مطالعہ کیا ہے (ترجمہ) اور یہ حقیقت بھی ہے کہ کشف المحجوب آپ کا ایک ایسا شاہکار ہے جس کی بدولت برصغیر پاک و ہند میں صحیح اسلامی تصوف نے فروغ پایا اور اس وصفِ خاص کی بدولت آج بھی کشف المحجوب کی قدر ومنزلت اتنی ہے جتنی آج سے نو سو برس پہلے تھی۔ کشف المحجوب کے سلسلہ میں اسلامی ثقافت کے مشہور مورّخ شیخ محمد اکرام مرحوم کہتے ہیں کہ:۔

''یہ کتاب آپ نے اپنے رفیق ابو سعید ہجویریؒ کی خواہش پر جو آپ کے ساتھ غزنی چھوڑ کر لاہور آئے تھے، لکھی اور اس میں تصوف کے طریقے کی تحقیق، اہل تصوّف کے مقامات کی کیفیت، اُن کے اقوال اور صوفیانہ فرقوں کا بیان معاصر صوفیوں کے رموز واشارات اور متعلقہ مباحث بیان کئے ہیں، اہل طریقت میں اس کتاب کو بڑا مرتبہ حاصل ہے۔'' (آبِ کوثر)

کشف المحجوب'' پر پروفیسر خلیق نظامی ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں۔

''شیخ ہجویریؒ کی اس کتاب نے ایک طرف تو تصوف سے متعلق عوام کی غلط فہمیوں کو دور کیا اور دوسری طرف اسکی ترقی کی راہیں کھول دیں۔'' (تاریخ مشائخ چشت)

کشف المحجوب کی قبولیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ صوفیائے کرام کے مشہور تذکرہ نگاروں مثلاً خواجہ فرید عطارؒ۔ حضرت مولانا جامی قدس سرّہٗ صاحب نفحات الانس۔ حضرت خواجہ محمد پارساؒ صاحب فصل الخطاب اور خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ نے اپنے تذکروں میں اور تصانیف میں کشف المحجوب سے استفادہ کیا ہے اور مشائخ تصوّف کے حالات اس سے اخذ کئے ہیں۔ آپ کے مقولوں اور آپ کی تحقیق کو بطور سند پیش کیا ہے۔

کشف المحجوب میں جو رموز طریقت اور جن حقائق معرفت کو منکشف کیا گیا ہے ان کی بنیاد حضرت داتا صاحب قدس سرّہ نے اپنے مکاشفات پر نہیں رکھی ہے بلکہ ان کا ماخذ قرآن وسنت کو قرار دیا ہے یا دنیائے عرفان کی مستند کتابیں ہیں جن کا ذکر ''کشف المحجوب'' میں داتا صاحب قدس سرّہ نے اپنی تصنیف لطیف میں کیا ہے اور یہی اس کی قبولیت کا راز ہے کہ آپ کے بعد کے بزرگان طریقت اور ارباب تصوف کے لئے وہ ہمیشہ ماخذ کا کام دیتی رہی ہے۔ صاحب کشف المحجوب جس مسئلہ یا رمز طریقت پر قلم اٹھاتے ہیں اولاً وہ قرآنِ حکیم اور ارشاد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس کی سند لاتے ہیں پھر اس کا استدلال آثار و اخبار سے کرتے ہیں اگر وہ اس استدلال میں کامیاب نہیں ہوتے تو اکابرین ارباب تصوف کے یہاں اس کی سند تلاش کرتے ہیں، آپ کشف المحجوب کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں آپ کو خود مصنف قدس سرّہٗ کی جانب سے ان منابع اور مآخذ کی نشاندہی ملے گی۔

کشف المحجوب کی زبان اور اسلوب بیان

کشف المحجوب کے مذکورہ بالا اِن چند پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد یہ بھی ضروری تھا کہ اس کی زبان اور اس کے اسلوب بیان پر بھی کچھ لکھا جاتا لیکن یہ مقدمہ یا دیباچہ اس کے اردو ترجمے کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے اس موقع پر کشف المحجوب کی فارسی زبان اور اس کے اسلوب کو بیان کرنا بے محل سی بات ہوگی مختصراً صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ حضرت داتا گنج بخش قدس سرّہ نے کشف المحجوب کو تکلف اور تصنع سے برَی، نہایت آسان اور روزمرہ کی فارسی میں تحریر کیا ہے، انداز بیان ایسا صاف اور واضح ہے کہ مفہوم و معنی کے سمجھنے میں کہیں دِقت پیدا نہیں ہوئی، افسوس کہ اب فارسی زبان عوام کے لئے ایک غیر اور بیگانہ زبان بن گئی ہے یہی سبب ہے کہ اصل متن کو شائع کرنے کے بجائے اس کا اردو ترجمہ شائع کیا جارہا ہے تاکہ عوام اس سے استفادہ کرسکیں

کشف المحجوب اور اسکے اردو تراجم

کشف المحجوب کی بلند پائیگی کا اندازہ اس امر سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ صوفیائے عظام نے اس کو اپنی تصانیف میں مآخذ قرار دیا۔ تیرھویں صدی کے وسط تک فارسی زبان عوام کی زبان تھی، تحریر کی زبان بھی فارسی تھی اس لئے اس وقت تک کشف المحجوب کے اردو ترجمے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ تیرھویں صدی کے اواخر اور چودھویں صدی کے اوائل میں جب فارسی زبان کا انحطاط بحدِ کمال پہنچ گیا اور اُردو عوام کی زبان قرار پائی تو اس وقت سے فارسی زبان کی بہت سی بلند پایہ کتب کے اُردو میں تراجم ہونے لگے چنانچہ اس ضرورت کے تحت ”کشف المحجوب“ جیسی بلند پایہ اور گراں مایہ

کتاب کے متعدد اُردو تراجم ہوئے جو اپنے اپنے وقت پر شائع ہو کر اُس عہد اور اس وقت کی ضرورت کو پورا کرتے رہے۔ اس وقت تک ۲۰ سے زیادہ اردو تراجم اس عظیم کتاب کے شائع ہو چکے ہیں۔ اولین تراجم کا انداز بالکل عامیانہ ہے اور زبان اپنے عہد کی ترجمان ہے۔ پھر کچھ کچھ تبویب، تذبیب کا اہتمام ہونے لگا لیکن سوانح مصنف پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔

اس سلسلہ میں عظیم مستشرق پروفیسر نکلسن (مصنف تاریخ ادبیات عرب) کو داد نہ دینا ناانصافی ہوگی کہ جب انہوں نے ۱۹۱۱ء میں کشف المحجوب کا انگریزی ترجمہ شائع کیا تو وہ ہمارے اردو تراجم سے بہت بلند، بہت وسیع اور جامع تھا۔ انہوں نے سوانح نگاری میں تحقیق کا حق ادا کیا اور حضرت داتا گنج بخش قدس سرّہ کی سوانح حیات کے ہر پہلو پر محققانہ بحث کی۔ کشف المحجوب کے منابع اور مآخذ کا پتہ چلایا، ان کے اساتذہ کرام، اُن کے معاصرین عظام اور ان سے متعلق تاریخوں کی جستجو اور صحت کی تحقیق کی۔ مختصراً یہ کہ کشف المحجوب کے موضوع اور مباحث پر سیر حاصل تبصرہ کر کے کشف المحجوب کے صحیح مقام سے دنیائے ادب کو متعارف کرایا۔ پروفیسر نکلسن کی تحقیقات نے "کشف المحجوب" کے اُردو مترجمین کو بہت سے نئے "راستوں" سے آشنا کیا انہوں نے اس عظیم مستشرق کی تحقیقات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

پروفیسر نکلسن کے بعد ایک روسی ادیب پروفیسر ژوکوفلی نے بڑی کاوش سے اور دقتِ نظر سے کشف المحجوب کے ایک قدیم نسخہ کی تصحیح کی اور اس کو اپنے ایک محققانہ مقدمہ (بزبان روسی) کے ساتھ لینن گراڈ سے شائع کیا کچھ مدت بعد ایک ایرانی ادیب نے اس روسی مقدمہ کو فارسی (جدید فارسی) میں منتقل کیا اور اپنا مترجمہ مقدمہ اس مصحح متن کے ساتھ شائع کر کے اس روسی ادیب کی کاوشوں سے ایرانیوں اور دوسرے دل دادگانِ کشف المحجوب سے روشناس کرایا۔ پروفیسر نکلسن کے ترجمے اور روسی ادیب کے مقدمہ اور تصحیح نے

کشف المحجوب کے اردو تراجم میں ایک نئی جان ڈال دی اور حضرت داتا گنج بخش قدس سرّہ کی سوانح حیات کے بہت سے پہلو پہلی مرتبہ عوام کے سامنے آئے، اس مختصر دیباچہ یا مقدمہ میں بھی ان معلومات سے استفادہ کیا گیا ہے۔

حضرت داتا گنج بخش قدس سرہ کی وفات اور آپ کا مزار: نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ جس طرح حضرت قدس سرّہ کی تاریخ ولادت پر آپ کے تذکرہ نگاروں کا اتفاق نہیں اسی طرح آپ کی تاریخ وفات بھی متفق علیہ نہیں ہے روسی مقدمہ نگار اور پروفیسر نکلسن بھی تاریخ ولادت کی طرح تاریخ وفات کے سلسلہ میں بھی کسی ایک سال کا تعین نہیں کر سکے۔ پروفیسر نکلسن ۴۵۶ھ تا ۴۶۵ھ کا کوئی درمیانی سال آپ کا سالِ وفات بتاتے ہیں۔ داراشکوہ بھی سفینۃ الاولیاء میں تذبذب کا شکار ہیں۔ بعض تذکرہ نگاروں نے ۴۶۵ھ کو صحیح سال وفات تسلیم کر کے لفظ 'سردار' سے تاریخ وفات نکالی ہے۔ یعنی ''سال وصلش برآمد از سردار''۔ شیخ محمد اکرام مرحوم بھی آب کوثر میں کوئی ایک سال متعین نہیں کر سکے اور کہتے ہیں کہ آپ کی وفات ۴۶۵ھ مطابق ۱۰۷۲ء کے قریب واقع ہوئی۔ ڈاکٹر نور الدین اپنے محققانہ مقالہ ''تصوف اور اقبال'' میں آپ کا سالِ وفات وثوق کے ساتھ ۴۶۵ھ ہی قرار دیتے ہیں اور اسی پر اکثر تذکرہ نگاروں کو اتفاق ہے۔

مزار پر انور: آپ کا مزار پُر انوار لاہور میں ہے اسی نسبت سے لاہور کو داتا کی نگری بھی کہتے ہیں، لاہور کی سرزمین اس پر جتنا بھی فخر کرے وہ کم ہے کہ ایک ایسی برگزیدہ اور بلند پایہ ہستی یہاں آرام فرما ہے جس کی آمد نے ہند کے اس عظیم خطہ میں شمع ایمان افروزاں کی، یہی وہ قدسی بارگاہ ہے جہاں خواجہ غریب نوازؒ بھی اِکتساب فیض کے لئے مقیم رہے۔ یہاں کی خاک اکابرین صوفیا کے لئے سرمہء بصیرت اور تاجِ عزت ہے۔ یہی وہ مقام ہے جو آج تک قبلہء اہلِ صفا بنا ہوا ہے اور جہاں انوار الٰہی ہر وقت برستے ہیں۔ یہاں عوام بھی حاضر ہوتے ہیں، صوفی اور عالم بھی۔ ہر ایک یکساں عقیدت کے ساتھ آتا ہے۔ یہاں کی فضا میں ہر وقت اور ہر لحظہ ذکر خدا اور ذکر رسول ﷺ جاری و ساری رہتا ہے اور داتاؒ کے فیض سے جھولیاں بھرنے والوں کا ہر وقت ہجوم رہتا ہے۔ بقول شاعر مشرق علامہ اقبالؒ

خاکِ پنجاب از دم او زندہ گشت
صبح ما از مہر او تابندہ گشت

شمس بریلوی
ایئرپورٹ۔ کراچی
۱۵ فروری ۱۹۵۷ء

السلوک الیٰ المحبوب

ترجمۃ

کشفُ المحجوب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ ط

اے ہمارے رب! اپنی بارگاہ سے ہم پر رحمتیں نازل فرما اور ہمارے معاملہ میں ہمیں راہِ راست کی توفیق عطا فرما۔ اللہ تعالیٰ ہی ہر خوبی کا سزاوار ہے جس نے اپنے اولیاء پر اپنی بادشاہت کے اسرار کھولے اور اپنے اصفیاء کے لئے اپنی خشیت وجبروت کے راز منکشف فرمائے اور اپنی شمشیرِ عظمت وجلال سے محبوبوں کا خون بہایا اور عارفین کو اپنے وصال کی چاشنی کا مزہ چکھایا۔ وہی اپنی بے نیازی اور کبریائی کے انوار کے ادراک سے مردہ دلوں کو زندگانی عطا فرماتا ہے۔ اور اپنے اسماء کی مہک کے ساتھ معرفت الٰہی کی خوشبو سے انہیں لطف اندوز ہونے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کے رسول محمد مصطفےٰ ﷺ اور ان کی آل واصحاب اور ازواجِ مطہرات ؓ پر ہمیشہ ہمیشہ درود وسلام نازل ہو۔

ابتدائیہ

اے طالب راہِ حقیقت! اللہ تعالیٰ دونوں جہان کی سعادتمندی نصیب فرمائے۔ جب تم نے مجھے اپنے سوال کے ذریعہ اس کتاب کی درخواست کی تو میں نے استخارہ کیا اور خود کو دلی واردات اور باطنی القا کے حوالہ کردیا (جب استخارہ میں اِذنِ الٰہی حاصل ہوگیا) تو میں نے تمہاری مقصد برآری کی خاطر اس کتاب کے لکھنے کا عزم صمیم کرلیا۔ اور اس نوشتہ کا نام "کشف المحجوب" رکھا امید ہے کہ ارباب فہم وبصیرت اس کتاب میں اپنے سوالات کا جواب علیٰ وجہ الکمال پائیں گے۔

بعدہٗ اللہ تعالےٰ سے استعانت طلب کرتا ہوں اور اسی سے توفیق کی استدعا ہے کہ وہ اس نوشتہ کو تمام وکمال کرنے میں مدد فرمائے۔ اظہار وبیان اور نوشت میں اپنی قوت وطاقت پر اعتماد اور بھروسہ کرنا درست نہیں ہے۔ وباللہ التوفیق۔

اپنا نام تحریر کرنے کی وجہ

شروع میں جو اپنا نام تحریر کیا ہے اس کی دو وجوہات ہیں ایک وجہ خاص حضرات کے لئے ہے اور دوسری وجہ عام لوگوں کے لئے۔ لیکن جو وجہ عام لوگوں کے لئے ہے کہ جب اس علم سے بے بہرہ و ناواقف کوئی ایسی نئی کتاب دیکھتے ہیں اور اس میں مصنف کا نام کسی جگہ نظر نہیں آتا تو وہ کتاب کو اپنی طرف منسوب کر لیتے ہیں (یعنی یہ کتاب میری تصنیف ہے) جس سے مصنف کا مقصد ناکام ہو جاتا ہے۔ حالانکہ مصنف کی تالیف و تصنیف کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ اس کا نام زندہ و پائندہ رہے۔ اور پڑھنے والے طالبان حق مصنف کو دعائے خیر سے یاد کرتے رہیں۔ ایسا حادثہ میرے ساتھ دو مرتبہ پیش آ چکا ہے۔

پہلا حادثہ یہ ہوا کہ ایک صاحب میرے اشعار کا دیوان مستعار لے گئے پھر انہوں نے واپس نہیں کیا۔ میرے پاس اس نسخہ کے سوا اور کوئی نسخہ نہیں تھا۔ اُن صاحب نے میرے نام کو حذف کر کے اپنے نام سے اس دیوان کو مشہور کر دیا۔ اس طرح میری محنت انہوں نے ضائع کر دی۔ اللہ تعالےٰ انہیں معاف فرمائے۔

دوسرا حادثہ یہ پیش آیا کہ میں نے علم تصوف میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام "منہاج الدین" رکھا تھا۔ ایک کمینہ خصلت "چرب زبان شخص جس کا نام میں ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ اس نے شروع سے میرا نام چھیل کر اور اپنا نام درج کر کے عام لوگوں میں کہنا شروع کر دیا کہ یہ میری تصنیف ہے۔ حالانکہ اس کی علیت اور قابلیت سے آگاہ حضرات اس پر ہنستے تھے۔ بالآخر اللہ تعالےٰ نے اس شخص پر بے برکتی مسلط کر دی اور اپنی بارگاہ کے طالبوں کی فہرست سے اس کا نام خارج کر دیا۔

دوسری وہ وجہ خاص حضرات کے لئے یہ ہے کہ جب وہ کسی کتاب کو اپنے علم کے مطابق اس نظر سے ملاحظہ فرماتے ہیں کہ اس کا مصنف و مؤلف نہ صرف یہ کہ اس علم کا دانا ہے بلکہ وہ اس فن کا ماہر محقق ہے تو اس کتاب کی قدر کرتے اور اُسے پڑھ کر یاد کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنا گوہرِ مقصود اُس کتاب سے حاصل کر لیتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

استخارہ کرنے کی وجہ

اس تصنیف کو شروع کرنے سے پہلے استخارہ کی طرف اس لئے متوجہ ہوا کہ حق تعالےٰ کے حقوق اور اس کے آداب کی حفاظت پر عمل کیا جائے چونکہ اللہ تعالےٰ نے اپنے حبیب سیدِ عالم ﷺ کو اور آپ کے دوستوں کے لئے اس کا حکم فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فاذا قرأت القرآن فاستعذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم۔ پ ١٦	اور جب تم قرآن کریم پڑھو تو شیطان مردود کی فریب کاریوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو۔

استعاذہ استخارہ اور استعانت سب کے ایک ہی مفہوم و معنی ہیں۔ مطلب یہ کہ اپنے تمام کام اللہ تعالیٰ کے سپرد کر کے ہر قسم کی آفتوں سے محفوظ رہنے کے لئے اس سے مدد حاصل کرو۔

صحابہ ءکرام رضوان اللہ علیہم اجمعین فرماتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے ہمیں استخارہ کرنا اسی طرح سکھایا جسطرح قرآن کریم کی تعلیم دی ہے، بندہ کو جب اس پر کامل یقین ہو جاتا ہے کہ تمام کاموں کی بھلائی کسب و تدبیر پر موقوف نہیں ہے بلکہ حق تعالیٰ کی مشیت و رضا پر موقوف ہے اور ہر نیک و بد اور خیر و شر اسی کی جانب سے مقدر ہوا ہے اور بندے کو بجز تسلیم و رضا کوئی چارہ ءکار نہیں ہے تو لا محالہ بندہ اپنے تمام کام اس کے سپرد کر کے اسی کی مدد چاہتا ہے تا کہ تمام افعال و احوال میں نفس کی شرارتوں اور شیطان کی دخل اندازیوں سے محفوظ رہے اور اس کے تمام کام خیر و خوبی اور راست روی سے انجام پائیں۔ اس لئے بندہ کے لئے یہی ضروری و مناسب ہے کہ تمام کاموں میں استخارہ کرے تا کہ اللہ تعالیٰ اس کے کاموں کو ہر قسم کے نقصان اور خلل و آفت سے محفوظ رکھے۔ و باللہ التوفیق۔

باطنی القا کے حوالہ کرنے کی وجہ

اب رہا میرا یہ کہنا کہ "میں نے خود کو دلی واردات اور باطنی القا کے حوالہ کر دیا" اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کام میں نفسانی اغراض شامل ہوتی ہیں تو اس کام سے برکت اٹھ جاتی ہے اور دل صراطِ مستقیم سے ہٹ کر کجروی اختیار کر لیتا ہے اور انجام بخیر نہیں ہوتا۔

نفسانی اغراض کی شکلیں:

نفسانی اغراض کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں یا تو اس کی غرض پوری ہوگی یا نہ ہوگی؟ (١) اگر اس کی غرض پوری ہوگئی تو سمجھ لو کہ وہ ہلاکت میں پڑ گیا اس لئے کہ نفسانی اغراض کا حاصل ہونا دوزخ کی کنجی ہے۔ (٢) اور اگر اس کی نفسانی غرض پوری نہ ہوئی تو اللہ تعالیٰ پہلے ہی اس کے دل کو نفسانی غرض سے بے پروا کر دے گا اور ایسی خواہش کو دل سے دور کر دے گا کیونکہ اس میں اس کی نجات مضمر تھی۔ اور یہی جنت کے دروازے کی کنجی بھی ہے جیسا کہ ارشاد حق تعالیٰ ہے۔

وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاوٰى۔	اور بندے نے نفس کو خواہشات سے باز رکھا تو جنت ہی اس کا مسکن ہے۔

کسی کام میں نفسانی دخل یہ ہے کہ بندہ اپنے کام میں حق تعالےٰ کی خوشنودی کو ملحوظ نہ رکھے۔ اور وہ اس میں نفس کے فتنوں سے نجات پانے کی طلب نہ کرے۔ کیونکہ نفس کے فتنوں کی کوئی حد و غایت نہیں ہے اور نہ اس کی ہوس کاریوں کا کوئی شمار ہے۔ اس کا تفصیلی ذکر مناسب مقام پر آئے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

جواب کے لئے عزم صمیم کیجئے

مدعائے نگارش یہ ہے کہ "تمہاری مقصد بر آری کی خاطر اس کتاب کی نوشت کا عزم صمیم کرلیا" تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے چونکہ مجھ سے سوال کر کے مجھے اس کا اہل اور صاحبِ علم و بصیرت جانا اور اپنے مقصود بر آری کے لئے رجوع کر کے ایسے جواب کی استدعا کی جس سے پورا پورا فائدہ حاصل ہو سکے اس لئے مجھ پر لازم ہو گیا کہ میں تمہارے سوال کا حق ادا کروں۔ جب استخارہ کے ذریعہ تمہارے سوال اور استدعا کا حق ہونا ظاہر ہو گیا تو میں نے عزم صمیم اور حسنِ نیت کے ساتھ کامل طور پر جواب دینے کا ارادہ کرلیا تاکہ شروع سے آخر تک تکمیلِ جواب میں حسنِ نیت اور عزم و ارادہ شامل رہے۔ بندہ جب کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو ابتدائے عمل سے ہی نیت شامل ہوتی ہے۔ اگرچہ دورانِ عمل اسے کوئی خلل ہی واقع کیوں نہ ہو۔ لیکن بندہ اس میں معذور متصور ہوتا ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے "نِيَّةُ الْمُؤْمِنِ خَيْرٌ مِّنْ عَمَلِهٖ" (مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے) لہٰذا ابتدائے عمل میں نیت کرنا اس سے بہتر ہے کہ بغیر نیت کئے عمل شروع کیا جائے۔ کیونکہ تمام کاموں میں نیت کو عظیم مرتبہ اور برہانِ صادق حاصل ہے۔ نیت میں جس قدر خلوص ہوگا اس عمل کا اجر و ثواب اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ اس لئے کہ بندہ نیت ہی کے ذریعہ ایک حکم سے دوسرے حکم کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ حالانکہ ظاہراً عمل میں نیت کا اثر کوئی ظاہر نہیں ہوتا۔ اسے یوں سمجھو کہ اک شخص نے دن بھر فاقہ کیا۔ لیکن وہ اس فاقہ سے کسی ثواب کا مستحق نہ بنا۔ لیکن اگر اس نے روزہ کی نیت کرلی تو وہ ثواب کا بھی مستحق بن گیا۔ حالانکہ ظاہر عمل میں نیت کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ اسی طرح اگر کوئی مسافر کسی شہر میں عرصہ دراز تک بود و باش رکھے تو بھی وہ وہاں کا باشندہ نہ کہلائے گا اور بدستور مسافر ہی رہے گا لیکن اگر اس نے (کم از کم پندرہ دن کی) اقامت کی نیت کرلی تو اب مقیم سمجھا جائے گا۔ شریعت مطہرہ میں اس قسم کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ہر عمل کی ابتداء میں نیک نیت کرنا ضروری ہے واللہ تعالےٰ اعلم۔

وجہ تسمیہ اب رہا میرا یہ کہنا کہ اس نوشتہ کا نام "کشف المحجوب" رکھا، تو اس سے میری مراد یہ ہے کہ کتاب کے نام سے ہی معلوم ہو جائے گا کہ کتاب کے اندر کس قسم کے مضامین ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ جب اہلِ علم و بصیرت کتاب کا نام سنیں گے تو سمجھ لیں گے کہ اس سے کیا مراد ہے اور اس میں کیسے مضامین ہیں۔

کشف حجاب کی تحقیق اے طالبانِ حق تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اولیاء اللہ اور محبوبانِ بارگاہِ ایزدی کے سوا سارا عالم لطیفۂ تحقیق سے محجوب و مستور ہے۔ چونکہ یہ کتاب راہِ حق کے بیان، کلماتِ تحقیق کی شرح اور حجاب بشریت کے کشف میں ہے لامحالہ اس کتاب کے لئے اس کے سوا اور کوئی نام موزوں و صحیح ہو سکتا ہی نہیں۔ چونکہ حقیقت کا منکشف ہونا مستور اشیاء کے فنا و ناپید ہونے کا موجب ہوتا ہے جس طرح موجود و حاضر کے لئے پردہ و حجاب میں ہونا موجب ہلاکت ہوتا ہے۔ یعنی قرب جس طرح بُعد کی طاقت نہیں رکھتا اسی طرح بُعد بھی قرب کی برداشت نہیں رکھتا۔ اسے اس طرح سمجھو کہ وہ کیڑے جو سرکہ میں پیدا ہوتے ہیں اگر انہیں سرکہ میں سے نکال کر کسی اور چیز میں ڈال دیا جائے تو وہ مر جاتے ہیں یا وہ کیڑے جو کہیں اور پیدا ہوئے ہوں اگر ان کو سرکہ میں ڈال دیا جائے تو وہ مر جائیں گے۔ اسی طرح حقائقِ اشیاء کے معانی و مطالب اسی پر کھلتے اور منکشف ہوتے ہیں جس کو خاص اسی لئے پیدا کیا گیا ہو ان کے سوا دوسروں کے لئے یہ ممکن نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے "کُلٌّ مُیَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَہٗ" ہر مخلوق کے لئے وہی چیز ہے جس کے لئے اُسے پیدا کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کو جس چیز کے لئے پیدا کیا ہے اس کے حصول کی راہ اس پر آسان کر دی گئی ہے۔

حجابات رینی و غینی انسان کے لئے وہ پردے جو راہِ حق میں اس پر مانع اور حائل ہوتے ہیں دو قسم کے ہیں۔ ایک کا نام حجاب رینی ہے جو کسی حالت میں اور کبھی نہیں اٹھتا اور دوسرے کا نام حجاب غینی ہے اور یہ حجاب جلد تر اُٹھ جاتا ہے۔ ان کی تفصیل یہ ہے کہ کچھ بندے ایسے ہوتے ہیں جن کے لئے اپنی ذات ہی راہِ حق میں پردہ و حجاب بن جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ان کے نزدیک حق و باطل دونوں یکساں اور برابر ہو جاتے ہیں اور کچھ بندے ایسے ہوتے ہیں جن کے لئے ان کی اپنی صفتیں راہِ حق میں پردہ و حجاب ہوتی ہیں اور وہ ہمیشہ اپنی طبع و سرشت میں حق کے متلاشی اور باطل سے گریزاں رہتے ہیں۔ ذاتی حجاب کا نام رین جو کبھی زائل نہیں ہوتا۔

حجابِ رین کے معنی: رین جس کے معنی زنگ آلود ہونے اور ختم جس کے معنی مہر لگنے اور طبع جس کے معنی ٹھپہ لگنے کے ہیں۔ یہ تینوں لفظ ہم معنی اور ہم مطلب ہیں۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔	یہ لوگ ہرگز راہِ حق قبول نہ کریں گے بلکہ انکے دلوں پر رین یعنی حجابِ ذاتی ہے جو کچھ بھی وہ کرتے ہیں۔

اس کے بعد حق تعالیٰ اُن کا حال ظاہر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ٥	بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ان پر برابر ہے خواہ آپ انھیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان لانیوالے نہیں ہیں۔

پھر ظاہر حال بیان کرنے کے بعد حق تعالیٰ عدمِ قبولِ حق کی علت بیان فرماتا ہے کہ

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ	اللہ نے انکے دلوں پر مہر لگادی ہے۔

حجابِ غین کے معنی

غین جس کے معنی اُوٹ اور ہلکے پردے کے ہیں یہ وصفی حجاب ہے۔ کسی وقت اس کا پایا جانا اور کسی وقت اس کا زائل ہونا دونوں جائز وممکن ہیں۔ اس لئے کہ ذات میں تبدیلی شاذ ونادر بلکہ ناممکن ومحال ہے اور غین یعنی صفات میں تبدیلی جائز وممکن ہے۔ مشائخِ طریقت رحمہم اللہ (جائز اور ممکن الارتفاع صفات یعنی) حجاب غینی کے بارے میں (اور محال وناممکن الارتفاع حجاب یعنی) حجابِ رینی جو کہ ذاتی ہے، کے بارے میں لطیف اشارات بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

الرين من جملة الوطنات والغين من جملة الخطرات	رین وطنات کے قبیل سے ہے اور غین خطرات کے قبیل سے۔

وطنات، وطن کی جمع ہے جس کے معنی قائم اور پائیدار رہنے کے ہیں۔ اور خطرات، خطر کی جمع ہے جس کے معنی عارضی اور ناپائیداری کے ہیں۔ اسے اس طرح سمجھو کہ پتھر کبھی آئینہ نہیں بن سکتا اگرچہ اسے کتنا ہی صیقل اور صاف وشفاف کرنے کی کوشش کی جائے۔ لیکن اگر آئینہ زنگ آلود ہو جائے تو تھوڑا سا صاف کرنے سے وہ مجلّٰی اور مصفّٰی ہو جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پتھر کے اندر

تاریکی اور آئینہ کے اندر چمک اس کی ذاتی اور اصلی خوبی ہے چونکہ ذات واصل قائم و پائیدار رہنے والی چیز ہوتی ہے اس لئے وہ کسی طرح زائل نہیں ہوسکتی۔ اور صفت چونکہ عارضی و ناپائیدار ہوتی ہے اور وہ قائم اور باقی رہنے والی چیز نہیں ہوتی اس لئے وہ جلد ہی زائل ہوجاتی ہے۔

میں نے یہ کتاب اُن لوگوں کا زنگِ کدورت دور کرنے کے لئے لکھی ہے جو حجابِ غینی یعنی پردہ صفاتی میں گرفتار ہیں اور ان کے دلوں میں نورِ حق کا خزانہ موجود ہے۔ تاکہ اس کتاب کے پڑھنے کی برکت سے وہ حجاب اٹھ جائے اور حقیقی معنی کی طرف انھیں راہ مل جائے۔ لیکن وہ لوگ جن کی سرشت وعادت ہی انکارِ حق ہو اور باطل پر قائم و برقرار رہنا ہی جن کا شعار ہو وہ مشاہدہ حق کی راہ سے ہمیشہ محروم رہیں گے۔ ایسے لوگوں کے لئے یہ کتاب کچھ فائدہ مند نہ ہو گی۔ والحمد للہ علیٰ نعمۃ العرفان۔

مجیب کا فرض

میں نے جو ابتداء میں یہ کہا ہے کہ "اس نوشتہ میں اپنے سوال کا جواب علی وجہ الکمال پاؤ گے" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے تمہارے سوال کا مقصد اور اس کی غرض و غایت کو جان لیا ہے۔ اس لئے کہ مجیب کو جب تک سائل کے سوال کا مقصد اور اس کی غرض و غایت معلوم نہ ہوگی اس وقت تک وہ اپنے جواب میں سائل کی تسلی وتشفی کیسے کرسکتا ہے؟ کیونکہ مشکل در پیش آنے پر ہی سوال کیا جاتا ہے اور جواب میں اس مشکل کا حل پیش کیا جاتا ہے۔ اگر جواب میں اس اشکال کو حل نہ کیا جائے تو ایسا جواب سائل کو کیا فائدہ پہنچائے گا۔ اور اشکال کا حل' بغیر معرفتِ اشکال ناممکن ہے؟

اور میرا یہ کہنا کہ "اپنے سوال کا جواب علیٰ وجہ الکمال پاؤ گے" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اجمالی سوال کے لئے اجمالی جواب ہوتا ہے اور جامع سوال کے لئے جامع جواب۔ لیکن جب سائل اپنے اجمالی سوال اور اس کے مراتب و درجات سے باخبر ہوتا ہے یا یہ کہ مبتدی کے لئے تفصیل کی حاجت ہوتی ہے تو مجیب کا فرض ہے کہ جواب میں اس کا پاس ولحاظ رکھے۔ اللہ تعالےٰ تمہیں سعادت عطا فرمائے۔ چونکہ تمہاری غرض یہی تھی کہ میں تفصیل کے ساتھ طریقت کے حدود واقسام بیان کروں جو ہر شخص کے لئے فائدہ مند ثابت ہوں خواہ وہ مبتدی ہو یا متوسط واعلیٰ۔ اس لئے میں نے تفصیل کو اختیار کرکے سوال کے جواب میں یہ کتاب مرتب کی ہے۔ وباللہ التوفیق۔

استعانت وتوفیق کی حقیقت

میں نے جو یہ کہا ہے کہ "اللہ تعالیٰ سے استعانت کرتا ہوں اور اس سے توفیق کی استدعا کرتا ہوں کہ وہ اس نوشتہ کو مکمل کرنے میں میری مدد فرمائے" تو اس سے

میری مراد یہ ہے کہ بندے کے لئے اللہ تعالےٰ کے سوا کوئی ناصر و مددگار نہیں ہے وہی ہر نیکی و بھلائی کا معین و مددگار ہے اور زیادہ سے زیادہ توفیق مرحمت فرماتا ہے۔

حقیقی توفیق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کے ہر عمل میں بالفعل اپنی تائید فرمائے اور اس عمل پر اسے اجر و ثواب کا مستحق بنائے۔ توفیق کی صحت و درستگی پر کتاب و سنت اور اجماع امت شاہد و ناطق ہے۔ البتہ فرقہ معتزلہ اور قدریہ نے اس کا انکار کیا ہے۔ یہ لوگ لفظ توفیق کو تمام معانی سے خالی کہتے ہیں۔ گویا وہ اس لفظ کو بے معنی اور مہمل تصور کرتے ہیں۔

مشائخ طریقت کی ایک جماعت تو کہتی ہے کہ توفیق اس قدرت کا نام ہے جو بوقتِ استعمال نیکیوں پر حاصل ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بندہ جب اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار ہو جاتا ہے تو حق تعالیٰ ہر حال میں اسے نیکیوں کی بیشتر توفیق و قوت عنایت فرماتا ہے جو اس سے قبل اسے حاصل نہ تھی۔ باوجودیکہ عالمِ وجود میں بندے کی ہر حرکت و سکون اسی کے فعل و خلق سے واقع ہوتے ہیں۔ یہاں صرف اتنا سمجھنا چاہئے کہ بندہ جو خدا کی عطا کردہ قوت سے طاعت و نیکی بجا لاتا ہے اس کو توفیق کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ کتاب اس مسئلہ کی تفصیل بیان کرنے کا موضوع نہیں ہے کہ بتایا جاسکے کہ کون کون سی خاص حالت و قوت مراد ہے۔ لہٰذا اسی پر اکتفا کر کے تمہارے سوال کے جواب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ قبل اس کے کہ میں جواب میں اپنا کلام و بیان شروع کروں تمہارے سوال کو بعینہ نقل کر دوں اور اس سوال سے اپنی کتاب کی ابتداء کروں۔ و باللہ التوفیق۔

صورتِ سوال

حضرت ابو سعید غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ سوال کیا ہے کہ؟

"مجھے تحقیقی طور پر بیان فرمائیے کہ طریقت و تصوف اور ان کے مقامات کی کیفیت اور ان کے مذاہب و اقوال اور رموز و اشارات کیا کیا ہیں؟ اور یہ کہ اہلِ طریقت و تصوف اللہ تعالےٰ سے کس طرح محبت کرتے اور ان کے دلوں پر تجلیات ربانی کے اظہار کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ اور یہ کہ اس کی ماہیت کی کنہ کے ادراک سے عقلیں حجاب میں کیوں ہیں اور نفوس انسانیہ اس کی حقیقت سے کیوں متنفر ہیں؟ اور صوفیائے کرام کی ارواح کو اس کی معرفت سے کیسے راحت و آرام ملتا ہے نیز اس ضمن میں جن باتوں کا جاننا ضروری ہے وہ بھی بیان فرمائیے؟"

الجواب بعون الملک الوہاب

اے طالبِ حق! تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہمارے زمانہ میں خاص کر اس علاقہ کے لوگ درحقیقت علمِ طریقت سے دور ہو کر ہوا و ہوس میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ رضائے الٰہی سے کنارہ کش ہو کر علماء حق کی طریقے سے بھٹک چکے ہیں۔ آج جو لوگ طریقت و تصوف کے مدعی نظر بھی آتے ہیں تو وہ درحقیقت اصل طریقت کے برخلاف عمل کرتے اور طریقت کو بدنام کرتے ہیں۔ لہٰذا ایسی استعداد و صلاحیت پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ اس مقام تک رسائی حاصل ہو جائے جہاں تک اہل زمانہ کی دسترس نہیں۔ اور اس مقام پر وہی حضرات فائز ہوتے ہیں جو خاصان بارگاہِ حق ہیں اور تمام ارادتمندوں کی وہی مقصود و مراد رہی ہے۔ اور وہ اس کے حصول کی خاطر ہر چیز سے کنارہ کش رہے ہیں۔ جس طرح کہ اہلِ معرفت وجودِ حق کی معرفت میں ہمہ خاص و عام مخلوق سے بے نیاز رہے تھے۔ اس کے برعکس ان ظاہری مدعیانِ تصوّف نے صرف ظاہری عبارتوں پر اکتفا کر رکھا ہے۔ اور دل و جان سے حجاب کے خریدار بن کر اور تحقیق کی راہ چھوڑ کر اندھی تقلید کے خوگر بن گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تحقیق نے بھی اپنا چہرہ ان مدعیان ظاہری سے چھپا لیا ہے۔ اور عوام اپنی موجودہ حالت میں مگن رہ کر کہہ رہے ہیں کہ ہم نے حق کو پہچان لیا ہے۔ اور خواص اسی میں خوش ہیں کہ ہمارے دل میں اس کی تمنا موجود ہے اور ہمارے نفس میں اس کی احتیاج اور سینوں میں اس کی محبت پائی جاتی ہے۔ اپنے اپنے مشاغل میں منہمک رہتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ سب رویتِ الٰہی کے شوق میں ہے اور دل میں جو بھی خواہشات ابھرتی ہیں وہ محبتِ الٰہی کی تپش ہے۔ اسی طرح مدعیانِ سلوک اپنے ادعا کے سبب کلیۃً محروم ہو گئے ہیں۔ ارادتمندوں نے ریاضت و مجاہدے سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ اور اپنے فاسد خیالات کا نام مشاہدہ رکھ لیا ہے۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے علم تصوف میں اس سے قبل بکثرت کتابیں لکھی ہیں لیکن وہ سب کی سب ضائع ہو چکی ہیں اور جھوٹے دعویداروں نے ان کی بعض باتوں کو مخلوقِ خدا کا شکار کرنے کی خاطر چن لیا ہے اور باقی سب کو گم کر کے اُن کا نام و نشان تک مٹا دیا ہے۔ چونکہ حاسدوں کا ہمیشہ یہی شیوہ رہا ہے۔ انہوں نے سرمایۂ حسد و انکار کو ہی نعمتِ خداوندی جان رکھا ہے۔ چنانچہ ان میں سے کچھ لوگ تو ایسے ہیں جنہوں نے نقل تو کیا مگر پڑھ نہ سکے۔ اور کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے پڑھ تو لیا مگر معانی و مطالب سے بے بہرہ رہے۔

انہوں نے صرف لفظ وعبارت کو پسند کیا اور اسی کو لکھتے اور یاد کرتے رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم علم تصوف و معرفت میں باتیں کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ انتہائی بدنصیبی اور محرومی میں گرفتار رہے ہیں۔ طبقات کا یہ تفاوت اس بنا پر ہے کہ علم تصوف اور معرفتِ الٰہی کبریت احمر (تانبے کو سونا بنانے والی سرخ اکسیر) کی مانند ہے جو سب کو عزیز و مرغوب ہے۔ کبریت احمر یعنی سرخ گندھک جب مل جاتی ہے تو وہ کیمیا ہوتی ہے۔ جس کی ایک چٹکی (ککھ) بہت سے تانبے کو خالص سونا بنا دیتی ہے۔ غرضکہ ہر شخص ایسی دوا کا خواہشمند ہوتا ہے جو اس کے درد کا درماں بن سکے۔ اس کے سوا اس کی اور کوئی خواہش نہیں ہوتی۔ اسی مفہوم میں ایک بزرگ کا شعر ہے۔

كُلُّ مَنْ فِیْ فُؤَادِهٖ وَجَعٌ	يَطْلُبُ شَيْئاً يُوَافِقُ الْوَجَعَا
ہر وہ شخص جس کے دل میں درد ہے	وہی چاہتا ہے جو درد کے موافق ہے

جس کی بیماری کی دوا کوئی حقیر ترین چیز ہو وہ مروارید و مرجان کی جستجو میں سرگرداں کیوں پھرے؟ اور جواہرات کی معجون یا دواء المسک بنانے کی کوشش کیوں کرے؟ علم طریقت و حقیقت تو اس سے کہیں زیادہ برتر ہے۔ ہر کہہ و مہہ کو یہ کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس سے قبل بھی بکثرت جہال نے مشائخ طریقت کے علمی کتابوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا ہے۔ اسرار الٰہی کے خزانے ان کے ہاتھوں میں آئے تو وہ چونکہ اس کی حقیقت سے بے بہرہ تھے گویا کلاہ دوز جاہلوں اور ناپاک و کمینہ جلد سازوں کی مانند ان کے ہاتھ لگ گیا انہوں نے ٹوپیوں کے استر اور ابونواس کے شعروں کے دیوان اور فضول ولغو افسانوں اور کہانیوں کے مانند اسرار الٰہی کے خزانوں کے ساتھ سلوک کیا۔ بلاشبہ جب بادشاہ کا باز کسی بوڑھی عورت کے جھونپڑے پر اترے گا تو وہ اپنے بال و پر ہی اکھڑوائے گا۔

اہلِ زمانہ کا شکوہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسے زمانہ میں پیدا فرمایا ہے کہ لوگوں نے اپنی خواہشات کا نام شریعت حبِ جاہ کا نام عزت تکبر کا نام علم اور ریاکاری کا نام تقویٰ رکھ لیا ہے۔ اور دل میں کینہ کو چھپانے کا نام حلم مجادلہ کا نام مناظرہ، محاربہ و بیوقوفی کا نام عظمت، نفاق کا نام وفاق، آرزو و تمنا کا نام زہد، ہذیانِ طبع کا نام معرفت، نفسانیت کا نام محبت، الحاد کا نام فقر، انکارِ وجود کا نام صفوت، بے دینی و زندقہ کا نام فنا اور نبی کریم ﷺ کی شریعت کو ترک کرنے کا نام طریقت رکھ لیا ہے۔ اور اہلِ دنیا کی آفتوں کو معاملہ کہنے لگے ہیں۔ اسی بنا پر اربابِ معانی و عارفانِ حقیقت نے ان لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر رکھی ہے۔ اور گوشہ خلوت میں رہنا پسند کر لیا ہے۔ ان جھوٹے مدعیان جہان کا ایسا غلبہ ہو گیا ہے جس طرح خلافتِ راشدہ کے اختتام کے بعد

اہل بیتِ اطہار رضوان اللہ علیہم اجمعین پر آلِ مروان کا غلبہ ہوگیا تھا۔ اس حقیقت کا انکشاف شہنشاہ اہلِ حقائق برہانِ تحقیق ودقائق حضرت ابوبکر واسطی رحمتہ اللہ علیہ نے کیا خوب کہا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ

اُبْتُلِیْنَا بِزَمَانٍ لَیْسَ فِیْہِ آدَابُ الْاِسْلَامِ وَلَا اَخْلَاقُ الْجَاھِلِیَّۃِ وَلَا اَحْکَامُ ذِی الْمُرُوَّۃِ۔	ہم ایسے دور میں پھنس گئے ہیں جس میں نہ تو اسلام کے آداب ہیں اور نہ جاہلیت کے اخلاق ہیں اور نہ عام انسانی شرافت کے طور وطریق۔

حضرت شبلی علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں کہ عرب کے شاعر متنبی کا یہ شعر زمانہءِ حال کے لوگوں کی بالکل صحیح تصویر ہے

نَجَا اللّٰہِ فِی الدُّنْیَا مُنَاخاً لِرَاکِبٍ	فَکُلُّ بَعِیْدُ الْھَمِّ فِیْھَا مُعَذَّبٌ
اللہ سے دنیا داروں کی تمنا اونٹ سوار کی منزل ہے	تو جو بھی غم سے دور ہے وہی آخرت میں عذاب پانیوالا ہے۔

دنیا مقامِ اسرارِ الٰہی ہے

اے طالبِ حق اللہ تعالےٰ تمہیں قوت عطا فرمائے خوب سمجھ لو کہ میں نے اس جہان کو اسرار الٰہی کا محل اور کائنات عالم کو اس کا مقام اور اعیانِ ثابتہ کو لطائف واسرار کی رہائش پایا ہے۔ جسے اللہ تعالےٰ کے اولیاء و محبین ہی خوب جانتے ہیں۔ یہ اغراض وجواہر، عناصر واجرام اور تمام اجسام وطبائعِ اُن اسرارِ الٰہی کے حجابات ہیں۔ مقام توحید میں ان کا اثبات شرک ہے۔ یہ بھی یاد رکھو کہ اللہ تعالےٰ نے اس جہان کو محلِ حجاب بنایا ہے تاکہ اپنے اپنے عالم میں ہر طبیعت حق تعالیٰ کے فرمان سے سکون وقرار حاصل کر سکے اور اپنے وجود کو اس کی توحید میں گم کردے۔ چونکہ اس جہان میں روحیں اپنے جسموں کے ساتھ ملحق ہو کر مقام اخلاص سے ہٹ کر ایسی مغرور ہوگئی ہیں کہ ان کی عقلیں اسرارِ الٰہی کے ادراک سے عاجز اور وہ روحیں قرب حق سے مستور ومحجوب ہوگئی ہیں۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ آدمی اپنی ہستی کے سبب غفلت کی تاریکی میں غرق ہوگیا اور مقامِ خصوصیت میں اپنی ہستی کے حجاب کے سبب عیب دار بن گیا۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے ارشاد میں اسی حقیقت کا اظہار فرمایا ہے۔

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍo	قسم ہے زمانہ کی۔ بلاشبہ انسان یقینی گھاٹے میں ہے۔

اور فرمایا

اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوْماً جَھُوْلاً۔	بے شک انسان ظالم ونادان ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے "اللہ تعالےٰ نے مخلوق کو تاریکی میں پیدا فرمایا پھر اس پر روشنی ڈالی" تو

یہ حجاب اس جہان میں اس کے لئے اختیار طبع بن گئی کیونکہ اس نے اپنی طبیعت اور اپنی عقل سے اس میں تصرف کیا۔ حتیٰ کہ اس نے نہ صرف جہل و نادانی کو پسند کیا بلکہ ان حجابات کا وہ دل و جان سے خریدار دمتوالا بن گیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جمالِ کشف سے بے خبر اور اسرار الٰہی کی تحقیق سے بے پرواہ بن گیا۔ اور وہ عارضی مسکن میں خوش رہ کر اپنی فلاح و نجات سے غافل ہو گیا۔ اس طرح وہ توحید باری سے بے علم، جمالِ احدیت سے بے خبر اور ذائقہء توحید سے ناآشنا ہو گیا ہے۔ روح و جسم کے ترکب سے مشاہدہ حق کی تحقیق سے محروم ہے۔ اور دنیاوی حرص و طمع میں مبتلا ہو کر حق کی طرف رجوع دانابت سے بے بہرہ ہو گیا۔ اور نفس حیوانی نے جو حیاتِ حقیقی کے سوا ہے اس کے ناطقہ کو مجبور کر دیا۔ یہاں تک کہ تمام حرکات و خواہشات نفسِ حیوانی کے تابع ہو کر رہ گئیں۔ پھر یہ حالت ہو گئی کہ سوائے کھانے، پینے، سونے اور شہوانی خواہشات کے کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب اولیاء کو ان تمام باتوں سے بچنے کا حکم فرمایا ہے۔ ارشاد ہے۔

ذَرْهُمْ يَأْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ۔	اہل دنیا کو چھوڑ دو تا کہ وہ کھائیں نفع اٹھائیں اور تمناؤں میں مگن رہیں عنقریب پتہ چل جائے گا۔

اس لئے کہ اُن کی خو بو اور عادت و طینت ہی یہ ہے کہ ان پر اسرارِ الٰہی مخفی رہیں۔ اور حق تعالےٰ کی توفیق و عنایت سے محروم رہ کر ہمیشہ ذلیل و خوار رہیں یہاں تک کہ وہ اس نفس امارہ کے جو ہمیشہ برائی کا حکم دیتا ہے، مطیع و تابع ہو جائیں۔ یاد رکھو یہ بہت بڑا حجاب ہے اور یہی ہر برائی و شر کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ	بیشک نفس ہر برائی کا زبردست حکم کرنیوالا ہے۔

اس تمہیدی نصیحت کے بعد تمہارے سوال میں جو مقاصد ہیں ان کا بیان شروع کرتا ہوں اور جو مقامات و حجابات ہیں ان کا بیان لطیف پیرایہ میں مرتب کرتا ہوں اور اہلِ علم و عرفان کی عبارتوں کو شرح کے ساتھ اور بقدر ضرورت اقوال مشائخ کو شامل کرتا ہوں نیز عجیب و غریب حکایتوں کو بیان کر کے فہم مقاصد میں تمہاری مدد کرتا ہوں۔ تاکہ تمہاری مقصد برآری ہو جائے اور ظاہری علوم کے علماء کو بھی معلوم ہو جائے کہ طریقہ تصوّف کی جڑ مضبوط اور اس کی شاخیں میوہ دار ہیں۔ اور وہ اس حقیقت سے روشناس ہو جائیں کہ طریقت کے تمام مشائخ صاحبانِ علم و معرفت تھے اور وہ اپنے مریدوں کو اس علم کے سیکھنے کا

شوق دلاتے تھے اور اس پر قائم رہنے کا ذوق پیدا کرتے ہیں۔ وہ کسی حالت میں لہو ولغو کا اتباع نہ کرتے
تھے اور کبھی بھی یہ حضرات قدس کسی واہی تواہی میں نہیں پڑے بکثرت مشائخ طریقت اور علمائے
معرفت نے تصوّف وطریقت میں کتابیں تصنیف فرمائیں اور اسرار ربانی کو دلیل و برہان کے ساتھ
لطیف عبارتوں سے ثابت کیا ہے وباللہ التوفیق۔

پہلا باب

تحصیلِ علم کی فرضیت اور اس کی اہمیت

اللہ تعالےٰ نے علماءِ ربانی کی صفت میں ارشاد فرمایا ہے۔

إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ۔	درحقیقت بندگانِ خدا میں سے علماء ہی خدا کا خوف رکھتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے" کہ ہر مسلمان مرد وعورت پر تحصیلِ علم فرض ہے نیز فرمایا۔ "علم حاصل کرو اگرچہ (دور دراز مقام) چین میں ہی کیوں نہ ہو"۔

اے طالب حق! تمہیں علم ہونا چاہئے کہ علم کی کوئی حد وغایت نہیں ہے اور ہماری زندگانی محدود ومختصر ہے۔ بنا بریں ہر شخص پر تمام علوم کا حصول فرض قرار نہیں دیا گیا جیسے علمِ نجوم، علمِ حساب اور نادر وعجیب صنائع وغیرہ۔ لیکن ان میں سے اس قدر سیکھنا جتنا شریعت سے متعلق ہے ضروری ہے۔ مثلاً علمِ نجوم سے اتنا سیکھنا جس سے دن ورات کے اوقات (جن سے نماز وروزے کی ادائیگی درست طریقہ پر ہو سکے) لازم ہے۔ اسی طرح علم طب سے اتنا جس سے ایام وعدت جان سکے۔ اور علم حساب سے اس قدر جس سے فرائض یعنی میراث وغیرہ کی تقسیم ہو سکے۔ غرض کہ عمل کے لئے جس قدر علم کی ضرورت ہے اس کا حاصل کرنا فرض ولازم ہے۔ لیکن ایسے علوم جو کسی کو نفع نہ پہنچا سکیں اللہ تعالیٰ نے ایسے علوم کے تحصیل کی مذمت فرمائی ہے۔ ارشاد ہے۔

وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ۔	وہ ان باتوں کو سیکھتے ہیں جو ان کو ضرر پہنچائے اور انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچائے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایسے بے منفعت علم سے پناہ مانگی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے۔

اَعُوْذُبِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ۔	اے خدا میں پناہ مانگتا ہوں ایسے علم سے جو نفع نہ پہنچائے۔

یارکھو! علم کے ساتھ عمل بھی ضروری ہے۔ تھوڑے سے علم کے لئے بھی بہت زیادہ عمل درکار ہے۔ علم وعمل دونوں باہم لازم وملزوم ہیں لہٰذا علم کے ساتھ عمل ہمیشہ پیوست رہنا چاہئے۔ اسی طرح بغیر علم کے عمل رائیگاں ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے۔

اَلْمُتَعَبِّدُ بِلَا فِقْهٍ كَالْحِمَارِ فِي الطَّاحُوْنَةِ۔	بے علم عبادت گذار اس گدھے کی مانند ہے جو آٹے کی چکی سے بندھا ہے۔

چکی سے بندھا ہوا گدھا اگر چہ دوڑتا بھاگتا اور چلتا ہے لیکن وہ اپنے ہی محور میں گھومتا رہتا ہے اور کوئی مسافت طے نہیں کر پاتا۔ میں نے عام لوگوں کے ایک گروہ کو دیکھا ہے کہ وہ علم کو عمل پر فضیلت دیتے ہیں اور ایک گروہ ایسا بھی دیکھا کہ وہ عمل کو علم پر فوقیت دیتا ہے حالانکہ ان دونوں گروہوں کے نظریے باطل ہیں۔ اس لئے کہ بغیر علم کے عمل کو حقیقت میں عمل کہا ہی نہیں جاسکتا کیونکہ عامل جبھی عمل کرتا ہے جبکہ پہلے اسے اس کا علم ہوتا ہے مطلب یہ کہ بندہ کو علم ہوتا ہے کہ اس عمل کے کرنے کا خدا نے اسے حکم دیا ہے۔ اس علم کے بعد بندہ اس پر عمل کرتا ہے جس سے وہ عمل کرنے کے ذریعہ اجر و ثواب کا مستحق قرار پاتا سمجھنا یوں چاہئے کہ نماز ایک عمل ہے جب تک بندے کو پہلے طہارت کے ارکان کا علم نہ ہو اسی طرح پانی کی شناخت کا علم، سمت قبلہ کا علم، کیفیت نیت کا علم، وقت نماز کا علم اور ارکانِ نماز کا علم پہلے سے نہ ہو وہ نماز صحیح کیسے ہوسکتی ہے؟ لہذا جب بغیر علم کے عمل سے بندہ بے علم ہو جاتا ہے تو جاہل کو اس سے کیسے جدا کر سکتے ہیں، اسی طرح اس گروہ کا حال ہے جو علم کو عمل پر فضیلت دیتا ہے۔ یہ نظریہ بھی باطل محال ہے کیونکہ عمل کے بغیر علم کچھ کام نہ آئے گا۔ ارشاد ہے۔

نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝	اہلِ کتاب کے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا ہے (یعنی وہ کتاب پر عمل نہیں کرتے) گویا وہ لوگ جانتے ہی نہیں بے علم ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیہ کریمہ میں عالمِ بے عمل کو علماء کے زمرے میں شمولیت کی نفی فرمائی ہے۔ اس لیے کہ سیکھنا، یاد کرنا، محفوظ کرنا یہ سب بھی تو عمل ہی کے قبیل سے ہیں۔ اور اسی عمل کے ذریعہ ہی تو بندہ مستحق ثواب ہوتا ہے۔ اگر عالم کا علم اس کے اپنے کسب و فعل سے نہ ہو تو بھلا وہ کسی ثواب کا کیسے حقدار ہوسکتا ہے۔

ایسی باتیں وہی لوگ بناتے ہیں جو مخلوق میں دنیوی عزت و منزلت اور جاہ و حشمت کی خاطر علم حاصل کرتے ہیں۔ نفس علم سے انہیں کوئی لگاؤ اور سروکار نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ یقیناً علم سے بے بہرہ ہیں کیونکہ وہ عمل کو علم سے جدا کرتے ہیں۔ وہ نہ تو علم کی قدر ہی جانتے ہیں اور نہ عمل سے واقف ہیں۔ بعض جاہل تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو قال ہے یعنی علم کی باتیں ہیں ہمیں علم نہیں چاہئے بلکہ حال یعنی عمل چاہئے۔ اور کوئی نادان یوں کہہ گزرتا ہے کہ عمل کی کیا ضرورت ہے؟ صرف علم ہی کافی ہے حالانکہ جس طرح عمل کے بغیر علم فائدہ نہیں پہنچاتا اسی طرح علم کے

بغیر عمل سودمند نہیں ہے۔ یہ دونوں نظریے باطل ہیں درحقیقت علم وعمل دونوں ہی لازم وملزوم ہیں۔

علم بے عمل کی مثال

حضرت ابراہیم ادھم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے راستہ میں ایک پتھر پڑا دیکھا اس پر لکھا تھا کہ مجھے پلٹ کر دیکھو جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو لکھا تھا ''انت لا تعمل بما تعلم فکیف تطلب ما لا تعلم '' جب تم اپنے علم پر عمل نہیں کرتے تو اس کی تلاش کیوں کرتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم علم پر عمل نہیں کرسکتے تو اب یہ محال ہے کہ جن باتوں کا ابھی علم نہیں اس کو تم طلب کرسکو۔ لہٰذا پہلے اپنے علم پر عمل کرو تاکہ اس کے بعد اس کی برکت سے دیگر علم کی راہیں تم پر کھل جائیں۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''علماء کی ہمت درایت یعنی غور وخوض کرنے میں ہے اور ناسمجھوں کی ہمت روایت کرنے یعنی نقل کرنے میں ہے۔''

لیکن وہ شخص جو علم کو دنیاوی عزت وجاہ کی غرض سے حاصل کرتا ہے درحقیقت وہ عالم کہلانے کا ہی مستحق نہیں ہے کیونکہ دنیاوی عزت وجاہ کی خواہش کرنا بجائے خود از قبیلِ جہالت ہے۔ اس لئے کہ علم بذاتِ خود بلند تر مرتبہ ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی مرتبہ ہے ہی نہیں جب وہ اس ظاہری علم کے مرتبہ سے ہی نادان ہے تو بھلا وہ ربانی لطائف واسرار کو کیسے جان سکے گا؟

علم کی اقسام

اے طالبِ حق! یاد رکھو کہ علم دو قسم کے ہیں۔ ایک علم اللہ تعالیٰ کا ہے اور دوسرا علم مخلوق کا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا علم، اس کی صفت ہے جو اس کے ساتھ قائم ہے اور اس کے کسی صفت کی کوئی حد وانتہا نہیں ہے اس کا علم موجود ومعدوم سب پر حاوی ہے۔ اور ہمارا علم یعنی مخلوق کا علم، ہماری صفت ہے جو خدا کی عطا کردہ ہے اور ہمارے ساتھ قائم ہے۔ مخلوق کی تمام صفتیں متناہی اور محدود ہیں۔ مخلوق کا علم بمقابلہ علم الٰہی کوئی حقیقت ونسبت ہی نہیں رکھتا۔ کیونکہ حق تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا۔	جس قدر تمہیں علم کا حصہ دیا گیا ہے درحقیقت وہ بہت تھوڑا ہے۔

غرضکہ علم اوصاف مدح میں سے ہے۔ اور اس کی تعریف، معلوم کو گھیرنا اور معلوم کا اظہار وبیان ہے۔ لیکن سب سے بہترین تعریف یہ ہے کہ

العلم صفة يصير الجاهل بها عالماً۔	علم ایسی صفت ہے جس کے ذریعہ جاہل، عالم بن جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''وَاللّٰہُ مُحِیْطٌ بِالْکَافِرِیْنَ '' اللہ کا علم کافروں کو گھیرے ہوئے ہے نیز ارشاد ہے ''وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ '' اور اللہ ہر شئے کو جاننے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم،

اس کی ذات کی صفت ہے۔ وہ ہر معدوم وموجود کو جانتا ہے۔ اس میں نہ کوئی مخلوق شریک ہے اور نہ اس کے علم کی تفسیر و تجزی ہو سکتی ہے۔ اور نہ وہ اس سے منفک و جدا ہو سکتا ہے۔ اس کے علم پر دلیل اس کے فعل کا مرتب ہونا ہے یعنی بحکمِ علم فاعل، فعل کا اقتضاء کرتا ہے۔ اس کا علم اسرار کیساتھ لاحق اور اظہار کے ساتھ محیط ہے۔ طالبِ حق کو چاہئے کہ خدا کے مشاہدے میں عمل کرے مطلب یہ کہ بندہ اعتقاد رکھے کہ وہ خدا کے علم میں ہے اور وہ اس کے افعال کو ملاحظہ فرما رہا ہے۔

معائنہ الٰہی کی مثال

بصرہ میں ایک رئیس تھا۔ ایک دن وہ اپنے باغ میں گیا تو باغبان کی بیوی کے حسن و جمال پر اس کی نظر پڑ گئی۔ رئیس نے اس کے شوہر کو کسی بہانے سے باہر بھیج دیا اور عورت سے کہا دروازے بند کر دو۔ عورت نے آکر کہا میں نے مکان کے تمام دروازے تو بند کر دیئے ہیں لیکن ایک دروازہ میں بند نہیں کر سکتی ہوں۔ رئیس نے پوچھا وہ کونسا دروازہ ہے؟ عورت نے کہا وہ دروازہ ہمارے اور خدا کے درمیان کا ہے۔ رئیس شرمندہ اور پشیمان ہو کر توبہ واستغفار کرنے لگا۔

چار سبق آموز باتیں حاتم الاصم رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب سے مجھے چار باتوں کا علم حاصل ہوا ہے میں عالم کے تمام علوم سے بے پروا ہو گیا ہوں۔ لوگوں نے دریافت کیا وہ کونسی چار باتوں کا علم ہے؟ انھوں نے فرمایا ایک یہ کہ میں نے جان لیا ہے کہ میرا رزق مقدر ہو چکا ہے جس میں نہ کمی ہو سکتی ہے نہ زیادتی۔ لہٰذا زیادہ کی خواہش سے بے نیاز ہوں۔ اور دوسری یہ کہ میں نے جان لیا ہے کہ خدا کا مجھ پر حق ہے جسے میرے سوا کوئی دوسرا ادا نہیں کر سکتا لہٰذا میں اس کی ادائیگی میں مشغول ہوں۔ اور تیسری یہ کہ میرا کوئی طالب ہے یعنی موت میری خواستگار ہے جس سے میں راہِ فرار اختیار کر نہیں سکتا۔ لہٰذا میں نے اسے پہچان لیا ہے اور چوتھی یہ کہ میں نے جان لیا ہے کہ میرا کوئی مالک ہے جو ہمہ وقت مجھے دیکھ رہا ہے میں اس سے شرم کرتا ہوں اور نافرمانیوں سے باز رہتا ہوں بندہ جب اس سے باخبر ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے تو وہ کوئی کام ایسا نہیں کرتا جس کی وجہ سے قیامت کے دن اسے شرمسار ہونا پڑے۔

فرض علوم

ہر شخص پر لازم ہے کہ احکامِ الٰہی اور معرفتِ ربانی کے علم کے حصول میں مشغول رہے۔

بندے کا علم وقت کے ساتھ فرض کیا گیا ہے یعنی جس وقت پر جس علم کی ضرورت ہو خواہ وہ ظاہر میں ہو یا باطن میں اس کا حاصل کرنا فرض کیا گیا ہے۔ اس علم کے دو حصے ہیں۔ ایک کا نام علم اصول

ہے اور دوسرے کا نام علم فروع۔ ظاہر علم اصول میں کلمہ شہادت یعنی اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان سیدنا محمداً عبدہٗ و رسولہٗ ہے۔ اور باطنِ علم اصول میں تحقیق معرفت یعنی حق تعالےٰ کی معرفت میں کوشش کرنا ہے۔ اور ظاہرِ علم فروع میں لوگوں سے حسنِ معاملہ اور باطنِ علم فروع میں نیت کا صحیح و درست رکھنا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا قیام بغیر دوسرے کے محال و ناممکن ہے۔ اس لئے کہ ظاہر حال' باطنی حقیقت کے بغیر نفاق ہے اسی طرح باطن بغیر ظاہر کے زندقہ اور بے دینی ہے۔ ظاہرِ شریعت' بغیر باطن کے ناقص و نامکمل ہے اور باطن بغیر ظاہر کے ہوا و ہوس۔

علم حقیقت کے ارکان علم حقیقت یعنی باطنِ علم اصول کے تین رکن ہیں۔

(۱) ذات باری تعالیٰ اور اس کی وحدانیت اور اس کے غیر سے مشابہت کی تنزیہ و نفی کا علم۔

(۲) صفات باری تعالےٰ اور اس کے احکام کا علم۔

(۳) افعالِ باری تعالیٰ یعنی تقدیر الٰہی اور اس کی حکمت کا علم۔

علمِ شریعت کے ارکان علمِ شریعت یعنی ظاہرِ علم اصول کے بھی تین رکن ہیں۔

(۱) کتاب یعنی قرآن کریم (۲) اتباعِ رسول یعنی سنت (۳) اجماعِ امت۔

دلائلِ و براہین اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کے افعال کے اثبات کے علم میں خود اسی کا ارشاد دلیل و برہان ہے فرماتا ہے۔

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ	جان لو یقیناً اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں

ارشاد ہے

وَاعْلَمُوْ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰكُمْ	جان لو یقیناً اللہ ہی تمہارا مولیٰ اور کارساز ہے۔

فرمان ہے

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ۔	کیا تم نے اپنے رب کی قدرت کی طرف نظر نہیں کی کہ اسنے سایہ کو کیسا دراز کیا

فرماتا ہے

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ۔	کیا اونٹ کی طرف نظر نہیں کرتے کہ کیسا پیدا کیا گیا۔

اس قسم کی بکثرت آیاتِ قرآنیہ ہیں جس میں اللہ تعالےٰ کے افعال پر غور فکر کرنے سے اس کے

صفات فاعلیہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں۔

مَنْ عَلِمَ اَنَّ اللّٰہَ رَبَّہٗ وَاَنِّیْ نَبِیُّہٗ حَرَّمَ اللّٰہُ تَعَالٰی لَحْمَہٗ وَدَمَہٗ عَلَی النَّارِ۔	جس نے جان لیا کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کا رب ہے اور یہ کہ میں اس کا نبی ہوں تو اللہ تعالےٰ نے اسکے گوشت اور اسکے خون کو آگ پر حرام کر دیا ہے۔

علم ذات باری کی شرائط ذات باری تعالیٰ کے علم کی شرط یہ ہے کہ ہر عاقل و بالغ یہ اعتقاد رکھے کہ حق تعالیٰ موجود اپنی ذات میں قدیم بے حد و حدود ہے اور اس کا کوئی مکان اور جہت نہیں ہے۔ اس کی ذات کے لئے تغیر و تبدل ہے اور نہ کسی آفت کا صدور۔ کوئی مخلوق اس کی مانند نہیں ہے۔ اور نہ اس کے بیوی بچے ہیں۔ تمہاری عقل و خیال میں جو صورت و شبیہ آئے وہ اس کی پیدا کردہ ہے سب کا وہی خالق ہے وہی باقی ہے، ارشاد ہے

لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ۔	کوئی شئے اس کی مثال نہیں وہی سُننے دیکھنے والا ہے۔

علم صفات باری کی شرائط صفاتِ باری تعالےٰ کے علم کی شرط یہ ہے کہ عاقل و بالغ یہ اعتقاد رکھے کہ اس کی تمام صفتیں اسی کے ساتھ ہیں مطلب یہ کہ اس کی صفتیں نہ تو اس کی ذات ہیں اور نہ اس کا غیر۔ وہ اپنی ہی صفات کے ساتھ دائم ہے۔ جیسے علم، قدرت، ارادہ، سمع، بصر، کلام اور بقا وغیرہ چنانچہ فرماتا ہے

(۱) اِنَّہٗ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ	بیشک وہی سینوں کے بھید کو جاننے والا ہے۔
(۲) وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ	اور اللہ ہر شئے پر قادر ہے۔
(۳) وَھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ	وہی سننے دیکھنے والا ہے۔
(۴) فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ	جو چاہتا ہے کرتا ہے۔
(۵) ھُوَ الْحَیُّ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ	وہی زندہ و باقی ہے اسکے سوا کوئی معبود نہیں۔
(۶) قَوْلُہُ الْحَقُّ وَلَہُ الْمُلْکُ۔	اسکا کلام سچا ہے اور اسی کا ملک ہے۔

افعالِ باری تعالےٰ کا علم علم افعال باری تعالیٰ کے اثبات میں یہ ہے کہ بندہ اعتقاد رکھے کہ تمام مخلوق اور جو کچھ اس کائنات میں ہے سب کا پیدا کرنے والا اور ان کی تدبیر فرمانے والا وہی ہے۔

ارشادِ حق ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ۔	اللہ نے تمہیں پیدا کیا اور ان سب کو جسے تم عملی جامہ پہناتے ہو۔

یہ جہان ناپید ومعدوم تھا اُسی کی تخلیق سے وجود میں آیا۔ اس نے ہر خیر وشر، نیک وبد کی تقدیر فرمائی اور وہی ہر نفع ونقصان کا پیدا کرنے والا ہے جیسا کہ فرمایا "اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ" "اللہ ہر شے کا خالق ہے۔"

احکامِ شریعت کا اثبات

احکامِ شریعت کے اثبات کی دلیل یہ ہے کہ بندہ اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہماری جانب معجزات اور خوارقِ عادات کے ساتھ خدا کے بکثرت رسول مبعوث ہوئے ہیں اور ہمارے رسول احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثنا خدا کے برحق رسول ہیں۔ آپ کے معجزات بہت ہیں اور آپ نے جو بھی غیب وظاہر کی باتیں بیان فرمائیں سب حق ہیں۔

شریعتِ اسلامیہ کا پہلا رکن کلام مجید ہے اس کے بارے میں حق تعالیٰ فرماتا ہے۔

فِیْهِ اٰیَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتَابِ	اس میں محکم آیتیں ہیں جو کتاب کی اصل ہیں۔

اور دوسرا رکن رسول اللہ ﷺ کی سنّت ہے۔ اس بارے میں حق تعالےٰ فرماتا ہے۔

مَا اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔	یہ رسول جو تمہیں دیں اسے لے لو اور جس سے روکیں باز رہو۔

اور تیسرا رکن اجماعِ امت ہے اس بارے میں حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے۔

لَا تَجْمَعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلَالَةِ عَلَیْكُمْ بِالسَّوَادِ الْاَعْظَمِ۔	میری امت گمراہی پر کبھی جمع نہ ہوگی۔ تم بڑی جماعت کے ساتھ رہو۔

اسی طرح حقیقت کے احکام بھی بکثرت ہیں۔ اگر ان سب کو کوئی یکجا کر کے لکھنا چاہے تو ناممکن ہے اسلئے کہ اللہ تعالےٰ کے لطائف واسرار کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

ملحد اور بے دینوں کی مذمّت

یاد رہنا چاہئے کہ ملحد اور بے دینوں کا ایک گروہ سوفسطائیہ ہے (اللہ کی لعنت ان پر) ان کا مذہب یہ ہے کہ کسی قسم کا علم درست نہیں ہے اور علم بجائے خود کوئی شے نہیں ہے۔ اس کے جواب میں ہم ان سے دریافت کرتے ہیں کہ بتاؤ یہ جو تم نے جانا ہے کہ کسی چیز کا علم درست نہیں ہے یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے یا نہیں؟ اگر یہ جواب دو کہ یہ بات صحیح ہے تو تم نے خود علم کا اقرار کر

لیااور اگر یہ کہو کہ یہ بھی صحیح نہیں ہے تو جو چیز بجائے خود صحیح و درست نہ ہو اس سے محاسبہ کرنا محال ہے ایسے شخص سے بات کرنا بھی دانائی نہیں ہے بے دینوں کا وہ گروہ جو اس نظریہ پر باتیں کرتا اور خیال رکھتا ہے کہ ہمارا علم کسی چیز میں صحیح نہیں ہے لہٰذا ہر چیز کے علم کو ترک کرنا اس کی ثابت کرنے سے زیادہ کامل ہے" تو ان کا یہ نظریہ وخیال ان کی حماقت و جہالت پر مبنی ہے اس لئے کہ علم کو ترک کرنا دو باتوں سے خالی نہیں یا تو (۱) وہ کسی علم سے ہوگا یا (۲) وہ جہل و نادانی ہے۔ اگر کسی علم سے ترک کیا جائے تو علم نہ کسی علم کی نفی کرتا ہے اور نہ ضد و مقابلہ میں آتا ہے لہٰذا علم کے ذریعہ علم کی نفی و ترک محال ہے۔ لامحالہ کسی علم کا ترک جہل و نادانی ہی سے ہوگا۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس سے علم کی نفی سراپا جہل ہے اور اس کا ترک کرنا سراسر حماقت و جہالت ہے کیونکہ جہالت قابل مذمت اور قبیح صفت ہے اور یہ کہ جہل قرینہء کفر و باطل ہی۔ حق کو جہل سے کوئی علاقہ نہیں۔ یہ بات تمام مشائخ طریقت کے برخلاف ہے جب عوام اس کی احمقانہ باتیں سنیں گے تو ان کو یہ کہنے کی [illegible] ہوگی کہ تمام اہلِ تصوف کا مذہب یہی ہے اور یہی ان کا عقیدہ ہے۔ اس طرح عوام کا اعتقاد متزلزل اور پراگندہ ہو جائے گا۔ اور حق و باطل میں تمیز کی صلاحیت جاتی رہے گی۔ لہٰذا ان کی باتوں کو خدا کے حوالہ کرتے ہیں تاکہ ملحد و بے دین اپنی گمراہی میں بھٹکتے رہیں اگر دین حق انھیں قابو میں لے کر ان کی گردن پکڑتا تو ان کی حالت اس سے بہتر ہوتی۔ اور دین کی رعایت کے حکم کو ہاتھ سے نہ چھوڑتے محبوبانِ خدا کو ناپسند و مکروہ نہ کہتے۔ اور اپنی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے۔

ملحدوں کا یہ گروہ جو ضد و اصرار میں مبتلا ہے اگر دین کے حسن و جمال کے ذریعہ اپنی آفتوں سے رستگاری پاتا اور عزت و منزلت کے سایہ میں اپنی زندگی گزارتا اور اہلِ حق کے ساتھ مکابرہ و مجادلہ سے پیش نہ آتا اور ان کی عزت و کرامت کو پامال نہ کرتا تو اُن کے لئے یہ کتنا اچھا ہوتا۔

سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے ایک ایسے شخص سے بحث کا اتفاق ہوا۔ جسے لوگ علم سے منسوب کر کے اہلِ علم خیال کرتے تھے حالانکہ وہ رعونت و تکبر کی کلاہ کا نام علم اور نفسانی پیروی کا نام سنت اور شیطان کی موافقت کا نام ائمہ کی سیرت رکھے ہوئے تھا۔ اثنائے بحث میں اس نے کہا۔ ملحدین کے بارہ گروہ ہیں ان میں سے ایک گروہ صوفیاء کا ہے۔ میں نے جواب میں کہا اگر ایک گروہ اہلِ تصوف کا ہے تو باقی گیارہ گروہ تم میں سے ہوں گے۔ مگر ایک گروہ خود کو تمہارے گیارہ گروہوں کے مقابلہ میں خوب اچھے طریقہ سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

یہ تمام آفت و فساد موجودہ زمانہ کی خرابی کا نتیجہ اور پیداوار ہے۔ بلاشک وشبہ اللہ تعالےٰ نے ہمیشہ اپنے اولیاء اور دوستوں کی ایک جماعت کو مخلوق سے چھپا کر رکھا ہے اور خلق کو ان کی

خاطران سے جدا رکھا ہے۔ شیخ المشائخ حضرت علی ابن بندار صیرفیؒ نے کیا خوب فرمایا ہے۔

فَسَادُ الْقُلُوْبِ عَلٰی حَسْبِ فَسَادِ الزَّمَانِ وَاَھْلِهٖ	دلوں کا فساد زمانہ اور اہلِ زمانہ کے فساد کے اعتبار پر ہے۔

اب ہم مشائخ طریقت کے فیصلہ کن اقوال پیش کرتے ہیں تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ صوفیاء کرام پر اللہ کی کیسی صادق اور سچی عنایتیں رہی ہیں اور ان کے منکرین کیسے خائب و خاسر ہوئے ہیں۔ وباللہ التوفیق۔

اثباتِ علم میں اقوالِ مشائخ

(۱) حضرت محمد بن فضل اللہ علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں کہ علوم تین طرح کے ہیں۔

(۱) علم من اللہ (۲) علم مع اللہ (۳) علم باللہ اسی کو علم معرفت کہتے ہیں کیونکہ تمام انبیاء و اولیاء نے اسی سے اللہ تعالیٰ کی معرفت پائی ہے۔ جب تک انھیں اس کی معرفت نہ ہوئی منزلِ عرفان حاصل نہ ہوئی۔ اس لئے کہ محض کوشش ومحنت کے ذریعہ حصولِ معرفت، ذات حق کے عرفان کے لئے منقطع ہے۔ کیونکہ بندہ کا علم، معرفتِ ذاتِ حق کی علّت نہیں بن سکتا۔ درحقیقت معرفت الٰہی کی علت، اللہ تعالیٰ ہی کی ہدایت اور اس کی عنایت ہے۔

علم من اللہ کا نام علم شریعت ہے۔ کیونکہ حق تعالےٰ نے ہماری طرف احکام نازل کر کے اس کی ادائیگی ہم پر لازم قرار دی ہے۔

علم مع اللہ کا نام، علمِ مقامات، علمِ طریقِ حق اور اولیاء کرام کے درجات کا بیان ہے لہٰذا اس کی معرفت شریعت کی پیروی کے بغیر صحیح نہیں ہوتی۔ اسی طرح شریعت کی پیروی اظہارِ مقامات کے بغیر درست نہیں ہے۔

(۲) حضرت ابو علی ثقفی علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں۔

اَلْعِلْمُ حَیٰوةُ الْقَلْبِ مِنَ الْجِھْلِ وَنُوْرُ الْعَیْنِ مِنَ الظُّلْمَةِ	جہالت اور تاریکی کے مقابلہ میں علم دل کی زندگی اور آنکھوں کا نور ہے۔

مطلب یہ کہ جہالت کے خاتمہ سے دل کی حیات اور کفر کی تاریکی دور ہونے سے آنکھ کی روشنی یقینی ہے جس کو معرفت کا علم نہیں اس کا دل جہل سے مردہ ہے۔ اور جس کو شریعت کا علم نہیں اس کا دل نادانی کا مریض ہے۔ پس کافروں کے دل مردہ ہیں کیونکہ وہ خدا کی معرفت سے بے بہرہ ہیں۔ اہلِ غفلت کا دل بیمار ہے کیونکہ وہ اللہ کے فرمان سے بہت دور ہیں۔

(۳) حضرت ابو وراق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

"جس نے صرف علم کلام پر اکتفا کیا اور زہد نہ کیا وہ زندیق ہے اور جس نے علمِ فقہ پر قناعت کی اور تقویٰ اختیار نہ کیا تو وہ فاسق ہے۔"

ان کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے صرف توحید کی عبارتوں کا ہی علم اختیار کیا اور زہد نہ کیا وہ زندیق بن جاتا ہے اور جس نے بغیر پرہیزگاری کے علم فقہ و شریعت کو پسند کیا وہ فاسق و فاجر بن جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بغیر درستگی معاملہ و مجاہدہ، مجردِ توحید جبر ہے ایسا موحد قول میں جبری اور فعل میں قدری کہلائے گا جب تک قدر و جبر کے درمیان صحیح راہ اختیار نہ کیا جائے۔

یہ قول بھی حقیقتہً انھیں بزرگ کا ہے جسے ایک اور جگہ بیان فرمایا ہے کہ "التوحید دون الجبر و فوق القدر" "توحید کا مقام جبر سے پست اور قدر سے اونچا ہے۔ لہٰذا جس نے علم توحید کو درستگی معاملہ کے بغیر محض اس کی عبارتوں کو اختیار کیا اور اس کے ضد و نفی کی طرف متوجہ نہ ہوا زہد کی روش پر نہ چلا۔ وہ زندیق ہو جاتا ہے۔

علمِ فقہ یعنی شریعت کی احتیاط کا نام تقویٰ ہے جو اسے بغیر ورع و تقویٰ کے پسند کرتا ہے اور رخصت و تاویل اور تعلق و شبہات کے درپے ہو کر مجتہدین عظام کے مذہب سے نکل جاتا ہے وہ جلد ہی بآسانی فسق کے گڑھے میں گر پڑتا ہے۔ ان باتوں کا ظہور بنائے غفلت ہوتا ہے۔

(۴) شیخ المشائخ حضرت یحییٰ بن معاذ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا ہے۔

"تین قسم کے لوگوں کی صحبت سے بچو ایک غافل علماء سے دوسرے مداہنت کرنیوالے فقراء سے تیسرے جاہل صوفیاء سے۔"

غافل علماء وہ ہیں جنہوں نے دنیا کو اپنے دل کا قبلہ بنا رکھا ہے اور شریعت میں آسانی کے متلاشی رہتے ہیں بادشاہوں کی پرستش کرتے ہیں ظالموں کا دامن پکڑتے ہیں، ان کے دروازوں کا طواف کرتے ہیں، خلق میں عزت و جاہ کو اپنی معراج گردانتے ہیں، اپنے غرور و تکبر اور اپنی خود پسندی پر فریفتہ ہوتے ہیں، دانستہ اپنی باتوں میں رقت و سوز پیدا کرتے ہیں، ائمہ و پیشواؤں کے بارے میں زبانِ طعن دراز کرتے ہیں۔ بزرگانِ دین کی تحقیر کرتے ہیں اور ان پر زیادتی کرتے ہیں۔ اگر ان کے ترازو کے پلڑے میں دونوں جہان کی نعمتیں رکھ دو تب بھی وہ اپنی مذموم حرکتوں سے باز نہ آئیں گے۔ کینہ و حسد کو انھوں نے اپنا شعارِ مذہب قرار دے لیا ہے۔ بھلا ان باتوں کا علم سے کیا تعلق۔؟ علم تو ایسی صفت ہے جس سے جہل و نادانی کی باتیں، اربابِ علم کے دلوں سے فنا ہو جاتی ہیں۔

اور مداہنت کرنے والے فقراء وہ ہیں جو ہر کام اپنی خواہش کے مطابق کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ باطل ہی کیوں نہ ہو وہ اس کی تعریف و مدح کرتے رہیں گے۔ اور جب کوئی کام ان کی خواہش کے خلاف ہوتا ہے چاہے وہ حق ہی کیوں نہ ہو تو وہ اس کی مذمت کرتے ہیں۔ اور مخلوق سے ایسا سلوک کرتے ہیں جس میں جاہ و مرتبہ کی طمع ہوتی ہے اور عملِ باطل پر خلق سے مداہنت کرتے ہیں۔

جاہل صوفیاء وہ ہیں جن کا کوئی شیخ و مرشد نہ ہو۔ اور کسی بزرگ سے انھوں نے تعلیم و ادب حاصل نہ کیا ہو۔ مخلوقِ خدا کے درمیان بن بلائے مہمان کی طرح خود بخود کود کر پہنچ گئے ہوں۔ انھوں نے زمانہ کی ملامت کا مزہ تک نہیں چکھا۔ اندھے پن سے بزرگی کے کپڑے پہن لئے۔ اور بے حرمتی سے خوشی کے رستہ پڑ کر ان کی صحبت اختیار کر لی۔ غرضکہ وہ خودستائی میں مبتلا ہو کر حق و باطل کی راہ میں قوتِ امتیاز سے بیگانہ ہیں۔

یہ تین گروہ ہیں جنکو شیخ کامل ہمیشہ یاد رکھے اور اپنے مریدوں کو انکی صحبت سے بچنے کی تلقین کرے کیونکہ یہ تینوں گروہ اپنے دعاوی میں جھوٹے ہیں اور ان کی روش ناقص و نامکمل اور گمراہ کرنے والی ہے۔

(۵) حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"میں نے تیس سال تک مجاہدہ کیا مگر مجھے علم اور اس کی پیروی سے زیادہ مشکل کوئی اور چیز نظر نہیں آئی"۔

ان کے فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ طبیعت کے نزدیک علم کے مطابق عمل کرنے کے مقابلہ میں آگ پر پاؤں رکھنا زیادہ آسان ہے۔ اور جاہل کے دل پر ہزار بار پل صراط سے گزرنا اس سے زیادہ آسان ہے کہ ایک علمی مسئلہ سیکھے۔ فاسق کے لئے جہنم میں خیمہ نصب کرنا اس سے زیادہ محبوب ہے کہ وہ کسی ایک علمی مسئلہ پر عمل پیرا ہو۔

اے طالبِ راہِ حق! تمہیں لازم ہے کہ علم حاصل کر کے اس میں کمال حاصل کرو۔ بندہ کتنا ہی کامل علم حاصل کر لے علمِ الٰہی کے مقابلہ میں وہ جاہل ہی ہے۔ اس لئے اسے چاہئے کہ وہ ہمیشہ یہی سمجھے کہ میں کچھ نہیں جانتا کیونکہ بندہ، بندگی کے علم کے سوا کچھ نہیں سیکھ سکتا۔ اور بندگی راہِ خدا میں بہت بڑا حجاب ہے۔ اسی مفہوم میں شعر ہے

اَلْعِجْزُ عَنْ دَرْكِ الْاِدْرَاكِ اِدْرَاك

وَالْوَقْفُ فِیْ طُرُقِ الْاَخْیَارِ اِشْرَاك

علم کے ادراک سے عاجز رہنا ہی علم و ادراک ہے

نیکوں کاروں کی راہ سے ہٹ جانا شرک کے برابر ہے

جو شخص تحصیلِ علم کی کوشش نہیں کرتا اور اپنے جہل پر مصر رہتا ہے ہمیشہ مشرک رہتا ہے اور جو سیکھتا ہے اور اپنے کمالِ علم میں اسے یہ معنی ظاہر ہوں اور اس کی علمیت اسے یہ نصیحت کرے کہ اس کا علم اپنے نتیجہء کار میں بجز عاجزی کے کچھ نہیں ہے اور علمِ الٰہی پر معلومات کا کوئی اثر ہی نہیں پڑتا۔ اگر اس میں عجز کی خوبی پیدا ہو گی تو در حقیقت علم کی تہ تک اس کی رسائی ہو سکتی ہے۔

فقر و درویشی

جاننا چاہیے کہ راہِ حق میں درویشی کا عظیم مرتبہ ہے اور درویشوں کو بڑے خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اللہ تعالٰی نے فرمایا ہے۔

(۱) لِلۡفُقَرَآءِ الَّذِيۡنَ اُحۡصِرُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ لَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ ضَرۡبًا فِى الۡاَرۡضِ يَحۡسَبُهُمُ الۡجَاهِلُ اَغۡنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ	ان فقیروں کیلئے جو راہِ خدا میں روکے گئے ہیں زمین پر چل نہیں سکتے۔ نادان انھیں بچنے کے سبب تونگر سمجھتے ہیں۔ (پ۳ ع۵)
(۲) ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبۡدًا مَّمۡلُوۡكًا لَّا يَقۡدِرُ عَلٰى شَىۡءٍ۔ (پ۱۴ ع۱۴)	اللہ نے ایک کہاوت بیان فرمائی ایک بندہ ہے دوسرے کے ملک، آپ کچھ مقدرت نہیں رکھتا۔
(۳) تَتَجَافٰى جُنُوۡبُهُمۡ عَنِ الۡمَضَاجِعِ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ خَوۡفًا وَّطَمَعًا	انکی کروٹیں خواب گاہوں سے جدا ہوئی ہیں اور اپنے رب کو پکارتے ہیں ڈرتے اور امید کرتے ہوئے۔ (پ۲۱ ع۱۵)

نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم نے بھی فقر و توکل کو پسند و اختیار فرمایا چنانچہ ارشاد ہے۔

اَللّٰهُمَّ اَحۡيِنِىۡ مِسۡكِيۡنًا وَّاَمِتۡنِىۡ مِسۡكِيۡنًا وَّاحۡشُرۡنِىۡ فِىۡ زُمۡرَةِ الۡمَسَاكِيۡنِ۔	اے خدا مجھے مسکینی کی زندگی عطا فرما اور مسکینی میں وفات دے اور مسکینوں کے زمرے میں اٹھا۔

سید عالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ روزِ قیامت اللہ تعالٰی ارشاد فرمایگا۔

"میرے محبوبوں کو میرے قریب لاؤ۔ فرشتے عرض کرینگے کون تیرے محبوب ہیں اللہ تعالٰی فرمائے گا وہ مسکین فقراء ہیں"

اس قسم کی بکثرت آیات و احادیث ہیں جو حدِ شہرت کو پہنچی ہوئی ہیں۔ ان کے اثبات کی حاجت نہیں اور نہ دلائل صحت کی ضرورت۔ کیونکہ ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ فقراء و مہاجرین میں جلوہ افروز تھے۔

صحابہء کرام کی ایک جماعت ایسی بھی تھی جنہوں نے اللہ تعالےٰ کی عبادت اور بندگی اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر رہنے کے لئے سب سے کنارہ کش ہو کر تمام معاملات سے یکسوئی حاصل کرلی اور اپنا رزق اللہ تعالیٰ کی عطا پر چھوڑ کر مسجد نبوی شریف میں اقامت اختیار کرلی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو ان صحابہ کے ساتھ صحبت وقیام پر مامور فرمایا جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے۔

جو صحابہ صبح وشام اپنے رب کی عبادت کرتے اور اس کی رضا چاہتے ہیں انھیں نہ چھوڑیئے۔	وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ (پ۷ ع۱۲)

اور فرمایا

تمہاری آنکھیں دنیاوی حیات کی زینت کی خاطر انہیں چھوڑ کر کسی اور پر نہ پڑیں۔	وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ (پ۱۵ ع۱۶)

اس کے بعد حضور اکرم ﷺ کا یہ معمول رہا کہ ان صحابہ میں سے کسی ایک کو جہاں کہیں بھی دیکھتے تو فرماتے۔ یہ وہ حضرات ہیں جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے مجھے تاکید فرمائی ہے۔

فقراء کا درجہ: بارگاہِ احدیت میں فقراء کا بڑا مقام ودرجہ ہے۔ خدا نے ان کو خاص منزلت ومرحمت سے نوازا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اسبابِ ظاہری و باطنی سے ترکِ تعلق کر کے مکمل طور پر مسبب الاسباب پر قناعت کر کے رہ گئے ہیں۔ اور اپنے آپ کو خدا کی ملازمت اور اس کی بندگی کے لئے وقف کر دیا ہے۔ ان کا یہ فقر ان کے لئے موجبِ فخر بن گیا ہے اور فقر کی دوری پر آہ وزاری اور اس کی آمد پر خوشی ومسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ حضرات فقر و مسکینی ہی سے ہمکنار رہتے ہیں اور اس کے سوا ہر چیز کو ذلیل وخوار جانتے ہیں۔

فقر و مسکینی کی نرالی شان ہے اور اس کی رسم عجیب ہے۔ حقیقی رسم افلاس واضطرار ہے اس کی حقیقت اقبال اختیاری یعنی خندہ پیشانی سے افلاس واضطرار کو قبول کرنا ہے۔ جس نے اس مسلک و طریق کو دیکھا اور سمجھا اس نے اُس سے آرام پایا۔ جب مراد پائی تو حقیقت سے ہمکنار ہو گئے اور جو حقیقت سے ہمکنار ہو گیا وہ موجودات سے دست کش ہو گیا رویتِ کل میں فنائے کلی حاصل کر کے بقائے کلی سے سرفراز ہو گیا۔

جس نے اسے رسم کے سوا کچھ نہ جانا اس نے اسکے نام واسم کے سوا کچھ نہ سنا۔	مَنْ لَّمْ يَعْرِفْ سِوٰى رَسْمِهٖ لَمْ يَسْمَعْ سِوٰى اِسْمِهٖ

فقیر و درویش وہ ہے کہ اس کے پاس کچھ نہ ہو۔ اور کوئی چیز اسے خلل انداز نہ کرے۔ نہ وہ اسبابِ دنیا کی موجودگی سے غنی ہو اور نہ اس کے نہ ہونے سے محتاج ہو۔ اسباب کا ہونا اور نہ ہونا دونوں اس کے فقر میں یکساں ہیں۔ بلکہ اسباب کی غیر موجودگی میں زیادہ خوش وخرم رہتا ہو۔ جواز کی ایک حالت یہ ہے اس لئے مشائخ نے فرمایا ہے کہ درویش جس قدر تنگدست ہوگا اس کا حال اتنا ہی کشادہ ہو گا۔ کیونکہ درویش کے نزدیک اسباب دنیاوی کا ظاہری وجود بھی تنگدلی کا موجب ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ کسی چیز کا دروازہ بند نہیں کرتا اگر بند کرے تو اتنا ہی اس کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ لہٰذا حق تعالیٰ کے ساتھ روشن اسرار بہتر ہوتے ہیں نہ کہ دنیائے غدار کی مصاحبت۔ چونکہ یہ دنیا نافرمانوں کی جگہ ہے اس کے اسباب سے تعلق رکھنا صحیح نہیں ہو سکتا ہے۔ اسی لئے یہ حضرات رضائے الٰہی کی راہ میں دنیاوی سازوسامان سے کنارہ کشی کی تعلیم دیتے ہیں۔

حکایت: کسی بادشاہ سے ایک درویش کی ملاقات ہوئی بادشاہ نے کہا اگر تمہیں کوئی حاجت ہو تو بیان کرو۔ اس نے جواب دیا کہ میں اپنے غلاموں کے غلام سے کچھ نہیں مانگتا۔ بادشاہ نے پوچھا یہ کس طرح؟ درویش نے کہا میرے دو غلام ہیں اور یہ دونوں تیرے آقا ہیں ایک حرص دوسرے امید وتمنا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اَلْفَقْرُ عِزٌّ لِاَهْلِهٖ" (فقر اس کے اہل کے لئے موجب عزت ہے) اس لئے جو چیز اہل کے لئے موجب عزت ہوتی ہے وہ نا اہل کے لئے باعثِ ذلت بن جاتی ہے۔ فقیر کی عزت اس میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل حرکتوں سے بچائے اور اپنے حال کو خلل سے محفوظ رکھے۔ نہ بدن معصیت و ذلت میں مبتلا ہو اور نہ جان پر خلل و آفت کا گزر ہو۔ درویش کی ظاہری حالت، ظاہری نعمتوں میں مستغرق اور باطنی حالت، باطنی نعمتوں سے آراستہ ہوتی ہے۔ تاکہ اس کا جسم روحانیت اور اس کا دل ربانی انوار کا منبع بن جائے نہ خلق سے اس کا تعلق ہو اور نہ آدمیت سے اس کی نسبت باطنی۔ یہاں تک کہ وہ خلق سے تعلق اور آدمیت کی نسبت سے بے نیاز ہو جائے اور اس جہان کی ملکیت اور آخرت میں درجات کی خواہش سے دل کو تونگری حاصل نہ ہو۔ اور یہ جانے کہ اس کے فقر کی ترازو کے پلڑے میں دونوں جہان مچھر کے پر کے برابر بھی وزن نہیں رکھتے۔ درویش کی ایسی حالت کے بعد اس کا ایک سانس بھی دونوں جہان میں نہ سما سکے گا۔

فقر وغنا کی افضلیت میں بحث

مشائخِ طریقت رحمہم اللہ تعالیٰ کا اس میں اختلاف ہے کہ صفاتِ خلق میں فقر و غنا میں سے کونسی خوبی افضل ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت غنی

ہے۔اور تمام صفات میں کامل ہونا اس کا خاصہ ہے چنانچہ متقدمین مشائخ میں سے حضرت یحیٰ بن معاذ رازی، احمد بن ابی الحواری، حارث المحاسبی، ابوالعباس بن عطا، ابوالحسن بن شمعون، اور متاخرین میں سے شیخ المشائخ ابوسعید فضل اللہ بن محمد المھینی رحمہم اللہ کا مذہب یہ ہے کہ فقر سے غنا افضل ہے۔ان تمام مشائخ کی دلیل یہ ہے کہ غنا حق تعالیٰ کی صفت ہے اس کے لئے فقر کی نسبت جائز نہیں ہے۔لہٰذا ایسا محبوب و دوست جس میں ایسی صفات مشترک ہو جو بندے اور معبود میں پائی جائے وہ محبوب و دوست ایسی صفت کے مقابلہ میں جس کی نسبت معبود کی نسبت جائز نہ ہو کامل ہوتا ہے۔اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ یہ اشتراک صرف لفظی اور اسمی ہے نہ کہ معنوی اور حقیقی۔حالانکہ معنی میں مماثلت و اشتراک درکار ہے (اور یہ محال ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ کی صفات قدیم ہیں اور مخلوق کی حادث۔لہٰذا یہ استدلال باطل ہے۔لیکن میں علی بن عثمان جلابی (سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ) کہتا ہوں کہ یہ ایک بیکار بحث ہے۔غنی خدا کی صفت ہے اور وہی اس کا سزاوار ہے۔مخلوقات درحقیقت اس نام کی مستحق نہیں ہوسکتی انسان تو محتاج و فقیر پیدا ہی ہوا ہے۔اس کے لئے فقر کا نام ہی زیب دیتا ہے۔مجازی اعتبار سے خدا کے ماسویٰ کسی کو غنی کہلایا جائے تو جائز ہے۔اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے غنی ہے وہ مسبب الاسباب ہے اس کے غنا کے لئے نہ کوئی سبب ہے اور نہ اس کے لئے کسی سبب کی ضرورت ہے۔بندے کو جو غنا حاصل ہوتا ہے وہ خدا کا عطا کردہ اور اسباب کا رہین منت ہے۔دونوں میں اشتراک و مماثلت کی یکسانیت باطل ہے۔نیز جب عین ذاتِ حق میں شرکت جائز نہیں ہے تو کسی کو اس کی کسی صفت میں بھی شرکت جائز نہیں ہے لہٰذا جب صفت میں اشتراک جائز نہیں تو اسم میں بھی جائز نہیں ہوسکتی۔

اب رہا لفظی اور اسمی اطلاق! تو نام رکھنا نشان و تعین کے لئے ہوتا ہے چونکہ خدا اور مخلوق کے درمیان ایک حدِ فاصل (حدوث و قدم کی) ہے۔اس لئے حق تعالیٰ کا غنا یہ ہے کہ اسے کسی کی پرواہ نہیں ہے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔نہ تو کوئی اس کی ارادہ کو روک سکتا ہے اور نہ کوئی اس کی قدرت میں مانع ہو سکتا ہے۔وہ اعیان یعنی موجودات کو پلٹنے اور مختلف چیزوں کے پیدا کرنے پر قادر ہے وہ ہمیشہ سے اس صفت کا حامل رہا اور ہمیشہ رہے گا۔

مخلوق کا غنا یہ ہے کہ اس کی زندگی ہر آفت سے محفوظ عیش و آرام اور خوشی و مسرت کے ساتھ گزرے۔یا مشاہدہ الٰہی میں سرشار ہو کر چین و راحت میں گزرے۔ان تمام باتوں میں حدوث و تغیر اور مشقت و حسرت کا سرمایہ اور عجز و تذلل کا مقام کارفرما ہے۔لہٰذا لفظ تمنا کا استعمال بندوں کے لئے بطور مجاز ہے اور اللہ تعالیٰ کے لئے حقیقی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

(۱) يَا اَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ	اے لوگوں تم خدا کے محتاج ہو اور اللہ ہی خوبیوں والا اور سراپا غنی ہے۔
(۲) وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ	اور اللہ ہی غنی ہے اور تم محتاج وفقیر۔

عوام کا ایک گروہ کہتا ہے کہ ہم تونگر کو درویش پر فضیلت دیتے ہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے تونگر کو دونوں جہان میں سعید پیدا کیا ہے اور تونگری کا اس پر احسان کیا ہے'' ان لوگوں نے اس جگہ غنا سے دنیا کی کثرت، انسانی آرزوؤں کا برآنا اور بآسانی خواہشوں کا مل جانا مراد لیا ہے۔ وہ دلیل میں کہتے ہیں کہ چونکہ خدا نے تونگری پر شکر گزاری اور مفلسی پر صبر وقناعت کا حکم دیا ہے۔ اور یہ کہ ابتلا میں صبر وقناعت کی تلقین کی ہے اور نعمتوں میں شکر کا حکم دیا لہٰذا مصیبتوں سے نعمتیں افضل ہیں۔

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ نعمت پر شکر گزاری کا حکم دیا اور شکر کو زیادتِ نعمت کی علت گردانا۔ اور فقر پر صبر کا حکم دیا اور صبر کو زیادتی قربت کی علت گردانا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے۔

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ''	اگر تم نے شکر کیا تو تم کو اور زیادہ دونگا۔

اور صبر کے لئے فرمایا۔

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ''	بیشک اللہ صبر کرنیوالوں کے ساتھ ہے

مطلب یہ ہے کہ ہر وہ نعمت جس کی اصل غفلت ہے جب شکر بجالاتا ہے تو ہم غفلت کو اس کی غفلت پر اور زیادہ کر دیتے ہیں۔ اور ہر وہ فقر جس کی اصل ابتلا ہے جب صبر کرتا ہے تو ہم قربت کو اس کی قربت پر اور زیادہ کر دیتے ہیں۔

اہل طریقت کے نزدیک غنا کا مطلب

مشائخ طریقت جس غنا کو فقر پر افضل کہتے ہیں اس سے عوام کی تونگری مراد نہیں ہے۔ کیونکہ عوام تو اسے غنی و تونگر کہتے ہیں جسے دنیاوی نعمتیں حاصل ہوں۔ لیکن مشائخ کا غنا سے مراد منعم یعنی نعمت دینے والے خدائے قدوس کو پانا ہے۔ وصالِ الٰہی حاصل ہونا اور چیز ہے اور غفلت کا پانا اور چیز ہے۔

شیخ ابوسعید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''فقیر وہی ہے جو اللہ کے ساتھ غنی ہو'' اس سے مراد ابدی کشف ہے جسے ہم مشاہدہ حق کہتے ہیں مکاشفہ ممکن الحجاب ہے اگر ایسے مکاشفہ والے کو محجوب گردانیں تو وہ مشاہدات کا محتاج ہوگا یا نہیں؟ اگر یہ کہو کہ محتاج نہ ہوگا تو یہ محال ہے اور اگر کہو کہ محتاج ہو گا تو جب احتیاج پیدا ہو گئی تو غنا کا نام جاتا رہے گا۔

نیز غنا باللہ اس شخص کو ہوتا ہے جو قائم الصفات اور ثابت المراد ہو۔ اور بشریت میں اقامت مراد اور اثبات صفات کی ساتھ غنا صحیح نہیں ہو سکتا اس لئے کہ ذات بشریت بجائے خود غنا کے لائق نہیں ہے۔ لہٰذا "اَلْغَنِیُّ مَنْ اَغْنَاہُ اللّٰہُ (غنی وہ ہے جسے اللہ غنی کرے) میں غنی باللہ فاعل ہے اور "اغناہ اللہ" مفعول ہے کیونکہ فاعل از خود قائم ہوتا ہے اور مفعول کا قیام فاعل کے ذریعہ۔ نتیجہ برآمد ہوا کہ اقامت بخود، صفت بشریت ہے اور اقامت باللہ فنائے صفت ہے۔

لیکن میں علی بن عثمان جلالی (سیدنا داتا گنج بخش رحمہ اللہ) کہتا ہوں کہ جب بندگی کی حالت میں یہ درست ہے کہ بقائے صفتِ بشریت پر غنائے حقیقی کا اطلاق نہیں ہو سکتا کیونکہ بقائے صفت، محلِ علت اور موجبِ آفت ہے چونکہ مذکورہ دلائل سے ثابت ہو چکا ہے کہ اپنی صفت کی فنا سے غنا باقی نہیں رہتا اس لئے کہ جو چیز بذاتِ خود باقی نہ رہے اس کا نام نہیں ہوتا۔ لہٰذا فنائے صفت کا نام غنا رکھنا چاہئے۔ اور جب کہ خود صفت ہی فانی ہے تو اسم ہی مقام نہ رہا۔ ایسے شخص پر نہ اسمِ فقر بولا جا سکتا ہے اور نہ اسمِ غنا۔ لہٰذا صفت غنا حضرت حق جل مجدہٗ کے سوا کسی کے لئے جائز نہیں اور صفتِ فقر بندے کے ساتھ خاص ہے۔

پھر یہ کہ تمام مشائخ طریقت اور اکثر عوام فقر کو غنا سے افضل مانتے ہیں کیونکہ قرآن و سنت اس کی فضیلت پر شاہد و ناطق ہے اور امت مسلمہ کی اکثریت کا اس پر اجماع ہے۔

حکایت ایک روز حضرت جنید بغدادی اور ابن عطار رحمہا اللہ کے درمیان اس مسئلہ میں بحث ہوئی۔ حضرت ابن عطار نے فرمایا کہ اغنیاء افضل ہیں کیونکہ روزِ قیامت نعمتوں کا حساب لیا جائے گا اور حساب دینے کے لئے بے واسطہ رب کے کلام کا سننا ہوگا چونکہ یہ محلِ عتاب ہے اور عتاب، دوست کا دوست کے ساتھ ہوتا ہے۔ حضرت جنید بغدادی نے جواب دیا کہ اگر اغنیاء سے حساب ہوگا تو فقراء اور درویشوں سے عذر خواہی ہوگی اور حساب سے عذر افضل ہے۔

اس جگہ ایک لطیفہ بیان کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ محبت کی تحقیق میں عذر بے گانگی ہے اور عتاب یگانگی کی ضد ہے۔ حالانکہ خدا کے دوست تو ایسے مقام پر فائز ہوتے ہیں جہاں یہ دونوں چیزیں ان کے لئے آفت ظاہر کرتی ہیں۔ اس لئے کہ عذر خواہی تو کسی ایسی کوتاہی پر ہوتی ہے جو دوست کے بارے میں اس کے فرمان کے خلاف کیا گیا ہو۔ جب دوست اپنے حق کو اس سے طلب کرتا ہے تو یہ اس سے عذر خواہی کرتا ہے۔ اور عتاب دوست کے فرمان میں کسی قصور کے سبب ہوتا ہے ایسی صورت میں دوست اُس قصور کے سبب اس پر عتاب نازل کرتا ہے۔ خدا کے

دوستوں کے لئے یہ دونوں باتیں محال ہیں۔ غرضکہ اہلِ طریق فقر کی ہر حالت میں صبر اور غنا کی حالت میں شکر بجالاتے ہیں۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ دوستی کا اقتضاء تو یہ ہے کہ دوست اپنے دوست سے کسی چیز کا مطالبہ نہ کرے اور نہ دوست، دوست کے فرمان کو رائیگاں کرے۔ لہٰذا۔

ظلم من سمّٰی ابن اٰدم امیر او قد سماہ رَبُّہٗ فقیرا۔	اس نے ظلم کیا جس نے آدمی کا نام امیر رکھا حالانکہ اس کے رب نے اس کا نام فقیر رکھا ہے۔

کیونکہ حق تعالٰی کی طرف سے اس کا نام فقیر ہے اگرچہ بظاہر وہ امیر و تونگر ہے لیکن حقیقت میں وہ فقیر ہی ہے۔ وہ شخص ہلاک ہو گیا جس نے خود کو گمان کیا کہ وہ امیر ہے اگرچہ وہ شخص تختِ حکومت پر موجود ہے اس لئے کہ امیر و غنی صاحبِ صدقہ ہیں اور فقراء صاحبِ صدق۔ اور صاحبِ صدق، صاحبِ صدقہ نہیں ہو سکتا۔

علم حقیقت میں حضرت ایوب علیہ السلام کا فقر، حضرت سلیمان علیہ السلام کے غنا کی مانند ہے۔ حضرت ایوب علیہ السلام کی چنگی صبر پر فرمایا ہے "نعم العبد" (کیا ہی اچھا بندہ ہے) اور حضرت سلیمان علیہ السلام سے ان کی حکومت کی وقت فرمایا "نعم العبد" (کیا ہی اچھا بندہ ہے) جب اللہ کی رضا حاصل ہو گئی تو اب فقر ایوب، غناء سلیمان علیہ السلام کی مانند بن گیا۔

حکایت

استاد ابو القاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے سنا وہ فرماتے ہیں کہ لوگ فقر و غنا میں بحث کرتے ہیں، اور خود کو مختار خیال کرتے ہیں، لیکن میرا طریق و مسلک یہ ہے کہ جو حق تعالٰی میرے لئے اختیار فرمائے اسی کی میں حفاظت کرتا ہوں۔ اگر وہ مجھے تونگر رکھے تو غافل نہیں ہوتا اگر وہ مفلس فقیر بنائے تو حریص و معترض نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ کہ غنا نعمت ہے لیکن اس میں غفلت برتنا آفت ہے اور فقر بھی نعمت ہے لیکن اس میں حرص و طمع کا داخل کرنا آفت ہے۔ معانی کے اعتبار سے تمام اعتبارات عمدہ ہیں لیکن سلوک و روش کے لحاظ سے معاملہ مختلف ہے۔ ماسوی اللہ سے دل کو فارغ رکھنے کا نام فقر ہے اور غیر میں مشغول رہنے کا نام غنا ہے۔ جب دل فارغ ہو تو اس وقت فقر غنا سے افضل ہے اور غنا فقر سے۔ ساز و سامان کی کثرت کا نام غنا نہیں ہے۔ اور نہ اس کے نہ ہونے کا نام فقر ہے۔ ساز و سامان تو خدا کی طرف سے ہے جب طالب، ساز و سامان کی ملکیت سے جدا ہو گیا شرکت جاتی رہی اور وہ دونوں ناموں سے فارغ ہو گیا نہ اب فقر ہے نہ غنا۔

فقر وغنا میں چند رموز وکنایات

مشائخِ طریقت رحمہم اللہ سے فقر وغنا کے سلسلہ میں چند رموز منقول ہیں۔ حسبِ مقدرت اُن کے اقوال درج کتاب کرتا ہوں۔

(۱) مشائخ متاخرین میں سے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ

"فقیر وہ نہیں جو ساز و سامان سے خالی ہو بلکہ فقیر وہ ہے جس کا دل آرزو کی تمنا سے خالی ہو۔"

اگر اللہ تعالیٰ اسے مال و دولت دے اور وہ مال کی حفاظت کی خواہش رکھے تو غنی کہلائے گا اور اگر مال کو ترک کرنے کی خواہش کرے تو بھی غنی کہلائے گا اس لئے کہ یہ دونوں حالتیں ملک غیر میں تصرف کرنے کے برابر ہیں۔ حالانکہ ترک حفظ وتصرف کا نام فقر ہے۔

(۲) حضرت یحییٰ بن معاذ رازی فرماتے ہیں کہ

"فقر کی علامت، فقر سے ڈرنا ہے۔"

مطلب یہ کہ صحتِ فقر کی علامت یہ ہے کہ بندہ کمالِ ولایت، قیامِ مشاہدہ اور فنائے صفت میں زوال اور قطع سے ڈرتا رہے اس حال کا کمال اس حد تک پہنچ جائے کہ وہ قطع سے بھی ڈرے۔

(۳) حضرت سائم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ۔

"فقیر کی تعریف یہ ہے کہ وہ اپنے اسرار کی حفاظت کرے اور اپنے نفس کو بچائے اور اس کے فریضہ کو ادا کرے۔"

مطلب یہ ہے کہ فقیر اپنے اسرار باطنی کو اغراضِ دنیاوی سے بچائے اور اپنے نفس کو (حرص و تمنا میں) آفت سے محفوظ رکھے۔ اور اس پر شریعت کے احکام وفرائض کو جاری کرے۔ غرضکہ جو کچھ اسرار پر گزرے اسے اظہار میں مشغول نہ کرے اور جو اظہار پر حالت ہو اسے اسرار میں مشغول نہ کرے۔ ان احوال کے غلبہ کے وقت اوامر ونواہی کی ادائیگی میں پس و پیش نہ کرے۔ یہ علامت صفاتِ بشری کے زائل ہونے کی ہوتی ہے اور بندہ مکمل طور پر ذاتِ باری تعالیٰ میں جذب ہو جاتا ہے۔ یہ معنی بھی حق تعالیٰ ہی کی جانب سے ہوتے ہیں۔

(۴) حضرت بشر حافی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

"افضل المقامات اعتقاد الصبر علی الفقر"

سب سے افضل مقام یہ ہے کہ فقر پر صبر کو مضبوطی سے تھامے۔ فقر پر صبر واعتقاد رکھنا بندے کے مقامات میں سب سے افضل مقام ہے۔ اور فقر فنائے مقامات کا نام ہے فقر پر صبر واعتقاد رکھنے کی علامت یہ ہے کہ درویش اعمال وافعال اور اوصاف کے فنا کے رُخ کو ملحوظ رکھے۔ لیکن اس قول میں ظاہرِ معنی غنا پر فقر کی فضیلت واعتقاد رکھنے میں ہے کہ کسی حال میں راہِ فقر سے منھ نہ موڑے۔

(۵) حضرت شبلی علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں کہ

"فقیر وہ ہے جو اللہ کے سوا کسی چیز میں راحت نہ پائے"۔

اس لئے درویش خدا کے سوا کسی سے کوئی واسطہ وعلاقہ نہیں رکھتا۔ اس قول کا ظاہر مفہوم یہ ہے کہ درویش حق تعالیٰ کے سوا غنا و تونگری پائے گا ہی نہیں۔ جب اسے پالے گا تو تونگر ہو جائے گا۔ لہٰذا تمہارا وجود اس کے لئے غیر ہے۔ اور جب تونگری ترکِ غیر کے بغیر حاصل ہونا ممکن نہیں تو تونگری حجاب بن گئی۔ جب تم اس راہ پر گامزن ہو گے تو تونگر کیسے رہو گے؟ یہ معنی بہت لطیف و عمیق ہیں۔ اہل حقیقت کے نزدیک مذکورہ جملہ کا مفہوم یہ نکلا ہے "الفقیر ان لا یستغنٰی عنہ" "فقیر وہ ہے جسے کبھی غنا نہ ہو یہ وہ معنی ہیں جسے شیخ طریقت حضرت خواجہ عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہمارا غم تو دائمی ہے کسی حال میں نہ تو ہم اپنی ہمت سے مقصود حاصل کر سکتے ہیں۔ اور نہ کامل طور پر دنیا و آخرت میں اس سے نابود ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کہ حصولِ شئے کے لئے مجانست ضروری ہے اور وہ جنس نہیں ہے اور موجود سے اعراض کے لئے غفلت درکار ہے لیکن درویش غافل نہیں ہوتا۔ کیونکہ پیش آمدہ راہ، دشوار و مشکل ہے۔ اور وہ دوست ایسا ہے کہ ریاضت و مجاہدے کے ذریعہ اس کا دیدار حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس کا دیدار، مخلوق کی قدرت والی جنس کی قبیل سے ہے۔ اور فنا پر تبدل صورت نہیں اور بقا پر تغیر جائز نہیں۔ اور نہ فانی کبھی باقی ہے جسے حق کا وصال نصیب ہو گا • اور نہ باقی کبھی فانی ہے کہ اس کا قرب و نزدیکی حاصل ہو گی۔ لہٰذا اس کے دوست تو سراسر مشکل ہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ دل کی تسلی کے لئے حسین عبارتیں بنا دی گئی ہیں۔ اور تسکین روح کے لئے مقامات و منازل اور طریق ظاہر کر دیئے ہیں۔ ان کی عبارتیں اپنے وجود میں مزین اور ان کی مقامات اپنی جنسیت میں پراگندہ حق تعالیٰ مخلوق کے اوصاف و احوال سے پاک و منزہ ہے۔

(۶) حضرت ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ۔

"فقیر کی تعریف یہ ہے کہ نہ ہونے کے وقت خاموش رہے اور جب ہو تو سب کچھ خرچ کر دے اور یہ بھی فرمایا کہ "موجودگی کے وقت مضطرب رہے"۔

مطلب یہ ہے کہ جب مال نہیں ہوتا تو وہ خاموش رہتا ہے اور جب مال ہوتا ہے تو وہ اپنے سے زیادہ دوسرے کو بہتر جان کر اس پر خرچ کرتا ہے۔ لہٰذا وہ شخص جو ایک لقمہ کی حاجت رکھتا ہے۔ جب اس کی حاجت پوری نہ ہو تو اس کا دل ساکن رہتا ہے اور جب وہ لقمہ مل جاتا ہے تو اپنے مقابلہ میں دوسرے کو بہتر جان کر اسے دے دیتا ہے۔ یہ عظیم کارنامہ ہے۔

اس قول میں دو اشارے ہیں ایک یہ کہ وہ نہ ہونے کی حالت میں خاموش اور راضی برضا رہتا ہے اور موجود ہونے کی صورت میں پسند کرتا ہے کہ دوسرے پر خرچ کردے کیونکہ راضی ہونا حصول خلعت کے لائق بناتا ہے یہی خلعت، قرب و نزدیکی کی علامت ہے اور محبّ و باطلب، تارک خلعت ہے۔ کیونکہ خلعت میں فرقت کا نشان ہے۔ اور دوسرا اشارہ یہ ہے کہ وہ ساکن ہوتا ہے یعنی نہ ہونے کی حالت میں موجود ہونے کے انتظار میں خاموش رہتا ہے پھر جب موجود ہو جاتا ہے تو اس کا وجود چونکہ خدا کا غیر ہے وہ غیر سے راحت نہیں پاتا تو اسے اپنے سے جدا کر دیتا ہے۔ یہی مفہوم شیخ المشائخ ابوالقاسم جنید بن محمد بن جنید رحمہ اللہ کے اقوال کا ہے فرماتے ہیں ''الفقر خلو القلب عن الاشکال'' تمام شکلوں سے دل کا خالی کرنا فقر ہے۔ دل میں جب شکل ہوتی ہے تو شکل چونکہ غیر ہے تو بجز نکال پھینکنے کے چارہ کار نہیں۔

(۷) حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

''الفقر بحر البلاء و بلاؤہ کلہ' عز''

فقر ابتلاء کا سمندر ہے اور اس کی تمام بلائیں عزت ہیں۔ اور عزت نصیب غیر ہے اس لئے کہ مبتلا تو عین بلا میں ہے اسے غیر سے کیا سروکار۔ اس وقت تو وہ ابتلا سے بھی میلان نہیں رکھتا۔ اُس وقت اس کی بلا بتمامہٖ عزت ہوتی ہے اور اس کی عزت ہمہ وقت۔ اور اس کا وقت، سب محبت میں، اور اس کی محبت تمام مشاہدے میں مرکوز ہوتی ہے تا کہ مطلب و طالب کا پورا دماغ غلبۂ خیال سے محلِ دیدار بن جائے۔ یہاں تک کہ بغیر آنکھ کے دیکھنے والا، بغیر کان کے سننے والا ہو جاتا ہے تو ایسا بندہ صاحبِ عزت ہے کہ اس نے ابتلا کا بوجھ اُٹھا رکھا ہے۔ کیونکہ حقیقت میں ابتلاء عزت کی چیز ہے اور دنیاوی نعمتیں ذلت کی چیز۔ اس لئے حقیقی عزت وہی ہے جس سے بندہ کی بارگاہِ حق میں حضوری ہو۔ اور ذلیل و حقیر وہ شئے ہے جس سے بندہ حق سے دور ہو۔ اور فقر کی بلائیں حضوری کی علامت ہیں۔ اور غنا و تونگری کی راحت دوری و غیبت کا نشان ہے۔ حاضر بحق صاحبِ عزت ہے اور غائب از حق ذلیل و خوار۔ جس ابتلاء کے معنی مشاہدہ اور اس کے دیدار سے اُنس ہو اس سے جس طرح بھی تعلق ہو غنیمت ہے۔

(۸) سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ۔

''اے گروہ فقراء! تم لوگوں میں اللہ والوں کی حیثیت سے جانے جاتے ہو اور اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ہی تمہاری تعظیم کی جاتی ہے۔ جب تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ تنہائی میں ہو تو اپنا جائزہ لیا کرو کہ فی الواقع تعلق کا کیا حال ہے۔''

مطلب یہ ہے کہ جب خلق خدا تم کو درویش کہہ کر پکارے اور وہ تمہارا حق ادا کرے تو تم اپنی درویشی کے حق کا جائزہ لیا کرو کہ یہ حق کس طرح ادا ہو رہا ہے۔ اور اگر خلقِ خدا تم کو تمہاری دعوے کے خلاف کسی اور نام سے پکارے تو ان کی یہ باتیں پسند نہ کرو۔ تم بھی اپنے دعوے کے ساتھ انصاف و راستی سے کام لو۔ کیونکہ لوگوں میں وہ شخص انتہائی پست اور ذلیل ہے کہ لوگ اسے درویش جانیں اور وہ خود ایسا نہ ہو! وہ شخص بہت اچھا ہے جسے لوگ درویش نہ کہیں لیکن وہ درویش ہو۔ جس طرح کہ وہ شخص برا ہے جسے لوگ باخدا درویش کہیں حالانکہ وہ ایسا نہ ہو۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی دعویٰ کرے کہ میں طبیب ہوں اور وہ بیماروں کا علاج کرنے لگے حالانکہ وہ علم طب میں کچھ درک نہ رکھتا ہو لوگوں کو اور زیادہ بیمار کر دے۔ جب خود بیمار ہو تو اپنا علاج کرنے سے عاجز رہے اور دوسرے طبیب کو اپنے علاج کے لئے تلاش کرے۔ ایسا درویش جسے لوگ باخدا کہیں اور وہ باخدا ہو وہ ایسے طبیب کے مانند ہے جو بیماروں کا علاج کر سکے اور جب خود بیمار ہو تو کسی دوسرے طبیب کی اسے حاجت نہ ہو۔ بلکہ خود ہی اپنا علاج کر لے۔ ایسا درویش جسے لوگ باخدا درویش نہ جانیں حالانکہ وہ باخدا درویش ہو وہ اس مردِ طبیب کے مانند ہے جو لوگوں کو اپنے طبیب ہونے کی خبر نہ کرے اور ان کے رجوعات سے فارغ ہو لیکن خود موافق غذاؤں مفرح شربتوں اور عمدہ و معتدل ہواؤں کا لحاظ رکھے تاکہ بیمار نہ ہو جائے۔ ایسا درویش چشمِ خلائق سے پوشیدہ رہتا ہے۔

(۹) بعض مشائخ متاخرین فرماتے ہیں کہ

"الفقر عدمٌ بلا وجود" بغیر وجود کے عدم کا نام فقر ہے۔

اس قول کی عبارت ناتمام و ناقص ہے اس کا مفہوم لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا کیونکہ کوئی شئے معدوم نہیں ہوتی۔ اور شئے کے وجود کے بغیر بیان نہیں کیا جا سکتا اس عبارت سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ فقر کوئی چیز نہیں ہے اور یہ کہ مذکورہ اقوال مشائخ اور تمام اولیاء اللہ کا اجماع و اتفاق بے اصل ہے کیونکہ وہ خود اپنی ذات میں فانی و معدوم ہیں۔ اور اس عبارت سے عین کا عدم مراد نہیں بلکہ عینِ عدمِ آفت مراد ہے حالانکہ آدمی کی تمام صفتیں آفت ہیں۔ جب آفت کی نفی ہو گئی تو وہ صفت کا فنا ہونا ہے اور فنائے صفت وصول و عدم وصول کے واسطہ کو ان کے سامنے سے ہٹاتا ہے اور ذات سے ان کے حال کو معدوم کرنا ذات کی نفی مراد پاتا ہے اور اس میں اسے ہلاک کر دیتا ہے۔

(۱۰) مصنف رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے متکلمین کی ایک جماعت کو دیکھا جنہیں فقر کی حقیقت کی خبر نہ تھی اور وہ اس عبارت پر ہنستے تھے اور کہتے تھے کہ یہ کیسی نامعقول بات ہے۔ اور میں نے مدعیانِ کاذب کی ایک جماعت دیکھی جو اس نامعقول بات کو تسلیم کرتے اور اس پر

اعتقاد و اعتماد کرتے تھے اور اصل قصہ کا انھیں علم ہی نہ تھا۔ وہ برملا کہتے تھے کہ ''الفقر عدم بلا وجود'' بغیر وجود کے عدم کا نام فقر ہے۔ حالانکہ یہ دونوں غلطی پر ہیں۔ ایک بر بنائے عدم علم، حق کا منکر ہوا اور دوسرے نے جہل و نادانی کو اپنا لیا۔ اور ظاہری الفاظ میں الجھ کر رہ گیا۔

مشائخ طریقت کی عبارتوں میں دم و فنا کا مطلب مذموم حرکات اور ناپسندیدہ صفات سے دور رہ کر پسندیدہ اور محمودہ صفات کی جستجو کرنا ہے آلات طلب و جستجو میں معدوم و ناپید ہونا مراد نہیں ہے۔

غرضیکہ درویش کو تمام معانی فقر میں خالی ہونا اور ہر سبب سے بیگانہ ہونا چاہئے۔

اب رہی یہ بات کہ اسرار ربانی میں سیر کرنا اسی سے اپنے امور حاصل کرنا اپنے فعل کو اس سے منسلک کرنا اور معانی و مقاصد کو اس سے اسناد کرنا، تو جب اس کے امور، کسب و محنت کی بندش سے رہائی پا جائیں گے تو فعل کی نسبت اس سے جدا ہو جائے گی۔ اس وقت اس پر جو حال گزرتا ہے وہ گذر جائے گا۔ اس حال میں وہ کسی چیز کو نہ تو خود اپنی طرف لاتا ہے اور نہ اپنے سے دور کرتا ہے۔ سب کچھ من جانب اللہ سمجھتا ہے۔ اور جو کچھ اس پر بیت جاتی ہے وہ اسے عین و حق سمجھتا ہے۔

(۱۱) حضرت مصنف رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے زبان دراز مدعیان (کاذب) کے ایک گروہ کو دیکھا جو نفس فقر میں نفی وجود کے قضیہ کے ادراک سے ان کے کمال کی نفی کا اظہار کر رہا تھا یہ بات بذاتِ خود سخت عزیز ہے۔ اور میں نے دیکھا کہ وہ لوگ حقیقتِ فقر سے نفی کرنے سے مراد عین فقر میں نفی صفت ظاہر کر رہے تھے۔ اور دیکھا کہ وہ طلب حق و حقیقت کی نفی کو فقر و صفت کہہ رہی تھے۔ اور دیکھا کہ اپنی ہوا و ہوس کو ثابت و برقرار رکھ کر نفی کل ظاہر کر رہے تھے اور وہ لوگ حجتِ فقر کے ہر درجہ میں پسماندہ تھے اس لئے کہ آدمی کے لئے اس بات کا ادراک کمال ولایت کی علامت اور اس بات کے سمجھنے کے درپے ہونا غایت درجہ کی ہمت ہے اور عین معنی سے محبت کرنا محلِ کمال ہے۔ لہٰذا طالبِ فقر و تصوف کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ ان کی راہ پر چلے اور ان کے مقامات کو طے کرے اور ان کی عبارات پر غور اور فکر کر کے سمجھنے کی کوشش کرے تاکہ محل خاص تاریکی میں نہ رہے اس لئے کہ تمام اصول، اصول سے اور تمام فروع، فروع سے نکلتے ہیں۔ اگر کوئی رہ گزر فروع سے رہ جائے تو اصول سے نسبت باقی رہتی ہے لیکن جب اصول ہی رہ جائے تو وہ کسی جگہ بیٹھنے کے لائق نہیں رہتا۔ اور کسی سے نسبت نہیں رہتی۔ میں نے یہ تمام باتیں واضح طور پر اس لئے بیان کی ہیں کہ تم انھیں غور و فکر کر کے

راہ حق کے آداب کی رعایت ملحوظ رکھو۔ اب میں مشائخِ طریقت کے کچھ اصول و رموز اور ان کے وہ اشارات جو تصوف کے سلسلہ میں فرمائے ہیں بیان کرتا ہوں اس کے بعد مردانِ خدا کے اسماء گرامی اور مشائخِ طریقت کے مذاہب کا اختلاف بیان کروں گا۔ بعدازاں حقائق و معارف اور احکامِ شرائع بیان کرکے ان کے مقامات کے رموز و آداب حتی الامکان بیان کروں گا تاکہ تم پر اور ہر اس شخص پر جو اس کتاب کو پڑھے حقیقت واضح ہو جائے وباللہ التوفیق۔

تیسرا باب

تصوف

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَعِبَادُ الرَّحۡمٰنِ الَّذِیۡنَ یَمۡشُوۡنَ عَلَی الۡاَرۡضِ ہَوۡنًا وَّ اِذَا خَاطَبَہُمُ الۡجٰہِلُوۡنَ قَالُوۡا سَلٰمًا۔	رحمٰن کے وہی بندے ہیں جو زمین پر اخلاق و انکسار سے چلتے ہیں۔ اور جب جاہل لوگ انھیں پکارتے ہیں تو وہ سلام کرتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

مَنۡ سَمِعَ صَوۡتَ اَہۡلِ التَّصَوُّفِ فَلَا یُؤَمِّنُ عَلٰی دُعَائِہِمۡ کُتِبَ عِنۡدَ اللّٰہِ مِنَ الۡغَافِلِیۡنَ۔	جو صوفیا کی آواز سنے اور ان کی دعا پر آمین نہ کہے تو وہ اللہ کے نزدیک غافلوں میں شمار ہو گا۔

اہلِ علم حضرات نے اسمِ تصوف کی تحقیق میں بہت کچھ کہا ہے اور کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ چنانچہ اہلِ علم کی ایک جماعت کہتی ہے کہ صوفی کو اس لئے صوفی کہا جاتا ہے کہ وہ صوف (پشمینہ) کے کپڑے پہنتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ وہ اوّل صف میں ہوتے ہیں۔ اور ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ یہ اصحابِ صفہ کی نیابت کرتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ یہ نام، صفا سے ماخوذ ہے غرضکہ ہر وجہ تسمیہ میں طریقت کے بکثرت لطائف ہیں لیکن اگر لغوی معنی کا اعتبار کیا جائے تو معنی بعید از مفہوم ہو جاتا ہے چونکہ ہر حالت میں ظاہر و باطن کی صفائی محمود و پسندیدہ ہے اور اس کی ضد، کدورت سے اجتناب کرنا مقصود ہے جیسا کہ سید عالم ﷺ کا ارشاد ہے "ذَھَبَ صَفۡوَۃُ الدُّنۡیَا وَ بَقِیَ کَدَرُھَا" (دنیا کی پاکیزگی جاتی رہی اور اس کی کدورت باقی رہ گئی) گویا صوفی میں لطیف و پاکیزہ چیزوں کے نام سے اس کی صفائی مراد ہے۔ چونکہ صوفیاء کرام اپنے اخلاق و معاملات کو مہذب و پاکیزہ بنا کر طبعی آفتوں سے نفرت کرتے ہیں اس بناء پر انھیں صوفی کہا جاتا ہے۔ صوفیاء کی جماعت کے لئے یہ نام اسماء اعلام یعنی مخصوص و معین ناموں میں سے ہے۔ اس لئے کہ ان کے خطرات ان کے اُن معاملات کے مقابلہ میں جسے وہ مخفی رکھتے ہیں بہت بڑے ہیں۔ تاکہ ان کا نام اسی سے ماخوذ سمجھا جائے۔

موجودہ زمانے میں حق تعالیٰ نے تصوف اور صوفیاء کرام کی مقدس ہستیوں کو کثر پردے میں رکھا ہے۔ اور تصوف کے لطائف کو ان کے دلوں سے پوشیدہ کیا ہے تاکہ کوئی تو یہ سمجھے

کہ یہ لوگ ظاہری اصلاح کے لئے ریاضتیں کرتے ہیں اور باطنی مشاہدات سے خالی ہیں اور کوئی یہ سمجھے کہ اصل وحقیقت کے بغیر یہ ایک رسم ہے حتیٰ کہ وہ اس کے انکار پر اُتر آتے ہیں۔ چنانچہ مسخرے اور ظاہر بیں علماء جو کلی طور پر اس کے منکر ہوں تصوف کے حجاب میں خوش رہتے ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی عوام بھی اُن کی ہاں میں ہاں ملانے لگے ہیں۔ اور انھوں نے باطن کی صفائی کی جستجو وطلب کو دل سے محو کر کے سلف صالحین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مسلک ومذہب کو بھلا دیا ہے۔

ان الصفا صفۃ الصدیق	ان ان اریث صوفیا علی التحقیق

حق وصداقت کی راہ میں اگر تم صوفی بننا چاہو تو جان لو کہ صوفی ہونا حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صفت ہے۔

صفائے باطن کے لئے کچھ اصول اور فروع ہیں۔ ایک اصل تو یہ ہے کہ دل کو غیر سے خالی کرے۔ اور فرع یہ ہے کہ مکر وفریب سے بھرپور دنیا سے دل کو خالی کردے۔ یہ دونوں صفتیں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہیں۔ اسی لئے آپ طریقت کے رہنماؤں کے امام ہیں۔ آپ کا قلبِ مبارک اغیار سے خالی تھا۔ حضور اکرم ﷺ کے وصال کے بعد جب تمام صحابہ کرام بارگاہِ معلیٰ میں دل شکستہ ہو کر جمع ہوئے تو سیدنا فاروق اعظم عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ تلوار سونت کر کھڑے ہو گئے اور فرمانے لگے کہ جس نے بھی یہ کہا کہ اللہ کے رسول کا انتقال ہو گیا ہے میں اس کا سر قلم کر دوں گا اس وقت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور بلند آواز سے خطبہ دیا کہ

الا من کان یعبد محمد افان محمد اقدمات و من عبد رب محمد فانہ حیی لا یموت ' خبردار! جو حضور ﷺ کی پرستش کرتا تھا وہ جان لے کہ حضور ﷺ کا وصال ہو چکا ہے اور جو حضور کے رب کی عبادت کرتا ہے تو آگاہ ہو کہ وہ زندہ ہے جسے موت نہیں ہے۔ اس کے بعد یہ آیہء کریمہ تلاوت فرمائی۔

وما محمد الا رسول قد خلت من	اور حضور تو اللہ کے رسول ہی ہیں بیشک
قلبہ الرسل افان مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم الآیہ	آپ سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں تو کیا اب حضور ﷺ انتقال فرما جائیں یا شہید کر دیئے جائیں تو تم اپنی ایڑیوں کے بل پلٹ جاؤ گے؟

مطلب یہ تھا کہ اگر کوئی یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ حضور ﷺ معبود تھے تو جان لے کہ حضور ﷺ کا وصال ہو چکا ہے اور اگر وہ حضور ﷺ کے رب کی عبادت کرتا تھا تو وہ زندہ ہے ہرگز اس پر موت نہیں آنی ہے۔ یعنی جس کا دل فانی سے پیوستہ ہوتا ہے تو وہ فانی تو فنا ہوتا ہے اور اس کا رنج باقی رہ جاتا ہے۔ لیکن جس کا دل حضرت حق سبحانہٗ سے لگا ہوا ہو تو جب نفس فنا ہو جاتا ہے تو وہ بقائے باقی دل کے ساتھ باقی رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس نے حضور اکرم ﷺ کو بشریت کی آنکھ سے دیکھا (اور آپ کو اپنا جیسا بشر سمجھا) تو جب آپ دنیا سے تشریف لے جائیں گے تو آپ کی وہ تعظیم جو اس کے دل میں ہے جاتی رہے گی۔ اور جس نے آپ کو حقیقت کی آنکھ سے دیکھا تو اس کے لئے آپ کا تشریف لے جانا موجود رہنا دونوں برابر ہیں اس لئے کہ اس نے آپ کی موجودگی اور حالت بقا کو حق تعالیٰ کی بقا کے ساتھ آپ کے تشریف لے جانے کو حق تعالیٰ سے واصل وفنا ہونے اور پلٹنے اور فنا ہونے والی چیزوں سے روگرداں ہو کر پلٹانے اور فنا کرنے والی ذات کی طرف متوجہ ہونے کو دیکھا۔ گویا اس نے قیام محوّل (پلٹنے والے وجود کو) محوِّل (پلٹانے والی ذات) کے ساتھ قائم دیکھا حق تبارک وتعالیٰ کی جس طرح تعظیم وتکریم کی جاتی ہے اسی طرح اس نے وجود واصل کی تعظیم اور توقیر کی۔ لٰہذا دل کی راہیں کسی مخلوق کے لئے نہ کھولے اور اپنی نظریں کسی غیر کی طرف نہ پھیلائے کیونکہ

مَنۡ نظر الی الخلق هلك و من رجع الی الحق ملك۔	جس نے مخلوق پر نظر ڈالی وہ ہلاک ہوا اور جس نے حق کی طرف رجوع کیا وہ مالک ہوا۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی دوسری شان کہ آپ کا قلب مبارک دنیائے غدار سے خالی تھا اس کی کیفیت یہ ہے کہ آپ کے پاس جتنا مال ومنال اور غلام وبردے وغیرہ تھے سب راہِ خدا میں دیکر ایک کمبل اوڑھ کر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو گئے۔ اس وقت حضور ﷺ نے دریافت فرمایا:

ما خلفت لعيالك فقال الله ورسوله	اے صدیق تم نے اپنے گھر والوں کیلئے کیا چھوڑا عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ﷺ۔

یعنی حضور ﷺ نے دریافت کیا تم نے اپنے مال میں سے اپنے گھر والوں کے لئے کیا چھوڑا انھوں نے عرض کیا بہت بڑا خزانہ اور بے حد وغایت مال ومنال چھوڑا ہے۔ فرمایا وہ کیا؟ عرض کیا ایک تو اللہ کی محبت اور دوسرے اُس کے رسول کی متابعت۔

جب بندہ کا دل دنیاوی صفات سے آزاد ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ دُنیاوی کدورتوں سے

اسے پاک وصاف کر دیتا ہے یہ تمام صفتیں صوفیِ صادق کی ہیں۔ ان کا انکار در حقیقت حق کا انکار اور اس سے کھلا مکابرہ وعناد ہے۔

میں کہتا ہوں کہ صفا، کدورت کی ضد ہے اور کدورت صفاتِ بشری میں سے ہے۔ حقیقۃً صوفی وہ ہے جو بشری کدورتوں سے گزر جائے جیسا کہ مصر کی عورتوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کا جب مشاہدہ کیا اور آپ کے حسن و جمال کے لطائف میں غرق ہوئیں تو ان پر بشریت غالب آ گئی پھر جب وہ منعکس ہو کر واپس آئیں اور اس کی انتہا حدِ کمال تک پہنچی اور اس سے گزر کر بشریت کے فنا پر نظر پڑی تو کہنے لگیں:۔

"مَا هٰذَا بَشَر" (خدا کی قسم یہ تو بشر ہے ہی نہیں) حالانکہ انھوں نے اپنے کلام کا نشانہ بظاہر انھیں بنایا لیکن انھوں نے اس طرح اپنا حال ظاہر کیا تھا۔ اسی لئے مشائخ طریقت فرماتے ہیں کہ۔

لیس الصفا من صفات البشر لان البشر مَدَرٌ وَالمدر لا یخلو من الکدر۔	حالت صفا، بشری صفات میں سے نہیں ہے اس لئے کہ بشر تو ایک مٹی کا تودہ ہے اور مٹی کا تودہ کدورت سے خالی نہیں ہوتا۔

لہٰذا بشری حالت میں برقرار رہ کر کدورت سے نجات پانا ممکن نہیں۔ اس لئے صفا کی مثال، افعال سے نہ ہوگی اور محض ریاضت ومجاہدہ سے بشریت زائل نہ ہوگی کیونکہ صفتِ صفا افعال واحوال سے منسوب نہیں ہے۔ اور نہ نام والقاب سے اس کو کوئی علاقہ ہے اس لئے کہ۔

الصفا صفۃ الاحباب و هم شموس بلاسحاب	صفا تو محبوبوں کی شان ہے وہ تو آفتاب تاباں ہیں جس پر کوئی ابر نہیں۔

مطلب یہ کہ صفا دوستوں کی صفت ہے یہ دوست وہ ہیں جو اپنی صفت فنا کر کے اپنے دوست، حق تعالیٰ کی صفت کے ساتھ باقی ہو گئے ہیں۔ ارباب حال کے نزدیک دوست وہی ہوتا ہے جن کے احوال مثل آفتاب کے ظاہر ہوں چنانچہ حبیب خدا محمد مصطفٰے علیہ التحیۃ والثنا سے صحابہ کرام نے حضرت حارثہ کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا "عَبْدٌ نَوَّرَ اللّٰهُ قَلْبَه بِالْاِیْمَان" وہ ایسا بندہ ہے جس کے دل کو اللہ تعالےٰ نے ایمان سے منور فرمایا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا چہرہ اس کی تاثیر سے تاباں اور نورِ ربانی سے درخشاں ہے۔ کسی بزرگ نے کیا خوب فرمایا

ضیاء الشمس والقمر اذا اشترکا

نموذج من صفاء الحب والتوحید اذا اشتکا

جب آفتاب وماہتاب کے نور باہم مل جاتے ہیں تو اس کی مثال محبت وتوحید کی صفائی ہے جب کہ یہ دونوں پیوست ہو جائیں۔

حق تعالیٰ کی توحید و محبت جس جگہ ایسے مقام پر مل جائے کہ ایک کی نسبت دوسرے کی طرف ہونے لگے تو آفتاب وماہتاب کے نور کی حیثیت وہاں کیا ہے؟ چونکہ دُنیا میں ان دونوں کے نور سے زیادہ روشن کوئی شئے نہیں جو وصفِ کمال اور نوری برہان میں اس سے بڑھ کر ہو کیونکہ آنکھیں آفتاب وماہتاب کے نور کو دیکھنے سے عاجز رہتی ہیں البتہ ان دونوں کے نور کے غلبہ سے آسمان کو دیکھ لیتے ہیں۔ اسی طرح قلبِ مومن مخلص، معرفت وتوحید اور محبت کے نور سے عرشِ الٰہی کو دیکھ لیتا ہے۔ اور دنیا میں عقبٰی کے حالات سے باخبر ہو جاتا ہے۔

تمام مشائخِ طریقت کا اس پر اجماع ہے کہ بندہ جب مقامات کی بندشوں سے آزاد ہو جاتا ہے اور احوال کی کدورتوں سے خالی ہو کر تغیر وتلون کی حدود سے نکل جاتا ہے تو وہ تمام احوال محمودہ سے متصف ہو جاتا ہے اور وہ تمام بشری صفات کی کدورتوں سے نجات پا جاتا ہے۔ یعنی بندہ جب دل میں اپنی کسی تعریف وتوصیف سے نہ لطف اندوز ہوتا ہے اور نہ اپنے میں کسی صفت کو دیکھ کر متعجب ہوتا ہے۔ ایسے بندوں کے احوال کو عام عقلیں سمجھنے سے قاصر ہیں اور وہم وگمان کے تصرف سے ان کی زندگی پاک وصاف ہوتی ہے۔ نہ ان کے حضور کو زوال ہے اور نہ ان کے وجود کے لئے اسباب کی حاجت۔

لان الصفا حضور بلا ذھاب و	اس لئے کہ صفا کے لئے بلا زوال حضور اور
وجود بلا اسباب۔	بلا سبب وجود ضروری ہے۔

لیکن اگر غیوبت کا اس پر غلبہ ہو جائے تو حضور نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح اگر اس کے وجود کے لئے سبب وعلت ہو تو وہ وجدانی ہو جائے گا۔ واجد نہ رہے گا۔ اور جن احکامِ ربانی کی حفاظت دشوار ہوتی ہیں وہ آسان ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ جب بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضر ہوئے تو ان سے حضور اکرم ﷺ نے دریافت فرمایا "اے حارثہ کس حال میں تم نے صبح کی؟ انھوں نے عرض کیا، اللہ کی حقانیت پر ایمان رکھتے ہوئے رات کٹی۔ حضور ﷺ نے فرمایا اے حارثہ تم غور کرو کیا کہہ رہے ہو؟ کیونکہ ہر شئے کی ایک حقیقت ہوتی ہے تمہارے ایمان کی حقیقت و دلیل کیا ہے؟ انھوں نے عرض کیا میں نے اپنے آپ کو دنیا سے قطع تعلق کر کے اپنے رب کو پہچانا ہے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ اب پتھر، سونا، چاندی اور مٹی میرے نزدیک سب برابر

ہیں کیونکہ دنیا سے بیزار ہو کر عقبیٰ سے لو لگا رکھی ہے۔ میرا حال یہ ہے کہ رات کو بیدار رہتا ہوں اور دن کو بھوکا پیاسا (یعنی روزے رکھتا ہوں) اب میری کیفیت یہ ہوگئی ہے کہ گویا میں اپنے رب کے عرش کو واضح طور پر دیکھ رہا ہوں، (ایک روایت میں یہ ہے کہ اہل جنت کو ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہوئے اور اہل جہنم کو ایک دوسرے سے گریزاں دیکھ رہا ہوں) اس پر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا "فالزم" اے حارثہ تم نے ایمان کی حقیقت پالی اب اس پر قائم رہو۔ آپ نے اسے تین مرتبہ فرمایا۔

اولیاء کاملین کا نام اولیاء کاملین اور عرفاء محققین کا نام صوفی ہے۔ یہ گروہ باصفا اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ ایک بزرگ نے فرمایا ہے:۔

من صفا الحب فهو صافٍ و من صفا الحبیب فهو صوفی۔

جس کی محبت پاک وصاف ہے وہ صافی ہے اور جو دوست میں مستغرق ہو کر اس کے غیر سے بری ہو وہ صوفی ہے۔

لہٰذا باعتبار لغت اس کے معانی مشتقات کسی چیز کے ساتھ صحیح نہیں بنتے کیونکہ اس لفظ کے یہ معنی لغوی تعریف سے بہت بلند و ارفع ہیں۔ اس معنی کی کوئی جنس نہیں ہے جس سے اس کو ماخوذ قرار دے دیا جائے۔ اس لئے کہ کسی چیز کا کسی چیز سے ماخوذ و مشتق ہونا جنسیت کا متقاضی ہوتا ہے۔ اور جس میں کدورت ہو وہ صاف و شفاف کی ضد ہوتی ہے اور کسی چیز کو ضد سے مشتق نہیں کرتے۔ لہٰذا عرفاء کے نزدیک یہ معنی اظہر من الشمس ہیں اس کے لئے نہ کسی تعبیر کی ضرورت ہے نہ کسی اشارہ کی۔ "لان الصوفی ممنوع عن العبارة والاشارة" اس لئے کہ صوفی کے معنی کے لئے عبارت و اشارہ کی ممانعت ہے۔

محققین کے نزدیک جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ صوفی کی تعریف عبارات سے کرنا ممنوع ہے اور عالم کی ہر شئے اس کی تعبیرات ہیں خواہ انہیں اس کا علم ہو یا نہ ہو۔ لہٰذا حصول معنی کے لئے اس نام کی لفظوں میں تعریف کی مطلق حاجت نہیں ہے۔ (فہم و ادراک کے لیے اتنا جان لو کہ) مشائخ طریقت اور عارفان حقیقت کو صوفی کہتے ہیں اور مریدین و متعلقین اور سالکین معرفت کو متصوف۔

تصوف کی تعریف کلمۂ تصوف بابِ تفعل سے ہے جس کا خاصہ ہے کہ یہ تکلف فعل کا متقاضی ہو اور یہ اصل کی فرع ہے لغوی حکم اور ظاہری معنی میں اس لفظ کی تعریف کا فرق موجود ہے۔

الصفا ولایة ولها آیة و روایة والتصوّف حکایة للصفا بلا شکایة	صفا ولایت کی منزل ہے اور اسکی نشانیاں اور روایات ہیں اور تصوف صفا کی ایسی حکایت و تعبیر ہے جس میں شکوہ وشکایت نہ ہو۔

صفا کے ظاہری معنی تاباں ہیں اور تصوّف اس معنی ومفہوم کی تعبیر وحکایت ہے۔

تصوف کی قسمیں تصوف کے ماننے والوں اور اس پر عمل کرنے والوں کی تین قسمیں ہیں ایک کو صوفی، دوسرے کو متصوف اور تیسرے کو مستصوف کہتے ہیں۔

(۱) صوفی وہ ہے جو خود کو فنا کر کے حق کے ساتھ مل جائے اور خواہشاتِ نفسانیہ کو مار کر حقیقت سے پیوستہ ہوجائے۔

(۲) متصوف وہ ہے جو ریاضت ومجاہدے کے ذریعہ اس مقام کو طلب کرے اور وہ اس مقام کی طلب وحصول میں صادق وراستباز رہے۔

(۳) مستصوف وہ ہے جو دنیاوی عزت ومنزلت اور مال ودولت کی خاطر خود کو ایسا بنا لے اور اسے مذکورہ منازل ومقامات کی کچھ خبر نہ ہو۔ ایسے نقلی صوفیوں کے لئے عرفاء کا مقولہ ہے کہ ''المستصوف عند الصوفیة کالذباب و عند غیرھم کالذیاب'' صوفیاء کرام کے نزدیک نقلی صوفی مکھی کی مانند ذلیل وخوار ہے وہ جو کرتا ہے نفس کے لئے کرتا ہے۔ اور دوسروں کے نزدیک بھیڑیے کی مانند ہے۔ جس طرح بھیڑیا اپنی تمام قوت وطاقت مردار کے حاصل کرنے میں صرف کرتا ہے یہی حال اس نقلی صوفی کا ہے۔ گویا صوفی صاحبِ وصول ہے اور متصوف صاحبِ اصول اور مستصوف صاحبِ نقول اور فضول۔

جسے وصل نصیب ہوگیا وہ مقصود کو پانے اور مراد کو حاصل کرنے میں اپنے نفسانی قصد و ارادہ سے بے نیاز ہوگیا۔ اور جسے منزل اصول نصیب ہوگئی وہ احوالِ طریقت پر فائز اور لطائف معرفت پر مستحکم ہوگیا۔ اور جس کے نصیب میں فضول ہے اور وہ نقلی صوفی ہے وہ حقیقت ومعرفت کی منزل سے محروم رہ کر محض رسم ورواج کی چوکھٹ پر بیٹھ گیا ہے۔ اس کے لئے یہی ظاہری رسوم ورواج اور طور وطریق معنی وکنہ سے محجوب ومستور بن گیا ہے۔ کیونکہ وصلِ واصل سے حجاب میں رہنا معیوب ہے۔ اسی سلسلے میں مشائخ طریقت کی بہت رمز ورموز ہیں اس جگہ ان کا تمام وکمال کا بیان کرنا تو دشوار ہے البتہ کچھ رمز واشارات بیان کرتا ہوں وباللہ التوفیق۔

صوفیائے کرام کے اوصافِ حمیدہ

(۱) حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''الصوفی اذا نطق بان نطقۂ عن الحقائق وان سکت نطقت عنہ الجوارح بقطع العلائق'' صوفی وہ ہے کہ جب بات کرے تو اس کا بیان اپنے حال کے حقائق کے اظہار میں ہو۔ مطلب یہ کہ وہ کوئی ایسی بات نہیں کہتا جو خود اس میں موجود نہ ہو۔ اور جب خاموش رہے تو اس کا معاملہ اور سلوک اس کے حال کو ظاہر کرے۔ اور علائق سے کنارہ کشی اس کے حال پر ناطق ہو۔ یعنی اس کا بولنا بوقت کلام اصول طریقت پر صحیح ہو اور اس کا کردار بوقت سکوت مجرد محض ہو اور یہ دونوں حالتیں درست ہوں۔ جب بولے تو اس کی ہر بات حق ہو اور جب خاموش رہے تو اس کا ہر فعل فقر ہو۔

(۲) حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''التصوف نعت اقیم العبدفیہ قیل نعت للعبدام للحق فقال نعت الحق حقیقت و نعت العبد رسم'' تصوف ایسی خوبی ہے جس میں بندے کو قائم کیا گیا ہے۔ کسی نے پوچھا یہ حق کی صفت ہے یا بندے کی۔ آپ نے فرمایا اس کی حقیقت، حق کی صفت ہے اور اس کی ظاہری رسم وحالت بندے کی صفت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی حقیقت بندگی کی صفت کی فنا چاہتی ہے اور صفت بندگی کی فنا' حق کے ساتھ بقا کی صفت ہے اور یہ صفتِ حق ہے اور اس کی ظاہری رسم وحالت بندے کی دائمی ریاضت ومجاہدے کی مقتضی ہے اور دائمی مجاہدہ یہ بندے کی صفت ہے اور جب دوسرے معنی میں دیکھنا چاہو تو یوں سمجھو کہ توحید کی حقیقت کسی بندے کی صفت میں صحیح نہیں ہو سکتی اس لئے کہ بندے کی صفات میں دوام نہیں۔ اور خلق کی صفت بجز رسم وظاہر کے کچھ نہیں۔ کیونکہ خلق کی صفت میں بقا نہیں ہے بلکہ وہ حقیقۃً حق کا فعل ہے لہٰذا ان صفات کی حقیقت حق کے ساتھ ہوگی۔ اس مفہوم کو یوں سمجھو کہ حق تعالیٰ نے بندے کو روزہ رکھنے کو فرمایا۔ روزہ رکھنے کی وجہ سے بندہ روزہ دار کہلایا۔ یہ روزہ ازروئے رسمِ ظاہری بندہ کی صفت ہوگی۔ لیکن ازروئے حقیقت روزے کی حقیقت حق تعالےٰ کے ساتھ ہے چنانچہ حق تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کے ذریعہ ہمیں خبر دی کہ ''الصوم لی وانا اجزی بہ'' روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔ مطلب یہ ہے کہ روزہ میری وجہ سے ہے اور جو کچھ ان کے معقولات سے ہے وہ سب اُس کی ملکیت ہے۔ لیکن تمام عبادتوں اور چیزوں کی نسبت بندے کی نسبت بطریق رسم ومجاز ہوگی نہ کہ حقیقۃً۔!

(۳) حضرت ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "التصوف ترک کل حظ للنفس" "تصوف تمام نفسانی لذات سے ہاتھ کھینچنے کا نام ہے" اس کی دو قسمیں ہیں ایک رسم یعنی مجاز دوسرے حقیقت۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ اگر نفسانی لذتوں کو چھوڑ چکا ہے تو ترک لذت بھی تو ایک لذت ہے اسی کو رسم و مجاز کہا جاتا ہے اور اگر وہ اس کا بھی تارک ہے تو یہ فنائے لذت و حظ کہلاتی ہے اس معنی کا تعلق حقیقت و مشاہدے سے ہے۔ لہٰذا ترک حظ و لذت بندہ کا فعل ہے اور فنائے حظ و لذت، حق تعالیٰ کا فعل ہے لہٰذا بندے کے فعل کو رسم و مجاز اور حق کے فعل کو حقیقت کہا جائے گا۔ اس قول سے وہ پہلا قول جو حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے خوب واضح ہو جاتا ہے۔

(۴) حضرت ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ "الصوفیۃ ھم الذین صفت ارواحھم فصاروا فی الصف الاول بین یدی الحق" "صوفیائے کرام کا گروہ وہ ہے جنکی زندگیاں کدورتِ بشری سے آزاد اور آفتِ نفسانیہ سے پاک و صاف ہو کر آرزو اور تمناؤں سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ کے حضور بلند درجے اور صفِ اول میں آرام گستر ہیں اور ماسوی اللہ کے سب سے قطعاً کنارہ کش ہو چکے ہیں۔

(۵) وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ "الصوفی لا یَملك ولا يُملك" "صوفی وہ ہے جس کے قبضہ میں کچھ نہ ہو اور نہ خود کسی کے قبضہ میں ہو۔ یہ عبارت عین فنا کی ہے کہ فانی الصفت نہ مالک ہوتا ہے نہ مملوک۔ کیونکہ صحت ملک موجودات پر درست آتی ہے۔ اس قول شریف کا مطلب یہ ہے کہ صوفی دنیاوی ساز و سامان اور اُخروی زیب و زینت میں سے کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ خود بھی تو کسی کی ملکیت میں ہے۔ وہ اپنے نفس کے حکم کا پابند نہیں ہوتا ہے اس لئے کہ غیر کی خواہش و ارادہ کے غلبہ سے وہ خود کو گھلا چکا ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ غیر کو بھی بندگی کی طمع سے فنا کر چکا ہوتا ہے یہ قول مبارک دقیق و لطیف ہے اس منزل کو گروہ صوفیاء "فنائے کل" سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہم ان کے غلط مقامات کی اس کتاب میں انشاء اللہ نشاندہی کریں گے۔

(۷) حضرت ابوعمر دمشقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "لیس التصوف رویۃ الکون بعین النقص بل غض الطرف عن الکون" "جہان کو نقص و عیب کی آنکھ سے دیکھنے کا نہیں بلکہ دنیا سے منہ پھیر لینے کا نام تصوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہان کو عیب و نقص سے بھرپور دیکھو کیونکہ یہ دلیل بقائے صفت کی ہے بلکہ جہان سے آنکھوں کو بند کر لو کیونکہ یہ دلیل فنائے

صفت کی ہے اس لئے کہ جب کائنات پر نظر ہو گی تو حد نظر کے بعد نظر کی منزل بھی ختم ہو جائے گی۔ اور دنیا سے آنکھیں بند کر لینے میں ربانی بصیرت کی بقا ہے یعنی جو شخص اپنے سے نابینا ہو گا وہ حق کو دیکھ سکے گا کیونکہ ہستی کا طالب بھی طالب ہی ہوتا ہے اور اس کا کام اس سے اسی کی طرف ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی ہستی سے باہر نکلنے کی اسے کوئی راہ نہیں ملتی۔ الغرض ایک وہ ہوتا ہے جو خود کو تو دیکھتا ہے لیکن اسے ناقص نظر آتا ہے۔ اور دوسرا وہ ہے جو اپنی طرف سے نظر کو بند کر لیتا ہے اسے نہیں دیکھتا۔ تو وہ شخص جو خود کو دیکھ لیتا ہے اگر چہ خود میں اسے نقص و عیب نظر آتے ہیں۔ مگر یہی نظارہ ایک حجاب ہے۔ اور جو دیکھتا ہے وہ نظر میں در پردہ رہتا ہے۔ اور جو اپنی ہستی کو دیکھتا ہی نہیں وہ نابینائی میں محجوب نہیں ہوتا۔ اہل معانی اور عرفا کے نزدیک یہ مفہوم و مراد، اصلِ قوی ہے۔ مگر یہ مقام اس کی شرح کا نہیں ہے۔

(۸) حضرت ابو بکر شبلی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ "التصوف شرك لانه صيانة القلب عن رؤية الغير ولا غير" "تصوف میں شرک ہے اس لئے کہ دل کو غیر کی رویت سے بچانا ہے حالانکہ غیر کا وجود ہی نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ اثبات توحید میں غیر کی رویت شرک ہے۔ جب دل میں غیر کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے تو دل کو غیر کے ذکر سے بچانا محال ہے۔

(۹) حضرت حصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "التصوف صفاء السر من كدورة المخالفة" "دل کو مخالفت کی کدورت سے پاک وصاف رکھنے کا نام تصوف ہے۔ مطلب یہ کہ باطن کو حق تعالیٰ کی مخالفت سے محفوظ رکھو کیونکہ دوستی موافقت کا نام ہے اور موافقت مخالفت کی ضد ہے۔ دوست کو لازم ہے کہ سارے جہان میں دوست کے احکام کی حفاظت کرے اور جب مطلوب و مراد ایک ہو تو مخالفت کی گنجائش نہیں ہے۔

اخلاق

(۱۰) حضرت محمد بن علی بن امام حسین بن علی مرتضی سلام اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین فرماتے ہیں کہ "التصوف خلق فمن زاد عَلَيْكَ فى الخلق زاد عليك فى التصوف" "پاکیزہ اخلاق کا نام تصوف ہے۔ جس کے جتنے پاکیزہ اخلاق ہوں گے اتنا ہی زیادہ وہ صوفی ہوگا۔

پاکیزہ اخلاق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حق تعالیٰ کے ساتھ دوسرے خلق کے ساتھ۔ حق تعالیٰ کے ساتھ نیک خوئی یہ ہے کہ اس کی قضاء و قدر پر راضی رہے۔ اور خلق کے ساتھ نیک خوئی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی رضا کی خاطر مخلوق کی صحبت کا بار برداشت کرے۔ یہ دونوں قسمیں طالب ہی کی طرف راجع ہوتی ہیں۔ کیونکہ حق کی صفت استغناء یعنی وہ طالب کی ناراضگی و رضا دونوں سے

بے نیاز ہے۔ یہ دونوں وصف نظارۂ توحید سے وابستہ ہیں۔

(۱۱) حضرت ابو محمد مرتعش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "الصوفی لا یسبق ھمتہ خطوتہ البتۃ" یعنی صوفی وہ ہے کہ اس کا باطن اس کے قدم کے ساتھ برابر ہو۔ مطلب یہ کہ دل مکمل طور پر حاضر رہے۔

یعنی دل وہاں ہو جہاں قدم ہو اور قدم وہاں ہو جہاں دل ہو۔ ایک قول یہ ہے کہ قدم وہاں ہو جہاں قول ہو۔ یہ حضوری کی علامت بغیر غیوبت کے ہے۔ اس کے برخلاف کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ خودی سے غائب ہو کر حق کے ساتھ ظاہر ہو۔ حالانکہ یہ کہنا چاہئے تھا کہ حق کے ساتھ ظاہر ہو کر خودی سے حاضر ہو۔ یہ جمع الجمع کے قبیل کی عبارت ہے کیونکہ جس وقت خود بخود رویت ہوگی تو خودی سے غیبت نہ رہے گی۔ جب رویت اٹھ جائے گی تو حضوری بے غیبت کے ہوگی اس معنی کا تعلق حضرت شبلی علیہ الرحمتہ کے اس قول سے ہے کہ

(۱۲) الصوفی لا یری فی الدارین مع اللہ غیر اللہ۔	صوفی وہ ہے جو دونوں جہان میں بجز ذاتِ الٰہی کے کچھ نہ دیکھے۔

کیونکہ بندے کی پوری ہستی غیر ہے اور جب وہ غیر کو نہ دیکھے گا تو خود کو بھی نہ دیکھے گا اور اپنی نفی اور اثبات کے وقت وہ خود سے مکمل طور پر فارغ ہوگا۔

تصوف کی بنیادی خصلتیں

(۱۳) حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تصوف کی بنیاد آٹھ خصلتوں پر ہے (۱) سخاوت، (۲) رضا، (۳) صبر، (۴) اشارہ، (۵) غربت، (۶) گدڑی، (۷) سیاحت، اور (۸) فقر۔ یہ آٹھ خصلتیں آٹھ نبیوں کی اقتدا میں ہیں، سخاوت حضرت خلیل علیہ السلام سے۔ کیونکہ آپ نے فرزند کو فدا کیا۔ اور رضا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے۔ کیونکہ بوقت ذبح اپنی رضا کا اظہار اور اپنی جانِ عزیز کو بارگاہ خداوندی میں پیش کر دیا۔ صبر حضرت ایوب علیہ السلام سے۔ کہ آپ نے بے حد و غایت مصائب پر صبر فرمایا۔ اور خدا کی فرستادہ ابتلا و آزمائش پر ثابت قدم رہے۔ اور اشارہ حضرت زکریا علیہ السلام سے کہ حق تعالےٰ نے فرمایا ان لا تکلم الناس ثلثۃ ایام الا رمزا "آپ نے تین دن لوگوں سے اشارہ کے سوا کلام نہ فرمایا اور اسی سلسلہ میں ارشاد ہے کہ "اذ نادیٰ ربہٗ نداءً خفیا "انھوں نے اپنے رب کو آہستہ پکارا۔ اور غربت حضرت یحیٰ علیہ السلام سے۔ کہ وہ اپنے وطن میں مسافروں کے مانند رہے اور خاندان میں رہتے ہوئے اپنوں سے بیگانہ رہے۔ اور سیاحت حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہ آپ

نے یکہ وتنہا مجرد زندگی گزاری اور بجز ایک پیالہ و کنگھی کے کچھ پاس نہ رکھا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ کسی نے اپنے دونوں ہاتھوں کو ملا کر پانی پیا ہے تو انھوں نے پیالہ بھی توڑ دیا اور جب کسی کو دیکھا کہ انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کر رہا ہے تو کنگھی بھی توڑ دی۔ اور خرقہ یعنی صوف کا لباس حضرت موسیٰ علیہ السلام سے۔ کہ انھوں نے پشمینی کپڑے پہنے۔ اور فقر سید عالم ﷺ سے ہے کہ جنہیں روئے زمین کے تمام خزانوں کی کنجیاں عنایت فرمادی گئی تھیں اور ارشاد ہوا کہ آپ خود کو مشقت میں نہ ڈالیں بلکہ آپ ان خزانوں کو استعمال کریں آرائش اختیار فرمائیں۔ لیکن بارگاہ الٰہی میں آپ نے عرض کیا۔ اے خدا مجھے اس کی حاجت نہیں ہے۔ میری خواہش تو یہ ہے کہ ایک روز شکم سیر ہوں تو دو روز فاقہ کروں تصوف کی یہ آٹھ اصولی خصائل ہیں جو افعال و کردار میں محمود ہیں۔

(۱۴) حضرت حصری علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں کہ "الصوفی لا یوجد بعد عدمه ولا یعدم بعد وجوده" "صوفی معدوم ہونے کے بعد ہستی کی تمنا نہیں کرتا اور موجود ہونے کے بعد معدوم ہونے کی خواہش نہیں کرتا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ جو کچھ بھی پاتا ہے اسے کسی حال میں گم نہیں کرتا اور جو چیز گم ہو جائے اس کو کسی حال میں بھی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ اس کی یافت کسی طرح نایافت نہ ہوگی اور اس کی نایافت کسی طرح یافت نہ ہوگی۔ تاکہ اثبات بغیر نفی اور نفی بغیر اثبات کے ہو جائے اس قول کا مقصد یہ ہے کہ صوفی کی بشریت کامل طور پر فنا ہو کر اس کے جسمانی شواہد اس کے حق سے جاتے رہیں اور اس کی نسبت سب سے منقطع ہو جائے۔ تاکہ بشریت کا بھید کسی کے حق میں ظاہر نہ ہو۔ یہاں تک کہ یہ فرق اپنے عین میں جمع ہو کر اپنے آپ قیام پا جائے۔ یہ صورت حال دو نبیوں میں ظاہر ہوئی ہے ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام میں کہ جن کے وجود میں عدم نہیں تھا یہاں تک کہ دعا کی "رب اشرح لی صدری ویسرلی امری" "میرے رب مجھے شرح صدر عطا فرما اور میرا معاملہ مجھ پر آسان کردے اور دوسری ذات مبارک ہمارے رسول مکرم ﷺ کی ہے کہ آپ کے عدم میں وجود نہ تھا جیسا کہ ارشاد ہوا ہے۔

الم نشرح لك صدرك	کیا ہم نے آپ کے لئے شرح صدر نہ فرمایا۔

ایک نبی نے آرائش و زینت کی درخواست کی اور دوسرے کو حق تعالیٰ نے خود آرائش و زینت سے مزین فرمایا اور انھوں نے اس کی دعا نہیں کی۔

(۱۵) حضرت علی بن پندار الصیر فی نیشاپوری رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ''التصوف اسقاط الرویۃ للحق ظاھرا و باطنا '' تصوف یہ ہے کہ صوفی اپنے ظاہر و باطن میں حق کی خاطر خود کو نہ دیکھے چنانچہ جب تم ظاہر پر نظر ڈالو گے تو ظاہر میں توفیق کا نشان پاؤ گے اور جب تم غور کرو گے تو ظاہری معاملات کو توفیق حق کے مقابلہ میں دیکھو گے تو مچھر کے پر کے برابر وزن نہ دو گے اور ظاہر دیکھنا چھوڑ دو گے اور جب باطن پر نظر ڈالو گے تو باطن میں تائید حق کے نشان پاؤ گے پھر جب غور کرو گے تو باطنی معاملات کو تائید حق کے پہلو میں دیکھ کر ذرہ بھر وزن نہ دو گے لہذا باطن کے دیکھنے کو بھی ترک کر کے سراسر حق کا مشاہدہ کرو گے۔ جب حق کا مشاہدہ کرو گے تو خود کو بھی نہ دیکھ سکو گے۔

(۱۶) حضرت محمد عمر بن احمد مقری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''التصوف استقامۃ الاحوال مَع الحق '' حق تعالیٰ کے ساتھ احوال کی استقامت کا نام تصوف ہے مطلب یہ کہ صوفی کے احوال کسی اور حال سے نہ بدلیں گے اور وہ کسی کج روی میں مبتلا نہ ہوگا۔ اس لئے کہ جس کا دل گردش احوال سے محفوظ ہے وہ درجہ استقامت سے نہیں گرتا اور نہ وہ حق تعالےٰ سے دور رہتا ہے۔

صوفیاء کے معاملات

(۱) حضرت ابو حفص حداد نیشاپوری رحمتہ اللہ علیہ صوفیاء کرام کے معاملہ کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ

> ''تصوف سراسر ادب ہے ہر وقت ہر مقام اور ہر حال کے لئے متعین آداب و احکام ہیں۔ جس نے ان آداب کی پابندی کو ان کے اوقات میں لازم رکھا وہ مردانِ خدا کے درجہ پر فائز ہو گیا اور جس نے ان آداب کی پابندی کو ملحوظ خاطر نہ رکھا اور اسے رائیگاں کر دیا وہ قرب حق کے خیال اور قبول حق کے گمان سے محروم رہ کر مردود بن گیا''

اسی معنی میں

(۲) حضرت ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ ''لیس التصوف رسوما ولا علوما ولکنہ اخلاق '' رسم و علم کا نام تصوف نہیں ہے بلکہ وصف و اخلاق کا نام ہے مطلب یہ ہے کہ اگر رسم کا نام تصوف ہوتا تو ریاضت و مجاہدے سے حاصل ہو جاتا۔ اور اگر علم کا نام تصوف ہوتا تو تعلیم سے تکمیل کی جا سکتی مگر یہ تو سراپا اخلاق ہے۔ حتیٰ کہ اگر اس کے احکام اپنی ہستی میں

جاری نہ کرو اور اس کے معاملات کو اپنے وجود میں نافذ نہ کرو اور اس کے انصاف کو اپنے اوپر نہ استعمال کرو تو ہرگز تصوف حاصل نہ ہوگا۔

رسم واخلاق کا فرق رسوم واخلاق کے درمیان فرق یہ ہے کہ رسم ایسا فعل ہے جو تکلیف ومحنت اور اسباب وذرائع سے حاصل ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایسا عمل جو باطن کے برخلاف ظاہری طور پر کیا جائے اور وہ فعل وعمل باطنی معنی سے خالی ہو۔ اور اخلاق ایسا فعلِ محمود ہے جو بے تکلیف ومحنت اور بغیر اسباب وذرائع کے باطن کے موافق ظاہر میں کیا جائے اور وہ دعوے سے خالی ہو۔

نیک خصائل (۳) حضرت مرتعش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "التصوف حسن الخلق" نیک خصائل کا نام تصوف ہے اس کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) یہ کہ حق تعالیٰ کے اوامر ونواہی کو بغیر سمع وریا کے ادا کیا جائے۔

(۲) یہ کہ بڑوں کی عزت وتعظیم اور چھوٹوں پر شفقت ومہربانی اور برابر والوں سے حق وانصاف پر قائم رہتے ہوئے کسی غرض وبدلے کا طالب نہ ہو۔

(۳) یہ تیسری قسم اپنی ذات سے متعلق ہے وہ یہ کہ وہ نفس وشیطان کی متابعت نہ کرے۔

جس نے اپنی ذات کو ان تینوں خصلتوں سے مزین کر لیا وہ تمام نیک خصلتوں کا خوگر بن گیا۔ یہ خصائل اس حدیث سے ماخوذ ہیں جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ ان سے کسی نے عرض کیا کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ کے اخلاقِ شریفہ کی تعلیم فرمایئے۔ آپ نے فرمایا قرآن کریم پڑھو۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں آپ کے اخلاقِ حمیدہ بیان فرمائے ہیں۔ یہ دلیل پہلی قسم کی ہے لیکن دوسری اور تیسری قسم کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "خذ العفو وأمر بالمعروف و اعرض عن الجاهلين" درگزر کو اختیار کرو اور نیکی کا حکم دو اور جاہلوں سے دور رہو۔

حضرت مرتعش فرماتے ہیں کہ "هذا مذهب كلهٗ جد فلا تخالطوه بشيء من الهزل" یہ نکھری ہوئی تصوف کی راہ ہے اس میں بالکل آمیزش نہ کرو۔ اور نقلی صوفیوں کے معاملات کو نہ ملاؤ۔ اور رسوم کے پابند لوگوں سے اجتناب کرو۔

جب زمانہ کے دنیا دار لوگوں نے دیکھا کہ نقلی صوفی پاؤں پر تھرکتے، گانا سنتے، اور بادشاہوں کے دربار میں جا کر ان سے مال ومنال کے حصول میں حرص ولالچ کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ درباری دیکھتے ہیں تو وہ ان سے نفرت کرتے اور تمام صوفیوں کو ایسا ہی سمجھ کر سب کو بُرا کہنے لگتے ہیں کہ ان کے یہی طور وطریق ہوتے ہیں اور پچھلے صوفیاء کا حال بھی ایسا ہی تھا حالانکہ وہ

حضرات ایسی لغو باتوں سے پاک وصاف تھے وہ اس پر غور وفکر نہیں کرتے یہ زمانہ دین میں سستی و غفلت کا ہے۔

بلا شک وشبہ جب بادشاہ وحکام پر حرص کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ اسے ظلم وستم پر آمادہ کر دیتا ہے اور اہل زمانہ طمع ونافرمانی اور زنا وفسق میں مبتلا ہو جاتے ہیں ریا کاری زاہد کو نفاق میں جھونک دیتی ہے اور ہوائے نفسانی صوفی کو پاؤں پر کوداتی ہے۔اور گانا سننے پر ابھارتی ہے۔خبردار ہوشیار! طریقت کے جھوٹے مدعی ہی تباہ ہوتے ہیں نہ کہ اصلِ طریقت۔خوب یاد رکھو کہ اگر مسخروں کی جماعت اپنے مسخرہ پن کو بزرگوں کی ریاضت ومجاہدے کے اندر ہزار بار پوشیدہ رکھے تو بزرگوں کی ریاضت ومجاہدہ مسخرہ پن نہیں بن سکتی۔

(۴) حضرت ابوعلی قزمینی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ التصوف ھو الاخلاق الرضیۃ پسندیدہ اور محمودہ افعال واخلاق کا نام تصوف ہے یعنی بندہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے راضی وخوش رہے۔رضیہ اور رضیٰ کے معنی راضی وخوش ہونے کے ہیں۔

(۵) حضرت ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ التصوف ھو الحریۃ والفتوۃ و ترک التکلف والسخا و بذل الدنیا ''یعنی نفس اور حرص وہوا کی غلامی سے آزادی پانے باطل کے مقابلہ میں جراءت ومردانگی دکھانے، دنیاوی تکلفات کو ترک کر دینے، اپنے مال کو دوسروں پر صرف کر دینے،اور دنیا کو دوسروں کے لئے چھوڑ دینے کا نام تصوف ہے۔

فتوت یہ ہے کہ اپنی جوانمردی ومردانگی کے دیکھنے سے آزاد ہو۔ترک تکلف یہ ہے کہ متعلقین کے ساتھ حسن سلوک کرے اور تقدیر سے راضی رہے۔اور سخاوت یہ ہے کہ دنیا کو دنیاداروں کے لئے چھوڑ دے۔

(۶) حضرت ابوالحسن فوشنجہ علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں کہ'' التصوف الیوم اسم ولا حقیقۃ وقد کان حقیقۃ ''آج بے حقیقت چیز کا نام تصوف سمجھ لیا گیا ہے ورنہ اس سے قبل بغیر نام کے ایک حقیقت تھی۔مطلب یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین کے زمانہ میں یہ نام تو نہ تھا مگر اس کے معنی موجود تھے۔اب نام تو ہے مگر معنی کا وجود نہیں۔یعنی معاملات وکردار تو معروف تھے لیکن دعویٰ مجہول تھا۔اب دعویٰ معروف ہے لیکن معاملات مجہول ہیں۔

تصوف کے معاملات، معانی وحقائق کے اظہار وبیان میں مشائخ طریقت کے مذکورہ ارشادات طالب حق کی رہنمائی کے لئے کافی ہیں۔لیکن جو تصوف کے منکر ہیں ان سے دریافت کیا جائے کہ تصوف کے انکار سے تمہاری کیا مراد ہے اور اگر محض اس کے نام سے انکار ہے تو کچھ

مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن اس طرح اس کے معانی وحقائق سے انکار لازم نہیں آتا۔ پھر بھی اگر اس کے معانی وحقائق سے انکار ہے تو یہ انکار کل شریعتِ اسلامیہ کا انکار بن جائے گا۔ یہی نہیں بلکہ یہ حضور اکرم ﷺ کے اخلاق حمیدہ اور خصائل جمیلہ اور اسوہء حسنہ کا انکار بھی کہلائے گا۔ اور اس انکار کے بعد پورا دین ریاکاری بن جاتا ہے میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایسا فرمانبردار اور سعید بنائے جس طرح اپنے دوستوں کو بنایا ہے۔ اور میں وصیت کرتا ہوں کہ خدا کے ان دوستوں، ولیوں اور حق شناس صوفیوں کے ساتھ حق وانصاف کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا۔ دعویٰ کم کرنا اور اہل اللہ سے حسنِ اعتقاد رکھنا۔ و باللہ التوفیق۔

صوفیائے کرام کا لباس یعنی خرقۂ صوف

پشم اور اون وصوف کا مخصوص وضع قطع کا لباس جسے گدڑی کہتے ہیں صوفیاء کرام کا شعار ہے۔ اور یہ لباس سنت کے موافق ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ "علیکم بلبس الصوف تجدون حلاوۃ الایمان فی قلوبکم" پشمینی لباس اختیار کرو کیونکہ اس سے اپنے دلوں میں ایمان کی شیرینی پاؤ گے۔

رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی کا ارشاد ہے کہ آپ صوف (پشمین) کا لباس زیب تن فرماتے اور دراز گوش (گدھے) پر سواری فرمایا کرتے تھے۔ نیز رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا "لا تضیعی الثوب حتی ترقعیہ" کپڑے کو ضائع نہ کرو جب تک کہ پیوند لگنے کی گنجائش ہو۔ سیدنا فاروق اعظم عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ آپ کے پاس ایک گدڑی ایسی تھی کہ جس میں تیس۳۰ پیوند لگے تھے۔ نیز منقول ہے کہ سب سے بہتر لباس وہ ہے جس میں آسانی سے محنت کی جا سکے۔

سیدنا امیر المومنین علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے پاس ایک پیرہن ایسا تھا جس کی آستینیں انگلیوں تک آتی تھیں اگر کسی پیرہن کی آستینیں انگلیوں سے بڑھ جاتی تھیں تو زائد حصے کو ترشوا دیا کرتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو حکم دیا "وثیابک فطھرای فقصر" آپ اپنے لباس کو ترشوا کر موزوں کر کے زیب تن فرمائیں۔

حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے سات بدری صحابیوں کو دیکھا ہے جو پشمینہ کا لباس پہنتے تھے۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خلوت میں صوف کا لباس زیب تن فرماتے تھے۔ حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو ایک گدڑی پیوند لگی پہنے دیکھا ہے۔ سیدنا امیر المومنین عمر بن الخطاب، سیدنا امیر المومنین علی مرتضیٰ اور ہرم بن حیان رضی اللہ عنہم بیان فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت اویس قرنی رحمتہ اللہ علیہ کو پشمینہ کا لباس پہنے دیکھا جس میں پیوند لگے ہوئے تھے۔

حضرت حسن بصری، مالک بن دینار اور حضرت سفیان ثوری رحمھم اللہ یہ سب گدڑی زیب تن کیا کرتے تھے۔ امام عالم سیدنا امام ابو حنیفہ کوفی رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں محمد بن علی حکیم ترمذی اپنی کتاب تاریخ المشائخ میں نقل فرماتے ہیں کہ حضرت امام اعظم نے ابتداء میں

گدڑی پہن کر خلوت نشینی کا ارادہ فرمایا اس وقت آپ کو رسول اللہ ﷺ کا خواب میں دیدار ہوا حضور نے ارشاد فرمایا تمہیں لوگوں کے درمیان رہنا چاہئے یعنی خلوت نشینی کے ارادے کو چھوڑ کر خلق اللہ کے سامنے آجاؤ کیونکہ تمہارے ذریعہ سے میری سنتیں زندہ ہوں گی۔ چنانچہ آپ نے خلوت کا ارادہ ترک فرمادیا اور قیمتی لباس کبھی نہ پہنا۔

حضرت داؤد طائی رحمتہ اللہ علیہ جو محققین صوفیاء میں سے ہیں ہمیشہ گدڑی پہنا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت ابراہیم ادہم گدڑی پہنے حضرت امام اعظمؒ کی مجلس میں آئے تو لوگوں نے ان کو بہ نظرِ حقارت دیکھا امام اعظمؒ نے فرمایا یہ ابراہم ادہم ہمارے سردار ہیں جو تشریف لائے ہیں۔ لوگوں نے عرض کیا اے امام عالی مرتبت! آپ کی زبان کبھی لغویات سے آلودہ نہیں ہوئی یہ سیادت و سرداری کے کیسے مستحق بن گئے؟ امام صاحب نے فرمایا انھوں نے خدمت کر کے سیادت پائی ہے۔ یہ ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی خدمت و عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔ اور ہم اپنی نفس پروری میں مصروف رہتے ہیں اس لئے یہ ہمارے سردار ہیں۔ آج کچھ لوگ گدڑی پہن کر جاہ و عزت حاصل کر لیتے ہیں مگر ان کے دل ظاہر کے مطابق نہیں ہیں تو کیا مضائقہ ہر لشکر میں بہادر و شجاع چند ہی ہوتے ہیں اژدحام میں محقق کم ہوتے ہیں۔ لیکن سب کی نسبت ان کی طرف کر دی جاتی ہے۔ کیونکہ صوفیاء کا یہ مسلک مذکورہ عملی مثالوں اور نبی کریم ﷺ کے مذکورہ ارشادات کے علاوہ آپ کے اس ارشاد پر بھی مبنی ہے کہ "من تشبہ بقوم فھو منھم" جس کی مشابہت جو اختیار کرے خواہ وہ مشابہت قول و فعل میں ہو یا اعتقاد میں وہ اسی قوم کا فرد شمار کیا جاتا ہے۔

صوفیاءِ کرام کے دیکھنے والوں کے طبقات مختلف ہیں (۱) کوئی تو ان کے ظاہری معاملات اور ان کی خصلتوں پر نظر ڈالتا ہے (۲) اور کوئی ان کی باطنی صفائی دل کی جلاء، خفیہ اسرار، طبعی لطافت، اعتدال مزاج اور دیدار ربانی کے اسرار میں صحتِ مشاہدہ کو دیکھتا ہے تاکہ محققین کا قرب اور ان کی رفعتِ کبریٰ کو دیکھے اور ان سے شرفِ نیازمندی بجالا کر ان کے مقام سے وابستہ ہو جائے۔ اور تعلق خاطر پیدا کر کے بصیرت حاصل کرے کیونکہ ان کے حال کی ابتداء کشف احوال اور خواہشات نفسانی اور اس کی لذتوں سے اعراض و کنارہ کشی پر مبنی ہوتی ہے۔

(۳) ایک طبقہ ایسا ہے جو جسم کی درستگی دل کی پاکیزگی اور قلب کے سکون و سلامتی کو ان کے ظاہر حال میں دیکھنا چاہتا ہے تاکہ وہ شریعت پر عمل کرنے اور اس کے مستحبات و آداب کی حفاظت اور باہم معاملات میں حسن عمل کو دیکھ سکے اور ان کی صحبت اختیار کر کے اصلاح حال کر سکے۔ اس طبقہ کے حال کی ابتداء ریاضت و مجاہدہ اور حسنِ معاملہ پر مبنی ہے۔

(۴) ایک طبقہ ایسا ہے جو انسانی اخلاق و مروت و برتاؤ، طریق صحبت و مجالست اور ان کے افعال میں حسنِ سیرت کی جستجو کرتا ہے تاکہ ان کی ظاہری زندگانی میں مروت برتاؤ کی خوبی، بڑوں کی تعظیم، چھوٹوں پر شفقت و مہربانی اور عزیزوں اور ہمسروں کے ساتھ حسنِ سلوک رواداری کو دیکھ کر ان کی قناعت کا اندازہ لگائے اور ان کی طلب و بے نیازی سے قربت حاصل کر کے ان کی صحبت اختیار کر لے اور آسان زندگی بسر کرے اور خود کو بندگان صالحین کی خدمت کے لئے وقف کر دے۔

(۵) ایک طبقہ ایسا ہے جسے طبیعت کی کاہلی، نفس کی بڑائی، جاہ طلبی اور بغیر فضیلت کے علوِ مقام کی خواہش اور بے علم ہونے کے باوجود اہلِ علم کے خصائص کی جستجو نے سرگرداں کر رکھا ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ ان میں اس ظاہری دکھاوے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ محض ظاہری طمع میں ان کی صحبت اختیار کرتے ہیں اور مداہنت کے طریقہ پر ان کے ساتھ اخلاق و کرم کا مظاہرہ کرتے ہیں اور "صلح کلی" بن کر ان کے ساتھ زندگانی بسر کرتے ہیں اسی بناء پر ان کے دلوں پر حقانی باتوں کا کچھ اثر نہیں ہوتا اور ان کے جسموں پر حصولِ طریقت کے مجاہدوں کی کوئی علامت پیدا نہیں ہوتی۔ باوجودیکہ وہ خواہشمند ہوتے ہیں کہ محققوں کی مانند لوگ ان کی تعظیم و تکریم کریں۔ اور ان سے ویسے ہی خوف کھائیں جیسے اللہ تعالیٰ کے مخصوص اولیاء کرام سے عوام ازرہِ ادب خائف رہتے ہیں وہ چاہتے ہیں ان کی اپنی آفتیں ان کی صلاح میں پوشیدہ رہیں ایسے لوگ ان صوفیائے کرام جیسی وضع و قطع اختیار کرتے ہیں حالانکہ ان کا لباس ان کے معاملہ کی درستگی کے بغیر ان کے مکر و فریب کا پردہ چاک کرتا ہے۔ ایسے مکر و فریب کا لباس، روزِ قیامت حسرت و ندامت کا موجب ہوگا۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے "مثل الذین حملوا التورٰۃ الخ" ان لوگوں کی مثال جنہوں نے تورات پر عمل نہیں کیا اس گدھے کی مانند ہیں جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ کتنی بری مثال ہے اس قوم کی جس نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا۔ اللہ تعالیٰ ظالم قوموں پر ہدایت کے دروازے بند کر دیتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں اس قسم کے لوگ بکثرت ہیں لہٰذا جہاں تک ہو سکے ایسوں سے بچنے کی کوشش کرو اور ان کی طرف قطعاً توجہ نہ دو اس لئے کہ ایسے نقلی صوفیوں سے اگر تم نے ہزار بار سلوک و طریقت حاصل کرنے کی کوشش کی تو ایک لمحہ کے لئے بھی طریقت کا دامن تمہارے ہاتھ نہ آئے گا۔ یہ راہ محض گدڑی پہننے سے طے نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ منزل ریاضت و محنت سے ملتی ہے۔ جو شخص طریقت سے آشنا ہو گیا اس کے لئے تونگری والا لباس بھی فقیرانہ عبا ہے۔ اور جو اس سے بیگانہ و

نا آشنا ہے اس کے لئے فقیرانہ گدڑی بھی نحوست و ادبار کی نشانی ہے۔ اور آخرت میں باعثِ بدبختی وشقاوت ہے۔ ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ انھوں نے کسی سے دریافت کیا کہ

"لم لا تلبس المرقعة قال من النفاق ان تلبس لباس الفتیان ولا تدخل فی حمل اثقال الفتوة"

آپ گدڑی کیوں نہیں پہنتے؟ انھوں نے فرمایا نفاق کے ڈر سے۔ اس لئے کہ مردانِ خدا کا لباس پہننے سے ان کے معاملات کا بوجھ اٹھانے کی طاقت نہیں آ جاتی۔ مردانِ خدا کا لباس پہننا اور ان کا بوجھ نہ اٹھانا کذب ونفاق ہے۔

اور اگر یہ لباسِ فقراء تم اس لئے پہنتے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں پہچانے کہ تم اُس کے خاص بندے ہو تو وہ بغیر لباس کے بھی جانتا ہے اور اگر اس لئے پہنتے ہو کہ لوگ تمہیں پہچانیں کہ تم خدا کے خاص بندے ہو اگر واقعی تم ایسے ہو تب بھی یہ ریا کاری ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ راہ بہت دشوار اور پر خطر ہے اور اہلِ حق اس سے برتر ہیں کہ وہ کوئی خاص لباس اختیار کریں۔

"الصفا من اللہ تعالیٰ انعام و اکرام والصوف لباس الانعام"

تزکیہ نفس اور باطنی صفائی اللہ تعالیٰ کی جانب سے بندے پر فضل وکرم ہے ورنہ صوف یعنی اُون تو چوپاؤں کا لباس ہے۔

لباس تو ایک حیلہ و بہانا ہے ایک طبقہ نے تو لباس ہی کو قربِ اختصاص کا ذریعہ جان رکھا ہے اور وہ اس کو پہن کر اپنے ظاہر کو آراستہ کرتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ وہ انھیں میں سے ہو جائیں گے اس طبقہ کے صوفیاء اپنے مریدوں کو ایسا لباس پہننے اور گدڑی کے استعمال کی تاکید کرتے ہیں اور خود بھی سیر وسیاحت کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ مشہور ومعروف ہو جائیں۔ اس طرح مخلوق خدا (ان کے فریب میں آ کر) ان کی نگہبان اور محافظ بن جاتی ہے۔ جب بھی ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہوتی ہے جو شریعت وطریقت کے خلاف ہے تو لوگ ان پر طعن وتشنیع شروع کر دیتے ہیں۔ اگر وہ چاہیں کہ یہ لباس پہن کر مرتکب گناہ ہوں تو خلق سے شرم محسوس کرتے ہیں۔

بہر حال گدڑی اولیاء اللہ کی زینت ہے عوام اس سے عزت حاصل کرتے اور خواص اس سے کمتری کا احساس دلاتے ہیں۔ عوام تو یوں عزت حاصل کرتے ہیں کہ جب وہ اس لباس کو

پہنتے ہیں تو مخلوق خدا انکی عزت کرتی ہے۔ اور خواص اس طرح کمتری کا احساس دلاتے ہیں کہ جب وہ گدڑی پہنتے ہیں تو لوگ انھیں عوام الناس میں سے جان کر انھیں ملامت کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ لباس ''النعم للعوام و جوشن البلاء للخواص'' عوام کے لئے نعمت ہے اور خواص کے لئے پیرہنِ ابتلاء۔ کیونکہ اکثر عوام حقیقت کی پہچان میں سرگرداں رہتے ہیں چونکہ یہ مقام و درجہ ان کی دسترس اور ان کے فہم سے بالاتر ہے اور وہ اس کے حصول کا سامان بھی نہیں رکھتے جس سے وہ رئیس بن جائیں محض اسی سبب کو جمع نعمت کا ذریعہ خیال کرتے ہیں لیکن خواص ریاو نمود اور ریاست کو چھوڑ کر عزت پر ذلت کو نعمت، پر ابتلا کو اس لئے ترجیح دیتے ہیں کہ ظاہری نعمتیں عوام کیلئے ہی موجبِ عزت ہیں مگر وہ اپنے لئے بلا و مصیبت کو باعثِ افتخار جانتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ صوفیاء کے لئے گدڑی وفا کا لباس ہے اور مغروروں کے لئے خوشی کی پوشاک۔ اس لئے کہ صوفیاء اسے پہن کر دونوں جہان سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ اور طبعی مرغوبات کو چھوڑ کر ان سے ترک تعلق اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن مغرور لوگ اس لباس کے سبب حق سے محجوب ہو کر احوال کی درستگی سے محروم رہتے ہیں۔ بہر حال یہ لباس ہر ایک کے لئے فلاح کا موجب ہے اور ہر ایک کو اس سے اپنی مراد حاصل ہو جاتی ہے کسی کو مرتبہء صفا ملتا ہے تو کسی کو بخشش و عطا۔ کسی کے لئے حجاب و پردہ ہے تو کسی کے لئے پائمالی اور پسپائی۔ کسی کے لئے رضا ہے تو کسی کے لئے رنج و تعب۔ میں امید رکھتا ہوں کہ باہمی محبت اور حسنِ صحبت سے سب کے سب نجات پا جائیں گے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے ''من احب قوما فهو منهم'' جو جس گروہ سے محبت رکھے گا وہ انھیں میں سے ہوگا۔ قیامت کے دن ہر گروہ کے دوستوں کو انھیں کے ساتھ اٹھایا جائے گا اور وہ انھیں کے زمرے میں شامل ہوں گے لیکن یہ لازمی ہے کہ اپنے باطن کو حقیقت کی طلب میں سرگرم رکھے اور دکھاوے کی رسوم سے اجتناب کرے اس لئے کہ جو شخص ظاہری چیزوں کو پسند کرتا ہے۔ وہ حقیقت تک کبھی نہیں پہنچ سکتا اور یہ بھی واضح ہے کہ وجود آدمیت، قرب ربوبیت کے لئے حجاب ہے۔ اور اس حجاب کو احوال کی گردش اور مقامات کی ریاضت و مجاہدہ ہی فنا و معدوم کرتے ہیں۔ وجود آدمیت کی صفائی اور حجابات بشری کو دور کرنے کا نام فنا ہے۔ اور جو فانی صفات ہو جائے وہ لباس اختیار نہیں کرتا۔ اور زیب و زینت میں الجھ کر قربِ حق اور فنائے بشریت کا حصول ناممکن ہے جو آدمی فانی صفت ہو گیا اور اس سے فنائے بشریت کی آفتیں دور ہو گئیں۔ آپ اسے خواہ صوفی کہہ کر پکاریں یا کسی اور نام سے یاد کریں اس کے نزدیک سب یکساں ہے۔

گدڑی پہننے کی شرائط

درویش کے لئے گدڑی پہننے کی کچھ شرائط ہیں۔ جو یہ ہیں کہ وہ اسے آسانی وفراغت کے خیال سے تیار کرے اور جب تک اصل کپڑا سالم رہے اس میں پیوند نہ لگائے۔ اور جب کہیں سے پھٹ جائے تو اس پر پیوند لگاتا جائے۔ پیوند لگانے کے سلسلہ میں مشائخ طریقت کے دو قول ہیں ایک یہ کہ پیوند لگانے میں ترتیب اور آرائش کا خیال نہ رکھنا چاہئے بلکہ جہاں سے بھی سوئی نکلے سیتا چلا جائے اس میں تکلف نہ کرے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ پیوند لگانے میں ترتیب اور درستی کا خیال رکھنا شرط ہے تاکہ مناسبت برقرار رہے۔ اور اسے بہ تکلف درست کرنا بھی فقر کے معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔ اور معاملات کا صحیح رکھنا صحتِ اصل کی دلیل ہے۔

سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت شیخ المشائخ ابوالقاسم گرگانی رحمتہ اللہ علیہ سے مقام طوس میں دریافت کیا کہ درویش کے لئے کم سے کم کونسی چیز درکار ہے۔ جو فقر کے لائق ومناسب ہو؟ انھوں نے فرمایا تین چیزیں درویشی کیلئے ضروری ہیں ان سے کم پر نام فقر زیبا نہیں۔ ایک یہ کہ گدڑی میں پیوند کی درست سلائی کرے دوسری یہ کہ سچی بات سننا پسند کرے اور تیسری یہ کہ زمین پر پاؤں ٹھیک رکھے (یعنی تفاخر و تکبر اور اترانے کی چال نہ چلے) جس وقت اُن سے یہ باتیں معلوم کیں تو صوفیاء کی ایک جماعت ان کے پاس بیٹھی تھی ان سب کی موجودگی میں انھوں نے یہ باتیں بیان فرمائیں۔ جب ہم ان کی محفل مبارک سے باہر نکلے تو ہر ایک نے بحث ومباحثہ شروع کر دیا اور جاہلوں کے ایک طبقہ کو ان باتوں میں لذت و شیرینی محسوس ہونے لگی وہ کہنے لگے کہ بس انہیں تین باتوں کا نام فقر ہے۔ چنانچہ بہتوں نے بہت سے پیوند لگائے اور زمین پر داہنا پاؤں مارنے کو مشغلہ بنا لیا ہر ایک یہ خیال کرنے لگا کہ ہم طریقت کی باتیں اچھی طرح سمجھتے ہیں چونکہ مجھے حضرت شیخ کی باتوں سے لگاؤ تھا مجھے ان کی باتوں کا اس طرح ضائع و برباد ہونا گوارہ نہ ہوا میں نے ان سے کہا آؤ اور ہم سب مل کر ان باتوں پر تبادلہء خیال کریں اور ہر ایک اپنی اپنی عقل وفہم کے مطابق ان کی تشریح و وضاحت کرے۔ چنانچہ جب میری باری آئی تو میں نے کہا کہ گدڑی میں درست پیوند لگانے کا مطلب یہ ہے کہ فقر کے لئے پیوند لگایا جائے نہ کہ زیب وزینت کی خاطر۔ جب فقر کے لئے پیوند لگا ہوگا تو وہ پیوند اگرچہ بظاہر درست نہ ہو تب بھی فقر میں درست ہوگا۔ اور سچی بات سننے کا خوگر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ حال کے لئے ہوں نہ کہ اپنے وجود و مرتبہ کے لئے اور وجد کی خاطر اس میں تصرف

کرے نہ کہ کھیل کود اور عیش پسندگی کے لئے۔ اور زمین پر ٹھیک پاؤں رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ وجد کی خاطر زمین پر پاؤں رکھے نہ کہ کھیل کود لہو ولعب کے لئے۔

کچھ لوگوں نے میری یہ تشریح و توضیح حضرت شیخ ابوالقاسم رحمۃ اللہ تک پہنچادی۔ اس پر آپ نے فرمایا "اصاب علیٔ خیرہ اللّٰہ" علی (یعنی داتا گنج بخش) نے درست بات کہی اللہ تعالیٰ اسے پسند فرمائے۔

دراصل صوفیاء کرام کا گدڑی پہننے سے مقصد یہ ہے کہ دنیاوی محنت و مشقت میں کمی ہو اور اللہ تعالیٰ سے فقر و احتیاج میں صدق و اخلاص پیدا ہو، احادیث صحیحہ میں منقول ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس ایک گدڑی تھی جسے وہ اپنے ساتھ آسمان پر لے گئے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں نے انھیں خواب میں دیکھا ہے کہ ان کی گدڑی کے ہر پیوند سے نور درخشاں تھا۔ میں نے عرض کیا اے حضرت مسیحؑ! آپ کی گدڑی سے یہ انوار کیسے درخشاں ہیں؟ فرمایا یہ میرے اضطرار و پریشانی کے انوار ہیں۔ کیونکہ میں نے ہر پیوند کو انتہائی ضرورت و احتیاج کے وقت سیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے میرے ہر رنج و کلفت کے بدلے مجھے ایک نور عطا فرمایا۔

نیز میں نے ماوراء النہر میں ملامتی گروہ کے ایک آدمی کو دیکھا کہ انسان جو چیز کھاتا اور پہنتا ہے وہ آدمی ان میں سے کچھ نہیں کھاتا اور نہ پہنتا تھا وہ صرف وہی چیزیں کھاتا تھا جسے لوگ پھینک دیتے تھے۔ مثلاً خراب ککڑی، کڑوا کدو بیکار گاجر وغیرہ اور وہ ایسی گدڑی پہنتا تھا جسکے چیتھڑے راستہ میں اکٹھا کرکے پاک کیے جاتے تھے۔ اور پھر ان سے وہ گدڑی بنائی جاتی تھی۔

میں نے سنا ہے کہ شہر مرادالردو میں ایک بزرگ ایسے تھے جن کا شمار متاخرین ارباب معانی میں تھا ان کا حال عمدہ اور خصلت نیک تھی۔ ان کی گدڑی اور جائے نماز میں بے ترتیب پیوند لگے ہوئے تھے اور بچھوؤں نے اس میں بچے دے رکھے تھے۔

میرے پیر و مرشد رضی اللہ عنہ نے اکیاون۵۱ سال تک ایک ہی گدڑی زیب تن رکھی۔ سو وہ اس میں بے ترتیب پیوند لگاتے رہتے تھے۔

اہلِ عراق کی ایک حکایت میں پڑھا ہے کہ دو۲ درویش تھے جن میں ایک تو صاحبِ مشاہدہ تھا اور دوسرا صاحب مجاہدہ۔ وہ درویش جو صاحبِ مشاہدہ تھا اس نے اپنی تمام عمر ایسی پھٹی گدڑی پہنی جیسی کہ بوقت سماع پھٹی ہوئی گدڑی درویش پہنتے ہیں۔ اور وہ درویش جو صاحبِ مجاہدہ تھا اس نے تمام عمر ایسی دریدہ گدڑی پہنی جیسی کہ استغفار و آمرزش کی حالت میں ہوتی ہے۔ اور اس حال میں اپنے لباس کو بوسیدہ کرلیا کرتا تھا تاکہ اس کی ظاہری حالت اس کی باطنی

کیفیات کے مطابق ہو جائے۔ یہ کیفیت اپنے حال کی حفاظت کے لئے ہوتی تھی۔

حضرت شیخ محمد بن خفیف رحمہ اللہ نے بیس سال تک انتہائی سخت و درشت ٹاٹ پہنا۔ وہ ہر سال چار چلّہ کرتے۔ اور ہر چالیس دن میں علوم وحقائق کی باریکیوں پر ایک کتاب تصنیف فرماتے تھے۔ ان کے زمانہ میں محمد بن زکریا جو طریقت وحقیقت کے علماء میں اپنا مقام رکھتے تھے ان کی حالت یہ تھی کہ وہ چیتے کی کھال پر بیٹھتے اور کبھی گدڑی نہ پہنتے تھے۔

حضرت شیخ محمد بن خفیفؒ سے لوگوں نے پوچھا کہ گدڑی پہننے کی شرائط کیا ہیں؟ اور اس کی حفاظت کس پر لازم ہے؟ انھوں نے جواب دیا گدڑی پہننے کی شرط یہ ہے کہ محمد بن زکریا جیسے بزرگ اپنے عمدہ سفید لباس کی جگہ گدڑی پہنیں اور ان جیسے بزرگ اس لباس کی حفاظت فرمائیں۔

صوفیاء کے لباس میں مسلک اعتدال

صوفیائے کرام میں ''ترک عادات'' کا طریقہ ان کی شرائط میں سے نہیں ہے۔ موجودہ زمانہ میں خرقہ صوف کم پہنا جاتا ہے اس کی دو وجہ ہیں۔ ایک یہ کہ آجکل اُون گندی اور خراب ملتی ہے۔ کیونکہ جانور ناپاک اور گندی جگہوں پر اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ دوسری یہ کہ اہل بدعت وہوا اور نقلی صوفیاء نے اونی لباس کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔ مبتدعین کے شعار کے خلاف عمل کرنا اگرچہ وہ سنت ہی کیوں نہ ہو درست ہے۔

لیکن گدڑی کے پہننے میں تکلف کو اس بناء پر جائز رکھا گیا ہے کہ ان کا مرتبہ لوگوں میں بلند و برتر ہے اور ہر شخص صوفیاء کی مشابہت اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ان سے خلاف شریعت وطریقت حرکات کا صدور ہوتا ہے ایسے نا اہل لوگوں کی صحبت سے ان کو رنج ہوتا ہے اس لئے انھوں نے ایسے لباس کو اختیار کیا ہے جس میں بجز ان کے اور کوئی اس طرح کے پیوند نہیں لگا سکتا۔ ایسی گدڑی کو اپنے اور غیروں کے درمیان امتیازی نشان بنا رکھا ہے۔ ایک درویش کسی بزرگ کے پاس حاضر ہوا۔ اس نے جو پیوند لگا رکھے تھے وہ کچھ کشادہ تھے۔ اس بزرگ نے اس کو اپنے پاس سے دور کر دیا اور اس کی گدڑی ادھیڑ ڈالی۔ اس لئے کہ صفاء کا مطلب تو یہ ہے کہ اصل طبع کو نرم اور مزاج کو لطیف بنایا جائے۔

بلاشبہ طبع کی درشتی اچھی نہیں ہے جس طرح کہ غیر موزوں شعر طبیعت پر گراں گزرتا ہے اسی طرح ناموزوں فعل طبیعت پر گراں ہوتا ہے۔

ایک طبقہ ایسا بھی ہے جس نے لباس کے ہونے یا نہ ہونے میں تکلف نہیں کیا اگر اللہ نے انھیں گدڑی دی تو زیب تن کر لی اگر قبا دی تو بھی پہن لی اور اگر برہنہ رکھا تو برہنگی میں بھی صبر و

شکر کیا۔

سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے اسی مسلک اعتدال کو اختیار کر رکھا ہے اور لباس کے پہننے میں اسی طریقہ کو پسند کرتا ہوں۔

حضرت احمد بن خضرویہ رحمتہ اللہ علیہ جس وقت حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت کو آئے تو وہ قبا زیب تن کیے ہوئے تھے۔ اور جب حضرت شاہ شجاع ابو حفص ملاقات کرنے آئے تو وہ بھی قبا پہنے ہوئے تھے۔ مقررہ لباس ان کے جسم پر نہ تھا کیونکہ وہ اکثر اوقات گدڑی پہنا کرتے تھے اور بسا اوقات وہ پشمینی پیرہن یا سفید قمیض پہن لیا کرتے تھے۔ غرضکہ جو لباس بھی میسر آ جاتا اسی کو زیب تن فرماتے تھے۔ چونکہ آدمی کا نفس عادی اور خو پسند ہوتا ہے۔ جیسی خو اور عادت ڈالی جائے وہ اسی کا غلام ہو جاتا ہے۔ جب نفس کو کوئی عادت پڑ جاتی ہے تو یہ حجاب بن جاتا ہے۔ اسی بناء پر حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا "خیر الصیام صوم اخی داود علیه السلام" "بہترین روزے میرے بھائی حضرت داؤد علیہ السلام کے تھے"۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ وہ کیسے روزے رکھا کرتے تھے؟ آپ نے فرمایا وہ ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن افطار سے رہا کرتے تھے تاکہ نفس کو روزہ رکھنے یا نہ رکھنے کی عادت نہ پڑ جائے اور وہ حجاب نہ بنے۔

یہی عادت حضرت ابو حامد دوستاں مروزی کی تھی کہ ان کو جو لباس بھی مریدین پہنا دیا کرتے تھے وہی پہن لیتے تھے پھر جب کسی کو اس کپڑے کی ضرورت ہوتی تو اتار کر اسے دے دیا کرتے تھے۔ حضرت ابو حامد پہنانے والے سے کچھ دریافت نہ فرماتے کہ کیوں پہنایا اور کیوں اُتارا۔ ہمارے زمانہ میں بھی ایسے بزرگ غزنی میں موجود ہیں جن کا لقب مؤید ہے جو اپنے لئے لباس میں پسندیدگی اور عدم پسندیدگی کو ملحوظ نہیں رکھتے اس لحاظ سے یہ طریقہ درست ہے۔

لباس میں رنگوں کی مصلحت

اکثر سلف صالحین صوفیا کرام کا لباس اس وجہ سے نیلے رنگ کا رہتا تھا کہ وہ اکثر سیر و سیاحت میں رہتے تھے چونکہ سفید لباس حالتِ سفر میں گرد و غبار وغیرہ سے جلد میلا ہو جاتا ہے اور اس کا دھونا بھی دشوار ہوتا ہے اس وجہ کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ نیلگوں رنگ مصیبت زدہ اور غمزدوں کا شعار ہے۔ یہ دنیا چونکہ مصائب و آلام کا گھر اور غم و اندوہ کی خندق اور غم خانہ فراق اور ابتلاء کا گہوارہ ہے۔ جب اہلِ ارادت نے دیکھا کہ اس دنیا میں مقصود بر آری ممکن نہیں تو انھوں نے یہ لباس پہننا شروع کر دیا اور وصل کے غم

میں سوگوار بن گئے۔

صوفیا کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے کہ جب انھیں معاملاتِ تصوف میں قصور اور کوتاہی اور دل میں خرابی کے سوا کچھ نظر نہ آیا اور دنیا میں ضیاع وقت کے سوا کچھ نہ پایا تو سوگواری اختیار کر لی۔ اس لئے کہ وقت ضائع کرنا کسی کی موت سے زیادہ سخت ہے۔ کسی نے اپنے کسی عزیز کی وفات پر سوگ منایا اور کسی نے مقصود کے فوت ہونے پر سوگواری کی۔

کسی مدعی علم نے کسی درویش سے پوچھا یہ سوگواری کیوں اختیار کر رکھی ہے؟ انھوں نے جواب دیا چونکہ رسول اللہ ﷺ نے تین چیزیں چھوڑی ہیں ایک فقر، دوسرا علم، تیسری تلوار۔ تلوار تو بادشاہوں نے لے لی۔ مگر انھوں نے اسے بے محل استعمال کیا۔ اور علم علماء نے اختیار کیا۔ لیکن انھوں نے اس کو صرف پڑھنے پڑھانے تک محدود رکھا۔ اور فقر کو فقراء کے گروہ نے اختیار کر لیا مگر انھوں نے اسے تونگری اور مالداری کا نعم البدل بنا لیا۔ میں نے ان تینوں مصیبتوں پر سوگواری کا یہ لباس اختیار کر رکھا ہے۔

حضرت مرتعش رحمتہ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ وہ ایک دن بغداد کے ایک محلّہ سے گزر رہے تھے کہ انھیں پیاس لگی ایک دروازہ پر جا کر دستک دی اور پانی مانگا ایک عورت پانی کا برتن لے کر حاضر ہوئی انھوں نے پانی لے کر پیا جب پانی پلانے والی پر نظر پڑی تو ان کا دل اس کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو گیا اور وہ وہیں بیٹھ گئے یہاں تک کہ صاحب خانہ باہر آیا اس سے حضرت مرتعش نے کہا اے خواجہ! میرا دل ایک گھونٹ پانی کا پیاسا تھا تمہارے گھر سے جو عورت پانی لے کر آئی اور مجھے پانی پلایا، وہ میرا دل لے گئی ہے۔ صاحب خانہ نے کہا وہ میری بیٹی ہے۔ میں نے اسے تمہارے نکاح میں دیدیا۔ اس کے بعد مرتعش مطلوبہ کی خاطر گھر کے اندر چلے گئے۔ اور اس سے نکاح کر لیا۔ یہ صاحب خانہ امیر آدمی تھا اس نے انھیں حمام بھیجا اور عمدہ لباس پہنا کر گدڑی اتروادی۔ جب رات ہوئی تو حضرت مرتعش نماز میں مشغول ہو گئے اور خلوت میں جا کر درود وظیفہ پڑھنے لگے۔ اسی اثنا میں انھوں نے آواز دی "ھاتوا رقعتی" "میری گدڑی لاؤ۔ لوگوں نے پوچھا کیا ہوا؟ انھوں نے فرمایا ایک غیبی آواز نے مجھ سے کہا کہ اے مرتعش! تم نے ایک نظر ہمارے غیر پر ڈالی تو ہم نے اس کی سزا میں صلاحیت کا لباس اور ظاہر خرقہ اتار لیا اب اگر تم دوسری بار نگاہ ڈالو گے تو ہم تمہارے باطن سے قرب و معرفت کا وہ لباس بھی اتار لیں گے جس کے پہننے سے اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے محبوبوں اور اولیاء کی محبت حاصل ہوتی ہے اور جس پر

برقرار رہنا مبارک ہوتا ہے۔ اگر تم حق تعالیٰ کے ساتھ ایسی زندگی گزار سکتے ہو تو کرو ورنہ تمہیں اپنے دین کی حفاظت کرنی چاہئے اور اولیاء کرام کے لباس میں خیانت نہ کرنی چاہئے تا کہ تم حقیقی اور سچے مسلمان بن سکو اور کوئی دعویٰ نہ کرو۔ یہ اس سے بہتر ہے کہ جھوٹ پر دل کو مائل کیا جائے۔ یہ گدڑی انھیں زیب دیتی ہے جو تارک الدنیا یا سالکِ راہِ حق ہیں۔

تربیت مرید کا طریقہ مشائخ طریقت کی عادت ہے کہ جب کوئی طالب و مرید تارک الدنیا ہو کر ان سے وابستہ ہوتا ہے وہ اسے تین سال تک تین معنی میں مؤدب اور خوگر بناتے ہیں اگر وہ اس میں قائم و مستحکم رہا تو بہتر ہے ورنہ اس سے کہتے ہیں کہ مسلک طریقت میں تمہاری گنجائش نہیں ہے۔ ایک سال تک تو اسے خدمتِ خلق میں مصروف رکھتے ہیں۔ اور دوسرے سال اسے حق تعالیٰ کی خدمت یعنی ریاضت و مجاہدہ کراتے ہیں اور تیسرے سال اپنے دل کی حفاظت کراتے ہیں۔ خلق کی خدمت اس طرح کرائی جاتی ہے کہ وہ خود کو سب کا خادم اور ان کو اپنے مخدوم کی مانند سمجھے مطلب یہ کہ بلا استثنا سب کو اپنے سے بہتر جانے اور ان کی خدمت کو اپنے اوپر واجب جانے۔ اس صورت کی کسی طرح گنجائش نہیں ہے کہ لوگوں کی خدمت کرتے کرتے اپنے آپ کو ان سے بہتر و بالاتر سمجھنے لگو۔ ایسی حالت بادشاہوں اور تونگروں کی ہوتی ہے جو در حقیقت آفتِ زمانی ہے۔

اسی طرح حق تعالیٰ کا حق اس وقت ادا کر سکتا ہے جب وہ دنیا و آخرت کی تمام خواہشوں سے خود کو محفوظ رکھے اور سب سے قطع تعلق کر کے یکسو ہو کر اس کی عبادت میں منہمک رہے۔ کیونکہ جب تک حق تعالیٰ کی عبادت کسی اور شیئی کے لئے کرتا ہے تو وہ گویا اپنی پرستش کرتا ہے نہ کہ خدا کی۔ اور دل کی حفاظت اس وقت کر سکتا ہے جب کہ اپنے دل کو مضبوط کر کے پوری دلجمعی اور تمام غم و افکار سے پاک و صاف کر کے عبادت کے وقت حضور قلب کے ساتھ مشغول ہو۔ جب مریدِ حق کوش میں یہ تینوں خصلتیں پیدا ہو جاتی ہیں تب اس کے لئے گدڑی کا پہننا ضروری ہوتا ہے۔

لیکن جب شیخ کامل اپنے کسی مرید کو گدڑی پہننے کی اجازت مرحمت فرمانے لگے تو اس وقت شیخ کو لازم ہے کہ وہ مرید میں یہ دیکھے کہ یہ اب مستقیم الحال ہو کر طریقت کے تمام نشیب و فراز سے گزر چکا ہے یا نہیں؟ اور یہ کہ اس نے احوال کی لذت اور اعمال کے گھونٹ کی چاشنی چکھ کر قہر جلال اور لطف جمال سے آشنا ہوا ہے یا نہیں؟ نیز شیخ طریقت یہ بھی ملاحظہ فرمائے کہ یہ مرید احوال کی کس منزل تک رسائی حاصل کر سکے گا اور یہ کہ واپس ہونے والوں میں سے ہوگا یا واقع

ہونے والوں یا کاملوں میں سے ہوگا؟ اب اگر اس مرید کے واپس ہونے کا خطرہ ہو تو اسے شروع ہی سے مرید نہ کرے۔ اور اگر درمیاں میں رہ جانے کا اندیشہ ہو تو اسے آگے بڑھانے کی کوشش کرے اور اگر کامیاب ہونے کی توقع ہو تو اس کی تربیت کرے کیونکہ مشائخ طریقت دلوں کے طبیب ہوتے ہیں جب طبیب کو بیمار کی بیماری کی خبر نہیں ہے تو ایسا طبیب بیمار کو ہلاک کر دے گا کیونکہ وہ اس کے معالجہ کو نہیں جانتا۔ خطرے کے مواقع کو نہیں پہچانتا۔ اور مرض کے خلاف غذا و دوا کا استعمال کراتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ "الشیخ فی قومہ کالنبی فی امتی" اپنی قوم میں شیخ ایسا ہوتا ہے جیسے کہ اپنی امت میں نبی۔ انبیاء علیہم السلام نے جو اپنی قوم کو دعوت و تبلیغ فرمائی وہ امت کے حالات سے واقف ہو کر فرمائی۔ اور ان کو بالکل ان کے مزاج کے موافق دوا دی تا کہ دعوت کا مقصد پورا ہو جائے لہٰذا ولایتِ ربانی میں کمال کے لئے ان تین سال کے ریاضت و مجاہدے کے بعد شیخ طریقت اس کی آگے تربیت فرمائے۔ ایسی ریاضت میں جب کامل ہو جائے تو اس وقت گدڑی پہننے کی اجازت دینا مناسب ہوگا۔

گدڑی پہننے کی شرط بالکل کفن پہننے کی شرط کی مانند ہے۔ جس طرح کہ مردہ زندگانی کی لذتوں سے محروم ہو جاتا ہے اور حیاتِ دنیاوی کی خوشیوں سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے اسی طرح جب مرید گدڑی پہن لیتا ہے تو وہ اپنی زندگانی کو حق تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی اور اس کی خدمت میں اپنی تمام زندگی وقف کر دیتا ہے نفسانی خواہشوں سے کنارہ کش ہو جانا ضروری ہو جاتا ہے۔ جب مرید میں یہ کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں تب شیخ طریقت گدڑی پہننے کی اجازت دیتا ہے۔ تا کہ وہ اس کا حق ادا کر سکے اور کسی قسم کی خواہش دل میں نہ لا سکے۔

خلاصہ یہ کہ گدڑی پہننے کے سلسلے میں مشائخ طریقت نے بکثرت ہدایات و اشارات فرمائے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابو عمر اصفہانی رحمۃ اللہ نے اس بابت میں ایک کتاب مستقل تصنیف فرمائی ہے۔ لیکن بناوٹی صوفیوں کو گدڑی پہننے میں بہت اصرار اور غلو ہے چونکہ اس کتاب کا مقصد مشائخ طریقت کے اقوال کا تحریر کرنا نہیں بلکہ سلوک و معرفت کی عقدہ کشائی اور مشکلات کا حل بیان کرنا ہے بایں ہمہ خرقہ پوشی میں سب سے بہتر اشارہ یہ ہے کہ گریبان صبر کا ہو، دونوں آستینیں خوف و امید کی، دونوں دامن قبض و بسط کے، کمر، نفس کے خلاف کرنے اور دو کرسی صحتِ یقین اور فراخی اخلاص سے مرکب ہو۔

اس سے زیادہ عمدہ اشارہ یہ ہے کہ گدڑی کا گریبان محبت کی قباء سے، دونوں آستینیں حفاظت و عصمت سے، دونوں دامن فقر و صفا سے، کمر مشاہدے میں قائم رہنے سے، کرسی بارگاہ

الٰہی میں مامون رہنے سے اور کشادگی مقام وصل میں قرار پانے سے مرکب ہو۔ جب تم نے باطن کے لئے ایسی گدڑی تیار کر لی تو ظاہر کے لئے بھی ایسی ہی گدڑی بنا سکتے ہو۔ اس باب میں میری ایک مستقل کتاب ہے جس کا نام ''اسرار الخرق والمؤنات'' ہے طالب راہ حق کے لئے اس کتاب کا پڑھنا ضروری ہے۔

لیکن جب مرید نے اس گدڑی کو نہ پہنا اور سلطانِ وقت کے قہر و جلال اور غلبہء حال سے ڈر کر اس نے گدڑی کو چاک کر دیا تو اسے مجبور و معذور سمجھنا چاہئے اور جب باختیار و تمیز اس نے گدڑی کو چاک کیا تو طریقت کی شرائط میں سے ہے کہ پھر اس کیلئے واجب ہو گیا کہ وہ گدڑی نہ رکھے اور نہ اسے پہنے۔ اگر اس نے گدڑی رکھی تو گویا وہ ایسا ہے جیسا کہ زمانہ ساز صوفی ظاہر داری میں بغیر صفائے باطن کے گدڑی پہنتے ہیں۔ گدڑی چاک کرنے کی حقیقت یہ ہے کہ جب سالکِ طریقت کا ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف انتقال ہوتا ہے تو وہ اظہار شکر میں لباس سے باہر آ جاتا ہے۔ اس مقام کے لئے اور کپڑے ہوتے ہیں۔ لیکن گدڑی طریقت اور فقر و صفا کے ہر مقام میں ایک جامع اور مکمل لباس ہے۔ اور سب سے باہر آنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر ایک سے کنارہ کش ہو گیا۔ یہ جگہ اس مسئلہ کے بیان کرنے کی نہیں ہے کیونکہ یہ خرقہ اور کشف، حجاب السماع'' میں بیان کرنا چاہئے تھا تاہم میں نے اس جگہ ہی اشارہ کر دیا تا کہ غلط مبحث نہ ہو جائے یہ مسئلہ اپنی جگہ تفصیل سے آئے گا۔

یہ بھی منقول ہے کہ گدڑی پہنانے والے شیخ کو طریقت میں اتنا تصرف و اختیار حاصل ہو کہ جب کسی غیر کو پہنائے تو شفقت و مہربانی کے ساتھ اس کو آشنائے معرفت کر دے اور جب کسی گنہگار کو پہنائے تو اسے اولیاء اللہ کے گروہ میں شامل کر لے۔

ایک مرتبہ میں اپنے شیخ کے ساتھ آذر بائیجان گیا تو خرمنِ گندم میں دو تین گدڑی پوشوں کو کھڑے دیکھا۔ جو گدڑی کے دامن کو پھیلائے ہوئے تھے۔ مزارع نے گندم کے تھوڑے سے دانے ان کی جھولی میں ڈال دیے۔ شیخ نے ان کی طرف متوجہ ہو کر یہ آیہ کریمہ پڑھی۔

اولئك الذين اشترو الضلالة بالهدىٰ فما ربحت تجارتهم وما كانوا مهتدين۔	یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی تو انھیں ان کی تجارت نے نفع نہ دیا۔ اور وہ ہدایت یافتہ نہ ہوئے۔

میں نے عرض کیا اے شیخ یہ لوگ کس بنا پر اس بے عزتی میں مبتلا ہیں کہ برسرِ عام ذلیل و خوار ہوتے ہیں؟ شیخ نے فرمایا ان کے پیروں کو مریدوں کے جمع کرنے کا لالچ ہے اور ان

مریدوں کو دنیاوی مال جمع کرنے کی ہوس ہے۔ کسی کی حرص دوسرے کی حرص سے بہتر نہیں ہے۔ اور بغیر امرِ حق دعوت دینا خواہشات کی پرورش کرنا ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے باب الطلق کے بازار میں ایک آتش پرست کو دیکھا جو نہایت حسین و خوبصورت تھا میں نے بارگاہِ الٰہی میں مناجات کی کہ خدایا اسے میری طرف پھیر دے۔ تو نے اسے کتنا خوبصورت پیدا کیا ہے۔ کچھ عرصہ بعد وہ آتش پرست میرے پاس آیا اور مجھ سے کہنے لگا اے شیخ! مجھے کلمہء شہادت پڑھائے اور مسلمان کر کے درجہء ولایت پر فائز کیجئے۔

حضرت شیخ ابو علی صباح سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ گدڑی پہننا کسے درست ہے۔ انھوں نے جواب دیا اس شخص کے لئے ہے جو خدا کی ساری مملکت میں مشرف ہوتے ہوئے بھی سارے جہان کے کوئی حکم اور کسی حالت سے بے خبر نہ ہو۔

گدڑی صالحین کی نشانی، نیکوں کی علامت اور فقراء و صوفیا کا لباس ہے۔ اور فقر و صفائی کی حقیقت کا بیان پہلے گذر چکا ہے اب اگر کوئی اولیاء کرام کے لباس کو دنیا جمع کرنے کا ذریعہ بنائے اور اس لباس کو اپنی معصیت کا سبب بنائے تو اس لباس کے جو اہل ہیں ان کا کوئی زیادہ نقصان نہیں ہوتا۔ ہدایت کے لئے اس قدر کافی ہے۔ و باللہ التوفیق۔

پانچواں باب

فقر و صفوت کے معانی میں اختلاف مشائخ عظام

طریقت کے اہل علم مشائخ عظام کا فقر و صفوت کی تفصیل میں اختلاف ہے۔ ایک جماعت فرماتی ہے کہ بہ نسبت صفوۃ کے فقر زیادہ کامل ہے اور ایک جماعت کہتی ہے کہ بہ نسبت فقر کے صفوۃ زیادہ کامل ہے۔ پہلے گروہ کا استدلال یہ ہے کہ فقر چونکہ فنائے کل اور انقطاع اسرار کا نام ہے اور صفوت اس کے مقامات میں سے ایک مقام ہے جب فنائے کل حاصل ہو جاتا ہے تو تمام مقامات ناپید ہو جاتے ہیں یہ مسئلہ فقر و غنا کی طرف رجوع کرتا ہے۔ پہلے اس کا بیان کیا جا چکا ہے۔ اور دوسری جماعت کا استدلال یہ ہے کہ چونکہ فقر ایک شئے موجود ہے جس کا نام بھی ہے اور صفوت اس حالت کا نام ہے جو تمام موجودات سے پاک و صاف ہو۔ اور یہ کہ صفا عینِ فنا ہے اور فقر عین بقا۔ لہٰذا فقر اس کے مقامات میں سے ایک مقام کا نام ہے اور صفوت اس کے کمالات میں سے ایک کمال کا نام۔ اس مسئلہ میں طویل بحث ہے۔ موجودہ زمانے میں ہر شخص تعجب خیز باتیں کرتا ہے اور ایک سے ایک بڑھ کر حیرت انگیز گفتگو کرتا ہے حالانکہ فقر و صفوت کی تفصیل و تقدیم میں اختلاف ہے۔ محض باتیں ہی بنانا باتفاق نہ فقر ہے نہ صفوت۔ بعض نے بیان کو مذہب بنا کر اس پر طبع آرائی اور نکتہ سنجی شروع کر دی اور ادراک معانی سے طبیعت کو خالی کر کے حق بات کو چھوڑ دیا اور خواہشات کی نفی کو عینِ نفی اور اثبات مراد کو عینِ اثبات کہنے لگے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی خواہشات نفسانی کے قیام میں موجود و مفقود اور منفی و مثبت میں محو ہو کر رہ گئے ہیں (حالانکہ ان مدعیوں کی طریقت لغویات سے پاک و صاف ہے۔)

الغرض اولیاء کرام اس مقام تک فائز ہوتے ہیں جہاں کوئی مقام نہیں رہتا اور درجات و مقامات سب کے سب فنا ہو جاتے ہیں اور ان معانی کو الفاظ کا جامہ ہرگز نہیں پہنایا جا سکتا۔ چنانچہ اس وقت نہ پینا رہتا ہے نہ لذت، نہ ممتنع، نہ قہر، نہ ہوش نہ بیہوشی ہر شخص اس کیفیتِ معانی کو ایسے ناموں سے تعبیر کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے نزدیک بزرگ تر ہوں۔ اس بنیاد پر تقدیم و تاخر کرنا اور اعلیٰ ادنیٰ کہنا جائز نہیں ہے کیونکہ تقدیم و تاخیر اور اعلیٰ و ادنیٰ تو مسمیات و موجودات کے لئے ہے۔ لہٰذا کسی جماعت کو اسمِ فقر، مقدم و افضل معلوم ہوا اور ان کے نزدیک یہی نام بزرگ تر اور مشرف معلوم ہوا کیونکہ اس سے منسوب کرنا شکستگی و تواضع کا مقتضی ہے۔ اور کسی

جماعت کو صفوت مقدم و افضل معلوم ہوا انھیں یہی نام اچھا لگا کیونکہ اس سے علاقہ رکھ کر کدورتیں دور ہوتی ہیں اور فنا و آفات قریب ہو جاتے ہیں اور چونکہ ان کی مراد و مقصود کا اظہار ان ہی دونوں ناموں سے ہو سکتا تھا (اس لئے ہر ایک نے ایک ایک نام منتخب کر لیا ورنہ) ان معانی کے نشان و علامات ان تعبیرات سے جدا تھے۔ یہ نام اختیار کرنے کی اس لئے ضرورت پیش آئی کہ باہم ان اشارات میں بات کر سکیں۔ اور اپنے کشفِ ذاتی کو ان ناموں کے ذریعہ بیان کر سکیں۔ اس طبقہ کو اس سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ کہ خواہ وہ اس معنی کو فقر سے تعبیر کریں یا صفوت سے۔ دوسرے یہ کہ تعبیر کرنے والے صاحبِ زبان لوگ چونکہ ان کے معانی سے ناآشنا اور بے خبر ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ لفظی بحثوں میں الجھ کر رہ گئے کسی نے کسی کو مقدم و افضل جانا اور کسی نے کسی کو؟ حالانکہ یہ دونوں تعبیرات ہیں نہ کہ اصل و حقیقت۔ لہٰذا اہل حق تو معانی کی تحقیق اور حقیقت و معرفت کی تلاش میں منہمک رہے اور یہ لوگ تعبیرات کی تاریکیوں میں الجھ کر رہ گئے۔ خلاصہ یہ کہ جب کسی کو معنی حاصل ہو جائیں اور وہ اسے دل کا قبلہ بنا لے تو ایسے درویش کو خواہ فقیر کہو خواہ صوفی۔ دونوں نام اضطراری ہیں اہل معرفت ناموں کے چکر میں نہیں پڑتے۔

یہ اختلاف حضرت ابوالحسن سمنون باز رحمۃ اللہ علیہ کے وقت سے چلا آ رہا ہے۔ کیونکہ وہ جب ایسے کشف میں ہوتے جو بقا سے تعلق رکھتا ہے تو فقر کو صفوت پر مقدم و افضل کرتے تھے جسے اس وقت کے اربابِ معانی و اہلِ معرفت جو سمجھے تھے انھوں نے ان سے دریافت کیا کہ ایسا کیوں ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ جب طبیعت کو فنا و نگونساری میں لطف تام حاصل ہوتا ہے اور بقا و علوی میں بھی۔ تو اس وقت جب ایسے مقام میں ہوتا ہوں جو فنا سے تعلق رکھتا ہے تو صفوت کو فقر پر افضل کہتا ہوں اور جب ایسے مقام پر ہوتا ہوں جس کا تعلق بقا و علو سے ہو تو فقر کو صفوت پر مقدم و افضل کہتا ہوں کیونکہ فقر بقا ہی کا نام ہے اور صفوت فنائے کل کا۔ اس طرح خود سے بقا کی رویت کو فنا کرتا ہوں اور فنا میں خود سے فنا کی رویت کو فنا کر دیتا ہوں، تا کہ اپنی طبیعت فنا سے بھی فانی ہو جائے اور بقا سے بھی فانی۔!

یہ رموز لفظی اعتبار سے عمدہ ہیں لیکن فنا کو فنا نہیں ہوتی اور بقا کو بھی فنا نہیں ہے۔ کیونکہ وہ باقی جو فانی ہو وہ تو از خود فانی ہوتا ہے اور جو فانی کے باقی ہو وہ از خود باقی ہوتا ہے۔ اور فنا نام ہی اس حالت کا ہے جس میں مبالغہ محال و ممتنع ہو یہ اس لئے ہے کہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ فنا ہو گیا۔ کیونکہ یہ کہنا اس معنی کے اثرِ وجود کی نفی سے مبالغہ کرنا ہوگا۔ کہ فنا میں کوئی اثرِ وجود رہ گیا ہے جو ابھی فنا نہیں ہوا۔؟ حالانکہ جب فنا حاصل ہو گئی تو فنا کی سوا کچھ نہ ہوگی۔ ایسا کہنا بجز عبارت میں بے معنی تعجب

خیزی کے اور کچھ نہیں ہے۔

اہلِ زبان کی یہ لغویات ہیں۔ جو مفہوم و مراد کی تعبیر کے وقت پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ اور ہمارا بقا وفنا لکھنا کلام کی اسی جنس سے تعلق رکھتا ہے جو بچپنے کی خواہش اور احوال کی تیزی کے وقت ہوتا ہے جس کا احتیاطاً ہم نے کچھ تذکرہ کر دیا ہے۔

فقر و صفوت کے درمیان معنوی فرق ہے لیکن معاملات کے اعتبار سے فقر و صفوت دنیا سے کنارہ کشی کا نام ہے۔ اور یہ کنارہ کشی بجائے خود ایک چیز ہے اور اس کی حقیقت فقر و مسکینی میں مضمر ہے۔

فقر و مسکینی کا فرق

مشائخ کی ایک جماعت کہتی ہے کہ مسکینی سے فقیری افضل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللّٰہ لا یستطیعون ضربا فی الارض الآیۃ	یہ ان فقراء کے لئے ہے جو راہِ خدا میں روکے گئے اور وہ زمین میں پھرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔

یہ افضلیت اس لئے ہے کہ مسکین صاحبِ مال ہوتا ہے اور فقیر تارکِ مال۔ اور یہ کہ فقیر عزیز ہوتا ہے اور مسکین حقیر۔ اور یہ کہ طریقت میں صاحبِ مال ذلیل ہوتا ہے کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے "درہم و دینار اور نئے پرانے کپڑے والوں کو کمینہ سمجھ" اسی لئے مال و دولت سے کنارہ کشی کرنے والے عزیز ہیں کیونکہ تونگر کو مال پر اعتماد ہوتا ہے اور تہی دست کو خدا پر توکل ہوتا ہے۔

مشائخ طریقت کی ایک جماعت کا نظریہ مسکینی ہے اس لئے کہ حضور ﷺ نے اپنی دعا میں اس کی مناجات کی ہے۔

اللھم احینی مسکینا و امتنی مسکینا واحشرنی فی زمرۃ المساکین۔	اے خدا مجھے مسکین زندہ رکھ اور مسکینی کی موت دے اور مسکینوں میں حشر فرما۔

رسول اللہ ﷺ نے جب فقر کو یاد فرمایا تو اس طرح ارشاد فرمایا

کاد الفقر ان یکون کفراً۔	بسا اوقات فقیری کفر میں مبتلا کر دیتی ہے

یہ فرق اس لئے ہے کہ فقیر وہ ہے جو سبب سے تعلق رکھتا ہے اور مسکین وہ ہوتا ہے جو اسباب سے ترک تعلق کر لے۔ شریعت میں فقہاء کی ایک جماعت کے نزدیک فقیر وہ ہوتا ہے جو

ایک وقت کا کھانا رکھتا ہو اور مسکین وہ ہے جو یہ بھی نہ رکھے۔ اور ایک جماعت کے نزدیک مسکین وہ ہے جو صاحبِ توشہ ہو اور فقیر وہ ہے جو یہ بھی نہ رکھے۔ اسی لحاظ سے اہلِ طریقت مسکین کو صوفی کہتے ہیں یہ اختلاف، فقہا کے اختلاف کے مطابق ہے۔ جن کے نزدیک فقیر وہ ہے جو کچھ نہ رکھے اور مسکین وہ ہے جو ایک وقت کا توشہ رکھے ان کے نزدیک صفوت سے فقر افضل ہے۔ صفوت و فقران کے اختلاف کا بیان برسبیل اختصار ہے واللہ اعلم بالصوّاب۔

ملامتی طبقہ

مشائخ طریقت کی ایک جماعت نے ملامت کا طریقہ پسند فرمایا ہے۔ کیونکہ ملامت میں، خلوص ومحبت کی بہت بڑی تاثیر اور لذت کامل پوشیدہ ہے اور اہلِ حق مخلوق کی ملامت کے لئے مخصوص ہیں۔ خاص کر بزرگانِ ملّت اور رسولِ خدا ﷺ ۔ کہ آپ اہلِ حق کے مقتداء و امام ہیں۔ آپ سے قبل بھی تمام محبوبانِ خدا پر جب تک برہانِ حق نازل نہیں ہوئی اور ان کو وحی سے سرفراز نہیں کیا گیا تھا اس وقت مخلوقِ خدا میں وہ نیک نام اور بزرگ سمجھے جاتے تھے مگر جب ان کے فرق مبارک پر دوستی کی خلعت رکھی گئی تو خلق نے ان کے حق میں زبانِ ملامت دراز کردی۔ چنانچہ کسی نے کاہن، کسی نے شاعر، کسی نے مجنوں اور کسی نے کاذب تک کہا۔ (نعوذ باللہ من ھٰذہ الخرافات)

اللہ تعالیٰ نے اہلِ حق اور مومنین کی تعریف میں فرمایا ہے۔

ولا یخافون لومۃ لائم ذالک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشآء واللّٰہ واسع علیم ○	بفضل خدا یہ زبان درازوں کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔ وہ جسے چاہے عطا فرمائے اور اللہ کا علم وسیع ہے۔

حق تعالیٰ کا دستور ایسا ہی ہے کہ جس نے حق کی بات منہ سے نکالی سارے جہان نے ملامت کی۔ کیونکہ ایسے بندے کے اسرار، ملامت میں مشغول ہونے کے باعث مخفی رہتے ہیں۔ یہ حق تعالیٰ کی غیرت ہے کہ وہ اپنے دوستوں کو دوسروں کے دیکھنے سے محفوظ رکھتا ہے تاکہ ہر شخص کی آنکھ اس کے دوست کے جمالِ حال پر نہ پڑے۔ اور بندے کو اس سے بھی محفوظ رکھتا ہے کہ وہ اسے دیکھنے کی کوشش کرے اور وہ خود بھی اپنا جمال نہ دیکھ سکے۔ کیونکہ وہ غرور اور تکبر کی مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے خلق کو ان پر ملامت کے لئے مقرر فرمایا اور نفسِ لوامہ (ملامت کرنے والی خصلت) کو ان کے اور پنہاں کر دیا تاکہ وہ جو بھی کرے وہ اس پر ملامت کرتا رہے۔ اگر وہ بدی کرے تو اسے بدی پر ملامت کرے اور اگر نیکی کرے تو کوتاہی پر۔ راہِ خدا میں یہی وہ اصل قول ہے جس میں کوئی آفت اور حجاب نہیں ہے۔ اور طریقت میں جو دشوار تر ہے اس لئے کہ بندہ اپنے آپ کسی غرور میں نہ پھنس جائے۔

عجب و غرور کی بنیاد

عجب و غرور دراصل دو چیزوں سے پیدا ہوتا ہے (۱) خلق کی عزت افزائی اور ان کی مدح وستائش سے اور دوسرا یہ کہ اپنے ہی افعال پر خوش ہونے سے۔ اول صورت میں لوگ چونکہ بندے کے افعال کو پسند کرنے لگتے ہیں اور اس پر اس کی مدح وستائش کرتے ہیں اس لئے انسان میں غرور پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسرے انسان کو اپنی برائیوں میں بھی حسن نظر آتا ہے اس لئے وہ غرور وخود پرستی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اپنے دوستوں پر ان دروازوں کو بند کر دیتا ہے۔ تا کہ ان کے معاملات اگرچہ نیک ہوں پھر بھی اس کو اپنی طاقت وقوت کے مقابلہ میں ہیچ ہی نظر آتا ہے اور وہ اسے پسند نہیں کرتا۔ جس کی بنا پر غرور سے محفوظ رہتا ہے۔ لہٰذا ہر شخص جو پسندیدۂ حق ہو گا خلق اسے پسند نہیں کرے گی اور جو اپنے جسم کو ریاضت ومجاہدے کے ذریعہ مشقت میں مشغول رکھے گا حق تعالیٰ اسے تکلیف نہیں دے گا۔ چنانچہ شیطان کو باوجودیکہ خلق نے پسند کیا اور فرشتوں نے بھی مانا اور اس نے خود بھی اپنے آپ کو پسند کیا مگر چونکہ حق تعالیٰ نے اسے پسند نہیں فرمایا اسی لئے یہ سب کچھ اس کے لئے لعنت کا سبب بن گیا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو نہ فرشتوں نے پسند کیا نہ ابلیس ملعون نے اور نہ انھوں نے خود ہی اپنے آپ کو پسند کیا مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو پسند فرمایا۔ فرشتوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "اتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفك الدماء" "اے خدا کیا تو زمین میں ایسے کو خلیفہ بناتا ہے جو اس میں فساد کرے گا اور خونریزی کرے گا۔) ابلیس ملعون نے کہا "انا خیر منه خلقتنی من نار و خلقته من طین" میں آدم سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے بارے میں کہا "ربنا ظلمنا انفسنا" اے ہمارے رب ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا۔ لیکن جب حق تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو پسند فرمایا تو ان کے حق میں فرمایا۔ "فنسی ولم نجدلهٗ عزما" "تو ان سے بھول ہو گئی ہم نے ان کی طرف سے ارادۃً نافرمانی نہ پائی۔ اس طرح حضرت آدم علیہ السلام کو خلق کی ناپسندیدگی کا ثمرہ، خدا کی رحمت کی شکل میں مل گیا تا کہ کائنات ہی کی مخلوق جان لے کہ ہمارا مقبول خلق کا مہجور ہوتا ہے اور جو خلق کا مقبول ہو وہ ہمارا مہجور ہوتا ہے۔ اور یقینی طور پر سب کو پتہ چل جائے کہ خدا کے دوستوں کی غذا خلق کی ملامت ہوتی ہے کیونکہ اس میں قبولیت کے آثار ہیں۔ اولیاء اللہ کا مذہب ہے کہ ملامت ہی قرب واختصاص کی نشانی ہے۔ جس طرح لوگ قبول خلائق سے خوش ہوتے ہیں اسی طرح وہ ملامت سے بھی خوش رہتے ہیں۔

حدیث قدسی میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بواسطہ حضرت جبریلؑ اللہ تعالےٰ کا ارشاد

نقل فرمایا کہ "اولیائی تحت قبائی لا یعرفھم غیری الا اولیائی" "میرے اولیاء میری رحمت کی چادر میں ہوتے ہیں جنھیں میرے ساتھ میرے اولیاء ہی پہچانتے ہیں۔

ملامت کی قسمیں ملامت کی تین قسمیں ہیں ایک یہ کہ وہ سیدھا چلے۔ دوسرے یہ کہ وہ قصد کرے تیسرے یہ کہ وہ ترک کرے۔ پہلی قسم کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص کام کرتا ہے اور امور دینیہ میں کامل احتیاط برتا ہے اور معاملات میں مراعات سے کام لیتا ہے مگر خلق پھر بھی اس پر ملامت کرتی ہے۔ کیونکہ لوگوں کی یہ عام عادت ہے۔ مگر وہ شخص کسی کی پروا نہیں کرتا۔ دوسرے یہ کہ کوئی شخص لوگوں میں صاحبِ عزت و شرف ہونے کے ساتھ ان میں مشہور بھی ہو اور اس کا دل عزت کی طرف مائل بھی ہو اس کے باوجود وہ یہ چاہے کہ ان سے جدا ہو کر یادِ الٰہی میں محو ہو جائے اور قصداً ایسی راہ اختیار کرے جس سے مخلوق اس پر ملامت کرے اور ایسے عمل سے شریعت میں بھی خلل نہ واقع ہو مگر لوگ اس سے نفرت کرنے لگیں اور اس سے متنفر ہو کر جدا ہو جائیں۔ اور تیسری قسم یہ ہے کہ دل میں تو کفر و ضلالت سے طبعی نفرت بھری ہو۔ بظاہر شریعت کی متابعت نہ کرے اور خیال کرے کی ملامتی طریقہ پر ایسا کر رہا ہوں۔ اور یہ ملامت کا طریقہ اسکی عادت بن جائے۔ اس کے باوجود وہ دین میں مضبوط اور راست رو ہو۔ لیکن ظاہر طور پر بغرض ملامت، نفاق وریا کے طور و طریق پر دین کی خلاف ورزی کرے۔ اور مخلوق کی ملامت سے بےخوف ہو وہ ہر حال میں اپنے کام سے کام رکھے خواہ لوگ اسے جس نام سے چاہیں پکاریں۔

حکایت حضرت شیخ ابو طاہر حرانی رحمتہ اللہ علیہ ایک دن گدھے پر سوار بازار سے گزر رہے تھے ایک مرید لگام تھامے ہوئے تھا۔ کسی نے پکارا دیکھو یہ پیر زندیق آ رہا ہے۔ جب مرید نے یہ بات سنی تو اس کی ارادت و غیرت نے جوش مارا اور اسے مارنے کے لئے دوڑا بازار والے جوش میں آ گئے حضرت شیخ نے مرید کو آواز دی اور فرمایا اگر تم نے خاموشی اختیار کی تو ایک نصیحت آموز چیز دکھاؤں گا۔ تاکہ تم اس سختی سے باز رہو۔ مرید خاموش ہو گیا جب قیام گاہ پر واپس آئے تو مرید سے فرمایا فلاں صندوق اٹھا لاؤ۔ وہ لایا اس میں بکثرت خطوط تھے جن کو لوگوں نے حضرت شیخ کے نام لکھے تھے۔ انھوں نے ان کو نکالا اور مرید کے آگے رکھ کر فرمایا پڑھو کیا لکھا ہے جن لوگوں نے خطوط بھیجے تھے انھوں نے ان میں ہر نامہ پر القاب میں کسی نے شیخ الاسلام، کسی نے زکی کسی نے شیخ زاہد، کسی نے شیخ الحرمین وغیرہ لکھا تھا۔ شیخ نے فرمایا یہ سب القاب و خطاب ہیں میرا نام نہیں ہے۔ حالانکہ میں کچھ بھی نہیں ہوں ہر شخص نے اپنے اعتقاد کے بموجب مجھ سے

تخاطب کیا ہے۔ اگر اُس بیچارے نے اپنے اعتقاد کے بموجب کوئی بات کہہ دی اور کوئی القاب دیئے تو بگڑنے یا ناراض ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس طرح اگر ملامت میں قصداً کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہے اور عزت و منزلت اور اس جاہ و حشم کے چھوڑنے کا ارادہ کرے جس کے وہ لائق ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ۔

حکایت ایک دن امیر المومنین سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کھجوروں کے باغ سے اس حال میں تشریف لا رہے تھے کہ لکڑیوں کا گٹھا آپ کے سر مبارک پر رکھا ہوا تھا حالانکہ آپ چار سو غلام رکھتے تھے۔ کسی نے عرض کیا اے امیر المومنین یہ کیا حال ہے؟ آپ نے فرمایا ''اریـد ان اجرب نفسی'' ''میں نے چاہا کہ اپنے نفس کا تجربہ کروں۔ اگرچہ یہ کام میرے غلام بھی کر سکتے تھے مگر میں نے چاہا کہ اپنے نفس کی آزمائش کروں تاکہ لوگوں میں جو رتبہ ہے اس کی وجہ سے یہ نفس کسی کام سے مجھے باز نہ رکھے!

یہ اثرِ صحابہ، اثباتِ ملامت میں واضح اور صریح ہے۔ اسی معنی میں ایک اور واقعہ ہے جو حضرت امام اعظم سیدنا ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ سے منسوب ہے اس کا تذکرہ امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے بیان میں آئے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت ابو یزید بسطامی رحمہ اللہ کا واقعہ ہے کہ وہ حج کر کے واپس آ رہے تھے۔ کسی شہر میں غلغلہ بلند ہوا کہ حضرت بایزید آ رہے ہیں اس شہر کے تمام لوگ استقبال کے لئے نکل آئے کہ اعزاز و اکرام کے ساتھ اپنے شہر میں لائیں حضرت بایزید نے لوگوں کی خاطر مدارت کو ملاحظہ فرمایا تو ان کا دل بھی مشغول ہو گیا اور وہ یادِ حق سے باز رہنے میں پریشان خاطر ہو گئے۔ جب بازار میں آئے تو قبا کی آستین سے ایک روٹی نکال کر وہیں کھانے لگے۔ یہ دیکھ کر تمام لوگ ان سے برگشتہ ہو گئے اور انہیں تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ چونکہ یہ واقعہ رمضان المبارک میں ہوا تھا اور خود چونکہ مسافر تھے (اور مسافر کو روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے) اس وقت اپنے ہمراہی مرید سے فرمایا دیکھا شریعت کے ایک مسئلہ میں لوگوں نے مجھے کاربند نہ دیکھا تو سب چھوڑ کر چلے گئے۔

سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اُس زمانہ میں ملامت کی روش اختیار کرنے کے لئے کسی زبوں عمل کرنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ اور ایسی بات ظاہر کرنی پڑتی تھی جو عوام کے منشاء و مزاج کے خلاف ہو۔ لیکن آج اگر کوئی چاہے کہ اسے ملامت کی جائے تو دو رکعت نفل شروع کر کے اس کو خوب طول دے دے یا پورے دین کی مکمل پیروی شروع کر دے تاکہ تمام لوگ اسے ریاکار اور منافق کہنے لگیں۔

لیکن جو ترک کے طریقہ پر ملامت اختیار کرے۔ اور کوئی کام خلاف شریعت کر کے یہ کہے کہ یہ عمل میں نے حصولِ ملامت کے لئے کیا ہے تو یہ کھلی ہوئی ضلالت و گمراہی ہے۔ ظاہری آفت اور سچی ہوس پرستی ہے۔ کیونکہ آج کل ایسے لوگ بکثرت ہیں جو ردِ خلق کی صورت میں قبولِ خلق کے خواستگار رہیں۔ اس لئے اس کی ضرورت ہے کہ وہ پہلے خلق میں مقبول ہوں پھر اپنے کسی فعل سے اس کی نفی کر دیں تا کہ لوگ انھیں مردود قرار دیں۔ نامقبول شخص کے لئے رد کرنے کا قصد کرنا قبولیت کے لئے ایک بہانہ ہوتا ہے۔

سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھے مدعیان باطل کی مجلس میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ ان میں سے ایک آدمی سے کوئی نازیبا حرکت سرزد ہوگئی۔ مگر اس نے یہ عذر کیا کہ میرا یہ عمل ملامت کے لئے تھا۔ اس پر کسی نے کہا۔ عذر و بہانہ بیہودہ ہے۔ میں نے اسے دیکھا کہ غیظ و غضب سے اس کا سانس پھول گیا ہے۔ تب میں نے اس سے کہا اے شخص! اگر ملامت میں تیرا دعویٰ درست تھا تو اس آدمی کے اعتراض پر چیں بجبیں ہونا کیا معنی؟۔ یہ تو تیرے مذہب کو مضبوط کرتا ہے۔ جب وہ تیرے ساتھ تیری راہ میں موافقت کرتا ہے تو تیرا اس سے جھگڑا ہی کیا۔؟ تجھے کیوں غصہ آتا ہے۔ اور جو شخص امرِ حق کی دعوت دے اس کے لئے دلیل و حجت درکار ہے اور وہ دلیل رسول اللہ ﷺ کی سنت کی حفاظت ہے۔ جب میں ظاہر میں تجھے فرائض کا تارک دیکھتا ہوں حالانکہ تو لوگوں کو اس کی طرف بلانا چاہتا ہے تو تیرا یہ عمل تجھے اسلام کے دائرے سے باہر کر دیتا ہے۔

لطائف در ملامت

واضح رہنا چاہئے کہ طریقت میں ملامتی مذہب کو شیخ زمانہ حضرت ابو حمدون قصار رحمہ اللہ نے پھیلایا ہے۔ ملامت کے سلسلے میں ان سے بکثرت لطیف باتیں منسوب ہیں چنانچہ ان کا ایک قول یہ ہے کہ "الملامة ترك السلامة" سلامتی سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا نام ملامت ہے۔ جب کوئی شخص قصداً سلامتی کے ترک کا دعویٰ کرتا اور بلاؤں میں خود کو مبتلا کر کے عیش و راحت اور خوش ذائقہ چیزوں کو چھوڑتا ہے تو اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ جلالت کا ظہور ہو اور اس کی امید بر آئے اور لوگ اس کی عادت سے بیزار ہو کر اس سے دور ہو جائیں اور اس کی طبیعت لوگوں کی محبت سے خالی ہو جائے۔ اس حال میں جس قدر وہ خود کو گھلائے گا اتنا ہی وہ حق سے واصل ہو گا۔ اور جس سلامتی کی طرف لوگ رغبت کرتے اور اس کی طرف مائل ہوتے ہیں یہ اس

سلامتی سے اتنا ہی نفرت و بیزاری کرتا ہے۔اس طرح ایک دوسرے کے عزائم میں تضاد و تقابل پیدا ہو جاتا ہے۔اور وہ اپنی صفتوں میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

احمد بن فاتک حسین بن منصورؒ سے روایت کرتے ہیں کہ کسی نے ان سے پوچھا صوفی کون ہیں؟ انھوں نے فرمایا ''واجدو الذات'' یعنی وہ لوگ ہیں جنھوں نے ذات باری تعالیٰ کو پالیا۔

نیز حضرت ابوحمدونؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ صوفی کون ہیں تو آپ نے یہ فرمایا یہ راستہ عام لوگوں کے لئے بہت دشوار اور تنگ ہے۔لیکن اتنا بتائے دیتا ہوں کہ ''رجاء المرجیۃ و خوف القدریۃ'' مرجیوں کی امید اور قدریوں کا خوف ملامتیوں کی صفت ہے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ ملامتیوں کی طبیعت کسی امر سے اتنی نفرت نہیں کرتی جتنی لوگوں میں عزت و منزلت پانے سے انھیں نفرت ہوتی ہے۔انسان کی خصلت ہے کہ وہ لوگوں کی تعریف و توصیف سے بہت زیادہ خوش ہوتا ہے اور پھولا نہیں سماتا۔اسی بنا پر وہ قربِ الٰہی سے دور تر ہی ہو جاتا ہے۔خوف خدا رکھنے والا شخص ہمیشہ یہی کوشش کرے گا کہ خطرے کی جگہ سے دور رہے کیونکہ اس میں اس کے لئے دو خطرے لاحق ہوتے ہیں۔ایک یہ کہ وہ حق تعالےٰ سے حجاب میں نہ آ جائے۔دوسرا یہ کہ وہ ایسا فعل کرنے سے بچے جس سے لوگ گنہگار ہوں۔اور اس پر طعن و تشنیع کرنے لگیں۔ان کا یہ مقصود نہیں ہوتا کہ ان میں عزت پانے سے راحت محسوس کریں اور نہ یہ کہ ملامت کرنے سے انھیں گنہگار بنائیں۔اس لئے ملامتی کو سزاوار ہے کہ پہلے دنیاوی جھگڑوں اور لوگوں کی اُخروی علاقوں سے خود کو جدا کرے اس کے بعد لوگ اسے کچھ بھی کہیں؟ دل کی نجات کے لئے ایسا فعل کرے جو شریعت میں نہ گناہِ کبیرہ ہو نہ صغیرہ۔تاکہ لوگ اس سے برگشتہ ہو کر اسے چھوڑ دیں یہاں تک احتیاط برتے کہ معاملات میں اس کا خوف، قدریوں کے خوف کی مانند ہو۔اور معاملہ کنندگان سے ایسی امید رکھے جیسے مرجیہ امید رکھتے ہیں۔حقیقت میں ملامت سے بہتر کسی چیز سے محبت و دوستی نہ ہو۔اس لئے کہ دوست کی ملامت کا' دوست کے دل پر اثر نہ ہوگا اور دوست کا گزر، دوست کی گلی ہی میں ہوگا اور دوست کے دل میں اغیار کا خطرہ نہ ہوگا۔جب ایسی حالت ہو جائے گی تو اپنی خواہش میں ملامت کی سب سے بڑھ کر لذت پائیں گے۔اس لئے کہ ملامت چمن عاشقاں، نزہت محباں، راحت مشتاقاں، سرور مریداں کا نام ہے۔یہ لوگ دل کی سلامتی کی خاطر جن و انس کا ہدف ملامت بننا پسند کرتے ہیں۔اور کوئی مخلوق' خواہ وہ

مقربوں میں سے ہو یا کروبیوں میں سے یا روحانیوں میں سے، اُن کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتی۔ گزشتہ امتوں کے زہاد اور عباد اور سالکان وطالبان حق میں سے بھی کوئی ان کے رتبہ تک نہیں پہنچا۔ بجز اِس امت کے اُن حضرات کے جو طریقت کے سالک ہیں اور دل کو منقطع کر چکے ہیں، سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک ملامت کی خواہش عین ریا ہے اور ریا کاری عینِ نفاق ہے۔ اس لئے کہ ریا کار قصداً ایسی راہ پر چلتا ہے جس سے وہ مخلوق میں مقبول ہو۔ اور ملامتی بھی قصداً ایسی روش اختیار کرتا ہے جس سے لوگ اس سے نفرت کریں۔ یہ دونوں طبقے خلق ہی میں سرگرداں رہتے ہیں۔ ان سے گزرنے کی انھیں راہ ہی نہیں ملتی۔ ایک اس راہ پر ہو لیا دوسرا دوسرے راستے پر۔ حالانکہ درویش کے دل میں مخلوقات کے گزر کی گنجائش کہاں؟ جب دل کے آئینہ سے خلق کی تصویر محو ہو چکی ہو تو وہ دونوں راستوں سے جدا ہو جاتا ہے۔ (یعنی نہ ریا کاری رہتی ہے اور نہ نفاق کا خطرہ) اور وہ کسی چیز میں گرفتار نہیں رہتا۔

ایک دن ماوراء النہر میں ایک ملامتی سے ملاقات ہوئی۔ جب وہ خوش ہوا تو اسی لمحہ میں نے پوچھا اے بھائی! ان افعالِ بد سے تیری کیا مراد ہے؟ اس نے جواب دیا لوگوں سے گلو خلاصی میں نے دل میں خیال کیا کہ یہ مخلوق تو بہت ہے اور تیری عمر تھوڑی ہے ان سب سے اپنا پیچھا چھڑانا دشوار ہے۔ اگر تو خلقت سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتا ہے تو ان سب کو چھوڑ دے تا کہ ان سب کی مصروفیتوں سے خود کو محفوظ رکھ سکے۔

ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو خلقت میں مشغول ہوتے ہوئے بھی سمجھتا ہے کہ لوگ خود ہی ان کی طرف متوجہ ہیں۔ اور کوئی تجھ کو نہیں دیکھتا اب تو خود اپنے آپ کو مت دیکھ۔ جب تیرے حال پر مصیبت تیری اپنی ہی نظر سے ہے تو تجھے غیر سے کیا سروکار۔ اگر کسی کو پرہیز سے شفا حاصل ہو جائے تو مداوائے غذائی حاصل کرنا مردانگی نہیں ہے۔

ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو ریاضت کے لئے نفس کو ملامت کرتا ہے۔ تا کہ خلقت میں رسوائی سے یا پھٹے کپڑوں میں ہونے کی ذلت سے، ان کا نفس ادب سیکھے۔ اس سے وہ داد کے خواہش مند ہوتے ہیں کیونکہ اس سے وہ بہت خوش ہوتے ہیں جن میں نفس کی خواری اور رسوائی پائیں۔

حضرت ابراہیم ادہم رحمتہ اللہ علیہ سے کسی نے دریافت کیا کہ کبھی آپ نے اپنے مقصد میں کامیابی دیکھی ہے؟ انھوں نے فرمایا ہاں دو مرتبہ۔ ایک اس وقت جب میں کشتی میں سوار تھا اور کسی نے مجھے نہیں پہچانا کیونکہ میں پھٹے پُرانے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اور بال بھی بڑھ

گئے تھے۔ ایسی حالت تھی کہ کشتی کے تمام سوار میرا مذاق اڑا رہے تھے۔ ان میں ایک مسخرہ اتنا جری تھا کہ وہ میرے پاس آکر سر کے بال نوچنے لگا۔ اور میرا مذاق اُڑانے لگا۔ اس وقت میں نے اپنی مراد پائی اور اس خراب لباس اور شکستہ حالی میں مسرت محسوس ہوئی یہاں تک کہ میری یہ مسرت بایں سبب انتہا کو پہنچی کہ وہ مسخرہ اٹھا اور اس نے مجھ پر پیشاب کر دیا۔ اور دوسری مرتبہ اس وقت جبکہ میں ایک گاؤں میں تھا اور وہاں شدید بارش ہوئی۔ سردی کا موسم تھا گدڑی بھیگ گئی اور ٹھنڈک نے بے حال کر دیا۔ میں نے مسجد کا رُخ کیا لوگوں نے وہاں ٹھہرنے نہیں دیا۔ دوسری مسجد کی طرف گیا وہاں بھی امان نہ ملی پھر تیسری مسجد کی طرف گیا وہاں بھی یہی سلوک ہوا۔ سردی میری قوت برداشت سے باہر ہوگئی۔ آخر کار میں حمام کی بھٹی کے آگے آیا اور اپنے دامن کو آگ پر پھیلا دیا اس کے دھوئیں سے میرے کپڑے اور چہرہ سیاہ ہوگیا۔ اس رات بھی میں اپنی مراد کو پہنچا۔

سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھے بھی ایک مشکل درپیش آئی میں نے اس مشکل سے خلاصی پانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ اس سے قبل بھی مجھ پر ایسی ہی مشکل پڑی تھی تو میں نے حضرت شیخ بایزید رحمتہ اللہ علیہ کے مزار شریف پر حاضری دی تھی اور میری وہ مشکل آسان ہوگئی تھی۔ اس مرتبہ بھی میں نے ارادہ کیا کہ وہاں حاضری دوں۔ بالآخر تین ماہ تک مزار مبارک پر چلہ کشی کی تاکہ میری یہ مشکل حل ہوجائے۔ ہر روز تین مرتبہ غسل اور تین مرتبہ وضو کرتا اس امید پر کہ مشکل آسان ہو مگر پریشانی دور نہ ہوئی تو خراسان کے سفر کا ارادہ کیا۔

اس ولایت میں ایک رات ایک گاؤں میں پہنچا وہاں ایک خانقاہ تھی جس میں صوفیوں کی ایک جماعت فروکش تھی۔ میرے جسم پر کھردری اور سخت قسم کی گدڑی تھی۔ مسافروں کی مانند میرے ساتھ کچھ سامان نہ تھا صرف ایک لاٹھی اور لوٹا تھا اس جماعت نے مجھے حقارت کی نظر سے دیکھا اور کسی نے مجھے نہ پہچانا۔ وہ اپنے رسم ورواج کے مطابق باہم گفتگو کرتے اور کہتے کہ یہ ہم میں سے نہیں ہے اور یہ درست بھی تھا کہ میں ان میں سے نہیں تھا۔ لیکن مجھے چونکہ وہاں رات گزارنی ضروری تھی گنجائش نہ ہونے کے باوجود میں ٹھہر گیا اور انھوں میں مجھے دریچہ میں بٹھا دیا اور وہ لوگ اس سے اونچی چھت پر چلے گئے۔ میں زمین پر رہا۔ انھوں نے میرے آگے ایک سوکھی اور پھپھوندی لگی ہوئی روٹی ڈال دی۔ میں ان خوشبوؤں کو سونگھ رہا تھا جو وہ لوگ خود کھا رہے تھے۔ وہ لوگ مجھ پر برابر آوازے کس رہے تھے۔ جب وہ کھانے سے فارغ ہوگئے تو خربوزے کھانے

لگے اور دل لگی سے اس کے چھلکے میرے سر پر پھینک کر میری تحقیر وتوہین کرتے رہے۔ اور میں اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ خداوند، اگر میں تیرے محبوبوں کا لباس پہننے والوں میں سے نہ ہوتا تو میں ان لوگوں سے کنارہ کش ہو جاتا۔ پھر جتنی بھی مجھ پر ان کی طعن وتشنیع زیادہ ہوتی رہی میرا دل مسرور ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس واقعہ کو بوجھ اُٹھانے سے میری مشکل حل ہوگئی۔ اس وقت مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ مشائخ کرام، جاہل لوگوں کو اپنے ساتھ کیوں گوارہ کرتے ہیں اور کیوں ان کی سختیاں جھیلتے ہیں؟ یہ ہیں کامل تحقیق کے ساتھ ملامت کے احکام۔ و باللہ التوفیق۔

صحابۂ کرام میں اہلِ طریقت کے مشائخِ عظام

اب میں اُن ائمۂ کرام کے احوال کا کچھ تذکرہ کرتا ہوں جو صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے مشائخ عظام کے پیش روِ طریقت اور ذات وصفات اور احوال میں ان کے امام و قائد ہیں۔ جن کا مرتبہ انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد ہے جو اوّلین سابقین اور مہاجرین وانصار میں سے ہیں ہمارے اور تمہارے۔

تذکرۂ خلفائے راشدین

صحابہ کرام میں سے شیخ الاسلام بعداز انبیاء خیر الانام علیہم السلام خلیفہ وامام تارکینِ دنیا کے سردار، صاحبان خلوت کے شہنشاہ، آفاتِ دنیاوی سے پاک وصاف، امیر المومنین سیدنا ابوبکر عبداللہ بن عثمان ابی قحافہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ کی کرامتیں اور بزرگیاں مشہور ہیں۔ اور معاملات وحقائق میں آپ کے نشانات ودلائل واضح ہیں۔ تصوف کے سلسلہ میں آپ کے کچھ حالات کتابوں میں مذکور ہیں۔ مشائخ طریقت نے ارباب مشاہدہ اور صاحبان علم وعرفان میں آپ کو مقدم رکھا ہے چونکہ آپ کی مرویات بہت کم ہیں۔ اسی طرح حضرت فاروق اعظم سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو اربابِ مجاہدہ میں مقدم رکھا ہے کیونکہ آپ کے معاملات اور حق پر صلابت، صحیح روایتوں میں مرقوم اور اہلِ علم کے درمیاں معروف ہیں۔ چنانچہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ رات میں تلاوتِ قرآن کریم نماز میں کرتے تو نرم وآہستہ آواز میں کرتے اور حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نماز پڑھتے تو بلند آواز سے کرتے تھے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا ابوبکر صدیقؓ سے دریافت فرمایا کہ تم کس وجہ سے نرم وآہستہ آواز میں تلاوت کرتے ہو؟ انھوں نے عرض کیا ''اسمع من اناجیه'' جس سے مناجات کرتا ہوں وہ خوب سنتا ہے۔ چونکہ میں جانتا ہوں وہ مجھ سے دور نہیں ہے اور اس کی سماعت کے لئے نرم یا بلند آواز سے پڑھنا دونوں برابر ہیں۔ اور جب حضرت فاروق اعظمؓ سے دریافت فرمایا تو آپ نے عرض کیا ''اوقظ الوسنان ای النائم واطرد الشیطان'' سوتے ہوئے کو جگاتا ہوں اور شیطان کو بھگاتا ہوں یہ مجاہدے کی علامت ہے اور وہ مشاہدے کا نشان۔ مجاہدے کا مقام مشاہدے کے پہلو میں

ایسا ہے جیسے قطرہ دریا میں۔ یہ اس لیئے ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا "ھل انت الا حسنۃ من حسنات ابی بکر" اے عمر! تم ابوبکر کی نیکیوں میں سے ایک نیکی ہو۔ جبکہ سیدنا فاروق اعظم حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے بطلِ جلیل جن سے اسلام کی عزت و رفعت ملی حضرت ابوبکر صدیقؓ کی نیکیوں میں سے ایک نیکی ہیں تو غور کرو کہ سارے جہان کے لوگ کس درجہ میں ہوں گے۔

(۱) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "دارنا فانیۃ واحوالنا عاریۃ وانفاسنا معدودۃ و کسلنا موجودۃ" ہمارا گھر فانی ہے، ہمارے احوال عاری ہیں، ہمارے سارے سانس گنتی کے ہیں اور سستی و کاہلی موجود و ظاہر ہے۔ لہٰذا فانی گھر کی تعمیر کرنا جہالت، عاریتی حال پر اعتماد کرنا نادانی، گنتی کے سانسوں پر دل لگانا غفلت اور کاہلی کو دین سمجھ لینا سراسر نقصان و خسارہ ہے اس لیئے کہ جو چیز عاریۃً لی جاتی ہے اسے واپس کرنا ہوتا ہے اور جو چیز واپس جانے والی ہوتی ہے وہ باقی نہیں رہتی۔ اور جو چیز گنتی میں آئے وہ محدود ہوتی ہے اور سستی و کاہلی کا تو کوئی علاج ہی نہیں۔ اس ارشاد میں آپ نے ہمیں تلقین فرمائی کہ یہ دنیا اور اس کی ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ اس کے جانے کا اندیشہ نہ کرنا چاہیئے اور نہ اس کی خاطر اس سے دل لگانا چاہیئے۔ کیونکہ جب تم فانی سے دل لگاؤ گے تو باقی سے پوشیدہ اور حجاب میں رہ جاؤ گے۔ حالانکہ یہ دنیا اور یہ نفس، طالب حق اور اس کے محبوبوں کے لئے حجاب و پردہ ہے۔ وہ دونوں سے اجتناب کرتے ہیں۔ جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ یہ دنیا اور اس کا تمام ساز و سامان سب عارضی اور عاریت کی چیزیں ہیں ان کو اپنی ملک سمجھ کر ان میں مالکِ حقیقی کی اجازت اور اس کی منشاء کے خلاف تصرف کرنا کتنی نادانی ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنی مناجات میں عرض کیا کرتے تھے کہ "اللھم ابسط لی الدنیا و زھدنی عنھا" اے خدا دنیا کو میرے لئے کشادہ فرما۔ لیکن مجھے اس میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھ۔ دنیا کی فراخی کی دعا کے بعد اس سے محفوظ رکھنے کی التجا میں ایک لطیف اشارہ ہے۔ وہ یہ کہ دنیا دے تاکہ شکر بجالاؤں پھر یہ توفیق دے کہ اسے تیری راہ میں اپنے ہاتھ سے خرچ کروں۔ اور اپنا رخ تیری طرف پھیروں۔ تاکہ شکر اور انفاق فی سبیل اللہ کا درجہ پاؤں اور مقامِ صبر بھی حاصل کروں تاکہ فقر میں پریشان نہ ہوں۔ اور فقر پر میرا اختیار ہو۔ اس مفہوم سے اس قول کی تردید بھی ہوجاتی ہے کہ جس نے یہ کہا ہے کہ جس کا فقر اضطراری ہو وہ فقرِ اختیاری سے زیادہ کامل ہوتا ہے اگر اضطراری ہو تو یہ فقر کی صفت ہے اگر اختیاری ہو تو یہ فقر

بندے کی صفت ہے جب اس کا عمل کشش فقر سے منقطع ہو جائے تو اس سے بہتر ہے کہ تکلف سے اپنا درجہ بنائے۔

سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صفتِ فقر کا اس وقت زیادہ ظہور ہوتا ہے جبکہ تونگری کی حالت میں اس کے دل پر فقر کا ارادہ ہو پھر وہ ایسا عمل کرے جو اسے ابنِ آدم کی محبوب چیزوں سے یعنی دنیاوی مال و متاع سے دست کش کردے نہ کہ فقر کی حالت میں اس کا دل تونگری کی خواہش سے بھرپور ہو۔ اور ایسے عمل کا ارتکاب کرے جس کی بناء پر تونگروں، بادشاہوں اور درباریوں کے دروازوں پر جانا پڑے۔

صفتِ فقر تو یہ ہے کہ انسان تونگری چھوڑ کر فقر اختیار کرے نہ یہ کہ فقر میں مال و منال اور جاہ و حشم کا طالب ہو۔

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا رتبہ انبیا علیہم السلام کے بعد ساری مخلوق سے افضل و مقدم ہے۔ اور یہ جائز نہیں ہے کہ کوئی ان سے آگے قدم رکھے اور معنوی اعتبار سے مقدم ہو جائے۔ کیونکہ آپ نے فقرِ اختیاری کو فقر اضطراری پر مقدم و افضل رکھا ہے۔ یہی تمام مشائخ طریقت کا مذہب ہے۔

حضرت زہری رضی اللہ عنہ آپ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ جب حضرت صدیقؓ نے بیعت خلافت لی تو آپ نے منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ میں ارشاد فرمایا

واللّٰہ ما کنت حریصا علی الامارۃ یوما ولا لیلۃ ولا کنت فیھا راغبا ولا سئالتھا اللّٰہ قط فی سرو علانیۃ وما لی فی الامارۃ من راحۃ	خدا کی قسم ایک دن یا ایک رات کے لئے بھی میں امارت کا خواہاں نہیں ہوا اور نہ مجھے اس کی رغبت ہے اور نہ ظاہر و باطن میں خدا سے اس کا سوال کیا ہے اور نہ میرے لئے امارت میں راحت ہے۔

اللہ تعالیٰ جب بندہ کو کمال صدق پر فائز کرتا اور عزت و منزلت کے مقام پر متمکن فرماتا ہے تو بندۂ صادق منتظر رہتا ہے کہ حق تعالےٰ کی طرف سے کیا حکم ہوتا ہے جیسا بھی اس پر حکم وارد ہوتا ہے وہ اس پر قائم و برقرار رہتا ہے۔ اگر فرمان آئے کہ فقیر ہو جا تو فقیر ہو جاتا ہے اگر فرمان آئے کہ امیر ہو جا تو امیر بن جاتا ہے۔ اس میں وہ اپنے تصرف و اختیار کو کام میں نہیں لاتا۔ یہی صورتِ حال حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تھی۔ آپ نے ابتداء میں بھی ویسی ہی تسلیم و رضا کو اختیار فرمایا جس طرح انتہا میں اختیار فرمایا۔ صوفیا کرام نے ترک دنیا اور حرص و منزلت کے

چھوڑنے کو فقر پر اور ترکِ ریاست کی تمنا کو اس لیے پسند کیا کہ دین میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تمام مسلمانوں کے امامِ عام ہیں۔ اور طریقت میں آپ تمام صوفیا کے امام خاص۔

(۲) سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ

دوسرے خلیفہء راشد، سرہنگ اہلِ ایمان، مقتدائے اہل احسان، امام اہلِ تحقیق، دریائے محبت کے غریق سیدنا ابو حفص عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ کے فضائل و کرامات اور فراست و دانائی مشہور و معروف ہیں۔ آپ فراست و صلابت کے ساتھ مخصوص ہیں۔ طریقت میں آپ کے متعدد لطائف و دقائق ہیں۔ اسی معنی و مراد میں حضور اکرم ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ "الحق ینطق علٰی لسان عمر" حق عمر کی زبان پر بولتا ہے۔ یہ بھی فرمایا کہ "قد کان فی الامم محدثون فان یك منهم فی امتی فعمر" گذشتہ امتوں میں محدثین گزرے ہیں، اگر میری امت میں کوئی محدث ہے تو وہ عمرؓ ہیں۔ طریقت کے بکثرت رموز و لطائف آپ سے مروی ہیں اس کتاب میں ان سے کا جمع کرنا دشوار ہے۔ البتہ ان میں سے ایک یہ ہے۔ آپ نے فرمایا "العزلة راحة من خلفاء السوء" بدوں کی ہم نشینی سے گوشہ نشینی میں چین و راحت ہے۔

گوشہ نشینی کے دو طریق

گوشہ نشینی دو طریقہ سے ہوتی ہے۔ ایک خلقت سے کنارہ کشی کرنے پر، دوسرے ان سے تعلق منقطع کرنے سے۔ خلقت سے کنارہ کشی کی صورت یہ ہے کہ ان سے منہ موڑ کر خلوت میں بیٹھ جائے اور ہم جنسوں کی صحبت سے ظاہری طور پر بیزار ہو جائے۔ اور اپنے اعمال کے عیوب پر نگاہ رکھنے سے راحت پائے۔ خود کو لوگوں کے ملنے جلنے سے بچائے۔ اور اپنی برائیوں سے ان کو محفوظ رکھے۔ اور دوسرا طریقہ یہ کہ خلقت سے تعلق منقطع کرے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ اس کے دل کی کیفیت یہ ہو جائے کہ وہ ظاہر سے کوئی علاقہ نہ رکھے۔ جب کسی کا دل خلق سے منقطع ہو جاتا ہے تو اسے کسی مخلوق کا اندیشہ نہیں رہتا۔ اور اسے کوئی خطرہ نہیں رہتا کہ کوئی اس کے دل پر غلبہ پا سکے گا اس وقت ایسا شخص اگرچہ خلقت کے درمیان ہوتا ہے لیکن وہ خلقت سے جدا ہوتا ہے۔ اور اس کے ارادے اُن سے منفرد ہوتے ہیں۔ یہ درجہ اگرچہ بہت بلند ہے لیکن بعید از قیاس نہیں مگر یہی طریقہ سیدھا اور مستقیم ہے۔ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اسی مقام پر فائز تھے۔ ظاہر میں تو سریر آرائے خلافت اور خلقت میں ملے جلے نظر آتے تھے لیکن حقیقت میں آپ کا دل عزلت و تنہائی سے راحت پاتا تھا۔ یہ دلیل واضح ہے کہ اہلِ باطن اگرچہ بظاہر خلق کے ساتھ ملے جلے ہوتے ہیں لیکن ان کا دل حق کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے اور ہر حال میں

خدا ہی کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ اور جس قدر وقت خلق سے ملنے جلنے میں صرف ہوتا وہ اسے حق کی جانب سے بلاء وامتحان شمار کرتے ہیں وہ خلق کی ہم نشینی سے حق تعالیٰ کی طرف بھاگتے ہیں۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ دنیا خدا کے محبوبوں کے لیئے ہرگز پاک وصاف نہیں ہوتی۔ کیونکہ احوالِ دنیا مکدر ہوتے ہیں جیسا کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا "دار اُسِسَتْ علی البلویٰ بلا بلویٰ محال" دنیا ایسا گھر ہے جس کی بنیاد بلاؤں پر رکھی گئی ہے محال ہے کہ بغیر بلا کے وہ رہ سکے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ رسولِ خدا ﷺ کے مخصوص صحابہ میں سے ہیں۔ اور بارگاہِ الٰہی میں آپ کے تمام افعال مقبول ہیں حتیٰ کہ ابتداء جب مشرف باسلام ہوئے تو جبریل علیہ السلام نے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوکر عرض کیا "قد استبشر یا محمد اھل السماء باسلام عمر" یارسول اللہ آسمان والے آج عمر کے مشرف باسلام ہونے پر بشارت وتہنیت دیتے ہیں۔ اور وہ خوشیاں منا رہے ہیں۔

صوفیاء کرام گدڑی پہنتے اور دین میں صلابت وسختی اختیار کرنے میں آپ کی پیروی کرتے ہیں اس لئے کہ آپ تمام امور میں سارے جہان کے امام ہیں۔

(۳) حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ

تیسرے خلیفہء راشد، مخزنِ حیاء، اَعْبدِ اہلِ صفا، متعلق بدرگاہِ رضا، متحلّی بطریقِ مصطفےٰ، سیدنا ابو عمر عثمان بن عفان ذوالنورین رضی اللہ عنہ ہیں۔ ہر لحاظ سے آپ کے فضائل واضح اور آپ کے مناقب ظاہر ہیں۔

حضرت عبداللہ بن رباح اور حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جس دن بلوائیوں نے آپ کے گھر کا محاصرہ کیا ہم امیر المومنین سیدنا عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے پاس موجود تھے۔ بلوائی جب دروازے کے سامنے جمع ہوگئے تو آپ کے غلاموں نے ہتھیار اُٹھا لئے۔ آپ نے فرمایا جو ہتھیار نہ اٹھائے وہ میری غلامی سے آزاد ہے۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ ہم اپنے خوف کے سبب باہر نکل آئے اثنائے راہ میں حضرت امام حسن بن علی مرتضیٰ رضے اللہ عنہما آتے ہوئے ملے۔ ہم ان کے ہمراہ پھر حضرت عثمانؓ کے پاس آگئے تاکہ دیکھیں امام حسنِ مجتبیٰؓ کیا کرتے ہیں۔ جب امام حسنِ مجتبیٰؓ اندر داخل ہوئے تو سلام عرض کیا پھر بلوائیوں کی حرکت پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا' اے امیر المومنین' میں آپ کے حکم کے بغیر مسلمانوں پر تلوار بے نیام نہیں کرسکتا' آپ امام برحق ہیں۔ آپ حکم دیجئے تاکہ آپ سے اس قوم کو دور کروں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا

يا ابن اخي ارجع واجلس في بيتك حتّٰى ياتي اللّٰه بامره فلاحاجة لنافي اهراق الدماء	اے میرے بھائی علیؓ کے فرزند جاؤ اپنے گھر آرام کرو یہاں تک کہ اللہ کا کوئی حکم وارد ہو ہمارے لئے لوگوں کے خون بہانے کی ضرورت نہیں

مقام خلقت و دوستی میں، بلا و مصیبت کے درمیان، تسلیم و رضا کی یہ روشن علامت ہے۔ آپ کا یہ طرزِ عمل حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے اس طرزِ عمل کے بالکل مماثل ہے جو اُن سے آتشِ نمرود کی آزمائش کے وقت ظہور میں آیا تھا۔ چنانچہ نمرود ملعون نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خاتمہ کرنے کے لئے آگ جلائی اور ان کو گوپھن (منجنیق) میں رکھا گیا تو جبریل علیہ السلام آئے اور عرض کیا "هل لك من حاجة" کیا آپ کو کوئی حاجت ہے؟ حضرت خلیل علیہ السلام نے فرمایا "اما اليك فلا" بندہ سراپا محتاج ہے۔ لیکن تم سے کوئی حاجت نہیں۔ جبریلؑ نے عرض کیا پھر اللہ تعالےٰ سے عرض کیجئے۔ فرمایا "حسبي من سوالي علمه بحالي" حق تعالیٰ میرے سوال سے بے نیاز ہے وہ میری حالت کو جانتا ہے۔ مطلب یہ کہ مجھے اپنا حال عرض کرنے کی کیا ضرورت ہے وہ جانتا ہے کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ وہ میرے معاملہ کو مجھ سے بہتر سمجھتا ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ میری درستگی و صلاح کس چیز میں ہے۔ حضرت عثمان ذوالنورین کا معاملہ بھی بالکل اسی کے مشابہ اور وہ حضرت خلیل علیہ السلام کو منجنیق میں رکھے جانے کے مقام پر تھے۔ اور بلوائیوں کا اجتماع، آتشِ نمرود کے قائم مقام، اور امام حسنِ مجتبیٰؑ حضرت جبریل علیہ السلام کی جگہ تھے۔ لیکن ان دونوں واقعہ میں فرق یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اُس بلا میں نجات ملی تھی اور حضرت عثمان ذوالنورینؓ اس بلا میں شہید ہوئے تھے۔ کیونکہ نجات کا تعلق بقا سے ہے اور ہلاکت کا تعلق فنا سے۔ فنا و بقا کا ذکر پہلے بیان کر چکے ہیں۔

الغرض صوفیاء کرام جو مال و جان خرچ کرتے ہیں اور بلاؤں میں تسلیم و رضا اور عبادت میں اخلاص برتتے ہیں، وہ سب انھیں کی اقتداء میں ہے۔ درحقیقت آپ حقیقت و شریعت کے امام برحق ہیں۔ اور آپ کی طریقت میں ترتیب یا تربیت درستی میں ظاہر ہے۔

(۴) حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ

چوتھے خلیفہ راشد، اخی مصطفےٰ، غریق بحرِ بلا، حریق نارولا، مقتدائے جملہ اولیاء و اصفیاء، سیدنا ابوالحسن علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہٗ ہیں۔ طریقت میں آپ کی شان عظیم اور مقام رفیع ہے۔ اصول حقائق کی تشریح و تعبیر میں آپ کو کمال دسترس حاصل تھی یہاں تک کہ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "شيخنا في

الاصول والبلاء علی المرتضٰی ''اصول وبلاء میں ہمارے رہنما و پیشوا حضرت علی مرتضیٰؓ ہیں اور آپ علمِ طریقت اور اس کے معاملات میں ہمارے امام ہیں۔ علم طریقت کو اہلِ طریقت اصول کہتے ہیں۔ معاملاتِ طریقت دراصل بلاؤں کا تحمل ہے۔

منقول ہے کہ کسی نے حضرت علی مرتضیٰؓ سے عرض کیا اے امیر المومنین! مجھے کوئی وصیت فرمائیے۔ آپ نے فرمایا۔

لا تجعل اکبر شغلک باھلک وولدک فان یکن اھلک وولدک من اولیاء اللّٰہ تعالٰی فان اللّٰہ لا یضیع اولیائه وان کانوا اعداء اللّٰہ۔ فماھمک و شغلک لا عداء سبحانه۔	اپنے اہل وعیال سے انہماک تیرا سب سے مشغلہ نہ بن جائے اگر تیرے اہل وعیال اولیاء میں سے ہیں تو اللہ تعالےٰ اپنے ولیوں کو ضائع نہیں کرتا اور اگر وہ دشمنِ خدا ہیں تو اس کے دشمن سے تجھے کیا سروکار؟

یہ مسئلہ ''من دون اللّٰہ'' سے دلی انقطاع وعلٰیحدگی سے متعلق ہے۔ وہ اپنے بندوں کو جیسا چاہتا ہے رکھتا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اہلیہ کو جو کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی دختر تھیں انتہائی دردناک (دردزہ) میں چھوڑ کر تسلیم ورضائے الٰہی اختیار فرمائی۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بی بی حضرت ہاجرہ اور اپنے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بے آب وگیاہ میدان میں چھوڑ کر رضائے الٰہی پر شاکر ہو گئے۔ انھوں نے ان کو اپنا سب سے بڑا مشغلہ نہ جانا۔ اور ہمہ تن ہو کر دل کو حق سے واصل کر لیا۔ بالآخر انھیں دونوں جہان میں سرفرازی حاصل ہوئی۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک اور موقعہ پر کسی نے دریافت کیا کہ سب سے اچھا عمل کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا ''غناء القلب باللّٰہ تعالٰی'' اللہ تعالےٰ کے ساتھ دل تونگر بنانا۔ جو دل خدا کے ساتھ غنی ہوتا ہے اسے نہ تو دنیا کی نیستی پریشان کر سکتی ہے اور نہ دنیا کی ہستی خوش کر سکتی ہے۔ درحقیقت یہ فقر وصفوت کی طرف لطیف اشارہ ہے۔ جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

لہٰذا اہلِ طریقت کو چاہیے کہ عبادات کے حقائق، اشارات کے دقائق، دنیا وآخرت کے مال سے انقطاع اور تقدیرِ الٰہی کے نظارہ میں آپ کی اقتداء کریں۔

آٹھواں باب

ائمۂ طریقت اہلِ بیتِ اطہار

رسول اللہ ﷺ کے اہلِ بیت وہ حضرات ہیں کہ جن کی طہارت ازل سے مخصوص ہے۔ ان کا ہر فرد طریق میں جامع و مکمل تھا۔ مشائخ طریقت اور صوفیاء کے ہر عام و خاص کے یہ امام رہے ہیں۔ ان میں چند حضرات کا مختصر تذکرہ کرتا ہوں۔

(۱) سیّدنا امامِ حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ

ائمۂ اہلِ بیت اطہار میں سے جگر بندِ مصطفےٰ، ریحان دلِ مرتضیٰ، قرۃ العین سیدۃ زہرا، ابو محمد سیدنا امام حسن بن علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما ہیں۔ طریقت میں آپ کی نظر کامل اور تعبیرات حقائق میں اعلیٰ درجہ کی دسترس حاصل تھی۔ یہاں تک کہ آپ نے اپنی وصیت میں فرمایا

علیکم بحفظ السرائر فان اللّٰہ تعالٰی مطلع علی الضمائر۔	تم اسرار ربانی کی حفاظت میں محکم رہنا کیونکہ اللہ تعالیٰ دلوں کے بھیدوں سے واقف ہے۔

اس کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اسرارِ ربانی کی حفاظت ایسے ہی کرتا ہے جس طرح دلوں کے بھیدوں کو وہ دوسروں سے پوشیدہ رکھتا ہے۔ لہٰذا حفظ اسرار یہ ہے کہ غیروں کی طرف متوجہ نہ ہو اور حفظ ضمائر یہ ہے کہ اس کے اظہار میں حیاء مانع ہو۔

علم طریقت کے حقائق و لطائف میں بلند مرتبت کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے

کہ جب فرقہ قدریہ کو عروج ہوا اور معتزلہ کا مذہب پھیلا تو حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ نے

حضرت امام حسنِ مجتبیٰؓ کی خدمت میں بدیں مضمون خط لکھا

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیمo السّلام علیکم یا ابن رسول اللّٰہ و قرۃ عینیہ و رحمۃ اللّٰہ و برکاتہ۔ اما بعد فانکم معاشر بنی ھاشم کالفلک الجاریۃ فی بحرلجی و مصابیح الدجیٰ واعلام الھدیٰ والائمۃ القادۃ الذین من تبعھم نجیٰ۔ کسفینۃ نوح المشحونۃ التی یؤل الیھا المومنون وینجو فیھا المتمسکون فما قولک یا ابن رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم عند حیرتنا فی القدر و اختلافنا فی الاستطاعۃ لتعلمنا بما تأکد علیہ رأیک فانکم ذریۃ بعضھا من بعض بعلم اللّٰہ علمتم و ھو الشاھد علیکم و انتم شھداء اللّٰہ علی الناس۔

والسّلام

اللہ کے نام سے جو رحمٰن و مہربان ہے آپ پر خدا کا سلام اور اس کی رحمت و برکت ہو اے رسول خدا ﷺ کے فرزند اور ان کی چشمانِ مبارک کی راحت۔ آپ گروہ بنی ہاشم میں اُس کشتی کی مانند ہیں جو گہرے اندھیرے سمندر میں چل رہی ہو آپ ہدایت کے روشن چراغ اور اس کی نشانیوں میں سے ہیں۔ اور آپ اُن ائمہء دین کے سرخیل و قائد ہیں کہ جس نے اُن کی پیروی کی وہ اس طرح نجات پائے گا جس طرح کشتی نوحؑ میں سوار ہونے والے مسلمانوں نے نجات پائی۔ اے فرزندِ رسول آپ کا کیا ارشاد ہے جو قدر و استطاعت (جبر و قدر) کے مسئلہ میں ہمیں پریشانی لاحق ہے۔ آپ ہماری رہنمائی فرماتے ہوئے بتایئے تا کہ اس مسئلہ میں ہمیں معلوم ہو جائے کہ آپ کی روش کیا ہے؟ کیونکہ آپ فرزندِ رسول ﷺ ہیں اللہ تعالےٰ نے آپ حضرات کو علم خصوصی سے نوازا ہے۔ وہ آپ سب کا محافظ ہے اور آپ تمام لوگوں پر خدا کی طرف سے محافظ و نگہبان ہیں۔

والسلام

حضرت امام حسنِ مجتبیٰ سلام اللہ علیہ نے اس مضمون کا جواب مرحمت فرمایا۔

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ٥ فقد انتھیٰ الی کتابك عند حیرتك و حیرۃِ من زعمت من امتنا۔ والذی علیه رائی ان من لم یؤمن بالقدر و خیره و شره من اللّٰہ تعالیٰ فقد کفر

اللہ کے نام سے جو مہربان و رحیم ہے۔ تمہارا مکتوب موصول ہوا۔ جس میں تم نے اپنی اور امت کے دوسرے لوگوں کی پریشانی کا تذکرہ کیا ہے۔ اس مسئلہ میں میری جو رائے ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص

ومن حمل المعاصی علی اللّٰہ فقد فجر٬ ان اللّٰہ لا یطاع باکراہ ولا یعصی بغلبة ولا یمهل العباد فی ملکه لکنه المالك لما یملکهم والقادر علی ما علیه قدرهم فان ایتمروا بالطاعة لم یکن لهم اختیار ولا لهم عنها مشبعاء وان اتوا بالمعصیة وشاء ان یمن علیهم فیحول بینهم و بینها فعل وان لم یفعل فلیس هو عملهم علیها اجبارا ولا الزمهم اکراهاً ایاها باحتجاجه علیهم ان عرفهم و مکنهم وجعل لهم السبیل خذوا ما دعاهم الیه واترکوا ما نهٰهم عنه وللّٰہ الحجة البالغه

والسلام

نیک و بد اور تقدیر پر ایمان نہیں رکھتا وہ کافر ہے اور جو اپنے گناہوں کا ذمہ دار خدا کو ٹھہراتا ہے وہ بے ایمان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو شتر بے مہار نہیں چھوڑا ہے۔ نہ وہ جبراً اطاعت کراتا ہے اور نہ جبراً گناہ۔ لیکن بندوں کی تمام ملکیتوں اور ان کی تمام قوت و طاقت کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ اگر بندوں کو طاعت پر مجبور کر دیا جاتا تو ان کے لئے کوئی اختیار نہ ہوتا اور انھیں طاعت کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہتا۔ اور اگر بندے اس کی معصیت کریں اور خدا کی مشیت ان پر احسان کرنا چاہے تو ان کے اور ان کے گناہ کے درمیان کوئی فعل حائل کر دیتا ہے۔ اب اگر وہ ارتکاب معاصی نہ کر سکیں تو یہ بات نہیں ہے کہ خدا نے انھیں مجبور کر دیا تھا۔ اور نہ جبر سے وہ فعل ان پر لازم کر دیا تھا۔ یہ ان پر دلیل وحجت کے طور پر ہے اگر انھیں اس کی معرفت ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے راہِ ہدایت بنا دی ہے لہٰذا جس کے کرنیکا حکم دیا ہے اسے کرو اور جس سے بچنے کا حکم دیا ہے اس سے بچو۔ اور اللہ ہی کیلئے حجتِ بالغہ ہے والسلام

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو جس قدر توفیق مرحمت فرمائی ہے بندہ عمل میں اسی قدر مختار ہے۔ ہمارا دین جبر وقدر کے درمیان ہے۔ اگرچہ اس خط کے تمام مضمون سے ایک ہی جملہ ہمارا مقصود تھا لیکن فصاحت و بلاغتِ کلام کے اعتبار سے ہم نے پورا خط نقل کر دیا ہے۔ اور یہ کہ تمہیں اندازہ ہو جائے کہ حضرت امام حسنؓ مجتبےٰ علم حقائق و اصول میں کیسی مہارت تامہ رکھتے تھے۔ حضرت حسنِ بصری رحمتہ اللہ علیہ کمالِ علم و فضل کے باوجود حضرت امام حسن مجتبیٰ کے علم و فضل کے مقابلے میں دسویں درجے پر تھے۔

حضرت امام حسنِ مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تحمل و بردباری کا اندازہ اسی واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک روز حضرت امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کوفہ کے دارالخلافہ کے دروازے پر تشریف فرما تھے صحرا سے ایک دیہاتی آیا اور اس نے آتے ہی آپ کو اور آپ کے والدین کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ آپ نے اس سے پوچھا کیا تو بھوکا پیاسا ہے یا تجھ پر کوئی مصیبت پڑی ہے اس نے پھر کہا آپ ایسے ہیں اور آپ کے والدین ایسے ہیں۔ حضرت امام حسنؓ نے اپنے غلام سے فرمایا طشت میں چاندی بھر کر لاؤ۔ اور اسے دیدو۔ پھر فرمایا اے دیہاتی ہمیں معذور سمجھنا۔ گھر میں اس کے سوا کچھ اور نہ تھا ورنہ اس کی دینے سے انکار نہ ہوتا۔ جب دیہاتی نے آپ کا یہ صبر و تحمل دیکھا تو کہنے لگا میں گواہی دیتا ہوں کہ یقیناً آپ فرزندِ رسول ﷺ ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام مشائخ و اولیاء کی یہ صفت آپ کے اتباع میں ہے کیونکہ ان کے نزدیک بھی لوگوں کو برا بھلا کہنا برابر ہے اور ان کے ظلم و ستم اور سب و شتم سے وہ کوئی اثر نہیں لیتے۔

(۲) حضرت امام حسین گلگوں قبا رضی اللہ عنہ

ائمہ اہل بیت اطہار میں سے، شمعِ آل محمد ﷺ، تمام دنیاوی علائق سے پاک و صاف۔ اپنے زمانہ کے امام و سردار، ابو عبداللہ سیدنا امام حسین بن علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما ہیں۔ آپ اہلِ ابتلا کے قبلہ و رہنما اور شہید دشتِ کرب و بلا ہیں۔ اور تمام اہلِ طریقت آپ کے حال کی درستگی پر متفق ہیں۔ اس لئے کہ جب تک حق ظاہر و غالب رہا آپ حق کے فرمانبردار رہے اور جب حق مغلوب و مفقود ہوا تو تلوار کھینچ کر میدان میں نکل آئے اور جب تک راہ خدا میں اپنی جان عزیز قربان نہ کر دی چین و آرام نہ لیا۔ آپ میں حضور اکرم ﷺ کی بیشتر نشانیاں تھیں۔ جن سے آپ مخصوص و مزین تھے۔ چنانچہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں ایک روز حضور اکرم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا تو

دیکھا کہ امام حسینؓ کو آپ نے اپنی پشت مبارک پر سوار کر رکھا ہے۔ ڈوری کا ایک حصہ حضور ﷺ نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے اور دوسرا حصہ امام حسینؓ کے ہاتھ میں ہے۔ امام حسینؓ آپ کو چلاتے اور حضور اکرم ﷺ زانو کے ذریعہ چلتے رہے۔ میں نے جب یہ حال دیکھا تو کہا "نعم الجمل جملك يا ابا عبد الله" اے ابو عبداللہ کتنی اچھی سواری ہے آپ کی۔ حضور ﷺ نے آپ سے فرمایا "نعم الراكب" یا عمر! یہ سوار بھی تو کتنا عمدہ ہے۔

سیدنا امام حسین علیہ السلام سے طریقت میں بکثرت کلامِ لطیف اور اس کے رموز و معاملات منقول ہیں۔ چنانچہ آپ نے فرمایا "اشفق الاخوان عليك دينك" تمہارے لئے سب سے زیادہ رفیق و مہربان تمہارا دین ہے۔ اس لئے کہ بندے کی نجات دین کی پیروی میں ہے۔ اور اس کی ہلاکت، اس کی مخالفت میں ہے۔ صاحبِ عقل و خرد وہی شخص ہے جو مہربان کے حکم کی پیروی کرے۔ اور اس کی شفقت کو ملحوظ رکھے اور کسی حالت میں اس کی متابعت سے روگردانی نہ کرے۔ برادر مشفق وہی ہوتا ہے جو اس کی خیر خواہی کرے اور شفقت و مہربانی کا دروازہ اس پر بند نہ کرے۔

ایک روز ایک شخص نے حاضر ہو کر آپ سے عرض کیا کہ اے فرزندِ رسول ﷺ! میں ایک مفلس و نادار شخص ہوں میں صاحب اہل و عیال ہوں مجھے اپنے پاس سے رات کے کھانے میں سے کچھ عنایت فرمایئے؟ حضرت امام حسینؓ نے فرمایا بیٹھ جاؤ میرا رزق ابھی راہ میں ہے۔ کچھ دیر بعد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس سے دیناروں کی پانچ تھیلیاں آئیں۔ ہر تھیلی میں ایک ہزار دینار تھے۔ لانے والوں نے عرض کیا کہ حضرت امیر معاویہ معذرت خواہ ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ فی الحال ان کو اپنے خدام پر خرچ فرمائیں مزید پھر حاضر کئے جائیں گے۔ حضرت امام حسینؓ نے اس نادار و مفلس شخص کی طرف اشارہ فرمایا اور پانچوں تھیلیاں اسے عنایت کرتے ہوئے معذرت کی کہ تمہیں بہت دیر انتظار کرنا پڑا صرف اتنا ہی کمتر عطیہ تھا اگر میں جانتا کہ اتنی قلیل مقدار ہے تو تمہیں انتظار کی زحمت نہ دیتا مجھے معذور سمجھنا۔ ہم تو اہلِ ابتلاء سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم نے تو تمام دنیاوی ضرورتوں کو چھوڑ کر اپنی راحتوں کو فنا کر دیا ہے دوسروں کی بھلائی کے لئے آپ کے فضائل و مناقب اس قدر مشہور ہیں کہ کوئی امتی اس سے بے خبر نہیں ہے۔

(۳) حضرت سجاد زین العابدین رضی اللہ عنہ

ائمہ اہلِ بیعت اطہار میں سے وارثِ نبوت، چراغِ امت، سیدِ مظلوم، زین العباد، شمعِ اوتاد، سیدنا ابوالحسن علی المعروف بہ زین

العابدین بن امام حسین رضی اللہ عنہما ہیں۔ آپ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے زاہد و عبادت گزار اور کشف و حقائق و نطق دقائق میں مشہور ہیں۔ کسی نے آپ سے دریافت کیا دنیا و آخرت میں سب سے زیادہ نیک بخت و سعید کون شخص ہے۔ آپ نے فرمایا "من اذا رضی لم یحمله رضاه علی الباطل واذا سخط لم یخرجه سخطه من الحق" وہ شخص جب راضی ہو تو اس کی رضا اسے باطل پر آمادہ نہ کرے اور جب ناراض ہو تو اس کی ناراضگی اسے حق سے نہ بھٹکنے دے۔ یہ وصف، راست رو لوگوں کے اوصاف کمال میں سے ہے اس لئے کہ باطل سے راضی ہونا بھی باطل ہے اور غصہ کی حالت میں حق کو ہاتھ سے چھوڑنا بھی باطل ہے۔ مومن کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو باطل میں مبتلا کرے۔

آپ کے بارے میں منقول ہے کہ میدانِ کربلا میں جب حضرت امام حسینؓ کو اپنے اہل و عیال اور رفقاء سمیت شہید کر دیا گیا اور حضرت زین العابدین کے سوا مستورات حرم کا محافظ و نگہبان کوئی نہ بچا آپ اس وقت بیمار و علیل تھے چنانچہ اہلِ بیت اطہار کو اونٹوں کی ننگی پشت پر سوار کر کے دمشق لے جایا گیا یزید بن امیر معاویہ (علیه ما یستحقه اخزاه الله دون ابیه) کے دربار میں کسی نے آپ سے پوچھا "کیف اصبحت یا علی و یا اهل بیت الرحمة" "اے علیؓ اے رحمت کے گھر والو کس حال میں ہو؟" قال اصبحنا من قومنا بمنزلة قوم موسیٰ من اٰل فرعون۔ یذبحون ابناء هم ویستحیون نساء هم فلا ندری صباحنا من مساء نامن حقیقة بلاء نا " آپ نے فرمایا ہماری حالت اپنی قوم کے ہاتھوں ایسی ہے جیسے حضرت موسیٰؑ کی قوم کی حالت فرعونیوں کے ہاتھوں ہوئی تھی کہ وہ ان کے فرزندوں کو قتل کرتے اور ان کی عورتوں کو چھوڑ دیتے تھے۔ لہٰذا ہم جانتے ہیں کہ اس امتحان گاہ میں ہماری صبح، ہماری شام کے مقابلہ میں کیا حقیقت رکھے گی۔ ہم خدا کی نعمتوں پر شکر بجالاتے ہیں اور اس کی ڈالی ہوئی مصیبتوں پر صبر کرتے ہیں۔

حکایت ایک سال ہشام بن عبدالملک بن مروان حج کے لئے آیا طواف کعبہ کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ حجر اسود کو بوسہ دے لیکن اژدھام میں وہاں تک پہنچنے کی راہ نہ ملتی تھی۔ جب وہ منبر پر خطبہ دینے کھڑا ہوا تو حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ مسجد حرام میں اس جاہ و جلال سے داخل ہوئے کہ آپ کا چہرہ درخشاں رخسار مبارک تاباں اور لباس مبارک معطر تھا۔ جب آپ طواف کرتے ہوئے حجرِ اسود کے قریب پہنچے تو آپ کے احترام و تعظیم میں حجرِ اسود کے گرد سے تمام لوگ

ہٹ کر کھڑے ہو گئے تا کہ آپ حجرِ اسود کو بوسہ دے سکیں۔ شامیوں نے جب آپ کی یہ شان و شوکت دیکھی تو وہ ہشام سے کہنے لگے اے امیر المومنین! لوگوں نے تمہیں حجر اسود کو بوسہ دینے کی راہ نہیں دی باوجودیکہ تم امیر المومنین تھے لیکن اس خوبرو نوجوان کے آتے ہی سب لوگ حجرِ اسود کے پاس سے ہٹ گئے اور انھیں راستہ دے دیا۔ ہشام نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا میں نہیں جانتا کہ یہ شخص کون ہے؟ اس انکار کا مقصد یہ تھا کہ شامی لوگ انھیں پہچان نہ سکیں۔ اور کہیں ان کی پیروی اختیار نہ کر لیں جس سے اس کی امارت خطرے میں پڑ جائے۔ فرزدق شاعر اس وقت وہیں کھڑا تھا اس اہانت سے اس کی غیرت ایمانی جوش میں آ گئی اور بانگِ دہل کہنے لگا۔ میں انھیں خوب جانتا ہوں۔ شامیوں نے پوچھا اے ابوفراش! بتاؤ یہ کون ہے؟ اس سے بڑھ کر پُر وقار اور دبدبہ والا نوجوان ہم نے نہیں دیکھا۔ فرزدق شاعر نے کہا کہ کان کھول کر سُن لو۔ میں ان کے اوصاف بتاتا ہوں اور ان کے نسب کو بیان کرتا ہوں اس کے بعد فی البدیہہ یہ قصیدہ موزوں کر کے پڑھا

قصیدہ مدحیہ در شان امام زین العابدین رضی اللہ عنہ

ھٰذَا الَّذِیْ تَعْرِفُ الْبَطْحَا وَطَاْتَه	وَ الْبَیْتُ یَعْرِفُه وَالْحِلُّ وَالْحَرَم

یہ وہ شخص ہے جس کے نشان قدم کو اہل حرم پہچانتے ہیں
خانہ کعبہ اور حِل و حرم اسے جانتے ہیں۔

ھٰذَا ابْنُ خَیْرِ الْعِبَادِ کُلِّهِمْ	ھٰذَا التَّقِیُّ النَّقِیُّ الطَّاهِرُ الْعَلَمْ

یہ خدا کے بندوں میں سے بہترین بندے کا فرزند ہے
سب سے زیادہ متقی، پاک و صاف اور بے داغ نشان والا ہے

ھٰذَا ابْنُ فَاطِمَةَ الزَّهرَا اِنْ کُنْتَ جَاهِله	بِجَدِّهٖ اَنْبِیَاءُ اللّٰهِ قَدْ خُتِمْ

اگر تو نہیں جانتا تو سن یہ فاطمہ زہرا کے جگر گوشہ ہیں،
ان کے نانا پر اللہ نے نبیوں کا سلسلہ ختم فرمایا ہے۔

یُبِیْنُ نُوْرَ الدُّجیٰ عَنْ نُوْرِ طَلْعَتِهٖ	کَالشَّمْسِ یَنْجَابُ عَنْ اِشْرَقِهَا الظُّلَمْ

ان کی منور پیشانی سے نور ہدایت اس طرح جلوہ فگن ہے،
جیسے آفتاب کی روشنی سے تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں۔

يُغْضِىْ حَيَاءً وَيُغْضِيْ مَهَابَةً ۔۔۔ فَمَا يُكَلِّمُ اِلَّا حِيْنَ يَتَبَسَّمُ

یہ اپنی آنکھیں حیاء سے نیچی رکھیں اور لوگ ہیبت سے انکی طرف آنکھیں اونچی
نہیں کر سکتے اور جب یہ بات کریں تو منہ سے پھول جھڑیں......

اِذَا رَأَتْهُ قُرَيْشٌ قَالَ قَائِلُهَا ۔۔۔ اِلٰى مَكَارِمِ هٰذَا يَنْتَهِي الْكَرَمُ

جب کوئی قریش انھیں دیکھتا ہے تو وہ بول اٹھتا ہے،
کہ ان پر تمام خوبیاں تمام ہو چکی ہیں......

يَنْمِىْ اِلٰى ذُرْوَةِ الْعِزِّ الَّتِىْ قَصُرَتْ ۔۔۔ عَنْ نَيْلِهَا عَرَبُ الْاِسْلَامِ وَالْعَجَمُ

یہ عزت و منزلت کی ایسی بلندی پر فائز ہیں،
کہ عرب و عجم کا کوئی مسلمان ان سے ہمسری نہیں کر سکتا

مَنْ جَدُّهٗ دَانَ فَضْلُ الْاَنْبِيَاءِ لَهٗ ۔۔۔ وَفَضْلُ اُمَّتِهٖ دَانَتْ لَهُ الْاُمَمُ

ان کے نانا تمام نبیوں سے افضل اور ان کی امت تمام
امتوں سے افضل ہے اورتو بھی ان کی امت کا ایک فرد ہے

يَكَادُ يُمْسِكُهٗ عِرْفَانَ رَاحَتِهٖ ۔۔۔ رُكْنُ الْحَطِيْمِ اِذَا مَاجَاءَ يَسْتَلِمُ

جب حجر اسود کو بوسہ دینے قریب ہوں تو ممکن ہے وہ ان کی
انگلیوں کی راحت پہچان کر انھیں تھام لے۔

فِىْ كَفِّهٖ خَيْزُرَانٌ وَرِيْحُهٗ عَبِقٌ ۔۔۔ مِنْ كَفِّهٖ اَرْوَعُ فِىْ عِرْنِيْنِهٖ شَمَمُ

ان کے دست مبارک میں چھڑی ہے جس کی خوشبو دلنواز ہے
ان کی ہتھیلی کی خوشبو ہر طرف پھیل رہی ہے۔

سَهْلُ الْخَلِيْقَةِ لَا يَخْفٰى بَوَادِرُهٗ ۔۔۔ يَزِيْنُهُ اثْنَانِ حُسْنُ الْخُلْقِ وَالشِّيَمُ

یہ نرم خو ہیں خفگی و غصہ کا ان سے کوئی اندیشہ نہیں
یہ اپنی دو خوبیوں سے یعنی حسن اخلاق اور پاکیزہ خصلت سے آراستہ ہیں

مُشْتَقَّةٌ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ نَبْعَتُهٗ ۔۔۔ طَابَتْ عَنَاصِرُهٗ وَالْخِيْمُ وَالشِّيَمُ

ان کے اوصاف حمیدہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ماخوذ ہیں
ان کے عناصر اور ان کی خو، بو پاکیزہ ہے۔

فَلَیْسَ قَوْلُكَ مَنْ هٰذَا بِضَائِرِهٖ — اَلْعَرَبُ تَعْرِفُ مَنْ اَنْكَرْتَ وَالْعَجَمُ

اے ہشام! تیرا انکار کرنا انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا
انھیں تو عرب و عجم سب پہچانتے ہیں......

كِلْتَا يَدَيْهِ غِيَاثٌ عَمَّ نَفْعُهُمَا — تُسْتَوْكَفَانِ وَلَا يَعْرُوْهُمَا الْعَدَمُ

ان کے دونوں ہاتھ ایسے ہیں جنکا فیض بارش کی مانند ہے
ان کی بخشش ہر وقت جاری ہے حتیٰ کہ تنگدستی میں بھی ختم نہیں ہوتی

عَمَّ الْبَرِيَّةَ بِالْاِحْسَانِ فَانْقَشَعَتْ — عَنْهَا الْغِيَابَةُ وَالْاِمْلَاقُ وَالظُّلَمُ

خدا کی تمام مخلوق پر ان کا احسان عام ہے،
جس سے گمراہی، تنگدستی اور ظلم و زیادتی پراگندہ ہو کر رہ گئے ہیں

لَا يَسْتَطِيْعُ جَوَادٌ بُعْدَ غَايَتِهِمْ — وَلَا يُدَانِيْهِمْ قَوْمٌ وَاِنْ كَرُمْ

کسی سخی کی سخاوت ان کی بخشش کی حد تک نہیں پہنچ سکتی اور کوئی قوم ان کے برابر
نہیں پہنچ سکتی اگرچہ شمار میں کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو

هُمُ الْغُوْثُ اِذَا مَا اَزِمَةٌ اَزِمَتْ — وَالْاُسْدُ اُسْدُ الشَّرٰى وَالنَّاسُ مُحْتَدِمُ

یہ حضرات قحط سالی کے زمانہ میں بارش کی مانند سیراب کرتے ہیں
یہ شیرِ ببر ہیں جب کہ لوگ جنگ کی بھٹی میں جل رہے ہیں

مِنْ مَعْشَرٍ حُبُّهُمْ دِيْنٌ وَبُغْضُهُمْ — كُفْرٌ وَقُرْبُهُمْ مَنْجًا وَمُعْتَصَمُ

یہ اس گروہ سے ہیں جن سے محبت کرنا دین اور ان سے بغض رکھنا
کفر اور اُن سے وابستہ رہنا نجات اور پناہ دینے والا ہے

اِنْ عُدَّ اَهْلُ التُّقٰى كَانُوْا اَئِمَّتَهُمْ — وَقِيْلَ مَنْ خَيْرُ اَهْلِ الْاَرْضِ قِيْلَ هُمُ

اگر تمام اہلِ تقویٰ کو جمع کیا جائے تو یہ ان سب کے امام ہوں گے۔ اگر
اہلِ زمین سے اچھے لوگوں کے بارے میں پوچھا جائے تو سب کہیں گے کہ یہی ہیں

سِيَّانِ ذَالِكَ اِنْ اَثْرَوْا وَاِنْ عَدِمُوْا — لَا يَنْقُصُ الْعُسْرُ بَسْطًا مِنْ اَكُفِّهِمُ

ان کے لئے تونگری و مفلسی دونوں برابر ہیں،،
تنگدستی ان کے ہاتھوں کی فراخی کو کم نہیں کرتی،

اَللّٰـهُ فَضَّلَـهُ كَرَماً وَشَرَّفَـهُ	جَرىٰ بِذٰلِكَ لَهُ فِي اللَّوۡحِ وَالۡقَلَم

اللہ نے انہیں فضیلت دی اور ان کو شرافت و بزرگی سے نوازا
اور لوح و قلم میں ان کے لئے یہی حکم نافذ ہو چکا ہے۔

مُقَدَّمٌ بَعۡدَ ذِكۡرِ اللّٰـهِ ذِكۡرُهُمۡ	فِىۡ كُلِّ بَدۡوٍ مَخۡتُوۡمٌ بِهِ الۡكَلِمُ

ان کا ذکر، ذکرِ خُدا کے بعد مقدم ہے
ہر میدان میں ان کے کلمات مثبت ہیں،

اَىُّ الۡقَبَائِلِ لَيۡسَتۡ فِىۡ رِقَابِهِمۡ	اِمَّا لِاَبَائِهٖ هٰذَا اَوۡلَـهُ نِعَم

وہ کونسا قبیلہ ہے جن کی گردنوں پر ان کا اور ان کے
آباء و اجداد کے احسان کا بوجھ نہیں ہے

مَنۡ يَّعۡرِفُ اللّٰـهَ يَعۡرِفُ اَوَّلِيَّتَه	وَالدِّيۡنُ مِنۡ بَيۡتِ هٰذَا نَالَهُ الۡاُمَم

جسے خدا کی معرفت ہے وہ ان کی برتری کو پہچانتا ہے۔
چونکہ ان کے گھر سے دین ساری امت کو پہنچا ہے۔

فرزدق شاعر نے حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ کی منقبت میں اشعار کہنے کے علاوہ رسول اللہ ﷺ اور اہل بیت اطہار کی تعریف وتوصیف میں اور بھی اشعار کہے جس پر ہشام بہت برافروختہ ہوا اور فرزدق کو گرفتار کر کے عسفان کے جیل خانہ میں قید کر دیا جو کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان واقع ہے۔ (ہشام کی یہ پہلی جراءت ہے کہ بلا ثبوت و مقدمہ کسی کو قید کیا حالانکہ اسلام میں اس کا کہیں جواز نہیں ہے۔ مترجم) حضرت امام کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو فرزدق کی جراءت ایمان کی تحسین فرمائی اور دلجمعی کیلئے بارہ ہزار درہم و دینار اس پیغام کے ساتھ بھجوائے کہ ہمیں معذور سمجھنا اگر اس سے زیادہ ہمارے پاس ہوتے تو اس میں بھی دریغ نہ کرتے۔

فرزدق نے وہ مال واپس کرتے ہوئے عرض کیا کہ اے فرزندِ رسول! میں نے بادشاہوں اور امیروں کی شان میں بکثرت قصیدے کہے ہیں اگر ان کے کفارہ میں کچھ اشعار فرزندان رسول ﷺ کی محبت میں عرض کر دیئے تو کیا کمال کیا ہے؟ میں نے اپنی ایمانی غیرت کا ثبوت دیا ہے کسی مال و منال کی طمع میں نہیں کیا ہے۔ اس کا اجر خدا سے ہی چاہتا ہوں۔ اور خدا کے رسول کے اہلِ بیت سے محبت و دوستی کا طلبگار ہوں۔ حضرت امامؑ کو جب یہ پیغام پہنچا تو آپ نے وہ رقم واپس کر

کے کہلوایا کہ اے ابوالفراش! اگر تم ہم سے محبت رکھتے ہو تو جو ہم نے بھیجا ہے اس کو قبول کر لو۔ کیونکہ ہم نے رضائے الٰہی کے لئے اپنی ملک سے نکال کر تمہاری ملک میں دے دیا ہے۔ اُس وقت فرزدق شاعر نے وہ عطیہ لے لیا اور احسان مندی کا اظہار کیا۔ حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کی تعریف و توصیف اس سے کہیں زیادہ ہے جتنی کی جائے کم ہے۔

(۴) حضرت امام ابو جعفر محمد باقر صادق رضی اللہ عنہ

ائمہ اہل بیت اطہار میں سے، طریقت میں دلیل و حجت، اربابِ مشاہدہ کے برہان امام اولادِ نبی ﷺ، برگزیدۂ نسلِ علی، سیدنا امام ابو جعفر محمد صادق بن علی بن حسین بن علی مرتضی المقلب بہ الامام باقر رضی اللہ عنہم ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ کی کنیت ابو عبداللہ تھی۔ علوم کی باریکیوں اور کتابِ الٰہی کے رموز و اشارات اور اس کے لطائف واضح طور پر بیان کرنے میں آپ کو کمالِ دسترس تھی۔ آپ کی کرامتیں اور روشن دلائل اور دلائل قاطعہ زبان زد خاص و عام ہیں۔ بادشاہِ وقت نے آپ کو شہید کرنے کے ارادے سے کسی کے ذریعہ بلوایا۔ جب اس کے قریب پہنچے تو وہ معذرت کرنے لگا اور تحائف پیش کر کے عزت و احترام کے ساتھ واپس کیا۔ درباریوں نے حیرت و تعجب سے پوچھا آپ نے تو انھیں شہید کرنے کی لئے بلایا تھا لیکن سلوک اس کے برعکس کیا۔؟ بادشاہ نے جواب دیا جب وہ میرے قریب آئے تو میں نے دو شیروں کو ان کے دائیں اور بائیں کھڑے دیکھا اور وہ زبانِ حال سے گویا تھے کہ اگر تو نے امام کے ساتھ بدسلوکی کی تو ہم تجھے مار ڈالیں گے منقول ہے کہ آپ نے ایۂ کریمہ "فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ" (جس نے طاغوت کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان رکھا) کی تفسیر میں "مَنْ شغلك عن مطالعة الحق فهو طاغوتك" جو تجھے حق تعالےٰ کے مطالعہ سے غافل کرے وہی تیرا طاغوت ہے۔

تو اے طالب حق! اب تمہیں یہ دیکھنا چاہیے کہ کون سی چیز حجاب بن رہی ہے جو معرفت الٰہی میں مانع ہے اور یادِ خدا سے تمہیں غافل بنا رہی ہے اسے ترک کر دو تاکہ مکاشفہ ربانی حاصل ہو اور کوئی حجاب و مانع درمیان میں حائل نہ رہے۔ کیونکہ کسی ممنوع و محجوب شخص کو زیب نہیں دیتا کہ وہ قرب کا دعویٰ کرے۔ آپ کے ایک خادم خاص بیان کرتے ہیں کہ جب رات کا ایک پہر گزر جاتا اور آپ درود و وظائف سے فارغ ہو جاتے تو بلند آواز سے مناجات کرتے اور کہتے "اے میرے خدا، اے میرے مالک! رات آ گئی ہے اب بادشاہوں کا تصرف و اختیار ختم ہو چکا ہے، آوازیں سکوت میں ڈوب چکی ہیں۔ خلقت لوگوں کے دروازوں سے ہٹ چکی ہے۔ بنو امیہ

بھی محو خواب ہیں انھوں نے اپنے خزانوں کو مقفل کر کے پہرے دار کھڑے کر دیے ہیں۔ جو لوگ ان سے طمع و لالچ رکھتے تھے وہ بھی ان سے دور ہو چکے ہیں۔ اے خدا تو زندہ و پائندہ اور دیکھنے اور جاننے والا ہے تیرے لئے خواب و بیداری برابر ہے۔ جو تجھے ایسا نہ جانے وہ کسی نعمت کا مستحق نہیں ہے۔ اے خداوند کریم! تجھ کو کوئی چیز کسی چیز سے روک نہیں سکتی، اور رات و دن، تیری بقا میں اثر انداز نہیں ہوتے۔ تیری رحمت کے دروازے ہر دعا کرنے والے کے لئے کھلے ہوئے ہیں اور تیرے خزانے تیری حمد و ثناء کرنے والوں کے لئے وقف ہیں۔ تو ایسا مالک حقیقی ہے کہ کسی سائل کو محروم رکھنا تیری شایانِ شان نہیں ہے۔ تو ہر مومن کی دعا قبول فرماتا ہے کسی کی دعا رد نہیں کرتا۔ اور زمین و آسمان میں کسی سائل کو محروم نہیں رکھتا۔ اے میرے خدا! جب موت، قبر، حساب اور حشر کو یاد کرتا ہوں تو دنیا میں یہ دل کسی طرح چین و قرار نہیں پاتا۔ لہٰذا جو بھی حاجت مجھے لاحق ہوتی ہے میں تجھی سے عرض کرتا ہوں اور تجھی کو فریاد رس جان کر تجھی سے مانگتا ہوں اب میری عرض یہ ہے کہ بوقتِ موت، عذاب سے محفوظ رکھنا اور بوقت حساب، بے عتاب راحت عطا فرمانا۔" آپ کا یہ معمول تھا کہ اس دعا میں تمام رات گزار دیتے۔ اور برابر آہ و فغاں میں مشغول رہا کرتے تھے۔ ایک رات میں نے عرض کیا۔ اے میرے اور میرے ماں باپ کے آقا! یہ گریہ و زاری کا اور سینہ فگاری کا سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟ آپ نے فرمایا اے دوست! حضرت یعقوب علیہ السلام کے ایک فرزند حضرت یوسف علیہ السلام نظروں سے روپوش ہوئے تھے اس پر وہ اتنا روئے تھے کہ انکی آنکھوں کی بصارت جاتی رہی تھی۔ اور آنکھیں سفید ہو گئی تھیں لیکن میرے اب وجد کے خاندان کے ۱۸ نفوس حضرت امام حسینؓ کی رفاقت میں میدان کربلا کے اندر گم ہوئے ہیں۔ یہ غم کیا اس سے کچھ کم ہے۔ میں ان کے غم و فراق میں اپنے رب کے حضور فریاد کر کے کیوں آنکھیں سفید نہ کروں۔

یہ مناجات عربی میں بہت فصیح ہے طوالت کے لحاظ سے صرف ترجمہ پر اکتفا کیا گیا ہے۔

(۵) امام جعفر بن محمد صادق رضی اللہ عنہما

ائمۂ اہلِ بیت اطہار میں سے، یوسفِ سنت، جمالِ طریقت، معبر معرفت، مزین صفوت سیدنا ابو محمد امام جعفر بن محمد صادق الملقب بہ امام باقر بن علی بن حسین بن علی مرتضی رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں۔

آپ کا حال بلند، سیرت پاکیزہ، ظاہر و باطن آراستہ و پیراستہ اور شمائل و خصائل شُستہ و منوّر تھے۔ آپ کے اشارات تمام علوم میں خوبی اور رقتِ کلام کی بنا پر مشہور ہیں اور مشائخ طریقت میں باعتبار لطائف و معانی معروف ہیں جن سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ آپ کا ارشاد

ہے کہ "من عرف اللہ اعرض عما سواہ " جسے اللہ کی معرفت حاصل ہوگئی وہ ماسوا اللہ سے کنارہ کش ہوگیا۔ اس لئے کہ جو شخص خدا سے واصل ہو جاتا ہے اس کے دل میں کسی غیر کی کوئی قدر و منزلت باقی نہیں رہتی۔

دراصل خدا کی معرفت، اس کے غیر سے دستکش ہونے ہی کا نام ہے۔ اور اسی علیٰحدگی سے ہی معرفت الٰہی حاصل ہوتی ہے۔ جب تک غیر اللہ سے لگاؤ اور تعلق رہے گا، معرفتِ الٰہی سے وہ محروم ہی رہے گا۔ چنانچہ عارف باللہ، مخلوق اور اس کی فکر سے بے نیاز ہوتا ہے اور اس کا دل ماسویٰ اللہ سے جدا ہو کر خدا کے ساتھ واصل ہو جاتا ہے۔ اس کے دل میں مخلوق کی کوئی قدر و منزلت نہیں رہتی نہ وہ کسی حال میں ان کی طرف التفات کرتا ہے۔ اور نہ ان سے کوئی علاقہ رکھتا ہے۔

آپ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ "لا تصح العبادۃ الا بالتوبتہ لان اللہ تعالیٰ قدم التوبۃ علی العبادۃ قال اللہ تعالیٰ التائبون العابدون لآیہ " توبہ کے بغیر عبادت صحیح نہیں ہوتی اس لئے کہ اللہ تعالےٰ نے توبہ کو عبادت پر مقدم فرمایا چنانچہ فرماتا ہے توبہ کرنے والے ہی عبادت کرنے والے ہوتے ہیں کیونکہ توبہ مقامات کی ابتداء اور عبودیت اس کی انتہا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے جب گنہگار بندوں کا ذکر فرمایا تو توبہ کے حکم سے یاد کیا چنانچہ فرمایا

توبوا الی اللہ جمیعا ایھا المومنون۔	خدا کی بارگاہ میں تمام گناہوں سے توبہ کرو اے مسلمانو!

لیکن اللہ تعالیٰ نے جب اپنے حبیب سید عالم ﷺ کو یاد فرمایا تو عبودیت و بندگی سے یاد کیا چنانچہ فرمایا

فاوحیٰ الیٰ عبدہٖ ما اوحیٰ	اللہ نے اپنے بندۂ خاص پر جو وحی چاہی نازل فرمائی۔

حکایت

ایک مرتبہ حضرت داؤد طائی رحمتہ اللہ علیہ آپ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ اے فرزندِ رسول ﷺ! مجھے کوئی نصیحت فرمایئے؟ میرا دل سیاہ ہوگیا ہے۔ آپ نے فرمایا اے ابا سلیمان! تم اپنے زمانہ کے مشہور عابد و زاہد ہو تمہیں میری نصیحت کی حاجت ہی کیا؟ انھوں نے عرض کیا اے فرزند رسول! آپ کو ساری مخلوق پر فضیلت حاصل ہے۔ اور آپ پر سب کو نصیحت فرمانا واجب ہے۔ آپ نے فرمایا اے ابا سلیمان! میں ہمیشہ اس بات سے خائف رہتا

ہوں کہ کل روز قیامت میرے جد کریم علیہ التحیۃ والتسلیم اس پر میری گرفت نہ فرمائیں کہ تم نے کیوں میری اتباع کا حق ادا نہ کیا۔ کیونکہ اتباع نبوی ﷺ کا تعلق نہ نسب صحیح سے ہے اور نہ نسبتِ قوی سے بلکہ پیروی کرنے سے ہی متعلق ہے یہ سن کر حضرت داؤد طائی رحمہ اللہ رو کر عرض کرنے لگے خداوندا! جس شخص کا خمیر ہی نبوت کی خاک سے ہے اور جس کی طبع نشو و نما اپنے جدِ کریم علیہ السلام کے برہان و حجت کے اصول سے ہے اور جس کی مادر معظمہ بتول الزہرا ہیں جن کا نام نامی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ہے۔ وہی جب بذات خود اسی حیرانی و پریشانی میں ہیں تو داؤد کس گنتی و شمار میں ہے وہ زہد و ورع پر کیسے بھروسہ کرسکتا ہے۔

ایک دن آپ اپنے غلاموں کے ساتھ تشریف فرما تھے آپ نے ان سے فرمایا آؤ ہم سب ملک کر عہد و پیمان کریں کہ ہم میں سے جو بھی بخشا جائے وہ روزِ قیامت دوسرے کی شفاعت کرے۔ تمام غلام عرض کرنے لگے اے فرزندِ رسول ﷺ! آپ کو ہماری شفاعت کی کیا حاجت ہے؟ آپ کے جدّ کریم علیہ السلام تو خود ساری مخلوق کے شفیع ہوں گے۔ آپ نے فرمایا میں اپنے رب تعالیٰ پر شرمسار ہوں اور روز قیامت اپنے جد کریم علیہ السلام کے روبرو کھڑے ہونے کی طاقت نہیں رکھتا۔

آپ کی یہ کیفیت اپنے نفس کی عیب گیری پر مبنی تھی۔ کیونکہ یہ صفت اوصاف کمال سے متعلق ہے۔ اور اسی صفت پر خدا کے تمام مقبول بندے ہیں خواہ وہ انبیاء و مرسلین ہوں یا اولیاء و اصفیاء کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے

اذا اراد اللہ بعبدہٖ خیرا ابصرہ بعیوب نفسہٖ	اللہ تعالیٰ جب اپنے کسی بندے پر بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کو اس کے نفس کے عیوب دکھا دیتا ہے۔

جو بندہ بارگاہِ صمدیت میں تواضع و بندگی سے سر جھکاتا ہے اللہ تعالےٰ اسے دونوں جہان میں سر بلند رکھتا ہے۔ اگر ہم تمام اہلِ بیت اطہار کا اسی طرح تذکرہ کریں۔ اور ان کے فضائل و مناقب شمار کرائیں تو یہ کتاب اس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

نواں باب

اصحابِ صفہ

خلفائے راشدین اور چند ائمۂ اہلِ بیتِ اطہار کے بعد دربارِ نبوی ﷺ کے اصحابِ صفہ کا تذکرہ اختصاراً کرتا ہوں۔ اگرچہ اس سے قبل کی تصنیف ''منہاج الدین'' میں نام بنام تفصیل کے ساتھ بیان کر چکا ہوں۔ اس جگہ ان کے اسماء وکنیت اور مختصر حال بیان کرتا ہوں تاکہ مقصد برآری میں معاون ثابت ہو۔ وباللہ التوفیق۔

واضح رہنا چاہئے کہ امتِ مسلمہ کا اس پر اجماع ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کے صحابۂ کرام کی ایک جماعت مسجدِ نبوی ﷺ میں ہمہ وقت، مصروفِ عبادت رہتی تھی اور انھوں نے کسبِ معاش سے کنارہ کشی اختیار کر رکھی تھی۔ اللہ تعالٰی نے اپنی نبی ﷺ کو ان کی طرف خصوصی توجہ فرمانے کا حکم دیا چنانچہ ارشاد ہوا۔

ولا تطرد الذین یدعون ربھم بالغداۃ والعشی یریدون وجھہ	جو لوگ دن رات اپنے رب کی عبادت کرتے اور اس کی رضا چاہتے ہیں آپ ان پر توجہ خاص مبذول فرمائیں۔

اصحاب صفہ کے فضائل ومناقب میں بکثرت آیاتِ قرآنی اور احادیث نبوی ﷺ ناطق وشاہد ہیں۔ ان میں سے چند باتوں کا اس جگہ ذکر کرتا ہوں۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسولِ خدا ﷺ کا گزر اصحابِ صفہ کی طرف ہوا اور آپ ﷺ نے ملاحظہ فرمایا کہ وہ فقر ومجاہدے کے باوجود خوش وخرم ہیں۔ آپ نے ان سے فرمایا اے اصحابِ صفہ! تم کو اور میری امت کے ہر اس شخص کو جو تمہاری صفت پر خوش دلی سے قائم ہو بشارت دی گئی ہے۔ کہ تم جنت میں میرے رفقاء ہوگے۔

(۱) ان اصحابِ صفہ میں سے ایک صحابی حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ ہیں جو بارگاہِ جبروت کے منادی یعنی مؤذن اور حضور ﷺ کے پسندیدہ تھے۔

(۲) دوسرے صحابی حضرت ابوعبداللہ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ہیں جو حضور ﷺ کے محبوب اور محرمِ اسرار تھے۔

(۳) تیسرے صحابی حضرت ابوعبیدہ عامر بن عبداللہ بن جراح رضی اللہ عنہ ہیں جو مہاجر وانصار کے جرنیل تھے اور رضائے الٰہی کے ہر وقت طالب تھے۔

(۴) چوتھے صحابی حضرت ابوالیقظان عمارہ بن یاسر رضی اللہ عنہ ہیں جو برگزیدہ اور محبوبانِ خدا کی زینت تھے۔

(۵) پانچویں صحابی حضرت ابومسعود عبداللہ بن مسعود ہزلی رضی اللہ عنہما ہیں جو علم وحلم کے مخزن ہیں

(۶) چھٹے صحابی حضرت عتبہ بن مسعود برادر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما ہیں جو پاک طینت اور درگاہ حرمت کے متمسک تھے۔

(۷) ساتویں صحابی حضرت مقداد بن الاسود رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جو گوشہ وتنہائی کی راہ کے سالک اور ہر عیب وذلت سے کنارہ کشی کرنے والے تھے۔

(۸) آٹھویں صحابی حضرت خباب ابن الارت رضی اللہ عنہ ہیں جو مقام تقوی کی دعوت دینے والے اور بلاؤ مصیبت پر راضی رہنے والے تھے۔

(۹) نویں صحابی حضرت صہیب بن سنان رضی اللہ عنہ ہیں جو درگاہِ رضا کے قاصد اور بارگاہِ بقا اندر فنا کے طالب تھے۔

(۱۰) دسویں صحابی حضرت عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ ہیں جو سعادت کے موتی اور بحر قناعت کے شناور تھے۔

(۱۱) گیارہویں صحابی حضرت زید بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہیں جو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے دونوں جہان اور تمام مخلوق سے منہ موڑ ایک خدا کے ہو کر رہ گئے۔

(۱۲) بارھویں صحابی حضرت ابوکیشہ رضی اللہ عنہ ہیں جو حضور اکرم ﷺ کے محبوب اور مشاہدات کی طلب میں مشقتیں جھیلنے والے تھے۔

(۱۳) تیرھویں صحابی حضرت ابومرثد کنمازۃ الحصین عدوی رضی اللہ عنہ ہیں جو معزّ وتواب اور تمام مخلوق سے منہ موڑ کر خدا کی طرف رجوع کرنیوالے تھے۔

(۱۴) چودھویں صحابی حضرت سالم جو حضرت حذیفہ یمانی رضی اللہ عنہما کے مولی ہیں وہ راہِ تواضع کی تعمیر کرنیوالے اور حجتِ قطعیہ کی راہ طے کرنیوالے تھے۔

(۱۵) پندرھویں صحابی حضرت عکاشہ بن الحصین رضی اللہ عنہ ہیں جو عذاب الٰہی سے ڈرنے والے اور گمراہی سے دور رہنے والے تھے۔

(۱۶) سولھویں صحابی حضرت مسعود بن ربیع القاری رضی اللہ عنہ ہیں جو قبیلہء

بنی قار کے سردار اور مہاجر و انصار کی زینت تھے۔

(۱۷) سترھویں صحابی حضرت ابوذر بن جنادہ غفاری رضی اللہ عنہ ہیں جن کا زہد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مانند تھا اور جو دیدارِ الٰہی کے مشتاق تھے۔

(۱۸) اٹھارھویں صحابی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہیں جو حضور کے تمام قول و فعل کے محافظ اور ہر خوبی سے متصف تھے۔

(۱۹) انیسویں صحابی حضرت صفوان بن بیضاء رضی اللہ عنہ ہیں جو مقام استقامت پر قائم اور متابعتِ شریعت پر گامزن تھے۔

(۲۰) بیسویں صحابی حضرت ابوالدرداء عویم بن عامر رضی اللہ عنہ ہیں جو صاحبِ ہمت اور ہر تہمت سے مبرّا اور پاک تھے۔

(۲۱) اکیسویں صحابی حضرت ابولبابہ بن عبدالمنذر رضی اللہ عنہ ہیں جو حضور اکرم ﷺ کے برگزیدہ صحابی اور بارگاہِ رجا سے تعلق رکھنے والے تھے۔

(۲۲) بائیسویں صحابی حضرت عبداللہ بن بدر جہنی رضی اللہ عنہ ہیں جو کیمیائے بحرِ شرف اور توکل کے صدف کے موتی تھے۔

اگر تمام اصحاب صفہ کے اسماء بیان کئے جائیں تو کتاب بہت طویل ہو جائے گی۔ شیخ ابوعبدالرحمٰن محمد بن الحسین سلمی رحمہ اللہ نے جو مشائخ عظام کے کلام و اقوال کے جامع و ناقل ہیں ایک کتاب، خاص اہل صفہ کے لئے تصنیف فرمائی ہے جس میں ہر ایک کے مناقب و فضائل اور اسماء گرامی ان کی کنیتوں کے ساتھ علٰیحدہ علٰیحدہ بیان کئے ہیں یہ کتاب قابلِ دید ہے۔

(۲۳) حضرت مسطح بن ثابت بن عباد بدری رضی اللہ عنہ کو بھی اصحابِ صفہ میں شمار کیا جاتا ہے مگر میں دل سے انکو دوست نہیں رکھتا چونکہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر لگائی جانے والی جھوٹی تہمت کی ابتدا ان ہی سے ہوئی تھی۔

(۲۴) حضرت ابوہریرہؓ۔

(۲۵) حضرت ثوبانؓ۔

(۲۶) حضرت معاذ بن الحارثؓ۔

(۲۷) حضرت دستانؓ۔

(۲۸) حضرت خلابؓ۔

(۲۹) حضرت ثابت بن ودیعہؓ

(۳۰) حضرت ابوعیسیٰؓ۔

(۳۱) حضرت عیوم بن ساعدؓ۔

(۳۲) حضرت سالم بن عمر بن ثابتؓ۔

(۳۳) حضرت ابواللیثؓ۔

(۳۴) حضرت کعب بن عمرؓ۔

(۳۵) حضرت ذہب بن معقلؓ۔

(۳۶) حضرت عبداللہ بن انیسؓ۔

(۳۷) حضرت حجاج بن عمر اسلمی رضی اللہ عنہم اجمعین کو بھی انھیں اصحاب صفہ میں شمار کیا جاتا ہے لیکن کبھی کبھی انھوں نے اپنے متعلقین کی طرف بھی توجہ کرلی تھی۔

طبقہ صحابہؓ کی افضلیت

تمام صحابہء کرام مرتبہ صحابیت میں یکساں ہیں ان کا زمانہ سب زمانوں سے ہر لحاظ سے افضل تھا۔ درحقیقت صحابہء کرام کا زمانہ ہی خیر القرون تھا اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے نبی ﷺ کی صحبت سے سرفراز فرمایا اوران کے دلوں کو تمام عیبوں سے محفوظ رکھا تھا۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے" خیر القرون قرنی ثم الذین یلونهم الحدیث "

سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے اس کے بعد وہ زمانہ جو اس سے متصل ہے پھر وہ جو اس کے بعد آئیگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے"

السابقون الاولون من المهاجرين والانصار والذين اتبعوهم باحسان الآيه.	سب سے پہلے ایمان میں سبقت کرنے والے مہاجرین و انصار ہیں اور وہ لوگ جو بھلائی کے ساتھ انکے بعد ایمان لائے۔

طبقۂ تابعین کے آئمہ طریقت کا تذکرہ

اب میں بعض تابعین کے تذکرے کو شامل کتاب کرتا ہوں تا کہ مکمل فائدہ حاصل ہو کیونکہ ان کا زمانہ صحابۂ کرام کے زمانہ سے متصل وقریب تھا۔

(۱) حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ

طبقۂ تابعین کے ائمۂ طریقت میں سے آفتاب امت، شمع دین وملّت حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ اہلِ تصوف کے مشائخ کبار میں سے ہیں۔ آپ نے رسول اکرم ﷺ کا زمانۂ حیات ظاہری اور عہدِ مبارک پایا ہے لیکن دو چیزوں نے دیدارِ جمالِ جہاں آراء سے آپ کو روکے رکھا۔ ایک آپ کا غلبۂ حال دوسرا آپ کی والدہ کا حق۔

حضور اکرم ﷺ نے صحابۂ کرام سے فرمایا ''قرن میں ایک اویس نامی مردِ خدا ہے۔ جس کی شفاعت سے قیامت کے دن قبیلۂ ربیعہ اور قبیلۂ مضر کی بھیڑوں کے بالوں کی تعداد کے برابر میری امت جنت میں داخل ہوگی۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہما کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا جب تم اس سے ملاقات کروگے تو پستہ قد، لانبے بال اور داہنی جانب روپے کے برابر سفید نشان پاؤ گے۔ یہ سفیدی برص کی نہ ہوگی۔ ایسا ہی نشان اس کے ہاتھ کی ہتھیلی پر ہوگا۔ وہ ربیعہ ومضر کی بکریوں کی تعداد کے برابر میری امت کی شفاعت کرے گا جب تم اس سے ملو تو میرا اسلام پہنچا کر کہنا کہ میری امت کے لئے دعا کریں۔ چنانچہ حضور اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد حضرت عمر فاروق جب حضرت علی مرتضٰے رضی اللہ عنہما کے ساتھ مکہ مکرمہ آئے تو حضرت عمر فاروقِ نے دورانِ خطبہ ارشاد فرمایا'' اے نجد کے رہنے والو کھڑے ہو جاؤ'' جب وہ لوگ کھڑے ہو گئے تو فرمایا تم میں سے کوئی قرن کا رہنے والا شخص ہے۔؟ جب قرن کے لوگ آئے تو ان سے حضرت اویس کے بارے میں استفسار فرمایا۔ انھوں نے بتایا وہ تو دیوانہ آدمی ہے۔ وہ نہ تو آبادی میں آتا ہے اور نہ کسی سے ملتا جلتا ہے۔ عام طور پر جو

لوگ کھاتے ہیں وہ نہیں کھاتا حتی کہ وہ غم وخوشی تک کو نہیں جانتا جب لوگ ہنستے ہیں تو وہ روتا ہے اور جب لوگ روتے ہیں تو وہ ہنستا ہے۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا میں اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں لوگوں نے کہا وہ جنگل میں ہمارے اونٹوں کے پاس رہتا ہے۔ چنانچہ حضرت فاروق اعظمؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ دونوں اٹھ کر چل دیئے۔ یہاں تک کہ دونوں حضرت اویس قرنی کے پاس پہنچے وہ نماز میں مصروف تھے انتظار میں بیٹھ گئے جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو سلام عرض کیا اور دونوں نے ان کی ہتھیلی اور پہلو پر نشان دیکھے اور جب حضور ﷺ کی بیان کردہ نشانیوں کو پہچان لیا تو دعا کے خواستگار ہو کر حضور اکرم ﷺ کا سلام اور امت کے لئے دعا کی وصیت پہنچائی۔ کچھ دیر یہ دونوں ان کے پاس بیٹھے رہے پھر حضرت اویسؓ نے کہا۔ آپ نے بڑی تکلیف و زحمت فرمائی اب جائیے قیامت نزدیک ہے وہاں ہمیں ایسا دیدار نصیب ہوگا جو کبھی منقطع نہ ہو گا۔ اب میں قیامت کا راستہ بنانے اور اسے صاف کرنے میں مشغول ہوں۔ ان دونوں امیروں کی ملاقات سے اہلِ قرن کو معلوم ہو گیا کہ بظاہر یہ دیوانہ آدمی کون ہے؟ چنانچہ وہ لوگ ان کی بہت عزت اور قدر و منزلت کرنے لگے۔ اس واقعہ کے بعد حضرت اویس قرنی وہاں سے کوچ کر کے کوفہ چلے گئے۔ کوفہ میں انھیں صرف ہرم بن حبان نے ایک مرتبہ دیکھا۔ یہاں تک کہ جنگ صفین میں حضرت علی مرتضیٰ کی حمایت میں جہاد کے لئے نکلے اور لڑتے ہوئے جام شہادت نوش فرمایا۔ ''عاش حمیداً ومات شہیداً'' پسندیدہ زندگی گزاری اور شہادت کی موت پائی۔

حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ ''السلامۃ فی الوحدۃ'' وحدت میں سلامتی ہے۔ اس لئے کہ جس کا دل تنہا ہو وہ غیر کے فکر و اندیشہ سے بے پرواہ، ہر حال میں مخلوق سے کنارہ کش اور ان آفتوں سے محفوظ رہتا ہے۔ لیکن اگر یہ سمجھے کہ تنہائی کی زندگی گزارنا محال ہے تو وہ جان لے کہ اس کے دل پر شیطان کا تسلط ہے اور اس کے سینہ میں نفس کا غلبہ ہے۔ حالانکہ جس وقت دنیا و آخرت کی فکر اور خلق کا اندیشہ اس کے دماغ میں موجود ہے اس وقت تک وحدت و تنہائی سے ہمکنار نہیں ہوسکتا اس لئے کہ کسی خاص چیز سے راحت پانا اور اس کی فکر رکھنا ایک ہی چیز ہے جسے خلوت گزینی اور تنہائی کی عادت ہوگئی وہ اگرچہ مجلس میں بیٹھا ہو مگر اس کی وحدت میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ اور جو شخص کسی اور خیال میں غرق ہوا گرچہ وہ خلوت میں ہو تو یہ خلوت اسے فارغ نہیں کرتی۔ معلوم ہوا کہ انسانوں سے جدا ہونا محبت الٰہی نہیں ہے لیکن جسے

محبتِ الٰہی حاصل ہو جائے اس کیلئے انسانوں سے ملنا جلنا ضروری نہیں ہے۔ اور جسے انسانوں سے محبت ہے اس کے دل میں خدا کی دوستی کا گزر نہیں ہوتا بلکہ اسے محبت الٰہی کی ہوا تک نہیں لگتی ''لان الوحدۃ صفۃ عبد صافٍ'' اس لئے کہ وحدت صاف دل بندہ کی صفت ہے۔ سنو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

الیس اللّٰہ بکافٍ عبدہ''	کیا اللہ بندے کے لئے کافی نہیں۔

(۲) حضرت ہرم بن حبان رضی اللہ عنہ

طبقہء تابعین کے ائمہ طریقت میں سے منبع صفا، معدن وفا حضرت ہرم بن حبان رضی اللہ عنہ ہیں جو اکابر طریقت میں سے ہیں۔ آپ کو طریقت و معرفت میں کمالِ دسترس حاصل تھی۔ صحابہ کرام کی مجلسوں میں رہے ہیں۔ آپ نے جب حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ سے ملاقات کرنے کا ارادہ کیا تو قرن پہنچے لیکن وہ وہاں سے کوچ کر کے جا چکے تھے۔ نا امید ہو کر واپس آ گئے۔ پھر پتہ چلا کہ کوفہ میں ہیں۔ تو کوفہ پہنچے مگر طویل عرصہ تک ملاقات نہ ہو سکی مایوس ہو کر بصرے جانے کا ارادہ کیا تو اچانک فرات کے کنارے جبہ پہنے وضو کرتے مل گئے۔ دیکھتے ہی پہچان لیا جب کنارہ فرات سے باہر آ کر ریشِ مبارک میں کنگھی کی تو حضرت ہرم بن حبان نے آگے بڑھ کر سلام عرض کیا۔ انھوں نے جواب دیا ''وعلیک السلام یا ہرم بن حبان'' حضرت ہرم بن حبانؓ نے دریافت کیا آپ نے مجھے کیسے پہچانا؟ انھوں نے کہا'' عرفت روحی روحک '' میری روح نے تمہاری روح کو پہچان لیا، کچھ عرصہ قیام کے بعد انھیں واپس کر دیا۔

حضرت ہرمؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما سے میری اکثر باتیں ہوئی ہیں۔ حضرت اویس قرنیؓ نے مجھے بروایت حضرت عمر فاروقؓ، حضور اکرم ﷺ کی یہ حدیث سنائی کہ

انما الاعمال بالنیات ولکل امرئٍ ما نوی (آخر تک) یعنی حقیقت یہ ہے کہ ہر عمل کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کو وہی ثمرہ ملتا ہے جس کی وہ نیت کرے۔ جس نے خدا اور رسول کی طرف ہجرت کی تو اس کی ہجرت خدا و رسول ہی کی طرف ہو گی۔ اور جس نے دنیا کی طرف ہجرت کی اسے وہی ملے گی۔ اگر بیوی کی خواہش کی تو اس سے نکاح کر لے گا۔ اس کی ہجرت اس کیلئے ہے جس کی وہ نیت کرے۔ اس کے بعد حضرت اویس قرنی نے مجھے نصیحت کی کہ

"علیک بقلبک" تم پر فرض ہے کہ اپنے دل کی نگہداشت کرو تا کہ کسی غیر کی فکر میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔

دلوں کی حفاظت کا طریقہ اس نصیحت کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ دل کو ریاضت و مجاہدے کے ذریعہ حق تعالیٰ کی اطاعت پر لگائے رکھے دوسرے یہ کہ خود کو دل کے تابع کرو۔ یہ دونوں اصول قوی ہیں۔ دل کو حق کے تابع کرنا ارادتمندوں کا کام ہے تا کہ خواہشات کی کثرت اور ہوائے نفس کی محبت سے دل محفوظ رہے اور تمام ناموافق خطرات اور اندیشے دل سے نکال پھینکے۔ اور اس کی درستگی و حفاظت کی تدبیر میں مشغول ہو کر حق تعالیٰ کے نشانِ قدرت پر نظر رکھے۔ تا کہ دل خدا کی محبت کی آماجگاہ بن جائے۔ اور خود کو دل کے تابع کرنا کاملوں کا کام ہے کیونکہ حق تعالیٰ ان کے دلوں کو نورِ جمال سے منور کر کے، تمام اسباب و علل سے پاک وصاف بنا کر مقام بلند اور درجہ رفیعہ پر فائز کر دیتا ہے اور ان کے جسموں کو خلعتِ قرب سے نواز دیتا ہے اور اپنے لطائف و تجلیات کی روشنی سے انھیں منور کر دیتا ہے اور مشاہدۂ قرب سے سرفراز کرتا ہے۔ جس وقت کامل کی ایسی حالت ہو جائے اس وقت اُسے خود کو دل کے تابع اور اس کے موافق کر دینا چاہئے گویا پہلی صفت کے حضرات، صاحب القلوب، مالک القلوب اور باقی الصفت، مغلوب القلوب، اور فانی الصفت، ہوتے ہیں۔ اس مسئلہ کی اصل و حقیقت یعنی دلیل و حجت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ الا عبادك منهم المخلصين (مگر یہ کہ ان میں سے تیرے مخلص بندے) اس میں دو قراءت ہیں۔ ایک یہ کہ مخلصین لام کے زیر سے اور دوسری مخلصین لام کے زبر سے۔ مخلص اسم فاعل ہے جو کہ باقی الصفت ہیں۔ اور مخلص اسم مفعول ہے جو کہ فانی الصفت ہے۔ انشاء اللہ کسی اور مقام پر اس مسئلہ کو بیان کروں گا۔

وہ حضرات جو فانی الصفت ہیں وہ زیادہ جلیل القدر ہیں۔ اس لئے کہ انھوں نے خود کو دل کے تابع اور اس کے موافق بنا رکھا ہے۔ اور ان کے دل حق تعالیٰ کے سپرد ہیں۔ اور ان میں حق تعالیٰ ہی جلوہ گر ہے۔ وہ اس کے مشاہدہ میں قائم ہیں۔ لیکن وہ حضرات جو باقی الصفت ہیں وہ دل کو بکوشش امر حق کے موافق بناتے ہیں۔ اس مسئلہ کی بنیاد ہوش و مستی اور مشاہدہ و مجاہدہ پر ہے۔ واللہ اعلم

(۳) حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ

طبقہ تابعین کے ائمہ طریقت میں سے، امامِ عصر، یگانہ زمانہ، حضرت ابو علی الحسن بصری رضی اللہ عنہ ہیں۔ بعض علماء ان کی کنیت ابو محمد بتاتے ہیں اور بعض ابو سعید۔ اہلِ طریقت کے درمیان آپ کی بڑی قدر و منزلت ہے۔ علم سلوک میں آپ کے لطیف اشارات ہیں۔

حکایت ایک مرتبہ حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ نے ایک دیہاتی کے سوال پر فرمایا صبر دو طریق پر ہوتا ہے۔ ایک مصیبت و بلا پر صبر کرنا اور دوسرا ان پر صبر کرنا جن کے نہ کرنے کا حکم حق تعالےٰ نے دیا ہے۔ جن چیزوں کے پیچھے چلنے سے حق تعالےٰ نے ہمیں منع کیا ہے انھیں نہ کریں اس پر دیہاتی نے کہا "انت زاھد مارأیت ازھد منك" آپ سراپا زاہد ہیں میں نے آپ سے بڑھ کر کسی زاہد کو نہیں دیکھا۔ حضرت حسن بصری نے فرمایا اے بندۂ خدا! میرا زہد مرغوب چیزوں میں ہے اور میرا صبر اضطرار و بیقراری میں ہے۔ دیہاتی نے کہا اس ارشاد کی وضاحت فرمائیں۔ کیونکہ میرا اعتقاد متزلزل ہو گیا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ بلاؤں پر میرا صبر کرنا اور منع کردہ چیزوں سے کنارہ بر بنائے اطاعت ہے اس لئے کہ یہ آتشِ دوزخ کے خوف سے ہے۔ اور اضطرار و بیقراری ہے۔ اور دنیا میں جو میرا زہد ہے وہ آخرت کی رغبت کی وجہ سے ہے اور یہ عین رغبت ہے۔ خوشی و مسرت کا موجب تو یہ ہے کہ دنیا میں اپنے نصیب پر قناعت کرے اور اسی کو حاصل کرے تاکہ صبر حق تعالیٰ کے لئے ہو نہ یہ کہ اپنے جسم کو آتشِ دوزخ سے بچانے کے لئے ہو۔ اور اپنا زہد خالص اللہ تعالےٰ کے لئے ہو نہ یہ کہ جنت میں جانے کی خواہش کے لئے ہو۔ یہ صحتِ اخلاص کی نشانی و علامت ہے۔

بدوں کی صحبت سے پرہیز حضرت حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "ان صحبة الاشرار تورث سوء الظن بالاخیار" بدوں کی صحبت، نیکوں سے بدگمانی پیدا کرتی ہے۔ یہ نصیحت بالکل صحیح و درست ہے اور موجودہ لوگوں کے حال کے عین مطابق ہے۔ مقبولانِ بارگاہ کے تمام منکروں پر صادق ہے، عام بدظنی و انکار کی وجہ یہی ہے کہ لوگ نقلی صوفیوں کی صحبت اختیار کرتے ہیں اور جب ان سے خیانت، جھوٹ اور غیبت وغیرہ کا صدور ہوتا ہے وہ کھیل کود اور بیہودہ پن کے شائق ہوتے ہیں لغویات و خواہشات اور شہوتوں کے دلدادہ ہوتے ہیں، اور حرام و مشتبہ مال کے جمع کرنے میں حریص ہوتے ہیں تو لوگ یہی سمجھنے لگتے ہیں کہ تمام صوفی ایسے ہی ہوتے ہوں

گے۔ اور تمام صوفیوں کا یہی مذہب ہوگا۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے بلکہ صوفیاء کے تمام افعال طاعتِ الٰہی میں ہوتے ہیں۔ اور محبتِ الٰہی سے بھرپور ان کی زبانوں پر کلمہء حق ہوتا ہے، ان کے قلوب، محبتِ الٰہی کی جگہ ان کے کان کلامِ حق سننے کا مقام، اوران کی آنکھیں مشاہدہ ٔجمالِ الٰہی کی جگہ ہوتی ہیں۔ جو کوئی خیانت کا مجرم ہوتا ہے وہ اس کا مواخذہ دار ہوگا۔ یہ نہیں کہ جہان بھر کے بزرگوں اوراکابر کو ایک سا سمجھا جائے۔ جو بدوں کی صحبت اختیار کرتا ہے دراصل خود اس میں ہی بدی کے جراثیم ہوتے ہیں۔ اگر اس کے دل میں نیکی و بھلائی کا مادہ ہوتا تو وہ نیکوں کی صحبت اختیار کرتا اس لئے وہی شخص مستحق ملامت ہے جو نالائق اور نااہلوں کی صحبت اختیار کرتا ہے۔ ایک وجہ انکار یہ بھی ہوتی ہے کہ جب صوفیاء کو اپنی خواہشِ نفس کے خلاف پاتے ہیں تو ان کے مقاماتِ بلند سے انکار کرنے لگتے ہیں یا منکروں کے ہم زبان ہو جاتے ہیں۔ اہلِ معرفت، صوفیاء کرام کے انکار کرنے والے لوگ، مخلوقِ خدا میں شریر تر اور غایت درجہ ذلیل و کمینہ ہوتے ہیں کیونکہ صوفیا کا طریقہ جہان بھر میں برگزیدہ ہے اوران کی برکتوں سے دونوں جہان کی مرادیں حاصل ہوتی ہیں۔ یہ حضرات تمام جہان میں ممتاز ہیں۔ اسی معنی میں یہ شعر ہے

فلا تحقرن نفسی وانت حبیبها

فکل امریء یصبه الیٰ من یجانس

تم میرے نفس کو حقیر نہ جانو، وہ تمہارا محبوب ہے

ہر شخص کو اپنے ہی ہم جنسوں سے مراد حاصل ہوتی ہے

(۴) حضرت سعید ابن المسیب رضی اللہ عنہ

طبقہ تابعین کے ائمہء طریقت میں سے، رئیس العلماء، فقیہ الفقہا، حضرت سعید ابن المسیب رضی اللہ عنہ عظیم المرتبت، رفیع المنزلت، ہردلعزیز اور سیرت و خصائل میں عمدہ ترین تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، لغت، شعر، توحید، نعت اور علم حقائق میں آپ کا بڑا مرتبہ ہے۔ وہ ظاہر میں ہوشیار اور طبیعت میں نیک سیرت تھے۔ یہ خوبی تمام مشائخ کے نزدیک محمود و مسعود ہے۔

آپ فرماتے ہیں "ارض بالیسر من الدنیا مع سلامة دینك كما رضی قوم بكثیرها مع ذهاب دینهم " اے مردِ مسلمان اپنی اس تھوڑی سی دنیا پر جو تجھے دین کی سلامتی کی ساتھ حاصل ہوئی ہے اس پر قناعت کر۔ جس طرح عام لوگ اپنا دین کھو کر مال کی زیادتی پر

خوش ہوتے ہیں۔ اگر فقر میں دین کی سلامتی ہے تو یہ اس تونگری سے بہتر ہے جس میں غفلت بھی ہو اور دین بھی جاتا رہے۔ اس لئے کہ سلامتی ایمان کے ساتھ جب فقیر اپنے دل کی طرف خیال کرتا ہے تو مال و دنیا سے اسے خالی پاتا ہے اور جو میسر آتا ہے اسی پر قناعت کرتا ہے۔ اور تونگر جب اپنے دل کی طرف خیال کرتا ہے تو اسے ہر دم مال کی طمع و زیادتی میں فکر مند پاتا ہے اور وہ حصول دنیا کی خاطر ہر طرف ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ لہٰذا محبوبان خدا کی ہر آن نظر، حق تعالیٰ کی رضا پر رہتی ہے اور غافلوں کی نظر ہمیشہ اُس دُنیا پر رہتی ہے جو غرور و آفت سے بھرپور ہے۔ حسرت و ندامت، ذلت و معصیت سے بہتر ہے۔ غافلوں پر جب بلا و مصیبت نازل ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہمارے جسم محفوظ رہے۔ اور جب محبوبانِ خدا پر آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ الحمد للہ ہمارے دین پر نہیں آئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب جسم پر بلا کا نزول ہو اور دل میں بقا ہو تو وہ جسم پر نزولِ بلا سے خوش ہوتے ہیں۔ اور اگر دل میں غفلت ہے اگرچہ جسم عیش و عشرت میں ہو تو یہ موجبِ ذلت ہے۔ درحقیقت مقام رضا یہ ہے کہ کم دُنیا کو زیادہ اور زیادہ دنیا کو کم سمجھے۔ اس لئے کہ اس کی کمی اس کی زیادتی کی مانند ہے۔

حضرت سعید ابن المسیب ایک مرتبہ مکہ مکرمہ میں تھے کسی نے آکر پوچھا مجھے ایسا حلال بتائیے جس میں حرام کا شائبہ نہ ہو اور ایسا حرام بتائیے جس میں حلال کا شائبہ نہ ہو تو۔ آپ نے جواب دیا ''ذکر اللّٰہ حلال لیس فیہ حرام و ذکر غیرہ حرام لیس فیہ حلال '' ذکر الٰہی ایسا حلال ہے جس میں کسی حرام کا شائبہ نہیں اور غیر اللہ کا ذکر ایسا حرام ہے جس میں ذرہ بھر حلال نہیں۔ اسی لئے ذکر اللہ میں نجات ہے اور ذکرِ غیر میں ہلاکت ہے۔ و باللہ التوفیق۔

طبقۂ تبع تابعین اور دیگر متقدمین کے ائمۂ طریقت

(۱) حضرت حبیب عجمی رحمہ اللہ

ائمۂ طریقت میں سے، شجاع طریقت متمکن در شریعت حضرت حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ ہیں آپ بلند ہمت، مردِ خدا، اور صاحبِ کمال بزرگ ہیں۔ آپ نے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر توبہ فرمائی۔ اس سے قبل آپ میں ریا و فساد بہت تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے سچی توبہ کی توفیق عطا فرمائی۔ آپ نے عرصہ تک حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے علم و طریقت کی تحصیل فرمائی۔ چونکہ آپ عجمی تھے عربی زبان پر عبور حاصل نہ ہوا مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو مقرب بنا کر متعدد کرامتوں سے سرفراز فرمایا۔ ایک رات حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا ان کی خانقاہ کی طرف گزر ہوا۔ آپ اقامت کہہ کر نماز مغرب شروع کر چکے تھے۔ حضرت حسن بصری نے ان کی اقتداء میں نماز نہ پڑھی کیونکہ صحیح تلفظ اور درست مخارج کے ساتھ تلاوت قرآن کریم پر آپ کو قدرت حاصل نہ تھی۔ حضرت حسن بصری جب رات کو سوئے تو دیدارِ الٰہی حاصل ہوا۔ آپ نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا رب العالمین تیری رضا کس چیز میں ہے؟ حق تعالیٰ نے فرمایا اے حسن! تو نے میری رضا تو پائی لیکن اس کی قدر نہ کی۔ آپ نے عرض کیا پروردگار وہ کونسی رضا ہے؟ حق تعالیٰ نے فرمایا اگر تو حبیب عجمی کی اقتدا میں نماز پڑھ لیتا تو صحت نیت اور معتبر عبادت کے انکار کے خطرے سے محفوظ رہتا اور تجھے رضائے الٰہی حاصل ہو جاتی۔

مشائخ طریقت میں یہ بات مشہور ہے کہ جب حضرت حسن بصریؒ حجاج کے ظلم سے بھاگ کر حضرت حبیب عجمی کی خانقاہ میں تشریف لائے اور حجاج کے سپاہی تعاقب کرتے ہوئے اندر گھس آئے تو سپاہیوں نے پوچھا اے حبیب! تم نے حسن بصری کو کہیں دیکھا ہے؟ فرمایا ہاں۔ سپاہیوں نے پوچھا۔ کس جگہ ہے؟ فرمایا میرے حجرے میں ہیں۔ وہ آپ کے حجرے میں گھس گئے لیکن وہاں کسی کو نہ پایا۔ سپاہیوں نے سمجھا کہ حبیب عجمی نے مذاق کیا ہے۔ اس پر انھوں نے درشت کلامی کے ساتھ پوچھا سچ بتاؤ وہ کہاں ہیں؟ انھوں نے قسم کھا کر فرمایا میں سچ کہتا ہوں وہ

میرے حجرے میں ہیں سپاہی دو تین بار اندر گئے آئے مگر وہ حسن بصری کو نہ دیکھ سکے۔ بالآخر وہ چلے گئے۔ جب حسن بصری حجرے سے باہر تشریف لائے تو فرمایا اے حبیب میں سمجھ گیا کہ حق تعالیٰ نے آپ کی برکت سے ان ظالموں کے پنجہ سے مجھے محفوظ رکھا۔ لیکن اس کی وجہ بتائیے کہ آپ نے یہ کیوں فرمایا کہ وہ اس حجرے میں ہیں۔ حضرت حبیب عجمی نے جواب دیا۔ اے میرے مرشدِ برحق! اللہ تعالےٰ نے آپ کو میری برکت کی وجہ سے ظاہر نہیں کیا بلکہ سچ بولنے کی وجہ سے خدا نے ان سے مخفی رکھا۔ اگر جھوٹ کہتا تو اللہ تعالےٰ مجھے اور آپ دونوں کو رسوا کرتا۔ اس قسم کی بکثرت کرامتیں آپ سے منسوب ہیں۔

حضرت حبیب عجمی رحمتہ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا کس چیز میں رضائے الٰہی ہے؟ آپ نے فرمایا ''فی قلب لیس فیہ غبار النفاق'' ایسے دل میں جہاں نفاق کا غبار تک نہ ہو۔ کیونکہ نفاق، وفاق کے خلاف ہے اور رضا، عینِ وفاق ہے اور یہ کہ محبت کو نفاق سے دور کا بھی علاقہ نہیں ہے۔ اور نہ وہ محل رضا ہے۔ محبانِ الٰہی کی صفت، رضا ہے اور دشمنانِ خدا کی صفت، نفاق۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ دوسری جگہ آئے گی۔

وباللہ التوفیق ومنہ العون۔

(۲) حضرت مالک بن دینار رحمتہ اللہ علیہ

ائمہ طریقت میں سے ایک بزرگ، امامِ طریقت، نقیب اہلِ محبت، جن وانس کی زینت حضرت مالک بن دینار رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے مصاحب و مرید ہیں۔ طریقت میں آپ کا بلند مقام ہے۔ آپ کی کرامتیں اور ریاضتیں مشہور و معروف ہیں۔

آپ کے والد کا نام دینار تھا جو کہ غلام تھے آپ غلامی کی حالت میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کی توبہ کا واقعہ یہ ہے کہ ایک رات آپ ایک جماعت کے ساتھ محفلِ رقص و سرود میں تھے جب تمام لوگ سو گئے تو اس طنبورہ سے جسے بجایا جارہا تھا آواز آئی ''یا مالک مالک ان تتوب'' اے مالک کیا بات ہے توبہ میں دیر کیوں ہے؟ آپ نے اپنے تمام دوست واحباب کو چھوڑ کر اور حضرت حسن بصریؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر سچی توبہ کی۔ اور اپنا حال درست کر کے ثابت قدم رہے۔ اس کے بعد آپ کی شان اس قدر بلند ہوئی کہ ایک مرتبہ جب آپ کشتی میں سفر کر رہے تھے ایک

تاجر کا موتی کشتی میں گم ہوگیا۔ باوجودیکہ آپ کو علم تک نہ تھا لیکن تاجر نے آپ پر سرقہ کی تہمت لگائی آپ نے آسمان کی طرف منہ اٹھایا اسی لحہ دریا کی تمام مچھلیاں منہ میں موتی دبائے سطحِ آب پر ابھر آئیں آپ نے ان میں سے ایک موتی لے کر تاجر کو دے دیا اور خود دریا میں اتر گئے اور پانی پر سے گزر کر کنارے پر پہنچ گئے۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا" احب الاعمال علی الاخلاص فی الاعمال " میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب عمل میں اخلاص ہے۔ کیونکہ اخلاص کے ساتھ عمل کرنا ہی تو واقعی عمل ہے۔ اسلئے کہ عمل کے لئے اخلاص کا درجہ ایسا ہے جیسے جسم کے لئے روح۔ جس طرح بغیر روح کے جسم پتھر و جماد ہے۔ اسی طرح بغیر اخلاص کے عمل، ریت کا تودہ ہے۔ اخلاص باطنی اعمال کے قبیل سے ہے۔ اور طاعات و نیکیاں ظاہری اعمال کے قبیل سے۔ ظاہری اعمال کی تکمیل باطنی اعمال کی موافقت پر موقوف ہیں۔ اور اعمالِ باطنہ، ظاہری اعمال کے ساتھ ہی قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ہزار برس تک دل سے مخلص رہے جب تک اخلاص کے ساتھ عمل کو نہ ملائے وہ مخلص نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ہزار برس تک ظاہری عمل کرتا رہے لیکن جب تک وہ ظاہری عمل کے ساتھ اخلاص کو نہ ملائے گا وہ عمل نیکی نہیں بن سکتا۔

(۳) حضرت حبیب بن اسلم راعی رحمہ اللہ

ائمہ طریقت میں سے ایک بزرگ، فقیر کبیر، تمام ولیوں کے امیر، ابو حلیم حضرت حبیب بن اسلم راعی رحمہ اللہ ہیں۔ مشائخ کبار میں آپ کو بڑی قدر و منزلت ہے۔ تصوف کے تمام احوال میں بکثرت دلائل و شواہد آپ سے مذکور ہیں۔ آپ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مصاحب ہیں آپ سے ایک حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" نیۃ المومن خیر من عملہ " مومن کی نیت اس کے عمل سے افضل ہے۔

آپ بکریاں پالتے تھے اور فرات کے کنارے چرایا کرتے تھے۔ آپ کا مسلک خلوت گزینی تھا۔ ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرا گزر اس طرف ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ آپ تو نماز میں مشغول ہیں اور بھیڑیا ان کی بکریوں کی رکھوالی کر رہا ہے۔ میں ٹھہر گیا کہ اس بزرگ کی زیارت سے مشرف ہونا چاہئے جن کی بزرگی کا کرشمہ آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ بڑی دیر تک انتظار میں کھڑا رہا یہاں تک کہ جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے سلام عرض

کیا۔ آپ نے جواب سلام کے بعد فرمایا کس کام سے آئے ہو؟ میں نے عرض کیا بغرض زیارت۔ فرمایا "جزاك الله"۔ اس کے بعد میں نے عرض کیا یا حضرت! آپ کی بکریوں سے بھیڑیئے کو ایسا لگاؤ ہے کہ وہ ان کی حفاظت کر رہا ہے۔ فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ بکریوں کے چرواہے کو حق تعالےٰ سے دلی ربط ہے یہ فرما کر آپ نے لکڑی کے پیالے کو پتھر کے نیچے رکھ دیا۔ پتھر سے دُو چشمے جاری ہوئے ایک دودھ کا دوسرا شہد کا۔ پھر فرمایا نوش کرو۔ میں نے عرض کیا آپ نے یہ مقام کس طرح پایا؟ آپ نے جواب دیا سید عالم ﷺ کی متابعت کے ذریعہ اے فرزند! حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم اگرچہ ان کی مخالف تھی لیکن پتھر نے انھیں پانی دیا۔ حالانکہ موسیٰ علیہ السلام، حضور سید عالم ﷺ کے درجہ میں نہ تھے جب کہ میں حضور اکرم ﷺ کا ایک فرمانبردار ہوں تو یہ پتھر مجھے دودھ اور شہد کیوں نہ دے گا۔ کیونکہ حضور اکرم ﷺ موسیٰ علیہ السلام سے افضل ہیں۔ پھر میں نے عرض کیا مجھے کچھ نصیحت فرمائیے۔ آپ نے فرمایا "لا تجعل قلبك صندوق الحرص و بطنك وعاء الحرام" یعنی اپنے دل کو حرص کی کوٹھری اور اپنے پیٹ کو حرام کی گٹھری نہ بنانا۔ کیونکہ لوگوں کی ہلاکت انھیں دُو چیزوں میں مضمر ہے اور ان کی نجات ان سے دور رہنے میں ہے۔

حضرت شیخ مذکور کے اور بھی بکثرت احوال و روایات ہیں اس وقت اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ کیونکہ جب میں ملتان کے علاقہ بھنور میں دشمنوں کے چنگل میں محصور تھا تو میری کتابیں غزنی میں رہ گئی تھیں۔

(۴) حضرت ابو حازم مدنی رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین میں سے ایک بزرگ، امام طریقت، پیر صالح حضرت ابو حازم مدنی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ مشائخ کرام کے پیشوا اور سلوک و معرفت میں کامل دسترس رکھتے ہیں۔ فقر میں بزرگ اور صادق قدم تھے۔ مجاہدات میں بڑی محنت و مشقت برداشت کیا کرتے تھے۔ حضرت عمرو بن عثمان مکی رحمتہ اللہ علیہ کو آپ کی صحبت کا شرف حاصل ہے۔ آپ کا کلام مقبول اور تمام کتابوں میں مذکور ہے۔ یہی حضرت عمرو بن عثمان روایت کرتے ہیں کہ کسی نے آپ سے پوچھا "مالك" یعنی آپ کی پونجی کیا ہے؟ "قال الرضا عن الله والغنٰی عن الناس" فرمایا میری پونجی خدا کی رضا اور لوگوں سے بے نیازی ہے۔ بلاشبہ جو شخص حق تعالیٰ سے راضی ہوگا

وہ لوگوں سے مستغنی ہو جائیگا کیونکہ اس کیلئے سب سے بڑا خزانہ تو خدا کی رضا ہی ہے غنا سے ان کی مراد حق تعالیٰ سے غنا ہے جو شخص حق تعالیٰ سے مستغنی ہو جاتا ہے وہ غیروں سے بے پرواہ ہو جاتا ہے۔ وہ اس کے در کے سوا کسی اور در کو جانتا ہی نہیں۔ اور ظاہر و باطن، کسی حالت میں خدا کے سوا کسی کو پکارتا ہی نہیں۔

ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے اُن کو سوتا پایا۔ چنانچہ میں انتظار میں بیٹھ گیا۔ جب وہ بیدار ہوئے تو فرمایا میں نے خواب میں اس وقت رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی ہے۔ حضور ﷺ نے تمہارے لئے مجھے پیغام دیا ہے کہ ماں کے حق کی حفاظت کرنا حج کرنے سے بہتر ہے لوٹ جاؤ ماں کو خوش رکھو۔ میں واپس آ گیا اور مکہ مکرمہ حاضر نہ ہوا۔ میں نے اس سے زیادہ ان کے اقوال نہیں سُنے۔

(۵) حضرت محمد بن واسع رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین میں سے ایک بزرگ، امام طریقت، داعیِ اہلِ مجاہدہ، قائم فی المشاہدہ حضرت محمد بن واسع رحمہ اللہ ہیں۔ آپ یگانۂ روزگار، بکثرت تابعین کے صحبت یافتہ تھے۔ اور اکثر مشائخِ متقدمین نے بھی آپ سے ملاقات کی ہے۔ اور آپ سے طریقت کے حقائق، انفاس عالیہ اور اشاراتِ کاملہ بکثرت منقول ہیں۔ چنانچہ آپ نے فرمایا "ما رأیت شیئا الا ورأیت اللّٰہ فیہ "یعنی میں نے کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی جس میں مجھے خدا کا جلوہ نظر نہ آیا ہو۔ یہ مقام مشاہدہ کا ہے کیونکہ بندہ فاعل حقیقی کی محبت میں اس حد تک فائز ہو جاتا ہے کہ وہ جب بھی کسی فعل کو دیکھتا ہے تو اسے فعل نظر نہیں آتا بلکہ فاعل ہی نظر آتا ہے۔ جس طرح کوئی شخص تصویر کو دیکھ کر تصویر بنانے والے کے کمال کو دیکھتا ہے اس کلام کی اصل و حقیقت حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے اس قول مبارک پر ہے۔ جبکہ انھوں نے چاند ستارے اور آفتاب کو دیکھ کر کہا تھا "ھٰذا ربی" "یہ میرا رب ہے یہ آپ کے غلبۂ شوق الٰہی کا حال ہے کہ انھوں نے جو کچھ بھی دیکھا اس میں محبوب ہی کی صفت کا جلوہ دیکھا۔ اس لئے کہ محبوبانِ خدا، جب کسی چیز پر نظر ڈالتے ہیں تو انھیں جہان کی ہر چیز اس کے قہر کا مقہور اس کے غلبہ کا اسیر نظر آتی ہے۔ اور ہستی کے وجود کو اس کے فاعل کی قدرت کے

پہلو میں پراگندہ دیکھتے ہیں وہ مفعول کو نہیں دیکھتے بلکہ فاعل کو دیکھتے ہیں۔ اور تکوین کی حالت میں ناچیز نظر آتے ہیں۔ جب حالتِ اشتیاق میں اس پر نظر پڑتی ہے تو ان کی نظر مقہور یعنی کائنات پر نہیں پڑتی بلکہ قاہر یعنی کائنات کے بنانے والے ہی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اس لئے ان کی نظر مفعول پر نہیں ہوتی بلکہ فاعل ہی کے مشاہدے میں ہوتی ہے۔ مخلوق نظر ہی نہیں آتی بلکہ خالق کا جلوہ سامنے ہوتا ہے۔ مزید تفصیل انشاء اللہ تعالےٰ مشاہدے کے باب میں آئے گی۔

ایک گروہ سے اس مقام میں غلطی واقع ہوئی ہے وہ ''رأیت اللّٰہ فیہ'' کا مفہوم یہ لیتے ہیں کہ میں نے اس میں اللہ کو دیکھا۔ ان کا یہ مفہوم لینا مکان اور تجزی یعنی جز وحلول کا اقتضا کرتا ہے حالانکہ یہ صریح کفر ہے۔ اس لئے کہ مکان اور جو مکان میں ہو دونوں ایک جنس کے ہوتے ہیں۔ اگر کوئی یہ فرض کرے کہ مکان مخلوق ہے تو لازم ہے کہ جو مکان میں ہوگا وہ بھی مخلوق ہی ہوگا۔ اور اگر یہ فرض کیا جائے کہ جو مکان میں متمکن ہے وہ قدیم ہے تو لازم ہے کہ وہ مکان بھی قدیم ہی ہوگا۔ بہر طور دونوں نظریات فاسد ہیں۔ خواہ مخلوق کو قدیم کہا جائے یا خالق کو حادث۔ یہ دونوں باتیں کفر ہوں گی لہٰذا کسی چیز میں اس کی رویت اسی معنی میں ہے جسے ابتداء میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اس میں اور لطائف ہیں جو کسی اور جگہ لکھے جائیں گے۔ انشاءاللہ۔

(۶) امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رضی اللہ عنہ

تبع تابعین میں سے امام طریقت امام الائمہ، مقتدائے اہل سنت، شرفِ فقہا، عز علماء سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت خزاری رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ عبادات و مجاہدات اور طریقت کے اصول میں عظیم الشان مرتبہ پر فائز ہیں۔ ابتدائی زندگی میں آپ نے لوگوں کے اژدہام سے کنارہ کش ہو کر گوشہ نشینی کا قصد فرمایا تاکہ لوگوں میں عزت وحشمت پانے سے دل کو پاک وصاف رکھیں۔ اور دن ورات اللہ تعالےٰ کی عبادت میں مصروف ومنہمک رہیں مگر ایک رات آپ نے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کے استخوان مبارک کو جمع کر رہے ہیں اور بعض کو بعض کے مقابلہ میں انتخاب کر رہے ہیں۔ اس خواب سے آپ بہت پریشان ہوئے اور حضرت محمد بن سیرین رضی اللہ عنہ کے ایک مصاحب سے اس خواب کی تعبیر دریافت کی انھوں نے جواب دیا کہ آپ رسول اللہ ﷺ کے علم مبارک اور آپ کی سنت کی حفاظت میں ایسے بلند

درجہ پر فائز ہوں گے گویا آپ ان میں تصرف کر کے صحیح وسقیم کو جدا جدا کریں گے۔ دوسری مرتبہ رسول کریم ﷺ کو خواب میں دیکھا حضور نے فرمایا اے ابوحنیفہ! تمہیں میری سنت کے زندہ کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تم گوشہ نشینی کا خیال دل سے نکال دو۔

آپ بکثرت مشائخ متقدمین کے استاد ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم بن ادہم، فضیل بن عیاض، داؤد طائی اور حضرت بشر حافی وغیرہ رحمہم اللہ نے آپ سے اکتسابِ فیض کیا ہے۔ علماء کے درمیان یہ واقعہ مشہور ہے کہ آپ کے زمانہ میں ابوجعفر المنصور خلیفہ تھا اس نے یہ انتظام کیا کہ چار علماء میں سے کسی ایک کو قاضی بنا دیا جائے۔ ان چاروں میں امام اعظم رحمہ اللہ کا نام بھی شامل تھا بقیہ تین فرد، حضرت سفیان ثوری، صلہ بن الشیم اور شریک رحمہم اللہ تھے۔ یہ چاروں بڑے متبحر عالم تھے۔ فرستادہ کو بھیجا کہ ان چاروں کو دربار میں لے کر آئے چنانچہ جب یہ چاروں یکجا ہو کر روانہ ہوئے تو راہ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا میں اپنی فراست کے مطابق ہر ایک کے لئے ایک ایک بات تجویز کرتا ہوں۔ سب نے کہا آپ جو تجویز فرمائیں گے درست ہی ہو گا۔ آپ نے فرمایا میں تو کسی حیلہ سے اس منصب قضا کو خود سے دور کر دوں گا صلہ بن الشیم خود کو دیوانہ بنا لیں، سفیان ثوری بھاگ جائیں اور شریک قاضی بن جائیں۔ چنانچہ حضرت سفیان ثوری نے اس تجوز کو پسند کیا اور راستے ہی سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ایک کشتی میں گھس کر کہنے لگے مجھے پناہ دو لوگ میرا سر کاٹنا چاہتے ہیں۔ اس کہنے میں ان کا اشارہ حضور اکرم ﷺ کے اس ارشاد کی طرف تھا کہ "من جعل قاضیا فقد ذبح بغیر سکین۔ جسے قاضی بنایا گیا اسے بغیر چھری کے ذبح کر دیا گیا۔ منصور نے امام اعظم کی طرف متوجہ ہو کر کہا آپ منصبِ قضا کے لئے بہت مناسب ہیں؟ امام اعظم نے فرمایا اے امیر! میں عربی نہیں ہوں۔ اس لئے سردارِ عرب میرے حاکم بننے پر راضی نہ ہوں گے۔ منصور نے کہا اوّل تو یہ منصب نسبت ونسل سے تعلق نہیں رکھتا یہ علم و فراست سے تعلق رکھتا ہے چونکہ آپ تمام علمائے زمانہ سے افضل ہیں اس لئے آپ ہی اس کے لئے زیادہ موزوں ولائق ہیں۔ امام اعظم نے فرمایا میں اس منصب کے لائق نہیں۔ پھر فرمایا میرا یہ کہنا کہ میں اس منصب کے لائق نہیں اگر سچ ہے تو میں اس کے لائق نہیں اور اگر جھوٹ ہے تو

جھوٹے کو مسلمانوں کا قاضی نہیں بنانا چاہیے۔ چونکہ تم خدا کی مخلوق کے حاکم ہو تو تمہارے لئے ایک جھوٹے کو اپنا نائب بنانا اور لوگوں کے اموال کا معتمد اور مسلمانوں کی ناموس کا محافظ مقرر کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس حیلہ سے آپ نے منصب قضا سے نجات پائی۔

اس کے بعد منصور نے حضرت صلہ بن الشیم کو بلایا۔ انھوں نے خلیفہ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا اے منصور تیرا کیا حال ہے اور تیرے بال بچے کیسے ہیں؟ منصور نے کہا یہ تو دیوانہ ہے اسے نکال دو۔ اس کے بعد حضرت شریک کی باری آئی ان سے کہا آپ کو منصب قضا ملنا چاہیئے۔ انھوں نے فرمایا میں سودائی مزاج کا آدمی ہوں اور میرا دماغ بھی کمزور ہے۔ منصور نے جواب دیا اعتدالِ مزاج کے لئے شربت وشیرے وغیرہ استعمال کرنا تاکہ دماغی کمزوری دور ہو کر عقل کامل حاصل ہو جائے۔ غرض یہ کہ منصب قضا حضرت شریک کے حوالہ کر دیا گیا۔ اور امام اعظم نے انھیں چھوڑ دیا اور پھر کبھی بات نہ کی۔ اس واقعہ سے آپ کا کمال دو حیثیت سے ظاہر ہے ایک یہ کہ آپ کی فراست اتنی ارفع واعلیٰ تھی کہ آپ پہلے ہی سب کی خصلت وعادت کا جائزہ لے کر صحیح اندازہ لگالیا کرتے تھے۔ اور دوسرے یہ کہ سلامتی کی راہ پر گامزن رہ کر خود کو مخلوق سے بچائے رکھنا تاکہ مخلوق میں ریاست وجاہ کے ذریعہ نخوت نہ پیدا ہو جائے یہ حکایت اس امر کی قوی دلیل ہے کہ اپنی صحت وسلامتی کے لئے کنارہ کشی بہتر ہے حالانکہ آج حصولِ جاہ ومرتبہ اور منصب قضا کی خاطر لوگ سرگرداں رہتے ہیں۔ کیونکہ لوگ خواہش نفسانی میں مبتلا ہو کر راہ حق وصواب سے دور ہو چکے ہیں۔ اور لوگوں نے امراء کے دروازوں کو قبلۂ حاجات بنا رکھا ہے اور ظالموں کے گھروں کو اپنا بیت المعمور سمجھ لیا ہے اور جابروں کی مسند کو "قاب قوسین او ادنی" کے برابر جان رکھا ہے جو بات بھی ان کی مرضی کے خلاف ہو وہ اس سے انکار کر دیتے ہیں۔

حکایت

غزنی میں ایک مدعی علم وامامت سے ملاقات ہوئی۔ اس نے کہا کہ گدڑی پہننا بدعت ہے۔ میں نے جواب دیا حشیشی اور دبیقی لباس جو کہ خالص ریشم کا ہوتا ہے جسے شریعت نے حرام قرار دیا ہے اس کو پہننا اور ظالموں کی منت وسماجت اور تملق وچاپلوسی کرنا تاکہ اموالِ حرام مطلق مل سکے کیا یہ جائز ہے؟ کیا شریعت نے اسے حرام نہیں کیا ہے؟ اسے بدعت کیوں نہیں کہتے؟ بھلا وہ لباس جو حلال ہو اور حلال مال سے بنا ہو وہ کیسے حرام ہو سکتا ہے۔ اگر تم پر نفس کی رعونت اور طبیعت کی ضلالت مسلط نہ ہوتی تو تم اس سے زیادہ پختہ بات کہتے۔ کیونکہ

ریشمی لباس عورتوں کے لئے حلال ہے اور مردوں پر حرام، اور جو دیوانے اور پاگل ہیں جن میں عقل وشعور نہیں ان کے لئے وہ مباح ہے۔ اگر ان دونوں باتوں کے قائل ہو کر خود کو معذور گردانتے ہو تو افسوس کا مقام ہے۔

حکایت سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت نوفل بن حبان رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو میں نے خواب میں دیکھا کہ قیامت برپا ہے اور تمام لوگ حساب گاہ میں کھڑے ہیں۔ میں نے حضور اکرم ﷺ کو دیکھا کہ آپ حوضِ کوثر کے کنارے کھڑے ہیں اور آپ کے دائیں بائیں بہت سے بزرگ موجود ہیں۔ میں نے دیکھا کہ ایک بزرگ جن کا چہرہ نورانی اور بال سفید ہیں حضور ﷺ کے رخسار مبارک پر اپنا رخسار رکھے ہوئے ہیں۔ اور ان کی برابر حضرت نوفل موجود ہیں جب حضرت نوفل نے مجھے دیکھا تو وہ میری طرف تشریف لائے۔ اور سلام کیا۔ میں نے ان سے کہا مجھے پانی عنایت فرمائیں۔ انھوں نے فرمایا میں حضور ﷺ سے اجازت لے لوں۔ پھر حضور نے انگشت مبارک سے اجازت مرحمت فرمائی اور انھوں نے مجھے پانی دیا۔ اس میں سے کچھ پانی تو میں نے پیا اور کچھ اپنے رفقاء کو پلایا لیکن اس پیالہ کا پانی ویسا کا ویسا ہی رہا کم نہیں ہوا۔ پھر میں نے حضرت نوفل سے پوچھا حضور ﷺ کی داہنی جانب کون بزرگ ہیں؟ فرمایا یہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام ہیں اور حضور کی بائیں جانب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں۔ اسی طرح میں معلوم کرتا رہا یہاں تک کہ سترہ بزرگوں کی بابت دریافت کیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو ہاتھ کی انگلیاں سترہ کے عدد پر پہنچ چکی تھیں۔

حکایت حضرت یحییٰ بن معاذ رازی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو خواب میں دیکھا تو میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ این اطلبك" "اے اللہ کے رسول آپ کو (روز قیامت) کہاں تلاش کروں؟" قال عند علم ابی حنیفة "فرمایا ابوحنیفہ کے علم میں (یا) ان کے جھنڈے کے پاس۔

حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ کا ورع اور آپ کے فضائل ومناقب اس کثرت سے منقول ومشہور ہیں کہ اُن سب کے بیان کی یہ کتاب متحمل نہیں ہوسکتی۔

حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ملکِ شام میں مسجدِ نبوی شریف میں موذن حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کے روضہء مبارک کے سرہانے سویا ہوا تھا۔ خواب میں دیکھا کہ میں مکہ مکرمہ میں ہوں اور حضور اکرم ﷺ ایک بزرگ کو آغوش میں بچے کی طرح لئے ہوئے بابِ شیبہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ میں نے فرط محبت میں دوڑ کر حضور ﷺ کے قدم مبارک

کو بوسہ دیا میں اس حیرت و تعجب میں تھا کہ یہ بزرگ کون ہیں حضور علیہ السلام کو اپنی معجزانہ شان سے میری باطنی حالت کا اندازہ ہوا تو حضور علیہ السلام نے فرمایا یہ تمہارے امام ہیں جو تمہارے ہی ولایت کے ہیں۔ یعنی ابوحنیفہؒ۔ اس خواب سے یہ بات منکشف ہوئی کہ آپ کا اجتہاد حضور اکرم علیہ السلام کی متابعت میں بے خطا ہے اس لئے کہ وہ حضور کے پیچھے خود نہیں جا رہے تھے بلکہ حضور علیہ السلام خود انہیں اٹھائے لئے جا رہے تھے۔ کیونکہ وہ باقی الصفت یعنی تکلف و کوشش سے چلنے والے نہیں تھے بلکہ فانی الصفت اور شرعی احکام میں باقی و قائم تھے۔ جس کی حالت باقی الصفت ہوتی ہے وہ خطا کار ہوتا ہے یا راہ یاب۔ لیکن جب انہیں لے جانے والے حضور علیہ السلام خود ہیں تو وہ فانی الصفت ہو کر نبی کریم علیہ السلام کی صفت بقا کے ساتھ قائم ہوئے۔ چونکہ حضور سے خطا کے صدور کا امکان ہی نہیں اس لئے جو حضور علیہ السلام کے ساتھ قائم ہو اس سے خطا کا امکان نہیں۔ یہ ایک لطیف اشارہ ہے۔

حکایت

حضرت داؤد طائی رحمتہ اللہ علیہ جب حصولِ علم سے فارغ ہو گئے اور ان کا شہرہ آفاق میں پھیل گیا اور یگانہء روزگار عالِم تسلیم کر لئے گئے، تب وہ حضرت امام اعظم رحمہ اللہ کی خدمت میں اکتساب فیض کے لئے حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اب کیا کروں؟ امام اعظمؒ نے فرمایا ''علیک بالعمل فان العلم بلا عمل کالجسد بلا روح'' یعنی اب تمہیں اپنے علم پر عمل کرنا چاہئے کیونکہ بلا عمل کے علم ایسا ہے جیسے بلا روح کے جسم ہوتا ہے۔ عالم جب تک باعمل نہیں ہوتا اسے صفائے قلب اور اخلاص حاصل نہیں ہوتا۔ جو شخص محض علم پر ہی اکتفا کر لے وہ عالم نہیں ہے۔ عالم کے لئے لازم ہے کہ وہ محض علم پر قناعت نہ کرے کیونکہ عینِ علم کا اقتضا یہی ہے کہ باعمل بن جائے۔ جس طرح کہ عین ہدایت، مجاہدے کی مقتضی ہے۔ اور جس طرح مشاہدہ بغیر مجاہدے کے حاصل نہیں ہوتا۔ اسی طرح علم بغیر عمل کے سود مند نہیں ہوتا۔ کیونکہ علم عمل کی میراث ہے علم میں نور و وسعت اور ان کی منفعت، عمل ہی کی برکت کا ثمرہ ہوتا ہے کسی صورت سے بھی علم عمل سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ جیسے کہ آفتاب کا نور کہ وہ عین آفتاب سے ہے اس سے جدا نہیں ہو سکتا۔ یہی حال علم و عمل کے مابین ہے۔ ابتدائے کتاب میں علم و عمل پر کچھ بحث کی جا چکی ہے۔ وباللہ التوفیق۔

(۷) حضرت عبداللہ بن مبارک مروزی رحمہ اللہ

تبع تابعین میں سے امام طریقت، سیدِ زہاد، قائد اوتاد، حضرت عبداللہ بن المبارک

مروزی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔آپ مشائخ طریقت میں بڑی قدر و منزلت والے اور اپنے وقت میں طریقت و شریعت کے اسباب و احوال اور اقوال کے عالم و امامِ زمانہ تھے۔اکابر مشائخ طریقت کے صحبت یافتہ صاحبِ تصانیف کثیرہ اور تمام علوم و فنون کے ماہر تھے۔آپ کی کرامتیں بکثرت مشہور ہیں۔آپ کی توبہ کا واقعہ عجیب و عبرتناک ہے۔آپ ایک حسین و جمیل باندی کے عشق میں مبتلا ہو گئے ایک رات اپنے ایک دوست کو لے کر اپنی معشوقہ کی دیوار کے نیچے جا کر کھڑے ہو گئے وہ معشوقہ بھی چھت پر آ گئی صبح تک یہ دونوں ایک دوسرے کے نظارے میں مست رہے۔جب فجر کی اذان ہوئی تو آپ نے گمان کیا کہ عشا کی اذان ہوئی ہے لیکن جب دن چڑھا تو سمجھے کہ تمام رات اس کے حسن کے نظارے میں بیت گئی ہے۔یہی بات آپ کی تنبیہ کا موجب بنی دل پر چوٹ پڑی تو کہنے لگے کہ اے مبارک کے بیٹے تجھے شرم کرنی چاہیئے کہ نفس کی خواہش کے پیچھے ساری رات ایک پاؤں پر کھڑے کھڑے گزار دی اسی پر تو اعزاز و بزرگی کا خواستگار ہے اگر امام نماز میں کسی سورۃ کو طول دے دے تو تو گھبرا جاتا ہے اس پر بھی تو مومن ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔اسی وقت آپ نے صدق دل سے توبہ کی اور تحصیل علم اور اس کی طلب میں مشغول ہو گئے۔اور ایسی زہد و دین داری کی زندگی اختیار کی کہ ایک روز اپنی والدہ کے باغ میں سو رہے تھے آپ کی والدہ نے دیکھا کہ ایک سانپ منہ میں ریحان کی ٹہنی لئے آپ کے چہرے سے مکھی اور مچھر اڑا رہا ہے۔

آپ نے مرو چھوڑ کر عرصہ دراز تک بغداد میں اقامت فرمائی اور بکثرت مشائخ طریقت کی صحبت میں رہے۔اس کے بعد کچھ عرصہ تک مکہ مکرمہ میں بھی رہے پھر اپنے وطن مرو واپس تشریف لے آئے اور تعلیم و تدریس میں مشغول ہو گئے۔شہر کی نصف آبادی ظاہر حدیث پر عمل کرتی اور شہر کی نصف آبادی راہِ طریقت پر چلتی تھی۔چونکہ شہر کے دونوں فریق آپ کو اپنا بزرگ مانتے تھے اور آپ سے راضی و متعلق رہتے تھے اس بنا پر آپ کو "رضی الفریقین" کے لقب سے سب پکارتے تھے۔آپ نے اس جگہ دو کمرے بنائے ایک متبعینِ احادیث کے لئے اور ایک اہلِ طریقت کے لئے۔یہ دونوں کمرے آج تک انھیں قدیم بنیادوں پر قائم ہیں۔اسکے بعد آپ وہاں سے حجاز آ گئے اور یہیں پر سکونت اختیار کر لی۔

آپ سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے کونسی عجیب و غریب چیز دیکھی ہے؟ فرمایا میں نے ایک راہب کو دیکھا جس کا بدن ریاضت و مجاہدے سے لاغر و نحیف ہو گیا تھا اور اس کی کمر دوہری ہو چکی تھی۔میں نے اس سے پوچھا۔اے راہب! خدا تک رسائی کی کون سی راہ ہے؟ اس

نے کہا "لو عرفت اللّٰہ لعرفت الطریق الیه" اگر تم اللہ کو جانتے ہو تو اس کی تک رسائی کی راہ بھی جانتے ہوگے؟ پھر کچھ دیر بعد اس نے کہا مجھے دیکھو میں اسے نہیں جانتا لیکن اس کی عبادت میں میں نے اپنا یہ حال بنا لیا ہے۔ تم اسے جانتے ہو لیکن تم اس سے دور ہو۔ مطلب یہ کہ معرفت کا اقتضاء یہ ہے کہ اس کی خشیت دل میں ہمہ وقت رہے لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اس سے بے خوف ہو۔ اور میں کفر و جہالت میں مبتلا ہونے کے باوجود اس سے خوفزدہ ہوں۔ حضرت عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے راہب کی یہ نصیحت گرہ میں باندھ لی ہے اس نے مجھے بہت سے ناجائز افعال سے باز رکھا ہے۔ آپ کا ایک قول یہ ہے کہ "السکون حرام علٰی قلوب اولیائه" خدا کے دوستوں کا دل ہرگز ساکن نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ بے قرار رہتے ہیں کیونکہ اس طبقہ پر سکون و آرام حرام ہے۔ اس کی وجہ یہ کہ چونکہ وہ دنیا میں حصول مقصد کی خاطر بے قرار ہوتے ہیں اور آخرت میں منزل مقصود حاصل ہونے کی خوشی میں کیونکہ دنیا میں حق تعالیٰ سے غائب ہونے کی وجہ سے ان پر سکون و آرام جائز نہیں ہوتا اور عقبیٰ میں بارگاہِ حق میں اس کی تجلی و رویت کی وجہ سے انھیں قرار نہیں آتا ان کے لئے دنیا عقبیٰ کی مانند اور عقبیٰ دنیا کی مانند ہے۔ کیونکہ دل کو سکون یا تو مقصود و مراد کو پالینے سے حاصل ہوتا ہے یا اپنے مقصود و مراد سے بے خبر و غافل ہونے سے۔ اللہ تعالےٰ کے دوستوں کے لئے اپنے مقصود و مراد سے بے خبری و غفلت دنیا و آخرت دونوں جگہ جائز نہیں۔ اس لئے محبت کی وارفتگی سے دل کو قرار کیسے حاصل ہو؟ واللہ اعلم۔

(۸) حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ تعالےٰ

طریقت کے اماموں میں ایک واصلین حق کے سردار، مقربین بارگاہ کے بادشاہ حضرت ابو علی فضیل بن عیاض رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ فقر□ میں آپ کا بڑا مرتبہ ہے۔ طریقت میں آپ کو کامل مہارت اور پورا شغف حاصل تھا۔ مشائخ طریقت کے درمیان آپ بہت مشہور و معروف ہیں۔ آپ کے احوال صدق و صفا سے معمور تھے۔ آپ ابتدائے عمر میں جرائم پیشہ آدمی تھے۔ مرو اور مادرد کے درمیان رہزنی کا مشغلہ تھا۔ اس کے باوجود آپ کی طبیعت ہر وقت مائل بہ اصلاح رہتی تھی۔ چنانچہ جس قافلہ میں کوئی عورت ہوتی تو اس کے قریب تک نہ جاتے جس کے پاس مال تھوڑا ہوتا اس سے تعرض نہ کرتے اور ہر شخص کے پاس کچھ نہ کچھ مال ضرور چھوڑ دیتے تھے

آپ کی توبہ کا واقعہ بڑا عجیب ہے۔ ایک سوداگر مرو سے ماورد جا رہا تھا۔ مرو کے لوگوں نے اس سوداگر سے کہا مناسب ہے کہ ایک سرکاری حفاظتی دستہ ساتھ لے کر چلو کیونکہ راہ میں فضیل راہزنی کرتا ہے۔ سوداگر نے جواب دیا میں نے سنا ہے کہ وہ رحمدل اور خداترس آدمی ہے۔ سوداگر نے حفاظتی دستہ کی بجائے ایک خوش آواز قاری کو اجرت پر لے کر اونٹ پر بٹھا دیا اور روانہ ہو گیا۔ قاری دن ورات راستہ میں تلاوت قرآن کرتا رہا یہاں تک کہ یہ قافلہ اس مقام تک پہنچ گیا جہاں یہ گھات لگائے بیٹھے تھے۔ اتفاق سے قاری نے یہ آیت تلاوت کی ''الم یان للذین آمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ وما نزل من الحق'' ''یعنی کیا ابھی تک مومنوں کے لئے وہ وقت نہیں آیا کہ وہ ذکر الٰہی اور حق کی طرف سے نازل کئے ہوئے احکام کے آگے اپنے دلوں کو جھکائیں''۔ حضرت فضیل نے جب یہ سنا تو ان کے دل پر رقت طاری ہو گئی۔ فضیل کے دل پر فضلِ خدا نے غلبہ دکھایا اور اسی لمحہ انھوں نے رہزنی سے توبہ کر لی۔ جن جن کے مال لوٹے تھے ان کے نام لکھ رکھے تھے اُن سب کو راضی کیا۔ اس کے بعد مکہ مکرمہ چلے گئے اور عرصہ تک وہاں مقیم رہے۔ اور بکثرت اولیاء اللہ سے ملاقاتیں کیں پھر وہ کوفہ آ گئے اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی مجلسِ مبارک میں مدت تک رہے۔ ان سے بکثرت روایات مروی ہیں جو محدثین کے نزدیک بہت مقبول ہیں۔

حضرت فضیل بن عیاض رحمتہ اللہ علیہ تصوف کے حقائق و معرفت میں اعلیٰ درجہ کی گفتگو کیا کرتے تھے چنانچہ آپ کا قول ہے کہ ''من عرف اللہ حق معرفتہ عبدہٗ بکل طاقۃ'' جسے اللہ تعالےٰ کی کما حقہ معرفت حاصل ہو گئی وہ مقدور بھر اس کی عبادت میں مشغول ہو گیا۔ اس لئے کہ اس کی معرفت، اس کے احسان و کرم کی پہچان کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اور جب اس کے احسان و کرم کی پہچان ہو جائے تو اس نے اس کو دوست بنا لیا۔ اور جب اسے دوست بنا لیا تو گویا اس نے مقدور بھر طاعت و عبادت کر لی۔ کیونکہ دوست کا کوئی حکم مشکل و دشوار نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر جتنی دوستی زیادہ ہو گی اتنا ہی طاعت و عبادت کا ذوق بڑھتا جائے گا۔ اور دوستی کی زیادتی ہی معرفت کی حقیقت ہے۔ چنانچہ اُمُّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ ایک رات حضور اکرم ﷺ میرے پاس سے اُٹھے پھر آپ میری نظروں سے اوجھل ہو گئے مجھے خیال گزرا کہ شاید کسی دوسرے حجرے میں تشریف لے گئے ہیں میں اٹھی اور حضور ﷺ کے پیچھے

چل دی یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ آپ مسجد میں نماز پڑھ رہے ہیں اور حضور علیہ السلام کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ آئے اور انھوں نے صبح کی اذان دی اور حضور علیہ السلام بدستور نماز میں مشغول رہے۔ نماز صبح ادا فرمانے کے بعد جب حضور علیہ السلام حجرے میں تشریف لائے تو میں نے دیکھا کہ آپ کے قدم مبارک پر ورم تھا اور آپ علیہ السلام کی انگلیوں سے خون جاری تھا۔ میں نے رو کر عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ کو مغفور فرمایا اس بشارت کی موجودگی میں اتنی مشقت کیوں برداشت فرماتے ہیں ایسا تو وہ کرے جس کی آخرت محفوظ نہ ہو۔ آپ نے فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے "افلا اکون عبدا شکورا" کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں اللہ تعالیٰ تو مجھے ایسی بشارت دے اور تم یہ چاہتی ہو کہ میں اس کی بندگی نہ کروں۔ اور مقدور بھر شکر گزاری بھی نہ کروں۔

نیز حضور اکرم علیہ السلام نے شب معراج پچاس نمازیں قبول فرمالی تھیں اور آپ نے انھیں گراں نہ جانا تھا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بار بار عرض کرنے پر دوبارہ جا جا کر پانچ نمازیں کرائیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ آپ کی سرشت میں فرمان الٰہی کی مخالفت کا شائبہ بھی نہ تھا۔ "لان المحبۃ ھی الموافقۃ" اس لئے کہ محبت نام ہی موافقت کا ہے۔

نیز آپ کا ارشاد ہے۔

الدنیا دار المرضٰی والناس فیھا مجانین، وللمجانین فی دار المرضیٰ الغل والقید"	یہ دنیا بیماری کا گھر ہے اور لوگ اس پر دیوانے ہیں اور دیوانوں کو بیمارستان میں طوق و سلاسل سے مقید رکھا جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ہماری خواہشیں ہماری زنجیریں اور ہمارے گناہ ہماری قید ہیں۔

حکایت حضرت فضل بن ربیع بیان فرماتے ہیں کہ میں خلیفہ ہارون رشید کے ساتھ حج کے لئے مکہ مکرمہ گیا۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد ہارون رشید نے مجھ سے کہا اگر مردانِ خدا میں سے کوئی یہاں موجود ہو تو ہم اس کی زیارت کے لئے جائیں گے۔ میں نے کہا ہاں اس جگہ حضرت عبدالرزاق صنعانیؒ ہیں۔ اس نے کہا مجھے اس کے پاس لے چلو۔ جب ہم ان کے پاس پہنچے تو بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ رخصت کے وقت ہارون رشید نے مجھ سے کہا ان سے دریافت کرو کہ کیا ان کے ذمہ کچھ قرضہ ہے؟ انھوں نے کہا ہاں قرضہ ہے۔ ہارون رشید نے مجھ سے کہا ان کا قرضہ ادا کر دو۔ جب ہم وہاں سے واپس آئے تو اس نے کہا اے فضل! میرا دل کسی اور بزرگ سے بھی ملنے کا متمنی ہے۔ میں نے کہا یہاں حضرت سفیان بن عیینہ بھی جلوہ گر ہیں۔ اس نے کہا ان کے پاس بھی لے چلو۔ چنانچہ جب حاضر ہوئے تو دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ واپسی

چل دی یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ آپ مسجد میں نماز پڑھ رہے ہیں اور حضور علیہ السلام کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ آئے اور انھوں نے صبح کی اذان دی اور حضور علیہ السلام بدستور نماز میں مشغول رہے۔ نماز صبح ادا فرمانے کے بعد جب حضور علیہ السلام حجرے میں تشریف لائے تو میں نے دیکھا کہ آپ کے قدم مبارک پر ورم تھا اور آپ علیہ السلام کی انگلیوں سے خون جاری تھا۔ میں نے رو کر عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ تعالےٰ نے آپ کو مغفور فرمایا اس بشارت کی موجودگی میں اتنی مشقت کیوں برداشت فرماتے ہیں ایسا تو وہ کرے جس کی آخرت محفوظ نہ ہو۔ آپ نے فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کا فضل واحسان ہے "افلا اکون عبداشکورا" کیا میں خدا کا شکرگزار بندہ نہ بنوں اللہ تعالیٰ تو مجھے ایسی بشارت دے اور تم یہ چاہتی ہو کہ میں اس کی بندگی نہ کروں۔ اور مقدور بھر شکرگزاری بھی نہ کروں۔

نیز حضور اکرم علیہ السلام نے شب معراج پچاس نمازیں قبول فرمائی تھیں اور آپ نے انھیں گراں نہ جانا تھا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بار بار عرض کرنے پر دوبارہ جا جا کر پانچ نمازیں کرائیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ آپ کی سرشت میں فرمان الٰہی کی مخالفت کا شائبہ بھی نہ تھا۔ "لان المحبۃ ھی الموافقۃ" اس لئے کہ محبت نام ہی موافقت کا ہے۔

نیز آپ کا ارشاد ہے۔

الدنیا دار المرضیٰ والناس فیھا مجانین، وللمجانین فی دار المرضیٰ الغل والقید۔"	یہ دنیا بیماری کا گھر ہے اور لوگ اس پر دیوانے ہیں اور دیوانوں کو بیمارستان میں طوق وسلاسل سے مقید رکھا جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ہماری خواہشیں ہماری زنجیریں اور ہمارے گناہ ہماری قید ہیں۔

حکایت

حضرت فضل بن ربیع بیان فرماتے ہیں کہ میں خلیفہ ہارون رشید کے ساتھ حج کے لئے مکہ مکرمہ گیا۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد ہارون رشید نے مجھ سے کہا اگر مردانِ خدا میں سے کوئی یہاں موجود ہو تو ہم اس کی زیارت کے لئے جائیں گے۔ میں نے کہا ہاں اس جگہ حضرت عبدالرزاق صنعانی ہیں۔ اس نے کہا مجھے اس کے پاس لے چلو۔ جب ہم ان کے پاس پہنچے تو بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ رخصت کے وقت ہارون رشید نے مجھ سے کہا ان سے دریافت کرو کہ کیا ان کے ذمہ کچھ قرضہ ہے؟ انھوں نے کہا ہاں قرضہ ہے۔ ہارون رشید نے مجھ سے کہا ان کا قرضہ ادا کردو۔ جب ہم وہاں سے واپس آئے تو اس نے کہا اے فضل! میرا دل کسی اور بزرگ سے بھی ملنے کا متمنی ہے۔ میں نے کہا یہاں حضرت سفیان بن عیینہ بھی جلوہ گر ہیں۔ اس نے کہا ان کے پاس بھی لے چلو۔ چنانچہ جب حاضر ہوئے تو دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ واپسی

کے وقت خلیفہ نے مجھے اشارہ کیا کہ میں ان سے بھی قرض کے بارے میں دریافت کروں میں نے پوچھا تو فرمایا ہاں قرض ہے۔ خلیفہ نے مجھے حکم دیا کہ ان کا قرض بھی ادا کردوں باہر آ کر خلیفہ نے مجھ سے کہا اے فضل! ابھی میرا دل سیر نہیں ہوا کسی اور بزرگ سے بھی ملاقات کراؤ۔ میں نے کہا مجھے یاد آیا یہاں حضرت فضیل بن عیاض بھی تشریف فرما ہیں پھر ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ اوپر ایک گوشہ میں بیٹھے قرآن کریم کی تلاوت کر رہے تھے۔ میں نے دستک دی! اندر استفسار ہوا کون ہے؟ میں نے جواب دیا امیر المومنین آئے ہیں، انھوں نے فرمایا "مالیَ ولا میر المومنین" مجھے امیر المومنین سے اور انھیں مجھ سے کیا سروکار؟ میں نے کہا سبحان اللہ! کیا حضور اکرم ﷺ کا یہ ارشاد نہیں ہے کہ

لیس للعبد ان یذل نفسہ فی طاعۃ اللہ۔	کسی بندے کے لائق نہیں کہ اطاعت الٰہی میں خود کو ذلیل کرے۔

آپ نے فرمایا حضور کا ارشاد حق ہے "اما الرضا فعز عند اھلہ" لیکن رضائے الٰہی اس کے حضور میں دائمی عزت ہے تم میری اس حالت کو ذلیل گمان کرتے ہو۔ حالانکہ میں طاعتِ الٰہی میں اپنی عزت جانتا ہوں۔ اس کے بعد نیچے آ کر دروازہ کھول دیا اور چراغ بجھا دیا۔ اور مکان کے ایک کونے میں جا کر کھڑے ہو گئے۔ مصافحہ کے وقت ہارون رشید کا ہاتھ ان کے ہاتھ سے مس ہوا تو حضرت فضیل نے فرمایا افسوس ہے کہ اتنا نرم و نازک ہاتھ دوزخ میں جلے گا۔ کاش کہ یہ ہاتھ خدا کے عذاب سے محفوظ رہتا۔ ہارون رشید یہ سن کر رونے لگا اور اتنا رویا کہ بیہوش ہو کر گر پڑا۔ جب ہوش میں آیا تو کہنے لگا اے فضیل! مجھے کوئی نصیحت فرمایئے؟ آپ نے فرمایا اے امیر المومنین تیرا باپ، حضور اکرم ﷺ کا چچا تھا۔ انھوں نے حضور ﷺ سے درخواست کی کہ مجھے اپنی قوم پر امیر بنا دیجئے؟ حضور نے فرمایا اے چچا! میں نے تم کو تمہاری جان پر امیر بنا دیا کیونکہ ایک سانس اگر طاعتِ الٰہی میں گزرے تو وہ اس سے بہتر ہے کہ لوگ ہزار سال تک تمہاری فرمانبرداری کریں۔ "لان الامارۃ یوم القیمۃ الندامۃ" اس لئے کہ امیری سے قیامت کے دن بجز ندامت و شرمندگی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ہارون رشید نے کہا کچھ اور بھی نصیحت فرمایئے۔ حضرت فضیل نے فرمایا جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو لوگوں نے خلافت پر فائز کرنا

چاہا تو انھوں نے سالم بن عبداللہ۔ رجاء بن حَیْوۃ اور محمد بن کعب قرظی کو بلایا اور ان سے کہا لوگوں نے مجھے اس بلاو مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔ مجھے کیا تدبیر کرنی چاہئے کیونکہ امارت کو میں بلا سمجھتا ہوں اگر چہ لوگ اسے نعمت خیال کرتے ہیں، ان میں سے ایک نے کہا۔ اے عمر بن عبدالعزیز! اگر آپ چاہتے ہیں کہ روز قیامت عذابِ الٰہی سے رستگاری ہو تو مسلمان بزرگوں اور بوڑھوں کو اپنے باپ کی مانند اور جوانوں کو بھائی اور بچوں کو اپنی اولاد کی مانند سمجھیں اور ان سب کے ساتھ وہی سلوک کیجئے جو خاندان کا سربراہ باپ، اپنے بھائیوں، فرزندوں اور دیگر عیال کے ساتھ کرتا ہے۔ کیونکہ یہ ممالکِ اسلامیہ ایک گھر کی مانند ہیں۔ اور ان میں رہنے والے اہل و عیال'' زر اباك و اكرم اخاك و احسن على ولدك ''اپنے بڑوں کی زیارت کرو اور بھائیوں کی عزت کرو اور چھوٹوں سے پیار و محبت کرو۔ اس کے بعد حضرت فضیلؒ نے فرمایا اے امیر المومنین مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں تمہارا یہ خوبصورت چہرہ دوزخ کی آگ میں نہ جھلسایا جائے، خدا کا خوف رکھو اور اس کا حق بہترین طریق پر ادا کرو۔ اس کے بعد ہارون رشید نے عرض کیا۔ آپ پر کچھ قرض ہے؟ حضرت فضیل نے جواب دیا ہاں! خدا کا قرض میری گردن پر ہے وہ اس کی اطاعت ہے میں فکر مند ہوں کہ اس وجہ میں میری گرفت نہ ہو جائے۔ ہارون رشید نے عرض کیا بار قرض سے میری مراد لوگوں کا قرض ہے؟ آپ نے فرمایا اللہ عزوجل کا شکر و احسان ہے اس نے مجھے بہت کچھ نعمت دے رکھی ہے مجھے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ کہ لوگوں سے بیان کرتا پھروں۔ ہارون رشید نے ایک ہزار اشرفیوں کی تھیلی آپ کے آگے رکھ دی اور عرض کیا اسے اپنی ضرورتوں پر خرچ فرمایئے۔ حضرت فضیل نے فرمایا اے امیر المومنین میری اتنی نصیحتوں نے تم پر کچھ اثر نہیں کیا اور ابھی تک ظلم و استبداد کی روش پر قائم ہو۔؟ ہارون رشید نے کہا میں نے آپ پر کیا ظلم و استبداد کیا ہے۔؟ فرمایا میں تمہیں نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے ابتلاء میں ڈالنا چاہتے ہو۔ کیا یہ ظلم و جفا نہیں ہے۔؟ یہ سن کر ہارون رشید اور فضل بن ربیع دونوں رونے لگے اور روتے ہوئے باہر آ گئے۔ اس کے بعد ہارون رشید نے مجھے کہا اے فضل بن ربیع! بادشاہ در حقیقت حضرت فضیل ہیں اور یہ سب ان کے دبدبہ کی دلیل ہے جو دنیا اور دار الآخرت میں انھیں حاصل ہے۔ دنیا کی تمام زیب و زینت ان کی نظر میں بے وقعت اور حقیر ہیں اہلِ دنیا کی خاطر تواضع کرنی بھی انھوں نے اسی لئے ترک کر رکھی ہے۔

آپ کے فضائل و مناقب اس سے کہیں زیادہ ہیں جتنے کہ لکھے جا سکتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اذا سلمت منك نفسك فقد اديت حقها و اذا سلم منك الخلق و قضيت حقوقهم۔	جب تمہارا جسم تم سے سلامتی پائے تو جان لو کہ تم نے اس کا حق ادا کر دیا اور جب لوگ تم سے محفوظ رہیں تو جان لو کہ تم نے ان کا حق ادا کر دیا۔

مطلب یہ ہے کہ حق دو طرح کے ہیں۔ اپنے اوپر اپنا حق دوسرا اپنے اوپر لوگوں کا حق۔ جب تم نے اپنے آپ کو معصیت سے محفوظ رکھا اور دنیا میں سلامتی کی راہ پر قائم رہ کر آخرت کے عذاب سے اسے بچالیا تو تم نے اس کا حق ادا کر دیا۔ اور جب تم نے لوگوں کو اپنی اذیت سے محفوظ رکھا اور ان کی بدخواہی نہ کی تو تم نے ان کا حق ادا کر دیا۔ لہٰذا کوشش کرو کہ نہ تم خود بُرائی میں پڑو اور نہ لوگوں کو بُرائی میں ڈالو۔ اس کے بعد حق تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی میں پوری کوشش کرو۔ واللہ اعلم

(۵۶) حضرت ابوبکر محمد بن موسیٰ واسطی علیہ الرحمتہ

منجملہ آئمہ طریقت، اپنے حق کے امام، عالی حال، لطیفِ کلام، حضرت ابوبکر محمد بن موسیٰ واسطی رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو محققین مشائخ میں سے تھے۔ حقائق میں آپ کا بہت بلند درجہ تھا۔ تمام مشائخ کے نزدیک آپ لائق تعریف، اور حضرت جنید کے قدیم مصاحبوں میں سے تھے۔ آپ کے اظہار و بیان میں ایسی گہرائی ہوتی تھی کہ اصحاب غور و فکر کی فہم سے بالاتر ہوتی تھی۔ آپ نے کسی شہر میں مستقل اقامت اختیار نہیں کی۔ جب آپ شہر مرو میں تشریف لائے تو وہاں کے لوگ آپ کی لطافت طبع اور نیک سیرتی کے گرویدہ ہو گئے اور آپ کا وعظ غور سے سُنا کرتے تھے عمر کے آخری ایام وہیں گزارے۔

آپ کا ارشاد ہے:۔

الذاکر فی ذکرہٖ اکثر غفلۃ من الناس لذکرہٖ۔	ذکر کرنے والے کو اس کی یاد میں فراموش کنندۂ ذکر سے زیادہ غفلت ہوتی ہے۔

اس لئے کہ جب خدا کو یاد رکھے اور اس کے ذکر کو بھول جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے خرابی تو اس میں ہے کہ تو اُس کے ذکر کو یاد رکھے اور اُسے بھول جائے۔

کیونکہ ذکر اور چیز ہے اور مذکور یعنی جس کا ذکر کیا جائے اور ہے۔ لہٰذا جب ذکر کے گمان پر، ذاتِ مذکور سے مُنہ موڑ لے تو اس میں غفلت زیادہ پائی جاتی ہے بہ نسبت اس کے کہ عین مذکور کی یاد کو فراموش کر دے اور گمان بھی نہ ہو۔ بھول جانے والے کو نسیان و غیبت کی حالت میں حضور کا گمان نہیں رہتا۔ اور ذاکر کو حالت ذکر و غیبت میں ذاتِ مذکور کے حضور کا گمان ہوتا ہے۔ لہٰذا عدم حضور کی حالت میں حضور کا گمان بہ نسبت اس کے جو غیبت خالی از گمان ہو غفلت سے زیادہ نزدیک ہے۔ اس لئے کہ طالبانِ حق کی ہلاکت ان کے گمان میں ہے۔ کہیں گمان زیادہ اور معنی کم ہوں گے اور کہیں معنی زیادہ اور گمان کم ہوگا۔ درحقیقت ان کا گمان، عقل کی اتہام طرازی ہے۔ اور عقل کی اتہام طرازی، نفس کے ارادہ سے حاصل ہوتی ہے۔ لیکن ہمت کا تہمت سے کوئی تعلق نہیں۔ اصل ذکر یا تو غیبت میں ہوتا ہے یا حضور میں، جب غائب از خود غیبت میں اور حق کے حضور میں ہو تو وہاں ذکر نہیں ہوتا بلکہ مشاہدہ ہوتا ہے۔ اور جب بندہ حق سے غائب اور از خود حاضر ہو تو وہاں بھی ذکر نہیں ہوتا، کیونکہ غیبت، غفلت سے ہوتی ہے۔

(۵۷) حضرت ابوبکر بن دلف بن جحدر شبلی علیہ الرحمتہ

منجملہ آئمۂ طریقت، سکینۂ احوال، سفینۂ مقال حضرت ابوبکر بن دلف بن جحدر شبلی رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو اکابر مشائخ میں سے تھے۔ اور سب کے نزدیک قابلِ تعریف تھے۔ آپ کے حالات و مقالات بیانِ حق میں مہذب و پاکیزہ ہیں۔ اشارے لطیف اور قابلِ ستائش ہیں۔ جیسا کہ متاخرین مشائخ فرماتے ہیں کہ "ثلثة من عجائب الدنیا، اشارات الشبلی، و نکات المرتعش و حکایات الجعفر" دنیا میں تین بزرگوں کی عجیب و غریب خصوصیتیں ہیں۔ ایک شبلی کے اشارے دوسرے مرتعش کے نکتے اور تیسرے جعفر کی حکایتیں۔

آپ اکابر قوم اور سادات اہلِ طریقت میں سے ہیں۔ ابتداء میں آپ خلیفۂ وقت کے مقربِ خاص تھے۔ حضرت خیر النساج کی صحبت میں توبہ کی اور حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ سے تعلقِ ارادت قائم کیا۔ بکثرت مشائخ سے ملاقاتیں کیں۔

آپ نے ارشادِ حق "قل للمومنین یغضوا من ابصارھم" کی تفسیر میں فرمایا:۔

اے نبی ﷺ مسلمانوں کو یہ حکم پہنچا دو کہ وہ اپنی نگاہوں کو نیچا رکھیں۔ یعنی سروں کی آنکھوں کو نامحرموں کی طرف شہوت کے ساتھ دیکھنے سے بچائیں۔ اور دلوں کی آنکھوں کو غیر اللہ کی طرف دیکھنے سے محفوظ رکھیں۔	اے ابصار الرؤس عن المحارم وابصار القلوب عماسوی اللّٰہ۔

مطلب یہ ہے کہ دل کی آنکھ کو انواعِ فکر سے محفوظ رکھو، اسے دیدار و مشاہدہ کے سوا اور کسی سے سروکار نہ ہو۔ لہٰذا خواہشات کی پیروی اور نامحرموں کی طرف نظر، غفلت سے ہوتی ہے۔ اور غافلوں کے لئے اہانت آمیز مصیبت یہ ہے کہ وہ اپنے عیبوں سے جاہل ہوتے ہیں جو شخص دنیا میں جاہل ہے وہ آخرت میں بھی جاہل ہوگا۔

حق تعالیٰ فرماتا ہے:۔

جو اس جہان میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔	من کان فی ھٰذہٖ اعمٰی فھو فی الاٰخرۃ اعمٰی۔

درحقیقت جب تک اللہ تعالیٰ کسی کے دل سے شہوانی خیالات کو دور نہ فرمائے اس وقت تک سر کی آنکھیں اس کے غوامض سے محفوظ نہیں ہوتیں اور جب تک اللہ تعالیٰ اپنی محبت اور اپنا ارادہ کسی کے دل میں جاگزیں نہ کرے اس وقت تک دل کی آنکھیں غیر کے نظارے سے محفوظ نہیں رہتیں۔

آپ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں بازار گیا تو لوگ کہنے لگے "ھٰذا مجنون" یہ پاگل ہے۔ میں نے ان کو جواب دیا "انا عندکم مجنون وانتم عندی اصحاء فزادنی اللّٰہ فی جنونی و زاد صحتکم" میں تمہارے نزدیک پاگل ہوں اور تم میرے نزدیک ہوشیار ہو لہٰذا اللہ تعالےٰ میرے جنون کو اور زیادہ کرے اور تمہاری صحت کو اور بڑھائے۔ کیونکہ میرا جنون شدتِ محبت میں ہے اور تمہاری صحت قوی، غفلت کی وجہ سے ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ میری دیوانگی کو بڑھائے تاکہ اس سے میری قربت اور زیادہ ہو جائے اور تمہاری ہوشیاری اور زیادہ کرے تاکہ اس سے اور زیادی دوری ہو جائے۔ یہ فرمان غیرت مندی کی وجہ سے ہے۔ تاکہ آدمی ایسا نہ بنے کہ وہ صحت و دیوانگی میں فرق نہ کر سکے۔ واللہ اعلم

(۵۸) حضرت ابو محمد جعفری بن نصیر خالدی علیہ الرحمتہ

منجملہ آئمہ طریقت، نرمِ گفتار سے حکایت کنندۂ احوال اولیاء حضرت ابو محمد جعفری بن نصیر خالدی علیہ الرحمتہ ہیں۔ آپ حضرت جنید کے اصحاب کبار اور متقدمین مشائخ میں سے ہیں۔ فنون طریقت کے متبحر عالم، اتقامیں مشائخ کے محافظ تھے۔ ہر فن میں آپ کا کلام ارفع ہے۔ ترک رعونت کے ہر مسئلہ میں حکایات بیان کی ہیں یہاں پر اس کا حوالہ کسی دوسرے کی طرف کیا ہے۔

آپ کا ارشاد ہے:۔

التوکل استواء القلب عن الوجود والعدم۔	متوکل وہ ہے کہ اس کے دل میں وجود اور عدم برابر ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ رزق پانے سے دل خوش نہ ہو اور اس کے نہ ہونے سے دل غمگین نہ ہو۔ اس لئے کہ جسم مالک کا ملک ہے اس کی پرورش اور اس کی ہلاکت دونوں مالک ہی کے قبضہ میں ہیں اور وہ اپنے مِلک کو تم سے زیادہ جانتا ہے وہ جیسا چاہے رکھے۔ تم اس میں دخل نہ دو۔ ملکیت کو مالک کے حوالہ کر کے اس سے لاتعلق ہو جاؤ۔

آپ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دن حضرت جنید علیہ الرحمتہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کو بخار میں مبتلا پایا۔ میں نے عرض کیا کہ اے استاذ! آپ حق تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ صحت بخشے۔ حضرت جنید نے فرمایا میں نے کل دعا کی تھی میرے دل میں آواز آئی کہ اے جنید! تمہارا جسم، ہماری ملکیت ہے ہمیں اختیار ہے چاہے تندرست رکھیں یا بیمار۔ تم کون ہو کہ ہمارے اور ہماری ملکیت کے درمیان دخل دو۔ اپنا اختیار ختم کرو تا کہ بندے ہو جاؤ۔ واللہ اعلم

(۵۹) حضرت ابو علی محمد بن قاسم رود باری علیہ الرحمتہ

منجملہ آئمہ طریقت، شیخ محمود، معدنِ جود، حضرت ابو علی محمد بن قاسم رود باری رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ جو اکابر جوانمردانِ صوفیا کے سرخیل تھے۔ خاندانِ سلاطین سے تعلق رکھتے تھے، فنون معاملات میں عظیم المرتبہ تھے، آپ کے مناقب و نشانیاں بکثرت اور معرفت و طریقت کے دقائق میں کلام لطیف ہے۔

آپ کا ارشاد ہے:۔

المرید لا یرید لنفسه الا ما اراد اللّٰہ له والمراد لا یرید من الکونین شیئا غیرہ۔	مرید وہ ہے جو اپنے لئے کچھ نہ چاہے بجز اس کے جو اللہ تعالیٰ اس کے لئے چاہے۔ اور مراد وہ ہے جو دونوں جہان سے بجز خدا کسی چیز کو نہ چاہے۔

مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے ارادے پر راضی رہ کر اپنے لئے کوئی خواہش نہ رکھے تا کہ وہ مرید صادق بن جائے۔ محبّ کو زیبا ہے کہ اپنا کوئی ارادہ نہ ہو تا کہ خدا ہی اس کی مراد ہو۔ گویا وہ حق تعالےٰ ہی کو چاہے اور کسی غیر کی طلب نہ رکھے۔ اور وہی چاہے جو خدا چاہے۔ کیونکہ اسے حق چاہتا ہے لہٰذا وہ بجز حق کے کسی کو نہ چاہے۔ چونکہ تسلیم و رضا طریقت کا ابتدائی مقام ہے اور ربوبیت کے ساتھ محبت کرنا احوال کی انتہا ہے۔ عبودیت کے تحقق سے مقامات کی نسبت ہے اور ربوبیت کی تائید سے احوال کی منزلت ہے۔ جب یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی تو مرید خود بخود قائم اور مراد بحق قائم ہو جائے گا۔ واللہ اعلم

(۶۰) حضرت ابوالعباس قاسم بن مہدی سیاری علیہ الرحمتہ

منجملہ ائمہ طریقت، خزینہ دار توحید، سمسار تفرید حضرت ابوالعباس قاسم بن مہدی سیاری رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ جو اپنے زمانہ کے امام اور علوم ظاہر اور فنونِ حقائق کے عالم تھے۔ حضرت ابوبکر واسطی کے صحبت یافتہ، بکثرت مشائخ سے ادب گرفتہ، صوفیاء کی صحبت میں از ہمہ اشرف اور راہِ الفت میں زاہد تر تھے۔ آپ کا کلام بلند اور تصانیف عمدہ ہیں۔

آپ کا ارشاد ہے:۔

التوحید ان لا یخطر بقلبك مادون	توحید یہ ہے کہ دل میں حق تعالیٰ کے سوا
توحید۔	کسی دوسرے کا تصور نہ ہو۔

دل کے اسرار پر کسی مخلوق کا گذر نہ ہو۔ اور نہ معاملات کی پاکیزگی میں کوئی کدورت ہو۔ اس لئے کہ غیر کا اندیشہ غیر کے اثبات سے ہے۔ جب غیر کا اثبات ہے تو حکمِ توحید ساقط ہے۔

حضرت ابوالعباس سیاری کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ مرو کے علاقے کے ایک بڑے رئیس تھے کہ کوئی شخص دولت اور مرتبہ میں آپ سے بڑھ کر نہ تھا۔ آپ نے اپنے والد کی میراث میں بہت مال و دولت پایا تھا۔ لیکن یہ تمام مال ومنال دے کر آپ نے حضور اکرم ﷺ کے دو موئے مبارک حاصل کر لئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان موئے مبارک کی برکت سے سچی

توبہ عطا فرمائی اور حضرت ابوبکر واسطی کی صحبت میں رہ کر ایسا کمال پایا کہ صوفیاء کے امام حنیف ہو گئے

آپ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے جو کچھ ملا ان موئے مبارک کی برکت سے ملا۔ جب آپ دنیا سے رحلت فرمانے لگے تو وصیت کی کہ وہ موئے مبارک میرے منہ میں رکھ دینا چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اسی کا اثر ہے کہ مرو میں آج بھی آپ کی قبر کا نشان ہے۔ لوگ مزار مبارک پر حاضر ہو کر مرادیں مانگتے ہیں اور حلِ مشکلات کی دعائیں کرتے ہیں۔ اور ان کی مرادیں پوری ہوتی ہیں۔ اور مشکلیں آسان ہوتی ہیں۔ یہ آزمودہ ہے۔

(٦١) حضرت ابوعبداللہ محمد بن خفیف رحمتہ اللہ علیہ

منجملہ ائمہ طریقت، اپنے زمانہ میں تصوف کے مالک، حضرت ابوعبداللہ محمد بن خفیف رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ کی طبیعت تکلف وتصرف سے پاک تھی۔ انواع علوم میں اپنے وقت کے امام تھے، مجاہدہ عظیم، حقائق میں بیان شافی اور حال عمدہ تھا۔ آپ کی تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے حضرت ابن عطا، حضرت شبلی، حسین بن حلاج، منصور، حریری اور مکہ مکرمہ میں حضرت یعقوب نہر جوری کی صحبت پائی تھی۔ مجرد رہ کر خوب سیاحت کی۔ آپ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن اللہ تعالےٰ نے توبہ کی توفیق بخشی اور بادشاہت چھوڑ کر راہِ طریقت اختیار کر لی۔

آپ کا باطن، اہل معانی کے باطن پر فائق تھا۔

آپ کا ارشاد ہے:

التوحید الاعراض عن الطبیعۃ۔	طبیعت سے منہ موڑنے ہی میں توحید کا قیام ہے۔

اس لئے کہ طبیعت سراپا حجاب ہے جو خدا کی نعمتوں سے محجوب واندھا کر دیتی ہے لہٰذا جب تک طبیعت سے منہ نہ موڑا جائے اس وقت تک وصالِ حق ممکن نہیں اور صاحب طبع، حقیقت توحید سے حجاب میں رہتا ہے۔ جس وقت طبیعت کی آفتوں سے باخبر ہو گیا اس وقت حقیقتِ توحید منکشف ہو جائے گی۔ آپ کے دلائل بکثرت ہیں۔ واللہ اعلم

(۶۲) حضرت ابوعثمان سعید بن سلام مغربی رحمتہ اللہ علیہ

منجملہ ائمہ طریقت، سیفِ سیادت آفتابِ نجابت حضرت ابوعثمان سعید بن سلام مغربی رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو اہل استقامت بزرگوں میں سے تھے صاحبِ ریاضت وسیاست اور فنون علم میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ روایات میں مانند آفتاب نجابت تھے۔ آپ کی نشانیاں بکثرت اور براہین عمدہ ہیں۔

آپ کا ارشاد ہے:۔

من آثر صحبة الاغنياء على مجانسة الفقراء ابتلاه الله تعالىٰ بموت القلب''	جو درویشوں کی صحبت پر تونگروں کی ہم نشینی کو ترجیح دیتا ہے اللہ تعالیٰ اسے دل کی موت میں مبتلا کر دیتا ہے۔

اس لئے کہ جب درویشوں کی مجلس کے مقابلہ میں تونگروں کی صحبت اختیار کرے گا تو اس کا دل حاجت کی موت سے آپ ہی مر جائے گا اور اس کا جسم وہم وگمان میں گرفتار ہو جائے گا۔ جب کہ مجلس چھوڑنے کا نتیجہ دل کی موت ہے تو صحبت سے اعراض کا کیا انجام ہوگا؟ ان مختصر کلمات میں صحبت اور مجانست کا فرق ظاہر ہے۔ واللہ اعلم

(۶۳) حضرت ابوالقاسم ابراہیم بن محمد محمود نصرآبادی علیہ الرحمتہ

منجملہ ائمہ متقدمین، صوفیا کے صف کے بہادر، عارفوں کے احوال کے معبر حضرت ابوالقاسم ابراہیم محمد بن محمود نصرآبادی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ جس طرح نیشاپور میں خوارزم بادشاہ تھے اور شاہ پور میں تمویہ بادشاہ گذرے ہیں اسی طرح آپ نیشاپور میں بلند مرتبہ پر فائز تھے۔ فرق یہ تھا کہ وہ دنیا کی عزت رکھتے تھے اور آپ آخرت کی عزت سے مالا مال۔ آپ کا کلام انوکھا اور نشانیاں بہت ہیں حضرت شبلی علیہ الرحمتہ کے مرید اور متاخرینِ اہل خراسان کے استاذ تھے۔ اپنے زمانہ میں ہر فن میں اعلم واورع تھے۔

آپ کا ارشاد ہے:۔

انت بين نسبتين نسبة الىٰ آدم و نسبة الى الحق فاذا انتسبت الىٰ آدم دخلت فى ميادين الشهوات و مواضع الآفات و الزلا لات وهى نسبة تحقق البشرية قال الله تعالىٰ انه كان ظلو ما جهولا۔ واذا نسبت الى الحق دخلت فى مقامات الكشف والبراهين والعصمة والولاية وهى

نسبة تحقق العبودية قال اللّٰہ تعالیٰ و عباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض ھوناً الأیہ۔

ترجمہ:

یعنی تم دونسبتوں کے درمیان ہو ایک نسبت حضرت آدم کی طرف ہے اور دوسری نسبت حق تعالیٰ کی طرف ہے جب تم آدم کی طرف منسوب ہوتے ہو تو شہوت کے میدانوں میں اور آفت کی غلط جگہوں اور مقامات میں داخل ہو جاتے ہو۔ یہی وہ نسبت ہے جس سے تمہارا بشر ہونا ثابت ہے اسی نسبت کے لحاظ سے اللہ تعالےٰ نے فرمایا ابن آدم بڑا جفاکار اور ناعاقبت اندیش واقع ہوا ہے۔ جب تم اپنی نسبت حق تعالیٰ سے قائم کرتے ہو تو تم کشف و براہین اور عصمت وولایت کے مقامات میں داخل ہو جاتے ہو یہی وہ نسبت ہے جس سے حق تعالیٰ کی بندگی کا ثبوت ملتا ہے اسی نسبت کے اعتبار سے حق تعالیٰ نے فرمایا رحمٰن کے بندے زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں۔

پہلی نسبت بشریت کی ہے اور دوسری نسبت عبودیت کی۔ نسبتِ آدم تو قیامت میں منقطع ہو جائے گی البتہ نسبتِ عبودیت ہمیشہ قائم ودائم رہے گی اس میں تغیر تبدل جائز نہیں رکھا گیا۔ جب اپنی نسبت کو اپنی طرف یا حضرت آدمؑ سے جوڑے تو اس کا کمال یہ ہے کہ وہ کہے "انی ظلمت نفسی" میں نے اپنی جان پر زیادتی کی ہے۔ اور جب اپنی نسبت حق تعالےٰ کی طرف کرتا ہے تو وہ بندہ اسی کا محل بن جاتا ہے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے "یا عبادی لا خوف علیکم الیوم" اے میرے بندے آج تم پر کوئی خوف نہیں۔ واللہ اعلم

(٦٤) حضرت ابوالحسن علی بن ابراہیم حضرمی علیہ الرحمتہ

منجملہ ائمۂ متقدمین سالکانِ طریق حق کے سردار، اہلِ تحقیق کی جانوں کے جمال حضرت ابوالحسن علی بن ابراہیم حضرمی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ جو بارگاہِ الٰہی کے بزرگ ترین احرار بندوں اور صوفیاء کبار کے اماموں میں سے تھے۔ آپ اپنے عہد میں بے نظیر تھے۔ ہر معانی میں آپ کا کلام ارفع اور عبارتیں عمدہ ہیں۔

آپ کا ارشاد ہے:۔

دعونی فی بلائی واسمعوا مالکم الستم من اولاد آدم الذی خلقه اللّٰه تعالٰی بیده و نفخ فیه من روحه واسجدله الملائکة ثم امرهٗ بامر فخالف فاذا کان اول الدن دردیافکیف کان آخره۔	مجھے اپنی بلاؤں میں چھوڑ دو، سنو! تم کیا اسی آدمؑ کی اولاد میں سے نہیں ہو جسے اللہ تعالےٰ نے اپنے دست قدرت سے پیدا کر کے اپنی طرف سے ان میں روح پھونکی اور انھیں فرشتوں سے سجدہ کرایا۔ پھر ایک حکم دیا تو اس کی بھی خلاف ورزی کی۔ جب کہ شروع ہی میں تلچھٹ ہے تو آخر میں کیا ہوگا۔

آپ کے فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ اگر آدمی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ سراسر مخالفِ حق بن جائے گا۔ اور اگر اس پر عنایتِ حق ہو جائے تو سرتاپا محبت ہو جائے گا۔ لہٰذا اللہ تعالےٰ کی حسنِ عنایت کو سمجھ کر اپنے معاملات کی برائی کا اس سے موازنہ کرتے رہنا چاہئے اور اپنی تمام عمر اسی موازنہ میں گزار دینی چاہیے۔
وباللہ التوفیق۔

یہ ہے سلف کے برگزیدہ متقدمین مشائخ کا مختصر تذکرہ۔ اگر میں اس کتاب میں تمام بزرگوں کا تذکرہ کرتا یا تشریح و تفصیل کے درپے ہوتا اور ان کے تمام حالات و واقعات کو درج کرتا تو اصل مقصود فوت ہو جاتا۔ طوالت کے خوف سے اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے اب کچھ متاخرین صوفیاء کا تذکرہ شامل کرتا ہوں۔

متاخرین آئمہ ومشائخ کا تذکرہ

واضح رہنا چاہئے کہ ہمارے زمانہ میں ایک گروہ ایسا ہے جو ریاضت کا بوجھ برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا اور بے ریاضت مرتبہ کا خواہاں ہے اور وہ تمام صوفیاء کو اپنا ہی جیسا کاہل خیال کرتا ہے۔ جب وہ ان صوفیاء کی باتیں سنتے ہیں اوران کے عزت ومرتبہ کو دیکھتے ہیں اوران کے معاملات کو پڑھتے ہیں اور پھر اپنے آپ پر نظر ڈالتے ہیں تو خود کو ان سے بہت دور پاتے ہیں۔ اس وقت تصوف کو چھوڑ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم ایسے باہمت لوگ نہیں ہیں اور نہ ہمارے زمانہ میں ایسے حضرات نظر آتے ہیں۔ حالانکہ ان کا یہ کہنا باطل ہے اس لئے کہ اللہ تعالےٰ زمین کو ہرگز بے حجت نہیں چھوڑتا اوراس امت کو بغیر ولی کے کبھی نہیں رکھتا۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ "لا یزال طائفة من امتی علی الخیر والحق حتی تقوم الساعة "میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ خیر وحق پر تاقیامت قائم رہے گی۔ نیز فرمایا "لا یزال فی امتی اربعون علی خلق ابراھیم "میری امت کے چالیس افراد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خُلق پر ہمیشہ موجود رہیں گے۔ ان میں سے کچھ افراد کا تذکرہ اس جگہ لا رہا ہوں۔ اگرچہ کچھ حضرات دنیا سے کوچ کر کے بہشت میں آرام پذیر ہیں اور کچھ زندہ ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنا وعن جمیع المسلمین والمسلمات برحمتہ۔

(۱) حضرت ابوالعباس احمد بن محمد قصاب علیہ الرحمتہ

منجملہ متاخرین ائمہ طریقت، طراز طریق ولایت، جمال اہلِ ہدایت، حضرت ابوالعباس احمد بن محمد قصاب رحمہ اللہ ہیں آپ نے ماوراء النہر کے صوفیاء متقدمین سے ملاقات کی اوران کی صحبت میں رہے۔ آپ علوِ حال، صدق فراست، کثرت برہان اور زہد وکرامت میں مشہور ومعروف تھے۔ امام طبرستان حضرت ابوعبداللہ خیاطی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ایک فضل یہ ہے کہ وہ کسی کو بغیر تعلیم کے ایسا بنا دیتا ہے کہ جب ہم کو اصولِ دین اور توحید کے دقائق میں کوئی مسئلہ دشوار ومشکل نظر آتا ہے تو ہم ان سے جا کر حل کر لیتے ہیں وہ حضرت ابوالعباس قصاب ہیں۔

چونکہ آپ اُمّی تھے لیکن علمِ تصوف اور اصولِ دین میں آپ کا کلام بہت ارفع تھا۔آپ کی حالتِ ابتداء وانتہا بہت اعلیٰ اور نیک سیرت تھی۔

اگرچہ مجھے آپ کی بہت سی حکایتیں سنائی گئی ہیں لیکن میرا طریق اس کتاب میں اختصار ہے اس لئے آپ کی ایک حکایت بیان کرتا ہوں۔

حکایت ایک بچہ اونٹ پر بوجھ لادے اس کی نکیل پکڑے آمل کے بازار میں جا رہا تھا اس بازار میں کیچڑ بہت تھا اونٹ کا پاؤں پھسلا وہ گر پڑا اور اس کا پاؤں ٹوٹ گیا۔لوگوں نے چاہا کہ اونٹ کی کمر سے بوجھ اتارلیں لیکن بچہ ہاتھ اٹھا کر دعائیں مانگ رہا تھا اور روتا جا رہا تھا اتفاق سے ادھر حضرت ابوالعباس کا گذر ہوا آپ نے پوچھا کیا بات ہے؟ لوگوں نے کہا اونٹ کا پاؤں ٹوٹ گیا ہے۔آپ نے اونٹ کی نکیل تھامی اور آسمان کی طرف مُنہ کر کے دعا مانگی کے اے خدا! اس اونٹ کا پاؤں ٹھیک کر دے اور اگر تو درست کرنا نہیں چاہتا تو اس قصابی کا دل بچے کے رونے سے کیوں جلاتا ہے۔اسی وقت اونٹ کھڑا ہو گیا اور دوڑنے لگا۔

آپ کا ارشاد ہے کہ سارے عالم کو خواہ وہ چاہیں یا نہ چاہیں بہر طور اخلاق اللہ سے متصف ہونا چاہیئے۔ورنہ وہ رنج میں رہیں گے۔اس لئے کہ جب تم حق تعالےٰ کی خصلت کے عادی بن گئے تو بلاء وابتلا کی حالت میں رغبت زیادہ پاؤ گے۔کیونکہ بلا پر بلا نہیں آتی۔اگر حق کے خوگر نہ ہو گے تو بلا کی حالت میں تم آزردہ دل ہو گے کیونکہ اللہ تعالےٰ نے خوشی و سختی دونوں مقدر فرمائے ہیں۔وہ اپنی تقدیر کو بدلتا نہیں ہے لہٰذا اس کے حکم پر ہمارا راضی ہونا ہماری راحت کا سبب ہوگا۔اور جو بھی اس کا عادی ہوگا اس کا دل راحت پائے گا۔اور اس سے اعراض کرو گے تو تقدیر کے نازل ہونے پر آزردہ ہو گے۔واللہ اعلم

(۲) حضرت ابو علی بن حسین بن محمد دقاق علیہ الرحمتہ

از ائمۂ متاخرین، بیان مریداں، برہانِ محققاں حضرت ابو علی بن حسین بن محمد دقاق رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو اپنے فن کے امام، زمانہ میں بے نظیر اور کشفِ راہِ حق میں، بیان صریح اور زبان فصیح رکھتے تھے بکثرت مشائخ سے ملاقات کی اور ان کی صحبت پائی۔آپ حضرت نصر آبادی کے مرید تھے وعظ و نصیحت فرمایا کرتے تھے۔

آپ کا ارشاد ہے:۔

من آنس بغیرہ ضعف فی حالہ ومن نطق من غیرہ کذب فی مقالہ۔	جو حق تعالےٰ کے ماسوا کسی اور سے انس رکھے وہ اپنے حال میں کمزور ہے اور جو اس کے غیر کی بات کرے وہ اپنے کلام میں جھوٹا ہے۔

اس لئے کہ غیر سے انس رکھنا معرفت کی کمی کی بنا پر ہے اور خدا سے انس رکھنا غیر کی وحشت سے محفوظ رہنا ہے۔ اور جو غیر سے ڈرنے والا ہوتا ہے وہ غیر سے بات تک نہیں کرسکتا۔

ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں ان کی مجلس میں اس لئے گیا کہ میں ان سے متوکلین کا حال دریافت کروں۔ آپ اس وقت طبری کا نفیس عمامہ سر پر باندھے ہوئے تھے۔ میرا دل دستار پر مائل ہوگیا۔ میں نے ان سے عرض کیا اے شیخ! توکل کیا ہے آپ نے فرمایا توکل یہ ہے کہ تم لوگوں کی دستار کا لالچ نہ کرو۔ یہ فرما کر اپنا عمامہ میرے آگے ڈال دیا۔

(۳) حضرت ابوالحسن علی بن احمد خرقانی علیہ الرحمتہ

از ائمۂ متاخرین شرف اہلِ زمانہ در زمانہ خود یگانہ حضرت ابوالحسن علی بن احمد خرقانی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ جو برگزیدہ جلیل القدر مشائخ میں سے ہیں۔ تمام اولیاء کے ممدوح رہے۔ حضرت شیخ ابوسعید نے ان کی زیارت کا قصد کیا۔ انھوں نے ان کے ساتھ ہر فن کے لطیف محاورات استعمال کئے۔ اور جب شیخ ابوسعید نے واپسی کا قصد کیا تو آپ نے فرمایا میں نے تمہیں اپنے زمانے کی ولایت (اور اپنی نیابت) کے لئے چن لیا۔ (حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں) میں نے حضرت ابوسعید کے خادم حسن مؤدب سے سنا کہ جب وہ حضرت خرقانی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں جاتے تو خاموش رہتے یا آپ کے سوالات کے (حسنِ ادب و اختصار کے ساتھ) جواب دیتے۔ میں نے ان سے دریافت کیا اے شیخ! آپ نے ایسی خاموشی کس لئے اختیار فرمائی آپ نے فرمایا ایک ہی شخص بیان کرنے کے لئے کافی ہے۔ حضرت استاذ ابوالقاسم قشیری رحمتہ اللہ علیہ سے میں نے سنا وہ فرماتے ہیں کہ جب میں خرقان کی ولایت میں داخل ہوا تو اس بزرگ کے جلال و دبدبہ کی وجہ سے میری فصاحت جاتی رہی۔ اور میری تمام نکتہ سنجیاں ختم ہوگئیں۔ میں نے خیال کیا کہ شاید میں اپنی ولایت سے معزول کردیا گیا ہوں۔

آپ کا ارشاد ہے کہ راستے دو ہیں، ایک گمراہی کا دوسرا ہدایت کا۔ جو راستہ گمراہی کا ہے وہ بندے کا راستہ خدا کی طرف ہے اور جو راستہ ہدایت کا ہے وہ خدا کی راہ بندے کی طرف ہے۔ لہٰذا جو یہ کہے کہ میں حق تک پہنچ گیا وہ نہیں پہنچا اور جو یہ کہے کہ مجھے اس تک پہنچا دیا گیا ہے وہ پہنچ گیا۔ اس لئے کہ جو خود بخود اس تک پہنچنے کا دعویٰ کرتا ہے گویا وہ بغیر پہنچانے والے کے دعویٰ کرتا ہے۔ اور یہ جس نے کہا کہ میں خود نہیں پہنچا، پہنچایا گیا ہوں تو یہ پہنچنے سے متعلق ہے۔ واللہ اعلم

(۴) حضرت محمد بن علی المعروف بہ داستانی علیہ الرحمتہ

از ائمۂ متاخرین، بادشاہِ وقت، اپنے زمانہ میں بیان و تعبیر میں منفرد، حضرت ابو عبداللہ محمد بن علی المعروف بہ داستانی علیہ الرحمتہ ہیں جو بسطام کے رہنے والے انواع علوم کے عالم اور برگزیدۂ بارگاہِ حق تھے۔ آپ کا کلام مہذب اور اشارات لطیف ہیں۔ اس علاقہ کے امام شیخ سہلکی رحمتہ اللہ علیہ آپ کے ساتھ خوش اعتقادی رکھتے تھے۔ میں نے ان کے کچھ انفاس شیخ سہلکی سے سُنے ہیں۔ وہ بہت بلند مرتبہ اور خوش اخلاق تھے۔

آپ کا ارشاد ہے:۔

التوحید عنک موجود وانت فی التوحید مفقود۔	تم سے متعلق توحید موجود ہے لیکن تم توحید میں غیر موجود ہو۔

کیونکہ توحید کا اقتضاء ہے اس پر تم قائم نہیں ہو۔ توحید کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ ملکیت میں اپنا تصرف و اختیار ختم کر دیا جائے۔ اور اپنے تمام امور خدا کے حوالہ کر کے اس پر ثابت قدم رہے۔

حضرت سہلکی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ شہر بسطام میں ایک مرتبہ ٹڈی دل نے یلغار کی اور ان کی کثرت سے تمام درخت اور کھیتیاں سیاہ ہو گئیں سب لوگ ہاتھ ملتے ہوئے دلفگار نکلے حضرت شیخ نے مجھ سے پوچھا یہ کیسا شور و غل ہے؟ میں نے بتایا کہ ٹڈیاں آ گئی ہیں لوگ پریشان ہیں۔ شیخ اٹھے اور چھت پر چڑھ کر منہ آسمان کی طرف اٹھایا اسی وقت تمام ٹڈیاں اُٹھ گئیں اور ظہر کی نماز تک ایک ٹڈی باقی نہ رہی اور کسی درخت کا ایک پتہ تک ضائع نہ ہوا۔

(۵) حضرت فضل اللہ بن محمد مہینی علیہ الرحمتہ

از ائمۂ متاخرین، شہنشاہِ محباں، ملکِ الملوک صوفیاں، حضرت ابو سعید فضل اللہ بن محمد مہینی رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو سلطانِ وقت اور جمال طریقت تھے تمام لوگ آپ سے مسخر تھے کچھ آپ کے دیدار جمال سے اور کچھ عقیدت سے اور کچھ قوتِ حال سے۔ آپ فنونِ علوم کے عالم اور نرالی شان رکھتے تھے۔ اسرارِ الٰہی سے مشرف حضرات میں آپ کا مرتبہ بلند تھا علاوہ ازیں آپ کی نشانیاں اور براہین بکثرت ہیں اور آج بھی جہان میں ان کے آثار ظاہر ہیں۔ اپ کا ابتدائی حال یہ ہے کہ آپ مہنہ سے تحصیل علم کے لئے سرخس آئے اور حضرت ابو علی زاہد کے درس میں بیٹھے۔ آپ ان سے ایک دن میں تین دن کا درس لیتے اور تین دن عبادت میں گزارتے یہاں تک کہ آپ کے استاد نے آپ کے رشد کا حال دیکھا تو تعظیم و تکریم میں اضافہ کر دیا۔ اس زمانہ میں سرخس کا حاکم شیخ ابو الفضل حسن تھا۔ ایک روز آپ نہر کے کنارے جا رہے تھے کہ سامنے سے ابو الفضل آتے دکھائی دیا۔ وہ کہنے لگا اے ابو سعید تمہارا راستہ یہ نہیں ہے جس پر تم چل رہے ہو، اپنی راہ چلو۔ آپ نے اس سے کچھ تعرض نہ کیا اور پلٹ کر اپنی جگہ آ گئے اور ریاضت و مجاہدہ میں مشغول ہو گئے۔ یہاں تک کہ حق تعالےٰ نے آپ پر ہدایت کا دروازہ کھول دیا اور مراتب علیا پر فائز کر دیا۔

حضرت شیخ ابو مسلم فارسی نے مجھے بتایا کہ میری ان سے بڑی چھیڑ چھاڑ رہتی تھی ایک مرتبہ میں ان سے ملنے گیا اس وقت میں میلی سی ایک گدڑی پہنے ہوئے تھے جب میں مکان کے اندر ان کے روبرو پہنچا تو انہیں دیبائے مصری پہنے ہوئے تخت پر بیٹھے دیکھا۔ میں نے دل میں کہا یہ اس ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ بود و باش پر درویشی کا دعویٰ کرتے ہیں اور میں ان تمام علاقوں سے مجرد رہ کر درویشی کا مدعی ہوں ان کے ساتھ میری موافقت کیسے ہوگی؟ وہ مردِ خدا، میرے اس دلی خدشہ سے باخبر ہو گیا۔ سر اٹھا کر فرمایا۔

یا ابا مسلم! فی ای دیوان وجدت من کان قلبہ قائماً فی مشاھدۃ الحق یقع علیہ اِسم الفقر۔	اے ابو مسلم! تم نے کس کتاب میں پایا ہے کہ جس کا دل مشاہدۂ حق میں قائم ہو اس پر نامِ فقر (ناداری و مفلسی) لکھا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اصحاب مشاہدہ، تو حق تعالےٰ کے ساتھ غنی ہوتے ہیں۔ فقراء تو ارباب مجاہدہ میں سے ہوتے ہیں۔ ابو مسلم کہتے ہیں کہ میں اپنے گمان پر پشیمان ہوا اور بُرے

اندیشہ سے توبہ کی۔

حضرت ابوسعید کا ارشاد ہے:۔

التصوف قیام القلب مع اللّٰہ بلا واسطة۔	تصوف وہ ہے کہ بے واسطہ حق کے ساتھ دل کا قیام ہو۔

یہ اشارہ مشاہدہ کی طرف ہے۔ اور مشاہدہ دوستی کے غلبہ کا نشان ہے۔ اور صفت میں مستغرق ہونا دیدار کے شوق کا ثبوت ہے۔ اور صفت کا فنا ہونا حق کے ساتھ بقا کا ثبوت ہے۔ مشاہدے کی تفصیل باب الحج میں بیان کی جائے گی۔

ایک مرتبہ حضرت ابوسعید نے نیشاپور سے مقام طوس جانے کا ارادہ کیا راستہ میں ایک گھاٹی اتنی سرد آئی کہ موزے میں پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے ایک درویش کو خیال آیا کہ میں اپنی چادر پھاڑ کر دو ٹکڑے کر کے شیخ کے پاؤں پر لپیٹ دوں چادر چونکہ عمدہ اور قیمتی تھی ٹکڑے کرنے کو دل نے گوارہ نہ کیا۔ جب ہم طوس پہنچے تو اس درویش نے اُن سے سوال کیا کہ اے شیخ! شیطانی وسوسہ اور الہام حق کے درمیان کیا فرق ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ الہام وہ تھا کہ تجھے چادر پھاڑ کر دو ٹکڑے کر کے ابوسعید کے پاؤں پر لپیٹنے کا حکم دیا گیا تا کہ وہ سردی سے محفوظ رہیں اور شیطانی وسوسہ وہ تھا کہ تجھے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ اس قسم کی بکثرت اور متواتر باتیں ان سے منسوب ہیں۔ مردانِ خدا کا یہی کام ہے۔ واللہ اعلم

(۶) حضرت ابوالفضل محمد بن الحسن الختلی علیہ الرحمتہ

ازائمہ متاخرین زین اوتاد، شیخ عباد، حضرت ابوالفضل محمد بن الحسن الختلی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ طریقت میں میری ارادت انھیں سے ہے۔ آپ علم تفسیر و روایات کے عالم اور تصوف میں حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے ہم مشرب تھے۔ حضرت حصری کے مرید اور حضرت سردانی کے مصاحب اور حضرت ابوعمر، حضرت ابوالحسن بن سعالیہ رحمہم الہ کے ہم عصر تھے۔ ساٹھ سال کامل گوشہ نشینی اختیار کر کے پہاڑوں کے غاروں میں زندگی گذار دی۔ اور اپنا نام ونشان گم رکھا۔ زیادہ تر لگام نامی پہاڑی پر اقامت رکھی عمدہ زندگی گزاری۔ آپ کی نشانیاں اور براہین بکثرت ہیں لیکن آپ عام صوفیاء کے رسم ولباس کے پابند نہ تھے۔ اہلِ رسوم سے سخت بیزار تھے میں نے آپ سے بڑھ کر رعب ودبدبہ والا کسی مردِ خدا کو کبھی نہ دیکھا۔

آپ کا ارشاد ہے:۔

الدنیا یوم ولنا فیھا صوم۔	دنیا ایک دن کی ہے اور ہم اس میں روزہ دار ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ ہم نہ تو دنیا سے کچھ حاصل کرنے کی خواہش کرتے ہیں اور نہ اس کی بندش میں آنا چاہتے ہیں۔ ہم نے اس کی آفتوں کو دیکھ لیا ہے اور اس کے حجابات سے باخبر ہو چکے ہیں۔ ہم اس سے بھاگتے ہیں۔

حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں وضو کراتے ہوئے آپ کے ہاتھوں پر پانی ڈال رہا تھا میرے دل میں خیال گزرا کہ جب تمام کام قسمت و تقدیر پر منحصر ہیں تو آزاد لوگ کیوں کرامت کی خواہش میں مرشدوں کے غلام بنتے پھرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اے فرزند! جو خیالات تمہارے دل میں گزر رہے ہیں میں نے جان لیا ہے لہٰذا تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہر حکم کے لئے کوئی سبب ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کسی سپاہی بچہ کو تاج و تخت عطا فرماتا ہے تو وہ اسے توبہ کی توفیق دے کر کسی دوست و محبوب کی خدمت کی سعادت نصیب فرماتا ہے تاکہ یہ خدمت اس کی کرامت کا موجب بنے۔ اس قسم کے بکثرت لطائف روزانہ ظہور پذیر ہوتے تھے۔ جس دن آپ کی رحلت ہوئی اس وقت آپ دمشق دنیان ردو کے مابین گھاٹی کے کنارے ایک گاؤں "بیت الجن" نامی میں تشریف فرما تھے اور آپ کا سر مبارک میری آغوش میں تھا۔ اس وقت اپنے کسی دوست کی طرف سے میرے دل میں کچھ رنج تھا جو انسانی خاصہ مزاج ہے آپ نے مجھ سے فرمایا اے فرزند! دل کو مضبوط کرنے والا ایک مسئلہ بتاتا ہوں اگر خود کو اس پر کاربند رکھو گے تو تمام رنج و فکر سے محفوظ رہو گے فرمایا ہر محل اور ہر حالت کو خواہ وہ نیک ہو یا بد، اللہ تعالیٰ ہی نے اسے پیدا فرمایا ہے لہٰذا اس کے کسی فعل پر معترض نہ ہونا چاہئے اور نہ دل کو رنجیدہ کرنا چاہئے۔ اس کے سوا آپ نے کوئی وصیت نہ فرمائی۔ اور اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔ واللہ اعلم۔

(۷) حضرت ابوالقاسم عبدالکریم بن ھوازی قشیری علیہ الرحمتہ

از ائمہء متاخرین، استاد و امام، وزین اسلام حضرت ابوالقاسم عبدالکریم ابن ہوازن قشیری رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو اپنے زمانہ میں یکتا اور قدر و منزلت میں ارفع واشرف تھے۔ آپ کے حالات اور گوناگوں فضائل، اہلِ زمانہ میں مشہور ہیں۔ ہر فن میں آپ کے لطائف موجود

ہیں۔ اللہ تعالٰی نے آپ کے حال وزبان کو لغویات سے محفوظ رکھا۔

میں نے آپ کا یہ ارشاد سنا ہے کہ:۔

مثل الصوفی کعلۃ البرسام اولہ ھذیان و آخرہ سکوت فاذا تمکن خرس۔	صوفی سرسام کی بیماری کی مانند ہے کہ پہلے ھذیان ہوتی ہے آخر میں خاموشی، پھر جب قائم ہوجائے تو گونگا بنادیتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ صفوت کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک وجد کی، دوسری نمود کی نمود مبتدیوں کے لئے ہے، نمود سے مراد ہذیان ہے۔ اور وجد منتہیوں کے لئے ہے اور حالتِ وجد کا بیان محال ودشوار ہوتا ہے۔ لہٰذا جب تک طالب ہے۔ علو ہمت سے گویا ہے اور گویائی اہلِ طلب کے نزدیک ہذیان ہے۔ جب وصال ہوگیا تو واصل ہوگئے۔ ان کے لئے بیان واشارے کی حاجت نہیں رہتی، جس طرح کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مبتدی تھے تو ان کی تمام ہمتیں رویتِ الٰہی کی تمنا میں رہیں اور "رب ارنی انظر الیک" اے رب مجھے اپنا جلوہ دکھا کہ میں تیرے دیدار سے مشرف ہوجاؤں کی مناجات کرتے رہے یہ مقصود کی نارسائی میں نمود کی تعبیر ہے اور ہمارے آقا سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم منتہی اور صاحب تمکین ہیں جب آپ کا وجود مقام ہمت سے بلند ہوا اور ہمت فنا ہوئی تو ارشاد ہوا "لا احصی ثناء علیک" میں تیری ثنا شمار نہیں کرسکتا۔ یہ منزلت رفیع اور مقام اعلیٰ ہے۔ واللہ اعلم

(۸) حضرت ابوالعباس احمد بن محمد اشقانی علیہ الرحمتہ

از ائمہ متاخرین، شیخ وامام اوحد، درطریق خود مفرد حضرت ابوالعباس احمد بن محمد اشقانی رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو فنون علم کے اصول وفروع میں امام، اور ہر معانی میں کامل واکمل تھے۔ اہل تصوف کے اکابر اور اجلّہ میں آپ کا شمار ہے۔ بکثرت مشائخ سے ملاقات کی۔ آپ اہل راہ کو فنا سے تعبیر کرتے تھے اور مغلق ومشکل عبارت بولنے میں مخصوص تھے۔ میں نے جہلا کی ایک جماعت کو دیکھا کہ وہ ان عبارتوں کی تقلید کرتے اور اُن کے شطحیات کی پیروی کرتے اور غیر محمود معنی کا اتباع کرتے تھے۔ حالانکہ ان کی عبارتوں پر غور وفکر کی ضرورت تھی مجھے ان سے بڑی محبت تھی چونکہ وہ مجھ پر بڑی مہربانی وشفقت فرماتے تھے۔ بعض علوم میں وہ میرے استاد تھے۔ شریعت کی تعظیم کرتے اور ہر شخص سے کنارہ کش رہنے میں ان سے زیادہ کسی شخص کو میں نے نہ دیکھا۔

علم اصول میں ان کی دقیق عبارتوں سے، امام و محقق کے سوا کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ ان کی طبیعت ہمیشہ دنیا و آخرت سے بیزار رہی اور ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ "اشتہی عدما مالا وجود لہ" میں ایسی فنا کا طالب ہوں جس میں وجود کا شائبہ تک نہ ہو۔ اور فارسی میں فرماتے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر آدمی کو محال کی خواہش ہے مجھے بھی محال درکار ہے۔ لیکن میں یقین سے جانتا ہوں کہ ایسا کبھی نہ ہوگا۔ حالانکہ ممکن وہی ہے جس کی مجھے ضرورت ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسی فنا میں لے جائے گا جہاں فنا کا بھی وجود نہ ہوگا۔ کیونکہ جتنے مقامات جو کہ زمانہ میں ہیں وہ سب ہی حجاب و ابتلاء ہیں۔ اور آدمی خود اپنے حجاب کا عاشق ہے۔ دیدار کی آرزو میں بندہ کا فنا ہونا حجاب میں آرام و سکون سے بہتر ہے اور جب کہ اللہ تعالیٰ باقی ہے اور اس پر عدم و فنا جائز ہی نہیں ہے تو بہتر یہی ہے کہ میں اس کے قبضہ قدرت ہی میں فنا ہو جاؤں کیوں کہ ایسے فنا کے لئے ہرگز بقا نہ ہوگی۔ صحت فنا میں یہ قاعدہ مضبوط و مستحکم ہے۔ واللہ اعلم

(۹) حضرت ابوالقاسم بن علی بن عبداللہ گرگانی علیہ الرحمتہ

از ائمہ متاخرین قطب زمانہ، در وقت خود یگانہ حضرت ابوالقاسم بن علی بن عبداللہ گرگانی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ جو اپنے وقت و زمانہ میں بے نظیر و بے عدیل تھے۔ آپ کا ابتدائی حال بہت اچھا تھا۔ آپ کی مسافرت سخت اور باشرط تھی۔ لوگوں کے دل آپ کی طرف مائل تھے۔ تمام طلباء آپ سے عقیدت رکھتے تھے اور مریدوں کے وقوع کشف میں ایک قسم کا نشان تھا۔ ظاہری حالت مزین اور تمام علوم میں ماہر تھے۔ آپ کا ہر مرید جہان کی زینت تھا۔ انھوں نے اپنی اولاد کو نیک چھوڑا۔ انشاء اللہ توقع ہے کہ وہ اپنے پیچھے ایسا جانشین چھوڑیں گے جسے تمام صوفیاء اپنا مقتداء تسلیم کریں گے۔ میری مراد انسان الوقت ابوعلی ابوالفضل بن محمد الفارمدی سے ہے۔

حضرت ابوعلی فضل بن محمد نے ان کے حق میں اپنا نصیب نہ چھوڑا تھا چونکہ وہ سب سے کنارہ کش رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس اعراض کی برکت سے اس مقتداء کو آپ کی زبانِ حال بنا دیا ہے۔ ایک دن میں شیخ کے روبرو حاضر تھا اور اپنے احوال و نمود کو شمار کر رہا تھا تاکہ اپنی کیفیت آپ سے بیان کروں کیونکہ آپ ہی وقت کے ناقد تھے۔ آپ نے مجھ پر شفقت فرما کر انہیں سنا۔ آپ کی توجہ اور انہماک کی وجہ سے میں نے طولِ کلام سے کام لیا اور یہ سمجھا کہ شاید آپ ان مقامات و کیفیات سے نہیں گزرے آپ اپنے کشف باطنی سے میرے خیالات جان گئے۔

فرمانے لگے اے والد کے دوست! تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میرا یہ انکسار نہ تمہارے لئے ہے نہ تمہارے حال کے لئے کیونکہ حال کا بدلنے والا محال کے محل میں آتا ہے بلکہ میرا یہ انکسار محوّلِ احوال اللہ تعالیٰ کے حضور میں ہے۔ یہ بات تمام طلباء کے لئے عام ہے صرف تمہارے ہی لئے نہیں ہے۔ جب میں نے یہ سُنا تو میں از خود رفتہ ہو گیا۔ انھوں نے میری باطنی حالت کو ملاحظہ فرما کر کہا اے فرزند! آدمی کو اس طریقت سے اس سے زیادہ نسبت نہیں ہوتی کہ جب اسے طریقت کی طرف لگائیں تو اس کے گمان کو پھیر دیا جائے اور جب وہ گمان سے پھر جائے تو پھر اس پر خیالی تعبیر کی راہ بند کر دی جائے۔ لہذا نفی و اثبات اور اس کا وجود و عدم دونوں خیالی ہیں۔ آدمی کسی طرح خیالی بندش سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اس لیے چاہئے کہ وہ حق کی بندگی اختیار کرے اور اپنے دل سے تمام نسبتوں کو نکال پھینکے۔ صرف بندگی اور فرمانبرداری کی نسبت کو برقرار رکھے۔ اسکے سوا اور بھی بکثرت اسرار کی باتیں ہوئیں جنکے تذکرے میں اصل موضوع خلط مبحث ہو جائے گا۔ واللہ اعلم

(۱۰) حضرت ابو احمد المظفر علیہ الرحمتہ

از ائمہ متاخرین، رئیسِ اولیاء، ناصح اصفیاء حضرت ابو احمد المظفر بن احمد بن حمدان رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ کا باطن مسندِ جلوہ ہائے ربانی تھا۔ تصوف کے دروازے کشادہ اور سر پر تاجِ فراست آراستہ تھا۔ فنا و بقا کی تشریح عمدہ اور تعبیر بلند تھی۔ شیخ المشائخ حضرت ابو سعید فرماتے ہیں کہ ہمیں بارگاہِ الٰہی کا قرب، بندگی کی راہ سے عطا ہوا۔ اور خواجہ المظفر کو براہِ راست خدا کی طرف سے ملا۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے مجاہدے سے مشاہدہ کیا اور انھوں نے مشاہدے سے مجاہدہ کیا۔ انھیں سے میں نے سُنا کہ بزرگوں کو جو کچھ بادیہ پیمائی اور قطع مسافت کے بعد ملا وہ مجھے مسند اور بالانشینی سے حاصل ہوا۔ اصحابِ رعونت و متکبرین شیخ کی اس بات کو دعویٰ پر محمول کرتے ہیں۔ حالانکہ دعویٰ عیب ہے۔ اور کسی صورت سے اپنے حال کی صداقت کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ خاص کر جبکہ اہل معنی بیان کریں۔ ان کا فرزندِ رشید موجود ہے۔

حضرت خواجہ ابو سعید فرماتے ہیں کہ ایک دن میں ان کے پاس موجود تھا کہ نیشاپور کا ایک مدعی آیا اور آپ کے ارشاد پر کہنے لگا "فانی شود انگاہ باقی شود" یعنی فانی ہو جانے کے بعد باقی ہوتا ہے۔ خواجہ المظفر نے فرمایا فنا پر بقا کی کیا صورت ہے؟ کیونکہ فنا معدوم ہونے کو کہتے ہیں۔ اور بقا موجود کو۔ یہ ہر ایک دوسرے کو نفی کرنے والا ہے۔ لہٰذا فنا تو معلوم ہے کہ چیز ناپید ہو جاتی

ہے۔ اگر وہ موجود ہو جائے تو وہ عین شئے نہیں ہو سکتی، بلکہ وہ بجائے خود دوسری چیز ہو گی۔ اور یہ جائز نہیں کہ ایمان وذات فنا ہو جائیں۔ البتہ فنائے صفت اور فنائے سبب جائز ہے۔ معلوم ہوا کہ جب سبب اور صفت معدوم ہو گئی تو اب موصوف و مسبب رہ گیا۔ اور ذات کے لئے فنا درست نہیں۔

حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت خواجہ کی بعینہٖ عبارت مجھے یاد نہیں البتہ اس کا مفہوم یہی تھا جو درج کیا گیا ہے مزید وضاحت عام فہم طور پر یوں کی جائے گی کہ بندے کا اختیار، بندے کی صفت ہے۔ بندہ اپنے اس اختیار کی وجہ سے اختیارِ حق میں محجوب ہے۔ لہٰذا اس صفت کی بنا پر بندہ حق تعالیٰ سے حجاب میں آ گیا۔ اور یہ یقینی امر ہے کہ اختیارِ حق ازلی ہے اور بندہ حادث۔ ازل کے لئے فنا جائز نہیں ہے۔ اور جب اختیارِ حق بندہ کے بارے میں بقا بنی تو لامحالہ بندے کا اختیار فانی ہوا اور اس کا تصرف منقطع ہو گیا۔ واللہ اعلم

ایک دن میں پراگندہ حال سفری کپڑے پہنے "کرمان" ان کے پاس پہنچا۔ انھوں نے مجھ سے فرمایا اے ابوالحسن! اپنا حال بیان کرو؟ میں نے عرض کیا، سماع چاہتا ہوں۔ آپ نے اسی وقت قوال کو بلا بھیجا۔ اس کے بعد اہلِ عشرت کی ایک جماعت آئی۔ جوش جوانی، قوتِ ارادی اور سوزِ محبت نے مجھے کچھ کلمات سننے پر بے چین کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد جب جوش ٹھنڈا پڑا اور غلبہ کم ہوا تو انھوں نے مجھ سے فرمایا سماع کے بارے میں کیا خیال ہے؟ میں نے عرض کیا اے شیخ! مجھے بڑی فرحت حاصل ہوئی۔ انھوں نے فرمایا جس وقت قوال کو بلایا گیا تھا اس وقت سماع کی آواز اور کوّوں کی آواز دونوں برابر تھیں کیونکہ سماع کی طاقت اس وقت تک ہے جب تک کہ مشاہدہ نہ ہو۔ اور جب مشاہدہ حاصل ہو جاتا ہے تو قدرتِ سماع ناپید ہو جاتی ہے دیکھو ایسی عادت اختیار نہ کرو کہ کہیں طبیعت ثانیہ نہ بن جائے اور مشاہدے سے دور ہو جاؤ۔ واللہ اعلم

تیرھواں باب

مختلف شہروں میں مشائخ متاخرین کا تذکرہ

اگر میں ہر ایک کے ذکر اور حال کی تشریح کروں تو کتاب طویل ہو جائے گی اور بالکل ہی ذکر نہ کروں تو کتاب کا مقصد فوت ہو جائے گا اس لئے صرف ان کے اسماء گنواتا ہوں جو میرے زمانہ میں طریقت کے مشائخ اور صوفیاء گذرے ہیں۔ اور وہ ارباب معانی میں سے ہیں نہ کہ اصحاب رسوم میں سے۔

عراق و شام میں مشائخ متاخرین میں سے (۱) شیخ زکی بن العلاء ہیں جو برگزیدہ اور سادات زمانہ میں سے ہیں۔ میں نے ان کو سراپا شعلہء محبت پایا ان کی نشانیاں اور براہین ظاہر ہیں۔ (۲) شیخ بزرگوار ابو جعفر محمد بن المصباح صیدلانی ہیں۔ جو روساء متصوفین میں سے ہیں اور تحقیق میں زبان و بیان کے ماہر ہیں۔ وہ حضرت حسین بن منصور حلاج سے بڑی محبت رکھتے ہیں۔ ان کی بعض تصانیف میں نے پڑھی ہیں۔ (۳) حضرت ابوالقاسم سدی جو صاحبِ مجاہدہ اور صاحبِ حال ہیں۔ حسنِ عقیدت کے ساتھ درویشوں کی نیاز مندی اور خدمت گزاری کرتے ہیں۔

ملک فارس میں (۱) شیخ الشیوخ ابوالحسن بن سالبہ ہیں جو تصوف میں افصح اللسان اور توحید میں اوضح البیان ہیں ان کے کلمات مشہور ہیں۔ (۲) شیخ مرشد ابو اسحٰق ابن شہریار ہیں جو برگزیدۂ قوم اور صاحبِ سیاست ہیں۔ (۳) شیخ طریقت ابوالحسن بن بکران ہیں جو اکابر صوفیا میں سے ہیں۔ (۴) شیخ ابو مسلم ہروی ہیں جو عزیز وقت اور صاحب حال ہیں۔ (۵) شیخ ابوالفتح سالبہ ہیں جو اپنے والد کے فرزند رشید اور امیدوار ہیں۔ (۶) شیخ ابو طالب ہیں جو ایک بزرگ پابند کلمات حق ہیں۔ (۷) شیخ الشیوخ شیخ ابو اسحٰق راہدیدہ جوان سب میں بزرگ ہیں۔

قہستان، آذربائیجان، بحرستان اور فک میں، (۱) شیخ شفیق فرح المعروف بہ اخی زنجانی ہیں جو مردِ نیک سیرت اور ستودہ طریقت ہیں اور اپنے زمانہ کے شیخ اور بزرگ صوفی ہیں۔ ان کی نیکیاں بہت ہیں۔ بادشاہ جو عیار شخص تھا ان کی وجہ سے تائب ہو کر راہ حق پر آ گیا۔ (۲) شیخ ابو عبداللہ جنیدی ہیں جو مہربان و شفیق بزرگ ہیں۔ (۳) اجلہء مشائخ میں سے شیخ ابو طالب مکشوف ہیں۔ (۴) خواجہ حسن سمنانی جو ایک مردِ گرفتارِ بلا اور امیدوار ہیں۔ (۵) شیخ سہلکی ہیں جو

جماعت صوفیا میں دانشور ہیں۔ (۶) احمد بن شیخ خرمانی جو اپنے والد کے فرزندِ رشید ہیں۔
(۷) حضرت ادیب کمندی جو ساداتِ زمانہ میں سے ہیں۔

کرمان میں، (۱) حضرت خواجہ علی بن حسین کیر کانی ہیں جو سیاحِ وقت اور نیک خصلت ہیں۔ ان کے فرزند حکیم، ایک مردِ عزیز ہیں۔ (۲) حضرت شیخ محمد بن سلمہ ہیں جو اس عہد کے بزرگوں میں سے ہیں ان کے سامنے بکثرت اولیاء اللہ جوانمرد اور طالب وامیدوار گذرے ہیں۔

خراسان میں جہاں آج سایۂ اقبالِ حق ہے (۱) شیخ مجتہد حضرت ابوالعباس دامغانی ہیں جن کا حال اور زمانہ بہت عمدہ ہے۔ (۲) حضرت خواجہ ابوجعفر محمد بن علی الجوینی ہیں جو طریقت کے محققوں میں سے ہیں۔ (۳) حضرت خواجہ ابوجعفر ترشیزی ہیں جو عزیزانِ وقت میں سے ہیں۔ (۴) حضرت خواجہ محمد نیشاپوری جو مقتدا اور فصیح ہیں۔ (۵) حضرت شیخ محمد معشوق ہیں جن کا حال عمدہ و نیک ہے۔ اور نہایت خوش خلق ہیں (۶) حضرت جمرۃ الحب جو نیک باطن اور خوش خرم بزرگ ہیں۔ (۷) حضرت خواجہ رشید مظفر فرزند شیخ ابوسعید امیدوار ہیں جو مقتدائے قوم اور دلوں کے قبلہ ہیں۔ (۸) حضرت خواجہ شیخ احمد نجار سمرقندی مقیم مرو ہیں جو سلطانِ زمانہ ہیں۔
(۹) حضرت خواجہ شیخ احمد جماری سرخسی ہیں جو وقت کے سپاہی اور میرے ساتھی ہیں ان کے کاموں میں بڑی قدرت دیکھی ہے۔ جوانمردان متصوفہ میں سے ہیں۔ (۱۰) حضرت شیخ ابوالحسن علی بن علی الاسود ہیں جو اپنے والد کے فرزند رشید اور اپنے زمانہ میں علوِ ہمت اور مصدق و فراست میں بہترین و بے مثل ہیں۔ خراسان کے تمام مشائخ کا ذکر تو دشوار ہے۔ ان میں سے تین سو مشائخ سے تو میں نے ملاقات کی ہے اور ہر ایک کا مشرب جدا جدا پایا ہے ان کا ہر ایک فرد سارے جہان کے لئے کافی ہے۔ یہ سب اس لئے ہیں کہ خراسان کے افق پر آفتابِ محبت اور اقبالِ طریقت ہمیشہ تاباں رہا ہے۔

ماوراء النہر ہیں، (۱) خواجہ و امام، مقبول خاص و عام حضرت ابوجعفر محمد بن حسین حرمی ہیں جو صاحبِ سماع اور پابندِ طریقت ان کی ہمت بلند اور حال پاکیزہ ہے۔ سالکانِ راہِ حق کے ساتھ شفقت فرماتے ہیں اور اپنے ساتھیوں میں سردار و فقیہہ ہیں۔ (۲) حضرت ابومحمد پا لغری ہیں جو عمدہ حال اور محکم معاملات رکھتے ہیں۔ (۳) شیخِ وقت حضرت احمد ایلاقی ہیں جو برگزیدۂ وقت اور تارکِ رسوم و عادات ہیں۔ (۴) فرید العصر اور یکتائے زمانہ حضرت خواجہء عارف ہیں۔
(۵) حضرت خواجہ زمن علی بن ابی اسحٰق ہیں جو مردِ محتشم اور نیک زبان ہیں۔ یہ وہ مشائخ ہیں کہ

جن سے میں نے ملاقات کی ہے اور ہر ایک کا مقام معلوم کیا ہے یہ سب محقق ہیں۔

غزنی میں، (۱) شیخ عارف، ممدوحِ زمانہ حضرت ابوالفضل بن اسدی ہیں۔ جو شیخ طریقت ہیں اور ان کی کرامت و براہین ظاہر ہیں۔ جب سوزِ محبت کا غلبہ ہوا تو ظاہری حالت سے لوگوں نے دھوکہ کھایا۔ (۲) شیخ مجرد، علائق دنیوی کے تارک حضرت اسمٰعیل شاشی ہیں جو شیخ محتشم اور ملامتی طریق پر ہیں۔ (۳) منجملہ علماء طریقت حضرت شیخ سالار ہیں جن کا حال عمدہ ہے۔ (۴) شیخ دانا، معدنِ اسرار حضرت ابوعبداللہ محمد بن حکیم معروف بہ "مرید از مستانِ حق" ہیں جو اپنے زمانہ میں اپنے فن میں ثانی نہیں رکھتے۔ ان کا حال لوگوں پر پوشیدہ ہے براہین ونشانات ظاہر وروشن ہیں۔ ان کا حال صحت میں بہتر ہے۔ اس لئے کہ وہ صاحبِ مشاہدہ ہیں۔ (۵) شیخ محترم تمام میں مقدم حضرت سعید بن ابی سعید عیار ہیں جو حدیث مصطفےٰ علیہ السلام کے حافظ ہیں عمدہ زندگی پائی، حال میں قوی وباخبر مگر پوشیدہ رہتے ہیں۔ کسی پر ظاہر نہیں ہوتے۔ بکثرت مشائخ کی صحبت پائی ہے۔ (۶) خواجہ بزرگوار، جانشینِ ہمت و وقار، حضرت ابوالعلی عبدالرحیم بن احمد سعدی ہیں جو عزیز قوم اور سردارِ وقت ہیں۔ مجھے وہ دل سے پیارے لگتے ہیں۔ ان کی زندگی مہذب، حال عمدہ اور فنون کے عالم ہیں۔ (۷) شیخ اوحد حضرت قصورہ بن محمد جرویزی ہیں جو اہل طریقت سے کمال محبت رکھتے ہیں اور ہر ایک کا احترام فرماتے ہیں۔ بکثرت مشائخ سے ملاقات کی۔ مجھے اس شہر کے عام لوگوں کے اعتقاد اور وہاں کے علماء سے اچھی امید وابستہ ہے وہاں کا رہنے والا جو بھی ملتا ہے مجھے اس سے حسنِ عقیدت ہوتی ہے۔ یہ گروہِ مشائخ، منتشر اور مختلف شہروں میں اقامت پذیر ہے یہ طریقہ میرے نزدیک اچھا نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ایسے شہر کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں جو بزرگوں کی اقامت گاہ ہے۔ اب میں طریقت کے فرقوں اور ان کے مذاہب کا بیان شروع کرتا ہوں۔

اہلِ طریقت کے مذاہب اور ان میں امتیازی فرق

حضرت ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ کے تذکرے میں پہلے بتا چکا ہوں کہ اہلِ طریقت کے بارہ مذہب ہیں۔ جن میں سے دو مردود اور دس مقبول ہیں۔ ان دسوں کے معاملات، اور طریقت کے سلوک درست و عمدہ ہیں۔ مشاہدات میں ان کے آداب لطیف و دقیق ہیں۔ اگرچہ باہم معاملات و مجاہدات اور ان کی ریاضتوں میں اختلاف ہے تاہم توحید اور شریعت کے اصول و فروع میں سب متفق ہیں۔ حضرت ابویزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "اختلاف العلماء رحمۃ الا فی تجرید التوحید" یعنی توحید خالص کے سوا ہر مسئلہ میں علماء کا اختلاف رحمت ہے۔ اس قول کے موافق ایک مشہور حدیث بھی ہے۔ اخیارِ مشائخ کے درمیان تصوف کی حقیقت، دو حصوں پر منقسم ہے ایک باعتبارِ حقیقت دوسرے باعتبارِ مجاز و رسوم۔ اب میں ان کے اقوال کو جو ان حصوں پر مشتمل ہیں بطریق ایجاز و اختصار بیان کرتا ہوں اور ہر مذہب کی اساس اور ان کی بنیاد کا تذکرہ کرتا ہوں تاکہ طالب کو ان کا علم ہو اور علماء کو علم کا مخزن ایک جگہ مل جائے اور یہ کہ مردوں کی اصلاح محجوبوں کی فلاح اور دانشوروں کو مسرت و تنبیہ ہو اور دونوں جہان میں میرے لئے اجر و ثواب کا سبب بنے۔ وباللہ التوفیق۔

(۱) فرقہ محاسبیہ

فرقہ محاسبیہ کی نسبت و عقیدت، حضرت ابوعبداللہ حارث بن اسد محاسبی رحمتہ اللہ علیہ سے ہے۔ وہ اپنے زمانہ میں مقبول النفس اور قاطع النفس تھے۔ آپ کا کلام توحید خالص کے حقائق اور اس کے فروع و اصول کے بیان میں ہے۔ آپ کے تمام ظاہری و باطنی معاملات صحیح و درست تھے۔ آپ کے مذہب کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ رضائے الٰہی کو مقامات کے قبیل سے نہیں مانتے تھے۔ بلکہ از قسم احوالِ طریقت سمجھتے تھے۔ طریقت میں یہ پہلا اختلاف ہے جو ان سے واقع ہوا۔ اس پر علماء خراسان و عراق نے گرفت و مواخذہ کیا ان کا کہنا ہے کہ رضا طریقت کے ایک مقام کا نام ہے جو توکل کی آخری منزل ہے۔ یہ اختلاف آج تک علماء کے درمیان

موجودو برقرار ہے۔اب میں اس قول کی کچھ تشریح کرتا ہوں۔

حقیقتِ رضا

بیانِ مذہب اور وجہ اختلاف کے لئے ضروری ہے کہ رضا کی حقیقت اور اس کی اقسام کی وضاحت کروں اس کے بعد حال ومقام کی حقیقت اور ان کا اختلاف ظاہر کروں گا۔جاننا چاہیئے کہ رضا پر کتاب وسنت ناطق اور اس پر امت کا اجماع ثابت ہے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے"ورضوا عنه "وہ اللہ سے راضی ہوگئے۔نیز ارشادِ باری ہے"لقد رضی اللّٰه عن المومنین اذیبا یعونك تحت الشجرة الآیہ" اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں سے راضی ہوگیا جنھوں نے درخت کے نیچے آپ سے بیعت کی۔حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے"ذاق طعم الایمان من رضا باللّٰه ربا "اس نے ایمان کا ذائقہ پالیا جو اللہ کے رب ہونے پر راضی ہوگیا۔

صورتِ رضا

رضا کی دُو صورتیں ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کا بندے سے راضی ہونا دوسری یہ کہ بندے کا اللہ تعالیٰ سے راضی ہونا ہے۔لیکن خدا کے راضی ہونے کی حقیقت یہ ہے کہ وہ بندے کو ثواب ونعمت اور کرامت سے نوازے۔اور بندے کا خدا سے راضی ہونے کی حقیقت یہ ہے کہ اس کے فرمان پر عمل کرے اور اس کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کردے۔اور خدا کے معاملات میں چون وچرانہ کرے۔اس لئے کہ رضائے بندہ، رضائے خدا پر موقوف ہے۔اسی پر اس کا قیام ہونا چاہیئے۔

رضائی بندہ کا خلاصہ یہ ہے کہ منع وعطاء کی دونوں حالتوں میں اس کا دل یکساں رہے۔ اور جلال وجمال کے نظارے میں اس کا باطن مضبوط ومستحکم رہے خواہ اسے منع سے روک دیا جائے یا عطا میں آگے بڑھایا جائے ہر حالت میں اس کا قیام مساوی ہو۔خواہ آتشِ جلال میں جلے یا لطف وجمال کے نور سے منور ہو،اس کے دل میں جلنا اور منور ہونا یکساں ہو کیونکہ اس کا ظہور حق تعالیٰ کی طرف سے ہے اس کی جانب سے جو بھی کچھ آئے اچھا ہی ہوتا ہے۔

امیر المومنین حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے آگے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا یہ قول رکھا گیا کہ"الفقر احب الی من الغناء والسقم احب الی من الصحت "میرے نزدیک مفلسی تونگری سے اور بیماری صحت مندی سے زیادہ محبوب ہے۔؟

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا"رحم اللّٰه ابا ذر اما انا اقول من اشرف علی حسنِ اختیار اللّٰه له لم یتمن غیر ما اختار اللّٰه له "اللہ تعالیٰ ابوذر پر رحم

فرمائے میں تو یہ کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کی لئے جو اختیار فرمایا ہے بندہ خدا کی اختیار کردہ حالت کے سوا کسی اور حالت کی آرزو نہ کرے اللہ تعالیٰ بندے کے لئے جو پسند فرمائے بندہ اسی کو چاہے۔ جب بندہ خدا کی رضا اور اختیار کو دیکھ لیتا ہے تو وہ اپنی مرضی و اختیار سے منہ موڑ کر ہر غم و فکر سے نجات پا جاتا ہے۔ یہ معنی حالتِ غیوبت میں ممکن نہیں اس کے لئے مشاہدہ درکار ہے۔

''لان الرضا للاحزان نافية وللغفلة معالجة شافية'' رضا بندے کو غفلت سے چھڑاتی ہے اور غموں کے پنجوں سے بچاتی ہے۔ اور غیر کے اندیشے کو دل سے نکالتی اور تکلیفوں کی بندشوں سے نجات دیتی ہے۔ کیونکہ رضا کی صفت ہی آزاد کرنا ہے۔

معاملاتِ رضا کی حقیقت معاملاتِ رضا کی حقیقت بندے کی پسندیدگی ہے کہ وہ یقین رکھے کہ منع و عطا اللہ تعالیٰ کے علم سے ہے اور وہ اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ تمام حالات کا دیکھنے والا باخبر ہے۔ اس معنی کے حق میں علماء کے چار گروہ ہیں۔ ایک یہ کہ وہ خدا کی عطا پر راضی ہو یہ معرفت ہے دوسرا یہ کہ وہ نعمتوں پر راضی ہو یہ دنیا کے اندر ہے۔ تیسرا یہ کہ مصائب و ابتلا پر راضی رہے یہ مختلف الانواع مشقتیں ہیں۔ چوتھا یہ کہ برگزیدگی پر راضی ہو یہ محبت ہے۔ لہٰذا وہ لوگ جو عطا کرنے والے کے جلوے کو اس کی عطا میں دیکھتے ہیں اور جان و دل سے قبول کرتے ہیں تو ان کا یہ قبول کرنا ان کے دل سے اس کی کلفت و مشقت کو دور کر دیتا ہے۔ اور جو لوگ عطا کے ذریعہ، عطا کرنے والے کو دیکھتے ہیں وہ عطا ہی میں رہ جاتے ہیں۔ وہ تکلف سے رضا کی راہ پر چلتے ہیں اور تکلف میں سراسر رنج و مشقت ہے معرفت اس وقت حقیقت ہوتی ہے جب بندہ حق کی معرفت میں مکاشف و مشاہد ہو۔ اور جب اس کے لئے معرفت قید و حجاب ہو تو وہ معرفت مکروہ، وہ نعمت عذاب اور وہ عطا حجاب بن جاتی ہے۔

لیکن۲ وہ لوگ جو دنیا کے اندر نعمتوں کے ذریعہ اس سے راضی ہوں وہ ہلاکت و نقصان میں رہتے ہیں۔ ایسی رضا، اسے دوزخ میں جھونک دیتی ہے اس لئے کہ جس کے دل میں حق تعالیٰ کی محبت ہوتی ہے اس کے لئے دنیاوی نعمتوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ اور نہ اس کے دل میں محرومی پر کوئی رنج و ملال گزرتا ہے۔ نعمت تو اس وقت نعمت کہلاتی ہے جب کہ وہ نعمت دینے والے کی طرف رہنمائی کرے لیکن جب وہ اسے منعم سے محجوب کر دے تو ایسی نعمت سراپا آفت و بلا ہوتی ہے۔

لیکن۳ وہ لوگ جو ابتلا کے ذریعہ اس سے راضی ہوں وہ وہ ہیں جو بلا میں میلان کو دیکھتے

اور مشقت کے ذریعہ مشاہدے کی طرف مائل ہوتے ہیں اس حالت میں ان کی تکلیف ان کو

دوست کے مشاہدہ کی مسرت میں آزردہ نہیں کرتی۔
لیکن وہ لوگ جو برگزیدگی کے ذریعہ اس سے راضی ہوں وہ اس کے محبوب ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ حالت رضا میں بلا وسختی سے خالی ہوتے ہیں ان کے دلوں کی منزلیں صرف حق تعالیٰ ہی کی طرف ہوتی ہے۔ ان کے سوا پردۂ اسرار بجز محبت کے گل وغنچہ کے کچھ نہیں ہوتا۔ غائب ہوتے ہوئے بھی حاضر ہوتے ہیں، فرشی ہوتے ہوئے بھی عرشی ہوتے ہیں اور جسمانی ہوتے ہوئے بھی روحانی ہوتے ہیں۔ یہ لوگ خالص موحّد ربانی اور لوگوں سے دل برداشتہ ہوتے ہیں۔ ان کے مقامات واحوال محفوظ، ان کا باطن خلق سے جدا، حق تعالیٰ کی محبت میں وارفتہ اور اس کے لطف وکرم کے انتظار میں رہتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

لا یملکون لا نفسهم ضراو لا نفعا ولا یملکون موتا ولا حیوة ولا نشورا۔	وہ اپنی جانوں کے نفع ونقصان کے مالک نہیں ہوتے نہ موت وحیوٰۃ اور مرنے کے بعد اٹھنے کے مالک ہوتے ہیں۔

لہٰذا غیرحق پر راضی ہونا نقصان کا موجب اور حق تعالیٰ سے راضی ہونا رضوان کا سبب ہے اس لئے کہ اللہ سے راضی ہونا صریحا بادشاہت ہے اور اسی میں عافیت ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے

من لم یرض باللّٰه و بقضائه شغل قلبه و تعب بدنه۔	جو اللہ کی رضا اور اس کی قضا پر راضی نہ ہوا اس نے اپنے دل کو تقدیر واسباب میں مشغول کر کے بدن کو سختی میں ڈال دیا۔ واللہ اعلم

حضرت کلیم کی دعائے رضا

احادیث میں وارد ہے کہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ ''اللّٰهم دلني علیٰ عمل اذا عملت رضیت عني'' اے میرے رب! مجھے ایسا عمل بتا جس پر میں عمل کروں تو مجھے تیری رضا حاصل ہوجائے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''لا تطیق ذالك یا موسیٰ، فخر موسیٰ علیه السلام ساجداً متضرعاً '' اے موسیٰ یہ بات تمہاری قوتِ برداشت سے باہر ہے۔ یہ سن کر حضرت موسیٰ روتے ہوئے سجدے میں گر پڑے۔ چنانچہ وحی نازل فرمائی کہ ''یا ابن عمران، ان رضائي في رضاك بقضائي'' اے فرزندِ عمران! میری رضا تو تمہارے اندر ہے تم کو چاہئے کہ قضا پر

راضی رہو۔ مطلب یہ ہے کہ جب بندہ اللہ تعالےٰ کی قضا پر راضی رہے گا تو یہ اس کی دلیل ہے کہ حق تعالےٰ اس سے راضی ہے۔!

زہد و رضا کے مابین فضیلت

حضرت بشر حافی رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت فضیل بن عیاض رحمتہ اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ زہد افضل ہے یا رضا؟ حضرت فضیل نے فرمایا:۔

الرضا افضل من الزهد لان الراضي لا يتمني فوق منزله۔	زہد سے رضا افضل ہے کیونکہ ''راضی'' اس سے اوپر کی منزل کی خواہش نہیں کرتا۔

مقصد یہ ہے کہ زہد کے اوپر اور بھی ایک منزل ہے جس کو حاصل کرنے کی زاہد تمنا کرتا ہے۔ لیکن رضا کے اوپر کوئی منزل نہیں جس کی راضی تمنا کرے۔ اوپر کا درجہ نیچے کے درجہ سے افضل ہوتا ہے۔ یہ واقعہ حضرت محاسبی کے اس قول کی صحت پر دلالت کرتا ہے کہ رضا احوال کے قبیل سے ہے۔ یہ کوئی شئے نہیں ہے جو مجاہدے اور کسب کے ذریعہ حاصل ہو جائے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہبی یعنی عطیہ اور بخشش کے طور پر حاصل ہوتی ہے۔ نیز اس کا بھی احتمال ہے کہ راضی کو سرے سے تمنا ہی نہ ہو جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنی دعا میں فرمایا ''اسألك الرضا بعد القضا'' میں تجھ سے دعا مانگتا ہوں کہ نزول قضا کے بعد مجھے راضی رکھنا۔ مطلب یہ کہ مجھے ایسی صفت عطا فرما کہ جب تیری جانب سے قضا کا اجراء ہو تو نزول قضا کے وقت تو مجھے راضی پائے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے نزول قضا سے پہلے رضا درست نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ یہاں رضا پر عزم ہوگا۔ اور عزمِ رضا، عین رضا نہیں ہوتی۔

رضا کے بارے میں اقوالِ مشائخ

حضرت ابو العباس بن عطا فرماتے ہیں کہ ''الرضا نظر القلب الي قديم اختيار الله للعبد'' بندے پر اللہ کے قدیم اختیار کی جانب دلی نگاہ کو رضا کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بندے کو جو کچھ پہنچے اس پر وہ اعتقاد رکھے کہ یہ اللہ کے ارادہ قدیم اور حکم ازلی کی بنا پر ہے جو میرے لئے مقدر فرمایا ہے۔ اس پر بندہ بے چین نہ ہو بلکہ خوش دل رہے۔

حضرت حارث محاسبی رحمہ اللہ صاحبِ مذہب فرماتے ہیں کہ ''الرضا سكون القلب تحت مجاري الاحكام'' احکام الٰہی کے اجراء پر سکونِ قلب کا نام رضا ہے۔ اس مسئلہ میں حضرت محاسبی کا مسلک قوی ہے کیونکہ دل کا سکون واطمینان بندے کے اختیاری عمل سے متعلق نہیں ہے بلکہ یہ وہبی اور اللہ تعالیٰ کی بخشش وعطا سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ بات اس کی دلیل

ہے کہ رضا احوال کے قبیل سے ہے مقام سے اس کا تعلق نہیں ہے۔

اہلِ علم بیان کرتے ہیں کہ حضرت عتبۃ الغلام رات بھر نہیں سوئے اور دن چڑھے تک یہی کہتے رہے کہ "ان تعذبنی فانا لك محب وان ترحمنی فانا لك محب "اگر تو مجھے دوزخ کے اندر عذاب میں ڈال دے یا اپنی رحمت کی چادر میں ڈھانپ لے! دونوں حالتوں میں میں تجھ سے محبت کرتا رہوں گا۔

مطلب یہ ہے کہ عذاب کی تکلیف اور نعمت کی لذت جسم پر ہوگی لیکن اگر محبت و دوستی میرے دل میں قائم رہے تو یہ عذاب میرے لئے نقصان رساں نہ ہوگا۔ یہ بات بھی حضرت محاسبی کے مذہب ہی کی تائید کرتی ہے کیونکہ رضا محبت کا نتیجہ ہے اور محبت کرنے والا، محبوب کے ہر فعل پر راضی رہتا ہے اگر وہ عذاب میں رکھے جب بھی دوستی سے محجوب نہیں ہوتا بلکہ خوش رہتا ہے اور اگر نعمت میں رکھے تب بھی دوستی سے محجوب نہیں ہوتا اور اپنی خواہش کو حق تعالےٰ کے اختیار کے مقابلہ میں دخل انداز نہیں کرتا۔

حضرت ابو عثمان حیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "منذ اربعین سنۃ ما اقامنی اللّٰہ فی حال فماکرھتہ وما نقلنی الیٰ غیرہ وما سخطتہ "چالیس سال گزر گئے ہیں اللہ تعالیٰ نے مجھے جس حال میں رکھا میں نے اسے ناپسند نہ کیا اور جس حال کی طرف بھی اس نے مجھے پھیرا میں نے اس سے ناراضگی نہیں کی۔ یہ اشارہ دائمی رضا اور کمالِ محبت کی طرف ہے۔

حکایت

مشہور واقعہ ہے کہ دجلہ میں ایک درویش پھنس گیا وہ تیرنا نہیں جانتا تھا کسی نے کنارے سے پکار کر کہا اے درویش اگر تم چاہو تو کسی کو بلاؤں تاکہ وہ تمہیں نکال لے؟ درویش نے کہا نہیں۔ اس شخص نے کہا کیا غرق ہونے کی خواہش ہے؟ درویش نے کہا نہیں۔ اس نے کہا پھر کیا چاہتے ہو؟ جواب دیا وہی چاہتا ہوں جو میرا رب میرے لئے چاہتا ہے۔

غرضکہ رضا کی تعریف بیان میں مشائخ کا بہت اختلاف ہے لیکن اس بات میں دو بنیادی قاعدے ہیں جن کو بیان کرکے بحث کو مختصر کرتا ہوں۔ مگر مناسب ہے کہ پہلے احوال و مقام کا فرق اور اس کی حدود ظاہر کردوں تاکہ اسے سمجھنے میں سب کو آسانی ہو اور اس کی حدود سے بھی واقفیت ہوجائے۔ انشاءاللہ

مقام وحال کا فرق

معلوم ہونا چاہیئے کہ مقام وحال کے دونوں لفظ تمام مشائخ کے مابین مستعمل اوران کی عبارتوں میں رائج اور محققین کے علوم وبیان میں متداول ہیں طالبانِ علم طریقت کے لئے ان کی واقفیت کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

مقام کی تحقیق

واضح ہو کہ مُقام، میم کے پیش سے بندے کا قیام اور میم کے زبر سے بندے کے جائے اقامت وقیام کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔لفظ مقام کے معنی اوراس کی تفصیل کے لئے عربی زبان کے قواعد کا اعتبار ولحاظ کرنا سہو وغلط ہے۔ چونکہ قواعدِ عربی میں لفظ مُقام،میم کے پیش سے بمعنی اقامت وجائے قیام کے ہیں۔اور بندے کا راہِ حق میں اقامت کے معنی اس میں نہیں ہیں۔اسی طرح مقام میم کے زبر سے قیام کے ہیں۔ بندے کا راہِ حق میں قیام کے معنی اس میں نہیں ہے۔اور بندے کا اس مقام کے حق کو ادا کرنا اوراس کی رعایت کرنا تا کہ اس کے کمال تک وہ رسائی پائے۔ جہاں تک بھی اس کی قدرت ہو جائز ہے۔ البتہ یہ جائز نہیں ہے کہ اس مقام کا حق ادا کئے بغیر اس مقام سے گزر جائے۔ مثلاً یہ پہلا مقام توبہ ہے اس کے بعد انابت پھر زہد پھر توکل وغیرہ وغیرہ۔

مطلب یہ ہے کہ یہ جائز نہیں ہے کہ بغیر توبہ کے انابت میں پہنچ جائے یا بغیر انابت کے زہد حاصل کرلے یا بغیر زہد کے توکل مل جائے۔اللہ تعالٰے نے ہمیں جبریل علیہ السلام کے کلام میں تعلیم دی کہ "وما منا الا له مقام معلوم" یعنی ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کے لئے کوئی مقام معلوم نہ ہو۔

حال کی تحقیق

حال اس معنی کو کہتے ہیں جو حق تعالیٰ کی طرف سے بندے کے دل پر طاری ہو اور اسے وہ اپنے قدرت واختیار سے دور نہ کرسکتا ہو۔اور نہ کسی محنت ومجاہدے سے حاصل کر سکتا ہو۔ مطلب یہ کہ جب دل میں آئے تو دور نہ کرسکے۔اور نہ آئے تو وہ لا نہ سکے۔ لہٰذا بارگاہِ الٰہی میں ریاضت ومجاہدے کے ذریعہ، محل ریاضت،اوراس کے درجہ میں طالب کی راہ اوراس کی جائے اقامت کا نام مقام ہے۔اور جو کیفیت بغیر ریاضت ومجاہدے کے دل پر وارد ہو وہ اللہ تعالیٰ کا لطف وفضل ہے اس کا نام حال ہے اسی لحاظ سے مقام اعمال کی قبیل سے ہے اور حال، اللہ تعالیٰ کی بخشش اوراس کی عطا کے زمرے میں ہے گویا مقام اول تا آخر کسبی ہے اور حال وہبی ہے۔ لہٰذا

صاحبِ مقام اپنے مجاہدے میں قائم اور صاحبِ حال، اپنے وجود میں فانی ہے اور وہ اس حال کے ساتھ قائم ہے جسے حق تعالےٰ نے اس کے دل میں پیدا فرمایا ہے۔ مشائخ کی ایک جماعت حال کے دوام کو جائز رکھتی ہے۔ اور ایک جماعت دوام کو جائز نہیں رکھتی اس سلسلے میں ان کا اختلاف ہے۔ چنانچہ حضرت محاسبی رحمتہ اللہ علیہ کا مذہب حال کے دوام کا ہے وہ فرماتے ہیں کہ محبت وشوق اور قبض وبسط یعنی دل کی تنگی وکشادگی یہ سب احوال سے متعلق ہیں اگر اس میں دوام کو جائز نہ مانا جائے تو محبّ، محبّ نہیں رہ سکتا۔ اور نہ مشتاق، مشتاق رہ سکتا ہے۔ جب تک حال بندے کی صفت نہ ہو تو اس کا وقوع بندے پر کس طرح ہو سکتا ہے؟ اسی بنا پر آپ رضا کو احوال کی قبیل سے شمار کرتے ہیں اور حضرت ابو عثمان حیری کے قول کا اشارہ بھی اسی طرف ہے کہ "چالیس برس گذر گئے ہیں اللہ تعالےٰ نے مجھے جس حال میں رکھا میں نے اسے ناپسند نہیں کیا"

مشائخ کی وہ دوسری جماعت جو حال کے دوام وبقا کو جائز نہیں مانتی، ان میں سے ایک حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ:۔

الاحوال کالبروق وان یبقی فحدیث النفس۔	احوال بجلی کوندنے کی مانند ہیں کہ جو ظاہر ہوتی اور ختم ہو جاتی ہے اور جو باقی رہتی ہے وہ حدیث نفس یعنی طبعی تخلیق ہے۔

ایک جماعت نے اس کی نسبت یہ کہا:۔

الاحوال کاسمھا یعنی انھا کما	احوال کی کیفیت اپنے نام ہی کی مانند ہے
تحل فی القلب نزول۔	یعنی جس طرح دل میں آتا ہے اسی طرح دوسرے وقت دل سے زائل ہو جاتا ہے۔

اور جو کیفیت باقی و برقرار رہتی ہے اس کو صفت کہتے ہیں اور صفت کا قیام موصوف کے ساتھ ہوتا ہے۔ ورنہ لازم آئے گا کہ موصوف اپنی صفت میں کامل ہو، یہ محال ہے۔

میں نے حال اور مقام کا یہ فرق اس لئے واضح کر کے بیان کیا ہے کہ اس کتاب میں جہاں کہیں بھی مشائخ کے اقوال میں حال ومقام کا ذکر آئے تو جان سکو کہ اس سے کیا مراد ہے۔؟

مختصراً اتنا یاد رکھو کہ رضا مقامات کی انتہا اور احوال کی ابتدا ہے اور یہ مقام ایسا ہے جس کا ایک کنارہ ریاضت ومجاہدے کی طرف ہے اور دوسرا کنارہ محبت واشتیاق کی سمت! اس سے اوپر اور کوئی مقام نہیں ہے۔ اور تمام مجاہدے اسی پر ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کی ابتدا کسبی ہے اور اس کی انتہا وہبی۔

البتہ اس کا امکان ہے کہ جس نے اپنی رضا کی ابتدا، اپنے ساتھ دیکھی اس نے کہہ دیا کہ یہ مقام ہے اور جس نے اپنے رضا کی انتہا، حق کے ساتھ دیکھی اس نے کہہ دیا کہ یہ حال ہے۔ تصوف میں حضرت محاسبی کے مذہب کا معاملہ یہ ہے۔ بایں ہمہ تصوف کے معاملات میں انھوں نے کوئی اختلاف نہیں کیا۔ البتہ انھوں نے اپنے مریدوں کو ایسی عبارات اور معاملات میں زجر و توبیخ فرمائی ہے جس میں کسی قسم کا ابہام و خطا ہو۔ اگرچہ وہ اصل میں درست ہی کیوں نہ ہو؟

جیسے ایک دن حضرت ابوحمزہ بغدادی رحمتہ اللہ علیہ جو حضرت محاسبی کے مرید تھے ان کے پاس آئے چونکہ وہ صاحبِ حال اور صاحبِ سماع تھے۔ اور حضرت محاسبی کے یہاں ایک مرغ تھا جو بانگ دیا کرتا تھا، اتفاق سے مرغ نے اس وقت بانگ دینی شروع کر دی۔ اسی بانگ پر حضرت حمزہ نے نعرہ مارا۔ حضرت محاسبی خنجر لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا "کفرت" تو نے کفر کیا۔ اور حضرت حمزہ کو مار ڈالنے کے لئے بڑھے۔ دیگر مریدین حضرت شیخ کے قدموں میں گر پڑے اور بمشکل انہیں باز رکھا۔ اس کے بعد انھوں نے ابوحمزہ سے فرمایا "اسلم یا مطرود" اور مردود اسلام قبول کر۔ (جب معاملہ رفت گزشت ہو گیا) تو مریدوں نے عرض کیا کہ اے شیخ! جب کہ ہم آپ سب، ابوحمزہ کو مخصوص اولیا اور توحید پر استقامت رکھنے والوں میں سے جانتے ہیں تو آپ کو ان پر کیوں شک و تردد ہوا؟ حضرت محاسبی نے فرمایا مجھے اس کے ایمان پر کوئی شک تردد نہیں ہوا یقیناً میں اسے مشاہدۂ حق اور دل سے توحید میں مستغرق جانتا ہوں۔ لیکن ہم اسے ایسا کرنے کی کیسے اجازت دے سکتے ہیں جیسے حلولیوں کا وطیرہ اور ان کے کردار کا شعار ہے مرغ ایک بے عقل جانور ہے وہ اپنی عادت کے مطابق بانگ دیتا ہے اسے حق تعالیٰ کے ساتھ ہمکلامی کیسے ہو گئی۔ یہ بات حق تعالیٰ کے شایانِ شان بھی نہیں۔ وہ تجزی سے پاک ہے۔ اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے دوستوں کا ہر وقت اور ان کا ہر حال حق کے ساتھ ہے۔ اور اُن کا ہر لمحہ خدا کے شایانِ شان سلام و کلام کے بغیر آرام و چین سے نہیں گزرتا۔ اس کے باوجود کسی چیز میں اس کا حلول و نزول بھی جائز نہیں ہے۔ اور نہ قدیم پر اتحاد و امتزاج اور ترکیب جائز ہے۔ حضرت ابوحمزہ نے جس وقت مرشد کی بالغ نظری کو دیکھا عرض کرنے لگے اے شیخ! اگرچہ میں اصل کے اعتبار سے راستی پر تھا لیکن چونکہ میرا یہ فعل ایسی قوم کے مشابہ بن گیا تھا جو حلولی اور گمراہی میں مبتلا ہیں۔ میں رجوع و توبہ کرتا ہوں۔

چونکہ میرا مقصود اختصار ہے اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ بلا شبہ ان کا یہ طریقہ سلامتی اور حفاظت کی راہ میں صحتِ کمال کی وجہ سے بہت پسندیدہ اور لائق تعریف ہے۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:۔

من کان منکم یومن باللّٰہ والیوم الآخر فلا یقف مواقف التھم“	تم میں جو اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا وہ تہمت کی جگہوں پر ہرگز کھڑا نہ ہو۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ یہی دعا کرتا ہوں کہ مجھے بھی ایسی ہی توفیق نصیب فرمائے۔ اور آج کل کے رسمی پیر وفقیروں کی صحبت سے بچائے۔ یہ لوگ ایسے ہیں کہ جن کی ریا و معصیت میں اگر موافقت نہ کی جائے تو دشمن ہو جاتے ہیں۔ نعوذ باللہ من الجہل۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۲۔ فرقہ قصاری

قصاری فرقہ کے پیشوا، حضرت ابو صالح بن حمدون بن احمد بن عمارہ قصار رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو اکابر علماء اور ساداتِ طریقت میں سے ہیں ان کا مسلک و مشرب، ملامت کی نشر واشاعت ہے۔ فنونِ معاملات میں ان کا کلام بلند و بالا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کو جتانے کے مقابلہ میں تمہارا علم، اللہ تعالیٰ کے متعلق بہت بہتر سے بہتر ہونا چاہئے۔ مطلب یہ ہے کہ خلوت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ تمہارا معاملہ اس سے بہتر ہونا چاہئے جو تم لوگوں کے ساتھ ظاہر میں کرتے ہو۔ اس لئے کہ راہِ حق میں سب سے بڑا حجاب یہ ہے کہ تمہارا دل لوگوں کے ساتھ مشغول ہو۔ ملامتی مشرب کے بارے میں شروع کتاب میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ مختصراً یہ کہ

حکایت

حضرت ابو صلاح بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نیشا پور میں نہر حیرہ کے کنارے جا رہا تھا وہاں ایک شخص نوح نامی جس کی جوانمردی نیشا پور میں مشہور تھی، راستے میں ملا میں نے اس سے پوچھا کہ اے نوح! جوانمردی کیا چیز ہے؟ اس نے کہا آپ میری جوانمردی کے بارے میں دریافت کرتے ہیں یا اپنی جوانمردی کے بارے میں؟ میں نے کہا دونوں کے بارے میں۔ اس نے کہا میری جوانمردی تو یہ ہے کہ میں نے قبا کو اتار کر گدڑی پہن لی ہے اور ایسا معاملہ کرنے لگا ہوں جس سے صوفی بن جاؤں خدا سے حیاء کرتا ہوں اور اس لباس میں معصیت سے پرہیز کرتا ہوں۔ اور آپ کی جوانمردی یہ ہے کہ آپ اس گدڑی کو اتار ڈالیں۔ تاکہ آپ سے لوگ فتنہ میں مبتلا نہ ہوں۔ لہٰذا میری جوانمردی ظاہرِ شریعت کی حفاظت میں ہے اور آپ کی جوانمردی، باطنی حقیقت کی حفاظت میں ہے۔ یہ اصل بڑی قوی ہے۔ واللہ اعلم

۳۔ فرقہ طیفوریہ

طیفوری فرقہ کے پیشوا، حضرت ابویزید طیفور بن عیسیٰ بن سروشاں بسطامی رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو اکابر اور سادات صوفیہ میں سے ہیں۔ یہ صاحبِ غلبہ اور صاحبِ سکر تھے۔ شوق الٰہی کا غلبہ، سکر اور محبت۔ انسان کی محبت کسی جنس سے نہیں ہے۔ بلکہ یہ انسان کے کسب و اختیار کے احاطہ سے باہر ہے۔ جو اس کا دعویٰ کرے وہ باطل ہے اور ایسوں کی تقلید محال ہے۔ لہٰذا کسی صحت مند کے لئے سکر یعنی مدہوشی صفت نہیں ہوسکتی۔ لامحالہ آدمی، سکر کو اپنی طرف لانے کی قدرت نہیں رکھتا۔ بلکہ وہ خود سکر کے ہاتھوں مغلوب ہوجاتا ہے نہ وہ لوگوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے نہ اس سے تکلف کی کوئی صفت ظاہر ہوتی ہے۔ اس بارے میں مشائخ کا مسلک یہ ہے کہ صاحب استقامت ہی کی پیروی اور تقلید کی جائے۔ گردشِ احوال کی اقتداء درست نہیں ہوتی۔ اگرچہ مشائخ کی ایک جماعت اسے جائز رکھتی ہے کہ آدمی اپنے اختیار سے غلبہ و سکر کی راہ اختیار کرسکتا ہے کیونکہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے۔

ابکوا فان لم تبکوا فتباکوا۔	تضرع وزاری کرو اگر نہ کرسکو تو رونے کی
	سی صورت بنالو۔

اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ ریاکاروں کی مانند خود کو بھی ویسا ہی بنالو یہ شرک صریح ہے۔ دوسری یہ کہ خود کو ویسا بنالو تاکہ حق تعالیٰ اس بناوٹ کو حقیقت کے اس درجہ کے مطابق بنا دے جو اہلِ حقیقت کا ہے۔ تاکہ حضور اکرم ﷺ کے اس فرمان کے موافق بن جاؤ "من تشبہ بقوم فھو منھم" "جس نے جس قوم کی مشابہت کی وہ اسی میں سے ہے۔ لہٰذا اقسام مجاہدے میں سے جس قدر ہوسکے اسے توکرتا رہے اس کے بعد وہ خدا سے امیدوار رہے کہ اس پر اس کے معنی حقیقت کو کھول دے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ "المشاھدات مواریث المجاھدات" مجاہدوں سے مشاہدے حاصل ہوتے ہیں۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجاہدے ہر لحاظ سے عمدہ اور بہتر ہیں لیکن سکر و غلبہ انسان کے کسب و اختیار میں نہیں ہیں کہ وہ مجاہدوں سے اسے حاصل کرسکے اور حصولِ سکر کے لئے عین مجاہدات بھی علت و سبب نہیں ہیں۔ مجاہدے صحت مندی کی حالت ہی میں ممکن ہیں اور کوئی صحت مند، سکر کی حالت کو قبول نہیں کرسکتا۔ کیونکہ یہ محال عادی ہے۔ اب میں سکر و صحو کو اور اس میں اختلافِ اقوال کو بیان کرتا ہوں تاکہ مشکلات دور ہوجائیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ

سکروصحو کی بحث

واضح رہنا چاہئے کہ ارباب معانی نے سکر و غلبہ (مدہوشی) سے غلبہء محبت الٰہی اور صحو (صحت مندی) سے حصولِ مقصد مراد لئے ہیں۔اس مسئلہ میں اہلِ معانی کا بہت اختلاف ہے۔ چنانچہ ایک جماعت، سکر کو صحو پر فضیلت دیتی ہے اور ایک جماعت صحو کو سکر پر برتری دیتی ہے۔ پہلی جماعت جو سکر کو صحو پر فضیلت دیتی ہے ان میں حضرت ابو یزید بسطامی اور ان کے متبعین ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ صحو آدمیت کی صفت پر اعتدال و استقامت کی شکل بناتی ہے اور یہ مشاہدہٗ حق میں بہت بڑا حجاب ہے۔اور سکر آفت کے زائل ہونے، صفاتِ بشریت کے فنا کرنے، تدبیر واختیار کے نیست و نابود ہونے اور معنوی بقا اور حق تعالیٰ کے افعال میں بندے کے تصرفات کے فنا ہونے اور اس قوت کے فنا ہونے سے جو بندے میں اس کی جنس کے خلاف ہے حاصل ہوتا ہے۔ یہ حالتِ سکر، بمقابلہ صحو ابلغ واتم اور زیادہ مکمل ہے چنانچہ حالت صحو میں جب حضرت داؤد علیہ السلام سے وہ فعل صادر ہوا جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا تو ان کے اس فعل کی نسبت انھیں کی طرف فرمائی جیسا کہ فرمایا" وقتل داؤد جالوت "حضرت داؤدؑ نے جالوت کو قتل کیا۔اور ہمارے نبی اکرم ﷺ چونکہ حالتِ سکر (یعنی فنا فی الذات) پر فائز تھے تو آپ سے جب فعل وجود میں آیا تو اللہ تعالیٰ نے اس فعل کی نسبت اپنی طرف فرمائی جیسا کہ فرمایا" وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی "آپ نے وہ مشتِ خاک نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی تھی۔" فبعد مابین عبد و معبودیۃ "لہٰذا بندے اور بندگی کے درمیان بڑا فاصلہ ہے۔ جو از خود قائم اور اپنی صفات میں ثابت و برقرار ہے اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے" تو نے کیا"؟ اگرچہ اس میں بھی ان کی بزرگی اور کرامت کا اظہار ہے لیکن وہ ذات جو حق کے ساتھ قائم ہے اور اپنی صفات میں فانی ہے اسے یوں فرمایا کہ" جو کچھ تم نے کیا وہ ہم نے کیا" لہٰذا بندے کے فعل کی نسبت حق تعالیٰ کے ساتھ ہونا اس سے افضل و بہتر ہے جس میں حق تعالیٰ کے فعل کی نسبت بندے کی طرف کی جائے۔ جب فعل الٰہی کی نسبت بندے کی طرف ہوتی ہے تو بندہ اپنے وجود

سے قائم ہوتا ہے اور جب بندے کے فعل کی نسبت حق تعالیٰ کے ساتھ ہو تو وہ حق کے ساتھ قائم و باقی رہتا ہے۔ جب بندہ اپنے وجود میں ثابت و برقرار ہوتا ہے تو بندہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زیر قدم نظر آتا ہے اور بسا اوقات ایسی حالت میں اس کی نظر نا مناسب مقام پر بھی پڑ جاتی ہے جیسے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی نظر اوریا عورت پر پڑی اور جو دیکھا سو دیکھا۔ اور جب بندہ حق کے ساتھ قائم ہو جائے جیسے کہ ہمارے نبی اکرم ﷺ ہیں تو اس کی نظر کا یہ عالم ہو جاتا ہے کہ جب اس کی نظر جنسِ عورت پر ہی پڑتی ہے تو حضرت زید رضی اللہ عنہ کی بیوی، خود زید پر حرام ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ محل صحو (ہوش و اختیار) میں تھے اور ہمارے حضور ﷺ محل سکر میں۔

اور وہ جماعت جو صحو کو سکر پر فضیلت دیتی ہے ان میں حضرت بغدادی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے تابعین ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ سکر محلِ آفت ہے اس لئے کہ سکر میں احوال پراگندہ، صحت و ہوش مفقود اور بندے کے تمام علائق گم ہوتے ہیں اور جب بندہ تمام قواعد معانی کا طالب ہو خواہ صورتِ فنا میں ہو یا حالت بقا میں، خواہ نابود ہونے کی صورت میں یا اثبات کی شکل میں اگر بندہ صحیح الحال نہ ہو گا تو تحقیق کا فائدہ کیسے حاصل کر سکے گا۔ اس لئے کہ اہلِ حق کا دل ہر موجود و مخلوق سے خالی ہونا چاہئے اور بینائی کی بنیاد، قید اشیاء میں کبھی چین نہیں پاتی اور اس کی آفت ہرگز زائل نہیں ہوتی۔ لوگ حق تعالےٰ کے مشاہدے سے اسی لئے محروم رہ جاتے ہیں کہ وہ حق تعالیٰ کے سوا چیزوں کو جیسی کہ وہ ہیں (کہ وہ ناپید و فنا ہونے والی ہیں) نہیں دیکھ پاتے۔ اور وہ اس میں پھنسے رہتے ہیں۔

صحیح طور پر اشیاء کا دیکھنا دو طرح پر ہے دیکھنے والی چیزوں کو یا بقا کی نظر سے دیکھے یا فنا کی نظر سے؟ اگر بقا کی نظر سے دیکھے گا تو ان تمام چیزوں کو اپنے وجود میں ناقص پائے گا۔ کیونکہ وہ چیزوں کو ان کی موجودہ حالت میں اپنے وجود کے ساتھ باقی دیکھے گا۔ اور اگر وہ فنا کی نظر سے دیکھے گا تو وہ تمام چیزوں کو حق تعالیٰ کی بقا کے پہلو میں فانی اور ناپید دیکھے گا۔ یہ دونوں کیفیتیں، موجودات سے، دیکھنے والے کا منہ پھیر دیتی ہیں۔ اسی لئے حضور اکرم ﷺ نے بحالتِ دعا یہ فرمایا کہ "اللھم ارنا الاشیاء کماھی" اے خدا مجھے اشیاء کی حقیقت جیسی کہ وہ ہیں دکھا۔ یہ اس

لئے کہ جس نے اشیاء کو ان کی حقیقت کے ساتھ دیکھا وہ آسودہ رہا۔ اسی معنی میں حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ ''فاعتبروا یا اولی الابصار'' اے دیکھنے والے صاحبِ بصیرت، بہ نگاہِ عبرت دیکھ۔ بندہ جب تک دیکھے گا نہیں تو وہ عبرت کیسے حاصل کر سکے گا۔ اس لئے یہ باتیں حالت صحو (ہوش و اختیار) کے سوا کیسے درست ہو سکتی ہیں۔ اہلِ سکر کی ان معانی تک کیسے رسائی ممکن ہے؟ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سکر کی حالت میں تھے۔ وہ ایک تجلی ربانی کو برداشت نہ کر سکے۔ ہوش جاتے رہے جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے ''وخر موسیٰ صعقا'' موسیٰ علیہ السلام چیخ مار کر زمین پر گر پڑے۔ اور ہمارے رسول مکرم ﷺ کی حالت صحو کی تھی اس لئے مکہ مکرمہ سے ''قاب قوسین او ادنیٰ'' تک عینِ تجلّی ربانی میں، بیدار اور ہوشیار رہے۔

شربت الراح کأسا بعد کأسِ
فما نفد الشراب وَمَا رَویت

میں نے شراب راحت، پیالے بھر بھر کے پیے
لیکن شراب نے مجھ پر نہ اثر کیا اور نہ میں اس سے سیراب ہی ہو سکا

میرے شیخ و مرشد نے فرمایا جو جنیدی مشرب کے تھے کہ سکر بچوں کے کھیل کا میدان ہے اور صحو، مردانِ خدا کے فنا کا میدان۔؟

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے شیخ و مرشد کی متابعت اور ان کی موافقت میں کہتا ہوں کہ صاحبِ سکر کے حال کا کمال، صحو ہے اور صحو کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ وہ بشریت کی حالت میں دیدار سے محروم رہ جائے۔ لہٰذا ایسا صحو جو یہ آفت برپا نہ کرے اس سکر سے بہتر ہے جو سراسر آفت ہے۔

حضرت ابو عثمان مغربی رحمتہ اللہ علیہ کے واقعات میں مذکور ہے کہ انھوں نے ابتدائے احوال میں جنگلوں میں بیں۲ سال تک ایسی گوشہ نشینی کی زندگی بسر کی کہ کسی آدمی کی بو تک نہ سونگھی۔ یہاں تک کہ ریاضت و مجاہدے نے چہرے پر جھریاں اور آنکھوں میں حلقے ڈال دیئے بیس سال کی بعد صحبت و جلوت کا فرمان ہوا۔ اس وقت انھوں نے دل میں سوچا کہ پہلے اہل اللہ اور خانہ کعبہ کے ہم نشینوں کے ساتھ ہم نشینی کرنا مبارک رہے گا چنانچہ مکہ مکرمہ کا قصد کر کے چل دیئے۔ ادھر اولیاء کرام کے دلوں میں الہام ہو چکا تھا کہ حضرت ابو عثمان آ رہے ہیں تو

وہ سب ان کے استقبال کے لیئے باہر آ گئے۔ انھوں نے ان کو اس حال میں پایا کہ بینائی پتھرا چکی تھی۔ اور سوائے زندگی کے رمق کے ان کے جسم میں کچھ نہ تھا۔ یہ حال دیکھ کر کہنے لگے کہ اے ابو عثمان! آپ نے زندگی کے بیس سال اس شان سے گذارے کہ تمام لوگ آپ کے زندہ ہونے سے ہی مایوس ہو چکے تھے۔ ہمیں بتایئے آپ نے ایسا کیوں کیا؟ اور آپ نے کیا دیکھا؟ اور کیا پایا؟ اور کیوں واپس آئے؟ حضرت ابو عثمان نے فرمایا میں بحالتِ سکر گیا، سکر کی آفت دیکھی، مایوسی کو پایا اور عاجزی سے واپس آیا۔ تمام مشائخ نے بیک زبان کہا اب آپ کے بعد صحو و سکر کی تعبیر، ہر تعریف کرنے والے پر حرام ہے کیونکہ انھوں نے تشریح و تعبیر کا حق ادا کیا۔ اور سکر کی آفت کو ظاہر فرما دیا۔

غرضکہ سکر، بقائے صفت کا عین اور فنائے صفت کا گمان ہے اور یہ سراپا حجاب ہے۔ اور صحو فنائے صفت میں مکمل مشاہدہ کی بقا ہے۔ اور یہ عین کشف و مشاہدہ ہے۔ اگر کسی کی یہ صورت ہو کہ صحو کے مقابلہ میں سکر فنا سے زیادہ نزدیک ہو تو یہ محال ہے کیونکہ سکر ایسی صفت ہے جو صحو پر زیادہ ہے اور جب تک بندے میں ایسی صفات کا اضافہ ہوتا رہے وہ اس وقت تک بے خبر رہتا ہے۔ اور جب بندے میں یہ صفات کم ہونے لگیں اس وقت طالب کو امید ہو سکتی ہے کہ مشاہدہ ہو۔ صحو و سکر کی تعریف میں یہ انتہائی حالت کا بیان ہے۔

حکایت

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ جو مغلوب الحال تھے ان کا واقعہ ہے کہ حضرت یحییٰ بن معاذ نے ان کے نام ایک خط بھیجا جس میں دریافت کیا کہ آپ اُس شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جس نے دریائے محبت سے ایک قطرہ پیا اور مست ہو گیا؟ حضرت بایزید نے جواب میں تحریر فرمایا آپ اُس شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں کہ اگر سارے جہان کے دریا، محبت کی شراب بن جائیں اور وہ شخص ان سب کو پی جائے پھر بھی وہ سیراب نہ ہو اور پیاسا ہی رہ جائے؟ لوگوں نے اس سے یہ سمجھا کہ حضرت یحییٰ نے سکر کی طرف اشارہ فرمایا تھا اور حضرت بایزید نے صحو کی طرف اشارہ فرمایا حالانکہ واقعہ اس کے برعکس ہے یعنی صاحبِ صحو وہ ہوتا ہے جو ایک قطرہ کی بھی برداشت نہ رکھے۔ اور صاحبِ سکر وہ ہوتا ہے جو مستی میں سب کچھ پی کر بھی پیاسا رہتا ہے۔ اس لئے کہ شراب مست، مستی کا سرچشمہ ہے۔ جنس کے لئے ہم جنس ہی بہتر ہوتی ہے۔ صحو چونکہ اس کی ضد ہے اس لئے وہ شراب سے راحت نہیں پاتا (بلکہ اس کے لئے شربت وصال اور دیدار و مشاہدہ موجبِ راحت ہوتا ہے۔ مترجم)

سکر کی اقسام

سکر کی دو قسمیں ہیں ایک شرابِ مودّت سے دوسرے جامِ محبت سے۔ سکر

مودت معلول ہے یعنی وہ سب کے ساتھ ہے کیونکہ مدہوشی اور مستی، نعمت کے دیدار سے پیدا ہوتی ہے اور سکرِ محبت غیر معلول یعنی بے علّت وسبب ہے کیونکہ یہ مستی، منعم یعنی حق تعالیٰ کے دیدار سے پیدا ہوتی ہے لہٰذا جس نے نعمت کو دیکھا گویا اس نے خود کو دیکھ لیا۔ اور جس نے منعم کو دیکھا اس نے اپنے آپ کو نہیں دیکھا۔ اگرچہ وہ حالتِ سکر میں ہے کیونکہ اس کا یہ سکر، صحو ہے۔

صحو کے اقسام اسی طرح صحو کی بھی دو قسمیں ہیں ایک صحو بر غفلت دوسرا صحو بر محبت۔ صحو بر غفلت بہت بڑا حجاب ہے اور صحو بر محبت، روشن وواضح کشف ومشاہدہ ہے۔ لہذا جو غفلت پر ہوتا ہے اگرچہ وہ صحو وہوش مند ہے مگر سکر ومدہوش ہے۔ اور جو محبت میں واصل بحق ہو جائے اگرچہ سکر ومدہوشی میں ہو مگر وہ صحو وہوش مند ہے۔ اور جب اصل وبنیاد، مضبوط ومستحکم ہوتی ہے تو صحو سکر کی مانند اور سکر صحو کی مانند ہوتی ہے اور جب اصل وبنیاد، درست وصحیح نہ ہو تو دونوں بے فائدہ اور بیکار ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ مردانِ خدا کی جائے اقامت میں صحو وسکر اختلاف سبب کی وجہ سے معلول ہوتا ہے لیکن جب سلطانِ حقیقت اللہ رب العزت اپنا جمال دکھا دے تو صحو وسکر دونوں طفیلی رہ جاتے ہیں۔ اس لئے کہ ان دونوں کے کنارے اور سرحدیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔ اور ایک کی انتہا میں دوسرے کی ابتدا شامل ہے۔ ابتدا وانتہا سوائے تفرقہ کے کچھ نہیں ہے۔ چونکہ ان کی نسبت تفرقہ سے ہے اس لئے حکم میں دونوں برابر ہیں۔ اور دو نفی کے جمع کرنے سے تفرقہ ہی ہوگا۔ اسی مفہوم میں یہ شعر کہا گیا ہے

اذا طلع الصباح بنجم راح
تساوی فیہ سکران وصاح

جب دیدِ حق کی صبح دل کو خوش کرنے والے ستاروں کے ساتھ طلوع
ہوتی ہے تو اس میں مست وہوشیار دونوں برابر ہوتے ہیں......

حکایت

سرخس میں دو بزرگ رہتے تھے ایک کا نام لقمان اور دوسرے کا نام ابوالفضل حسن تھا۔ ایک دن لقمان، ابوالفضل کے پاس آئے۔ ابوالفضل کے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر کہا اے ابوالفضل! کتاب میں کیا تلاش کر رہے ہو؟ انھوں نے جواب دیا اسے تلاش کر رہا ہوں جسے تم اس کو چھوڑ کر تلاش کر رہے ہو۔ لقمان نے کہا یہ خلاف کیوں ہے؟ ابوالفضل نے جواب دیا خلاف تو تم کر رہے ہو اور مجھ سے دریافت کرتے ہو کہ کیا تلاش کر رہے ہو؟ لہٰذا مستی

سے ہوشیار بنو اور ہوشیاری سے بیدار ہوتا کہ تم سے خلاف اُٹھ جائے اور جان سکو کہ ہم اور تم کسے تلاش کر رہے ہیں۔

مذکورہ بحث سے تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ طیفوریوں کا جنیدیوں سے کتنا اختلاف ہے۔ تصوف کے معاملات میں ان کا مذہب مطلقاً ترکِ صحبت اور عزلت نشینی اختیار کرنا ہے اور وہ اپنے مریدوں کو اسی کی تلقین کیا کرتے تھے۔ اگر یہ میسر آجائے تو یہ طریقہ محمود اور سیرت لائقِ ستائش ہے۔

۴۔ فرقہ جنیدیہ

فرقہءجنیدیہ کے پیشوا، حضرت ابوالقاسم جنید بن محمد بغدادی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ جن کو اپنے زمانہ میں "طاؤس العلماء" کہا جاتا تھا۔ وہ مشائخ کے سردار اور امام الائمہ تھے۔ ان کا طریقہ، طیفوری مذہب کے برعکس صحو پر مبنی ہے جس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ جنیدی مسلک و مشرب، تمام مذاہب میں سب سے زیادہ مشہور اور معروف ہے۔ اکثر و بیشتر مشائخ جنیدی مسلک پر ہوئے ہیں۔ ماسوا اس کے طریقت کے معاملات میں ان کے اختلاف اور بہت سے ہیں لیکن میں نے اختصار کے پیشِ نظر اسی پر اکتفا کر کے انھیں چھوڑ دیا ہے۔ وباللہ التوفیق

حکایت حضرت حسین بن منصور حلاج رحمتہ اللہ علیہ اپنے غلبہ حال میں جب حضرت عمرو بن عثمان سے جدا ہو کر حضرت جنید کے پاس آئے تو آپ نے فرمایا کیوں آئے ہو؟ عرض کیا اس لئے کہ شیخ کی صحبت میں رہوں۔ آپ نے فرمایا مجھے مجنونوں کی صحبت درکار نہیں ہے کیونکہ صحبت کے لئے صحت چاہئے۔ جب تم آفت کی موجودگی میں میرے قریب رہو گے تو ایسا ہی ہوگا جیسے تم نے حضرت عبداللہ تستری اور عمرو کے ساتھ رہ کر کیا اور پھر جدا ہو کر چلے آئے۔

حضرت حلاج نے عرض کیا "ایها الشیخ الصحو و السکر صفتان للعبد و مادام العبد محجوبا عن ربه حتّٰی فنٰی اوصافهٗ" اے شیخ! صحو سکر تو بندے کی صفتیں ہیں اور یہ بندے کی ساتھ اس وقت تک پیوست ہیں جب تک وہ اپنے رب سے محجوب ہے حتیٰ کہ اس کی تمام صفات فنا نہ ہو جائیں۔ اس کے جواب میں حضرت جنید نے فرمایا "یا ابن المنصور اخطأت فی الصحو و السکر لان الصحو بلا خلاف عبارة عن صحة

حال العبد مع الحق، و ذالك لا یدخل تحت صفة العبد الاکتساب الحق وانا اریٰ یا ابن المنصور فی کلامك فضولا کثیرا و عبارات لا طائل تحتها "اے منصور کے بیٹے! تم نے صحو وسکر کے معنی سمجھنے میں غلطی کی ہے اس لئے کہ بلاخلاف صحو کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ کا حال حق تعالیٰ کے ساتھ صحیح ہو اور یہ مفہوم نہ بندے کی صفت ہے اور نہ اس کے اکتساب حق کے تحت داخل ہے۔ اور اے ابن منصور میں نے تمہاری باتوں میں بہت سی لغو اور بے معنی عبارتیں پائی ہیں۔ واللہ اعلم

۵۔ فرقہ نوریہ

نوری فرقہ کے پیشوا، حضرت ابوالحسن احمد بن نوری رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو مشائخ میں علماء اعلام گذرے ہیں اور نوری کے لقب سے مشہور ہیں۔ مشائخ میں ان کے اوصافِ حمیدہ اور دلائل قویہ معروف ہیں۔ تصوف میں ان کا مذہب مختار ہے۔ ان کے مذہب کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ فقر پر تصوف کو فضیلت دیتے ہیں۔ اور ان کا معاملہ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کے مذہب کے موافق ہے اور اس طریقہ کے نوادرات میں سے یہ ہے کہ صاحبِ حق صحبت میں اپنے حق کا ایثار کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ بغیر ایثار کے صحبت حرام جانتے ہیں۔ حضرت نوری فرماتے ہیں کہ درویشوں کے لئے صحبت فرض ہے اور گوشہ نشینی ناپسندیدہ۔ اور یہ کہ ہم نشین کا دوسرے ہم نشین کے لئے ایثار بھی فرض ہے۔ چنانچہ ان کا ارشاد ہے:۔

ایاکم والعزلة فان العزلة مقاربة الشیطان وعلیکم بالصحبة فان الصحبة رضاء الرحمٰن	گوشہ نشینی سے بچو کیونکہ گوشہ نشینی شیطان کی ہم نشینی ہے۔ اور بندگانِ خدا کی صحبت میں آؤ۔ کیونکہ صحبت میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے۔

اب میں ایثار کی حقیقت بیان کرتا ہوں اور جب صحبت اور عزلت کے باب میں پہنچوں گا تو وہاں اس کی بھی وضاحت کردوں گا انشاء اللہ۔

ایثار کی بحث

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

ویؤثرون علیٰ انفسهم ولو کان بهم خصاصة۔	مسلمانوں اپنی جانوں کی نسبت دوسرے پر ایثار کرتے ہیں، اگرچہ انھیں تنگی ہو۔

ایثار کرنے والے اگرچہ خود اس کے ضرورت مند ہوتے ہیں۔ یہ آیہء کریمہ فقراء صحابہ کی شان میں خاص طور پر نازل ہوئی۔

ایثار کی حقیقت ایثار کی حقیقت یہ ہے کہ صحبت میں اپنے رفیق کے حق کی حفاظت رکھے اور اپنے حق سے اس کے حق کی خاطر دستبردار ہو جائے اور اپنے رفیق کو آرام وراحت پہنچانے میں خود تکلیف برداشت کرے اور اپنے آرام وراحت کو اس پر قربان کردے۔ ''لان الایثار، القیام بمعاونۃ الاغیار مع الاشتغال بما امرہ الجبار لرسولہ المختار صلے اللّٰہ علیہ وسلم قال اللّٰہ تعالیٰ خذالعفوو أمر بالمعرف و اعرض عن الجاھلین (لآیۃ)'' اس لئے کہ ایثار یہ ہے کہ دوسروں کی مدد کرنے میں قائم رہے۔ باوجودیکہ وہ خود اس کا حاجت مند ہو۔ یہ اس حکم خداوندی کے تحت ہے جس میں اپنے رسول مختار علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ درگزر سے کام لو اور نیکی کا حکم دو اور جاہلوں سے دور رہو۔ یہ مسئلہ اپنی کامل تشریح کے ساتھ آدابِ صحبت کے باب میں آئے گا انشاءاللہ۔

ایثار کی اقسام ایثار کی دو قسمیں ہیں ایک صحبت میں ایثار کرنا جیسا کہ لکھا جا چکا ہے۔ دوسرے محبت میں ایثار کرنا۔ لیکن ہم نشین اور رفیق کے حق میں ایثار کرنا ایک طرح سے رنج و تکلیف ہے۔ لیکن دوست کے حق میں ایثار کرنا سراسر راحت ہی راحت ہے۔

حکایت یہ واقعہ مشہور ہے کہ غلام الخلیل نے جماعت صوفیاء کے ساتھ جب عداوت کا اظہار کیا اور ہر ایک سے طرح طرح کی دشمنی پیدا کی اور حضرت نوری، رقام اور ابوحمزہ رحمہم اللہ کو گرفتار کرا کے دربارِ خلافت میں بلوایا تو اس وقت اس غلام الخلیل نے کہا یہ زندیقوں کی جماعت ہے۔ اے امیر المومنین! اگر آپ زندیقوں کے قتل کا حکم دے دیں تو ان زندیقوں کی نسل ہی ختم ہو جائے کیونکہ یہ تینوں تمام زندیقوں کے سرغنہ ہیں جس کے ہاتھ سے ایسی نیکی واقع ہوئی میں اس کے اجر وثواب کا ضامن ہوں گا۔ خلیفہ نے ان سب کی گردنیں اڑانے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ سیاف یعنی جلاد آیا اور اس نے تینوں کے ہاتھ باندھے۔ اور حضرت رقام کی گردان اُڑانے کے لئے تلوار اٹھائی تو حضرت نوری جلدی سے اُٹھے اور رقام کی جگہ تلوار کی زد میں جا بیٹھے۔ تمام لوگوں نے اس پر تعجب کیا۔ جلاد نے کہا اے جوانمرد یہ تلوار ایسی نہیں ہے جسے کھیل سمجھا جائے؟ اور تم اس کے سامنے آؤ۔ ابھی تمہاری باری نہیں آئی۔

حضرت نوری نے فرمایا تم ٹھیک کہتے ہو لیکن میرا طریقہ ایثار ہے دنیا میں سب سے عزیز چیز زندگانی ہے میں چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی کے جو بقیہ سانس ہیں ان کو اپنے بھائیوں پر قربان کر دوں۔ کیونکہ میرے نزدیک دنیا میں ایک سانس لینا آخرت کے ہزار سانس سے بہتر ہے۔ یہ دنیا خدمت وعبادت اور خدا کی بندگی کا مقام ہے اور آخرت قربت کی جگہ اور قربت خدا ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ خلیفہ نے جب یہ بات سنی تو وہ ان کی طبیعت کی نرمی اور کلام کی باریکی پر ایسا متعجب ہوا کہ اسی وقت حکم دیا کہ ابھی ٹھہر جاؤ۔ اس زمانے میں قاضی القضاۃ ابوالعباس بن علی تھے۔ خلیفہ نے ان کے احوال کی تفتیش کا کام اس کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ قاضی ابوالعباس ان تینوں کو اپنے گھر لے گیا۔ اس نے شریعت اور حقیقت کے احکام ومسائل کے بارے میں سوالات کئے اور ہر سوال کے جواب میں انھیں راہِ حق پر پایا اور ان کے احوال سے اپنی غفلت ونادانی پر شرمسار ہوا۔ اس وقت حضرت نوری نے فرمایا اے قاضی! جو سوالات تم نے دریافت کئے ہیں ان کی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ''فان للّٰہ عباد یاکلون باللّٰہ ویشربون باللّٰہ ویجلسون باللّٰہ و یقولون باللّٰہ'' اللہ تعالےٰ کے ایسے بندے بھی ہیں جو اسی کے ساتھ کھاتے، پیتے، بیٹھتے اور اسی کے ساتھ بات کرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اُن مردانِ خدا کا قیام و قعود، اکل وشرب، حرکت وسکون اور نطق وکلام اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ ہے اسی کے لئے زندہ ہیں اور اسی کے مشاہدے میں محو رہتے ہیں اگر ایک لمحہ کے لئے بھی مشاہدۂ حق نہ ہو تو ان کی زندگی مضمحل وپراگندہ ہو جاتی ہے۔ ایسا لطیف کلام سن کر قاضی بہت حیرت زدہ ہوا اس نے اسی وقت تمام گفتگو اور ان کے حالات کی درستگی قلمبند کر کے خلیفہ کے پاس بھیج دی۔ اور لکھا کہ اگر یہ جماعت ملحدوں کی ہے تو ''فمن الموحد فی العالم'' جہان میں پھر کون موحد اور توحید پرست ہوگا؟ میں گواہی دیتا ہوں اور فیصلہ کرتا ہوں کہ اگر یہ ملحد ہیں تو روئے زمین میں کوئی موحد نہیں ہے۔ خلیفہ نے ان سب کو بلایا اور کہا اگر کچھ ضرورت ہو تو بتائیں؟ انھوں نے کہا اے خلیفہ! ہمیں تم سے یہی حاجت ہے کہ تم ہم سب کو فراموش کردو۔ نہ اپنی قبولیت سے ہمیں اپنا مقرب بناؤ اور نہ اپنی دوری سے مردود ومقہور قرار دو۔ کیونکہ ہمارے لئے تمہاری دُوری، تمہاری قبولیت کے مشابہ ہے۔ اور تمہاری قبولیت، تمہاری دوری کی مانند۔ خلیفہ رونے لگا اور عزت واحترام کے ساتھ انھیں رخصت کر دیا۔

اثرِ صحابہ

حضرت نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو ایک روز مچھلی کھانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ شہر بھر میں مچھلی تلاش کرائی مگر نہ ملی۔ چند روز بعد مجھے مچھلی مل گئی میں

نے باورچی کو تیار کرنے کا حکم دیا۔ پھر جب میں نے ان کے روبرو پیش کیا تو مچھلی دیکھتے ہی ان کی پیشانی پر خوشی و مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اسی وقت ایک سائل ان کے دروازے پر آ گیا۔ انھوں نے حکم دیا کہ یہ مچھلی سائل کو دے دی جائے۔ غلام نے کہا اے آقا' آپ اتنے دن سے مچھلی کی تلاش میں تھے آپ کو اس کی خواہش تھی۔ آپ اسے کیوں دے رہے ہیں میں سائل کو کوئی اور چیز دے دیتا ہوں؟ فرمایا اے غلام! اب اس کا کھانا مجھ پر حرام ہے کیونکہ میرے دل میں اس کی خواہش نہیں رہی۔ اس کے بعد حضرت ابنِ عمرؓ نے یہ واقعہ حضور اکرم ﷺ کو سنایا تو حضور ﷺ نے فرمایا" ایما امرئ یشتھی شھوۃ فرد شھوتہ و آثر الاٰخرۃ علی نفسہٖ غفرلہ یعنی جس آدمی کے دل میں کسی چیز کی خواہش پیدا ہو اور وہ چیز اسے مل جانے پر وہ اس سے ہاتھ کھینچ لے اپنے آپ پر دوسرے کو ترجیح دے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس ایثار پر اسے بخش دے گا۔

ایثار کی نادر مثال دس درویش بیابان میں سفر کر رہے تھے۔ اثنائے راہ میں انھیں شدت کی پیاس لگی۔ ان کے پاس صرف ایک پیالہ پانی تھا۔ ہر ایک نے دوسرے کو وہ پیش کیا مگر کسی نے نہیں پیا یہاں تک کہ پیاس کی شدت میں نو درویش دنیا سے رخصت ہو گئے صرف ایک درویش رہ گیا اس نے کہا جب میں نے دیکھا کہ سب فوت ہو چکے ہیں اور صرف میں ہی رہ گیا ہوں تو میں نے وہ پانی پی لیا۔ جس سے مجھے ہوش آیا اور توانائی محسوس ہوئی۔ کسی نے اس درویش سے کہا اگر تم بھی اسے نہ پیتے تو اچھا ہوتا اس نے کہا او شخص! شریعت کو کیا سمجھتا ہے؟ اگر اس وقت میں اسے نہ پیتا اور مر جاتا تو میں اپنی جان کا قاتل ہوتا اور مواخذہ دار ٹھہرتا۔ اس شخص نے کہا پھر تو وہ نو درویش بھی اپنے قاتل ٹھہرے۔ درویش نے کہا نہیں، انھوں نے ایک دوسرے کی خاطر پانی نہیں پیا کہ ان کی زندگیاں بچ جائیں جب وہ اس خاطر داری اور ایثار میں جاں بحق ہوئے اور صرف میں اکیلا رہ گیا تو اب شرعاً پانی کا پینا مجھ پر واجب ہو گیا۔

ایثار میں فرشتوں کی آزمائش امیر المومنین سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ بوقتِ ہجرت، رسول کریم ﷺ کے بستر پر آرام فرما ہوئے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضور اکرم ﷺ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے غارِ ثور میں تشریف فرما ہوئے چونکہ اس رات کافروں نے حضور ﷺ کو شہید کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل و میکائیل (علیہما السلام) سے فرمایا میں نے تم دونوں کے درمیان برادری اور محبت پیدا کر کے ایک دوسرے پر زندگی دراز کر دی ہے اب بتاؤ تم دونوں میں سے کونسا بھائی ایسا ہے جو اپنی زندگی کو دوسرے پر

قربان کر کے اپنی موت کو چاہے گا؟ مگر ان دونوں فرشتوں نے اپنی اپنی زندگی کو ہی اختیار کیا اور ایک دوسرے پر ایثار و قربانی کے لئے تیار نہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم دونوں حضرت علی مرتضی کی بزرگی و فضیلت کو دیکھو کہ میں نے علی مرتضی اور اپنے رسول کے درمیان برادری قائم فرمائی لیکن علی مرتضی نے ان کے مقابلہ میں اپنے قتل اور اپنی موت کو پسند کیا اور وہ رسول اکرم ﷺ کی جگہ پر سو گئے۔ اپنی جان کو ان پر فدا کرنے اور اپنی زندگی کو ان پر نثار کرنے کی لئے تیار ہو گئے اور خود کو ہلاکت کے منہ میں ڈال دیا۔ اب تمہارا فرض یہ ہے کہ تم زمین پر جاؤ اور علی مرتضی کی خدمت بجالاؤ اور ان کو دشمنوں سے محفوظ رکھو چنانچہ جبریل و میکائیل علیہما السلام آئے ایک علی مرتضی کے سرہانے اور دوسرے ان کی پائنتی حفاظت کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اس وقت جبریل علیہ السلام نے کہا "بخ بخ مثلك ابن ابی طالب ان اللّٰہ یباھی بك علی ملئکتہ" اے علی ابن ابی طالب! تم کتنے خوش قسمت ہو، کون ہے جو تمہاری مثل ہو۔ بلا شبہ اللہ تعالیٰ آج تمہارے ساتھ فرشتوں پر فخر و مباہات فرما رہا ہے اور تم اپنی نیند میں مگن ہو۔ اس ایثار پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیہء کریمہ نازل فرمائی:۔

ومن الناس من یشتری نفسہ ابتغاء مرضات اللّٰہ واللّٰہ رؤف بالعباد۔	کچھ لوگ ایسے ہیں جو اپنی جان کو خدا کی خاطر بیچتے ہیں اور اللہ بندوں پر مہربان ہے۔

غزوۂ احد میں ایثار کی مثال جس وقت اللہ تعالیٰ نے غزوۂ احد میں سختی و مشقت کے ذریعہ مسلمانوں کا امتحان لیا تو ایک انصاری عفت مآب عورت شربت کا پیالہ لے کر آئی تا کہ کسی مجروح کو پلائے وہ بیان کرتی ہے کہ میدانِ جنگ میں ایک بزرگ صحابی کو زخموں سے چور دیکھا جو گنتی کے سانس پورے کر رہے تھے۔ انھوں نے اشارہ کیا کہ مجھے پانی دو۔ جب میں پانی لے کر ان کے قریب پہنچی تو دوسرے زخمی نے پکارا مجھے پانی دو۔ پہلے زخمی نے پانی نہ پیا اور مجھ سے کہا اس کے پاس لے جاؤ۔ جب میں اس کے پاس پہنچی تو تیسرے زخمی نے پکارا پانی اس نے بھی پانی نہ پیا اور کہا کہ اس کے پاس لے جاؤ یہاں تک کہ اس طرح میں سات زخمیوں کے پاس پہنچی جب میں ساتویں کے پاس پہنچی اور اس نے چاہا کہ پانی پیئے تو جان بحق ہو گیا میں پانی لے کر چھٹے کے پاس پہنچی تو اس نے بھی جان دے دی اسی طرح ہر ایک زخمی اپنی جان کو حق تعالےٰ کے حوالہ کرتا رہا اور کسی نے ایک دوسرے کے ایثار میں پانی نہیں پیا۔ اس سلسلے میں آیہء کریمہ نازل ہوئی کہ "ویوثرون علی انفسھم ولوکان بھم خصاصۃ" مسلمان اپنی جانوں پر ایثار کرتے ہیں اگر چہ وہ خود تنگی میں ہوں۔

بنی اسرائیل کے ایک عابد کا واقعہ

بنی اسرائیل میں ایک عابد تھا جس نے چار سو سال تک عبادت کی۔ ایک دن اس نے کہا اے خدا، اگر اس پہاڑ کو پیدا نہ فرمایا ہوتا تو لوگوں کے آنے جانے اور سفر وسیاحت کرنے میں بہت آسانی ہوتی۔ اس زمانہ کے نبی صلوات اللہ علیہ سے رب تعالےٰ نے فرمایا کہ تم فلاں عابد کو بتادو کہ ہماری ملکیت میں تجھے تصرف کرنے اور رائے دینے کا کوئی حق نہیں۔ اب چونکہ تو نے یہ گستاخی وجرائت کی ہے تو سُن کہ تیرا نام نیک بختوں کی فہرست سے خارج کر کے نافرمانوں اور بدبختوں کی فہرست میں لکھتا ہوں۔ عابد کے دل میں یہ سُن کر بڑی خوشی ہوئی اور فوراً سجدہ شکر میں گر گیا۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کے ذریعہ کہلوایا کہ او نادان، شقاوت وبدبختی پر سجدہ شکر واجب نہیں ہوتا۔ عابد نے کہا میرا شکر، شقاوت پر نہیں ہے بلکہ اس پر ہے کہ میرا نام اللہ تعالےٰ کے کسی دیوان میں تو ہے۔ لیکن اے خدا کے نبی! میری ایک حاجت خدا کی بارگاہ میں پیش کردو۔ نبی نے فرمایا کہو کیا ہے؟ اس نے کہا خدا سے عرض کرو کہ اب جب کہ تو نے میرے لئے دوزخ میں جانا مقرر کر دیا ہے تو اتنا کرم کر مجھے ایسا بنادے کہ تمام موحد گنہگاروں کے بدلے صرف میں ہی گنہگار ٹھہروں تاکہ وہ سب جنت میں جائیں۔ فرمانِ الٰہی ہوا کہ اس عابد سے کہہ دو، تیرا یہ امتحان تیری ذلت کے لئے نہیں تھا بلکہ لوگوں کے سامنے تیرے ایثار کے اظہار کے لئے تھا۔ اب روزِ قیامت تو جس جس کی شفاعت کرے گا ان سب کو جنت میں بھیج دوں گا۔

حضرت احمد حماد سرخسی کا ایثار

حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت احمد حماد سرخسی سے پوچھا کہ تمہاری توبہ کا ابتدائی واقعہ کیا ہے انھوں نے بیان کیا کہ میں ایک مرتبہ سرخس سے جنگل کی طرف گیا اور عرصہ تک وہاں اونٹوں کے پاس رہا۔ اور میں ہمیشہ خواہش مند رہا کہ میں بھوکا رہوں اور اپنا کھانا کسی دوسرے کو دے دوں چونکہ خدا کا یہ ارشاد لوحِ قلب پر نقش تھا کہ ”ویوثرون علٰی انفسھم ولوکان بھم خصاصۃ “مسلمان اپنی جانوں پر ایثار کرتے ہیں اگرچہ انھیں خود تنگی ہو۔ اسی بنا پر ایثار پسند لوگوں سے حسنِ عقیدت رکھتا تھا۔ ایک دن ایک بھوکا شیر جنگل سے آیا اور میرے اونٹوں میں سے ایک اونٹ کو مار ڈالا اور جا کر ایک بلند جگہ پر خاص قسم کی آواز نکالی۔ گرد ونواح کے تمام درندے اس آواز پر اس کے گرد جمع ہو گئے شیر نے ان سب کے سامنے اس اونٹ کو پھاڑ ڈالا۔ اور خود کچھ نہ کھایا۔ اور دور جا کر اونچی جگہ پر بیٹھ گیا۔ وہ درندے جس میں بھیڑیا، چیتا، لومڑی اور گیدڑ وغیرہ تھے سب اسے کھانے لگے۔

شیراس وقت تک کھڑا دیکھتا رہا جب تک کہ وہ درندے کھا کر واپس نہ چلے گئے۔ان کے جانے کے بعد شیر نے خود کھانے کا ارادہ کیا کہ اتنے میں ایک لنگڑی لومڑی نمودار ہوئی شیر پھر جا کر اونچی جگہ پر بیٹھ گیا۔لومڑی سے جتنا کھایا گیا کھایا اور چلی گئی۔اس وقت شیر آیا اور اس میں سے تھوڑا سا کھایا۔میں دور بیٹھا اس نظارے کو دیکھ رہا تھا۔جب لوٹنے لگا تو شیر نے فصیح زبان میں مجھ سے کہا اے احمد! لقمہ کا ایثار تو کتوں کا کام ہے۔مرد تو اپنی جان و زندگی تک قربان کر دیتے ہیں۔جب میں نے اس دلیل کو دیکھا تو میں نے ہر مشغولیت سے ہاتھ کھینچ لیا۔یہ تھا میری توبہ کا ابتدائی واقعہ۔

حضرت نوری کی مناجات

جعفر خلدی بیان کرتے ہیں کہ ایک دن حضرت ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ خلوت میں مناجات کر رہے تھے میں ان کی مناجات کے الفاظ سننے کی غرض سے اس طرح قریب ہوا کہ ان کو خبر نہ ہو کیونکہ وہ مناجات فصیح و بلیغ تھیں۔انھوں نے مناجات میں کہا کہ اے خدا، تو دوزخیوں کو عذاب دے گا حالانکہ وہ سب تیرے بندے ہیں اور تیرے پیدا کردہ ہیں۔اور وہ تیرے ازلی علم و ارادہ اور قدرت میں ہیں۔اگر تو واقعتہً دوزخ کو لوگوں سے بھرنا ہی چاہتا ہے تو تو اس پر قادر ہے کہ مجھ سے دوزخ اور اس کے طبقات کو بھر دے اور اُن دوزخیوں کو جنت میں بھیج دے۔جعفر کہتے ہیں کہ میں یہ الفاظ سن کر حیران رہ گیا۔میں نے خواب میں دیکھا کہ کسی نے آ کر مجھ سے کہا کہ تم ابوالحسن سے جا کر کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم نے تمہاری اس شفقت و ایثار پر جو تمہیں ہمارے بندوں سے ہے تمہیں بخش دیا۔

حضرت ابوالحسن رحمتہ اللہ علیہ کو نوری اس بنا پر کہا جاتا تھا کہ اندھیرے گھر میں جب وہ بات کرتے تھے تو ان کے باطن کے نور سے وہ گھر روشن ہو جاتا تھا اور یہ کہ وہ مریدوں کے اسرار کو نورِ حق سے معلوم کر لیتے تھے۔یہاں تک کہ حضرت جنید بغدادیؒ ان کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ "ابوالحسن تو دلوں کا جاسوس ہے"

یہ ہیں نوری مذہب کی خصوصیات جو اہلِ طریقت کے نزدیک قوی الاصل اور عظیم المعاملات ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے لئے روح پر خرچ کرنے اور اپنی محبوب و مرغوب چیز سے دست کش ہونے سے زیادہ شدید چیز کوئی نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ نے تمام نیکیوں کی کنجی سب سے زیادہ محبوب چیز خرچ کرنے کو بتایا ہے۔چنانچہ فرماتا ہے:۔

لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون۔	ہرگز ہرگز نیکی نہ پاؤ گے جب تک کہ اپنی سب سے زیادہ محبوب چیز اس کے لئے خرچ نہ کرو گے۔

طریقت کی اصل یہی ہے۔ چنانچہ حضرت رویم رحمتہ اللہ علیہ کے پاس ایک شخص آیا اس نے کہا مجھے کوئی نصیحت فرمایئے؟ آپ نے فرمایا:۔

یا بنی لیس الامر غیر بذل الروح ان قدرت علٰی ذالك والا فلا تشتغل بترهات الصوفية۔	اے فرزند! کوئی چیز جان خرچ کرنے سے بڑھ کر نہیں ہے بشرطیکہ تم کو اس پر قابو ہو ورنہ صوفیوں کی گہری باتوں کے درپے نہ ہو اس کے سوا جو کچھ ہے سب باطل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللّٰہ امواتاً۔	یعنی جو خدا کی راہ میں جان دے چکے ہیں انھیں مردہ گمان نہ کرو بلکہ وہ اپنے رب کے حضور زندہ ہیں انھیں رزق دیا جاتا ہے

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

ولا تقولوا لمن یقتل فے سبیل اللّٰہ	جنھوں نے راہِ خدا میں جان دی انھیں
اموات بل احیاء الآیہ۔	مردہ نہ کہو وہ زندہ ہیں۔

حیات ابدی اور قربِ سرمدی راہِ خدا میں جان دینے اپنے نصیب کو چھوڑنے اور اللہ کے دوستوں کی فرمانبرداری سے حاصل ہوتی ہے۔

عین ایثار و اختیار، اگرچہ معرفت کی نظر میں جدا جدا ہیں مگر عین میں جمع ہیں۔ عینِ ایثار یہ ہے کہ اپنے نصیب کو جو قربان کیا ہے حقیقت میں وہ ایثار قربانی ہی اس کا نصیب تھا۔ (کیونکہ حقیقت میں وہ حصہ اگر اس کے مقدر میں ہوتا تو مقدر میں چونکہ تغیر و تبدل کا امکان نہیں لامحالہ وہ کسی دوسرے پر کیسے خرچ ہوتا بلکہ اس کا مقدر وہی ہے جو اسے نہ ملا بلکہ دوسرے کو پہنچا۔ (فافہم مترجم) طالب کا سلوک جب تک اس کے حصول سے متعلق رہے گا وہ ہلاکت میں رہے گا لیکن جب اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی مدد شامل ہو جائے تو طالب کے تمام افعال و احوال پراگندہ اور ناپید ہو جاتے ہیں۔ اس کیفیت کی کوئی لفظی تعبیر نہیں ہو سکتی اور نہ اس کی کیفیت کا کوئی نام تجویز کیا جا سکتا ہے جس سے اس کی تعبیر کی جا سکے یا اس کا حوالہ دے کر کسی نام سے پکارا جا سکے۔ اس مفہوم کو

حضرت شبلی علیہ الرحمتہ اس طرح ادا کرتے ہیں کہ۔

غبت عنی فما احسن بنفسی

و تلاشت بصفاتی الموصوفة

فانا الیوم غائب عن جمیع

لیس الا العبارة الملهوفة

یعنی جب تو میری نگاہوں سے اوجھل تھا تو میں اپنے آپ کو بھی نہ پہچان سکا۔ اور ذات موصوف میری صفتوں کو تلاش ہی کرتی رہی۔ آج تو میں سب سے غائب ہوں۔ اب افسوس کی عبارتوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔

۶۔ فرقہ سُہیلیہ

فرقہ سہیلیہ کے پیشوا، حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ یہ اکابر و برگزیدہ مشائخ میں سے ہیں۔ ان کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔ غرضکہ یہ اپنے زمانہ کے سلطانِ وقت اور طریقت میں اہلِ حل و عقد، صاحبِ رائے تھے۔ ان کے دلائل بہت واضح اور ان کی حکایات فہمِ عقل سے بہت بلند ہیں۔ ان کے مذہب کی خصوصیت، اجتہاد، مجاہدۂ نفس اور ریاضت شاقہ ہے۔ مریدوں کو مجاہدے سے درجۂ کمال تک پہنچا دیتے تھے۔

آپ کے واقعات میں مشہور ہے کہ ایک مرید سے فرمایا خوب جہد و کوشش کرو یہاں تک کہ ایک روز تمام دن یا اللہ یا اللہ ہی کہتے رہو اور دوسرے اور تیسرے دن بھی یہی ورد رہے۔ اس کے بعد فرمایا اب دن کے ساتھ رات کو بھی شامل کر لو۔ اور یہی کہتے رہو۔ چنانچہ مرید نے اس پر عمل کیا یہاں تک کہ مرید جب خواب میں ہوتا تو وہ خواب میں بھی یہی کہتا تھا۔ حتیٰ کہ یہ اس کی طبعی عادت بن گئی۔ اس کی بعد فرمایا اب اس سے لوٹ آؤ اور اس کی یاد میں مشغول ہو جاؤ۔ پھر اس کی یہ حالت ہوگئی کہ وہ ہمہ وقت اسی میں مستغرق رہنے لگا۔ ایک دن مرید اپنے گھر میں تھا۔ ہوا کی وجہ سے وزنی لکڑی گری اور اس نے اس کا سر پھاڑ دیا۔ سر سے جو خون کے قطرے ٹپک کر زمین پر گرتے تھے وہ بھی اللہ اللہ لکھتے جاتے تھے۔

غرضکہ مجاہدے و ریاضت کے ذریعہ مریدوں کی تربیت، سہیلیوں کا خاص طریقہ ہے۔ درویشوں کی خدمت اور ان کی تعظیم و توقیر حمدونیوں کا خاص امتیاز ہے۔ اور باطن کا مراقبہ جنیدیوں کا امتیاز ہے اس میں ریاضت و مجاہدہ فائدہ مند نہیں ہوتا؟

اب میں معرفت نفس اور اس کی حقیقت بیان کرتا ہوں اس کے بعد مجاہدوں کے مذاہب اور ان کے احکام بیان کروں گا تا کہ طالبِ معرفت پر حقیقت آشکارا ہو جائے۔ واللہ اعلم

نفس کی حقیت اور ہویٰ کے معنی کی بحث

واضح ہو کہ نفس کے لغوی معنی، وجودِ شئ اور حقیقت وذات کے ہیں۔ لوگوں کی عادت اور ان کے استعمال میں اس کے معانی بہت ہیں جو ایک دوسرے کے بالکل خلاف بلکہ متضاد ہیں۔ چنانچہ ایک گروہ کے نزدیک نفس کے معنی روح ہیں، اور ایک گروہ کے نزدیک اس کے معنی مودّت ہیں اور ایک گروہ کے نزدیک اس کے معنی جسم و بدن کے ہیں ایک دوسرے گروہ کے نزدیک اس کے معنی خون کے ہیں۔ لیکن طریقت کے محققین کے نزدیک اس لفظ کے مذکورہ معانی میں سے کوئی معنی مراد نہیں ہیں۔ اربابِ طریقت کا اس پر اتفاق ہے کہ درحقیقت نفس، تمام شر اور برائی کا سرچشمہ ہے۔ جو بڑا امام اور قائد ہے۔ لیکن ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ نفس وہ شئے ہے جو قالب میں بطور امانت رکھا گیا ہے۔ جیسے روح۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ یہ قالب ہی کی ایک صفت ہے۔ جس طرح حیات وزندگانی اس کی صفت ہے بایں ہمہ اس میں سب متفق ہیں کہ کمینہ خصلتیں اور برے افعال اسی سے ظاہر ہوتے ہیں۔

افعالِ نفس کے اقسام نفس کے افعال کی دو قسمیں ہیں ایک معصیت و نافرمانی دوسرے کمینہ خصائل جیسے تکبر، حسد، بخل، غصہ اور کینہ وغیرہ ان کے ماسوا وہ تمام باتیں جو عقل و شریعت کے نزدیک مذموم و رکیک ہیں نفس کے افعال بد ہیں۔ اس لئے ریاضت ومجاہدے سے ان برے خصائص کو زائل کیا جاسکتا ہے۔ جس طرح توبہ سے معصیت کو دور کیا جاتا ہے۔ اور یہ کہ معاصی، نفس کے ظاہری اوصاف میں سے ہے اور کمینہ خصائل اس کے باطنی اوصاف سے تعلق رکھتے ہیں۔ ریاضت ومجاہدہ اس کے ظاہری افعال کو اور توبہ اس کے باطنی افعال کو نیست و نابود کرتی ہے۔ اور کمینہ خصائل سے جو باطن میں کدورت پیدا ہوتی ہے وہ ظاہری اوصاف (ریاضت ومجاہدے) کے ذریعہ پاک وصاف کی جاسکتی ہے۔ اور جو کدورت، ظاہری افعالِ بد سے پیدا ہوتی ہے وہ باطن کی صفائی سے جاتی رہتی ہے۔ نفس و روح دونوں قالب میں اتنے ہی لطیف ہیں جتنے عالمِ شیاطین وفرشتے اور جنت و دوزخ۔ لیکن ایک محلِ خیر ہے اور دوسرا محلِ شر جس

طرح آنکھ محلِ بصر، کان محلِ سماعت، اور زبان محلِ ذائقہ ہے اسی طرح کچھ ایمان واوصاف قالبِ انسان میں بطور امانت رکھے گئے ہیں۔ لہٰذا نفس کی مخالفت، تمام عبادتوں کی جڑ اور مجاہدوں کی اصل ہے۔ اس کے بغیر بندہ راہِ حق نہیں پا سکتا۔ اس لئے کہ نفس کی موافقت میں بندے کی ہلاکت ہے اور اس کی مخالفت میں بندے کی نجات ہے۔

چونکہ حق تعالیٰ نے اس کی مذمت فرمائی ہے جیسا کہ ارشاد ہے:۔

و نھی النفس عن الھویٰ فان الجنۃ ھی الماویٰ۔	جس نے نفس کو خواہش سے روکا بیشک جنت اس کا مسکن ہے۔

اور ارشاد ہے:۔

افکلما جاء کم رسول بما لا تھویٰ انفسکم استکبرتم۔	جب بھی تمہارے پاس رسول وہ چیز لے کر آئے جو تمہارے جی کو پسند نہیں تھی تو تم نے اس سے تکبر کیا۔

حضرت یوسف صدیق علیہ السلام کے قول کی اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ:۔

وما ابریٔ نفسی، ان النفس لا مارۃ بالسوء الا مارحم ربی۔	میں اپنے نفس کی پاکی نہیں بیان کرتا کیونکہ نفس تو بہت زیادہ برائی کا حکم کرنے والا ہے
	مگر جو خدا نے مجھ پر رحم فرمایا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

اذا اراد اللّٰہ بعبد خیراً بصرہ بعیوب نفسہ۔	اللہ تعالیٰ جب بندے سے بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے اس کے نفس کے عیوب دکھا دیتا ہے۔

احادیث میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی:۔

یاداود عاد نفسك فان ودی فی عداو تھا۔	اے داؤد تم اپنے نفس کو دشمن جانو کیونکہ میری محبت اس کی دشمنی میں ہے۔

یہ جو کچھ بیان ہوا سب صفات ہیں۔ اور یہ یقینی چیز ہے کہ صفت کے لئے موصوف درکار ہوتا ہے تاکہ وہ اس کے ساتھ قائم ہو کیونکہ صفت از خود قائم نہیں ہوتی۔ اور صفت کی معرفت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ قالب کی پہچان مکمل طور سے نہ ہو جائے۔ اس کی پہچان کا طریقہ، انسان کے اوصاف کا بیان ہے اور لوگوں کی انسانیت کی حقیقت میں عرفاء کے بہت سے

قول ہیں۔ یہاں تک کہ یہ نام کس چیز کا ہے اور کس چیز کے لئے سزاوار ہے؟ اس کا علم ہر طالب حق پر فرض ہے اس لئے کہ جو طالب خود سے بے خبر ہے وہ اپنے غیر سے زیادہ جاہل ہوگا۔ جب بندے کو معرفتِ الٰہی کا مکلف بنایا گیا ہے تو لامحالہ پہلے اسے اپنی معرفت ہونی چاہئے تاکہ اپنے حادث و ناپید ہونے کی صحت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے قدیم وازلی ہونے کو پہچانے۔ اور اپنی فنا سے حق تعالیٰ کے ساتھ بقا کو معلوم کر سکے۔ نص قرآنی اس پر ناطق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کا ذکر صفتِ جہالت سے کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ:۔

ومن یرغب عن ملت ابراھیم الا من سفہ نفسہٗ۔	جس نے ملّتِ ابراہیمی سے منہ موڑا وہ اپنے آپ سے جاہل ہے۔

یعنی اس نے اپنے آپ کو نہیں پہچانا۔ طریقت کے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ:۔

من جھل نفسہ فھو بالغیر اجھل۔	جو اپنے نفس سے جاہل ہے وہ دوسروں سے زیادہ جاہل ہوگا یعنی اس نے اپنے آپ کو نہیں پہچانا

حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں:۔

من عرف نفسہ فقد عرف ربہٗ"	جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

معرفتِ انسانیت

مطلب یہ کہ جس نے اپنے نفس کی بابت یہ جان لیا کہ وہ فنا ہونے والی چیز ہے تو اس نے اپنے رب کو پہچان لیا اور سمجھ لیا کہ وہی باقی رہنے والی ذات ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ جس نے اپنے نفس کو جان لیا کہ وہ ذلیل وخوار ہونے والی چیز ہے اس نے اپنے رب کو پہچان لیا کہ وہ عزت وکرامت بخشنے والی ذات ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ جس نے اپنے نفس کو بندگی سے پہچان لیا اس نے اپنے رب کو ربوبیت سے پہچان لیا جس نے اپنے ہی کو نہ پہچانا وہ دوسرے کو کیا پہچانے گا؟ اس جگہ معرفت نفس سے مراد، معرفتِ انسانیت ہے۔

باہمی معارضہ کی وجہ سے لوگوں کا اس میں اختلاف ہے چنانچہ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ انسان صرف روح کا نام ہے اور جسم اس کی زرہ اور لباس اور اس کے رہنے کی جگہ ہے تاکہ طبائع کے خلل سے محفوظ رہے۔ اور حسنِ عقل اس کی صفت ہے۔ یہ قول باطل ہے اس لئے کہ جب روح جسم سے جدا ہو جاتی ہے تب بھی اسے انسان کہا جاتا ہے یہ نام مردہ شخص سے بھی جدا نہیں ہوتا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جب جسم میں روح تھی تو زندہ انسان تھا اور جب رُوح نکل گئی تو وہ انسان مردہ ہو گیا۔

بطلان کی دوسری وجہ یہ ہے کہ حیوان کے اجسام میں بھی روح رکھی گئی ہے مگر اسے انسان نہیں کہا جاتا۔ اگر انسانیت کی علّت روح ہوتی تو چاہئے تھا کہ روح جہاں کہیں بھی ہو اس پر انسانیت کے حکم کا اطلاق کیا جاتا۔ اور وہ بھی دلائل کے ساتھ۔ یہ قول باطل ہے۔

ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ جب تک روح و جسم دونوں یکجا ہیں اس کا نام "انسان" ہے۔ اور جب یہ دونوں جدا ہو جائیں تو پھر یہ نام ساقط ہو جاتا ہے۔ جس طرح گھوڑے میں جب دو رنگ مل جائیں ایک سیاہ دوسرا سفید تو اسے ابلق کہتے ہیں اور جب کوئی ایک رنگ اس سے جاتا رہے تو پھر ابلق نہ کہیں گے بلکہ سفید یا سیاہ کہیں گے۔ یہ قول بھی باطل ہے کیونکہ اللہ تعالٰے فرماتا ہے:۔

هل اتٰى على الانسان حين من الدهر لم يكن شيئا مذكورا	کیا انسان پر زمانہ میں ایسا وقت نہ گزرا جب وہ کوئی قابلِ ذکر شئی نہ تھا۔

اور یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام کے جسدِ خاکی (پتلے) کو انسان کہا گیا حالانکہ ان کے قالب میں اس وقت جان و روح ڈالی بھی نہیں گئی تھی۔

ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ انسان ایسے حصہء جسم کا نام ہے جس کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا اور اس کا مقام دل ہے۔ کیونکہ آدمی کے تمام صفات کی بنیاد یہی دل ہے۔ یہ قول بھی باطل ہے اس لئے کہ اگر کوئی مار ڈالا جائے اور اس کا دل نکال کر پھینک دیا جائے تب بھی انسانیت کا نام اس سے جدا نہیں ہوتا۔ اور نفخِ روح سے پہلے باتفاق حضرت آدمؑ کے قالب میں دل نہ تھا۔

مدعیانِ تصوف کا ایک گروہ انسان کے معنی میں شدید غلطی پر اصرار کرتا ہے۔ اس کا قول ہے کہ انسان میں کھانے پینے اور تغیر پذیر ہونے کی صلاحیت نہیں ہے انسان کا وجود خدا کا ایک بھید ہے اور جسم اس کا لباس۔ یہ خدا کا بھید، امتزاجِ طبع اور جسم و روح کے اتحاد میں پنہاں ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تمام غافل، دیوانے، فاسق و فاجر اور تمام کافروں کے ساتھ بھی انسانیت کا نام مستعمل ہے حالانکہ ان میں، ان کے مزعومہ میں اسرارِ الٰہی کا نام و نشان تک نہیں۔ وہ سب متغیر اور اپنے وجود میں کھانے پینے والے ہیں۔ اسی طرح شخصی وجود کے بھی کوئی معنی نہیں کہ اسے انسان کہا جائے۔ خواہ وہ موجود ہو یا ناپید؟ حالانکہ اللہ تعالٰی نے ہمارے ان تمام عناصر کو جن سے ہم مرکب ہیں انسان ہی فرمایا ہے۔ باوجود ان معانی کے جو بعض آدمیوں میں نہیں ہیں چنانچہ اللہ تعالٰی فرماتا ہے:۔

ولقد خلقنا الانسان من سلالة من طین ٥ ثم جعلناه نطفة فی قرار مکین ٥ ثم خلقنا النطفة علقة فخلقنا العلقة مضغةً فخلقنا المضغة عظمًا فکسونا العظٰم لحما ثم انشأنٰه خلقًا آخر فتبارک اللّٰہ احسن الخالقین٥

بیشک ہم نے انسان کو چنی ہوئی مٹی سے بنایا پھر اسی پانی کی بوند (نطفہ) کیا ایک مضبوط جگہ (رحم) میں۔ پھر ہم نے اس پانی کی بوند کو خون کی پھٹکی بنایا اور پھر اس کو گوشت کی بوٹی پھر گوشت کی بوٹی سے ہڈی۔ اور پھر ان ہڈیوں پر گوشت چڑھایا پھر اسے اور صورت میں اٹھان دی تو بڑی برکت والا ہے اللہ، سب سے بہتر بنانے والا۔

لہٰذا بفرمان الٰہی جو تمام سچوں سے بڑھ کر سچا ہے۔ یہ مخصوص صورت جو اعضاء و طبائع اور مزاجوں سے مرکب ہے اس کا نام انسان رکھا ہے۔ جیسے کہ اہل سنت و جماعت کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ انسان اس صورت کا نام ہے جو ان صفات کے ساتھ مخصوص ہے۔ جو کہ اس کے نام کو اس کی موت سے جدا نہیں کرتی۔ یہاں تک کہ ظاہر و باطن کی جو کیفیت اس صورتِ مخصوصہ پر مرتب ہے اسی ظرف و آلہ ہی کا نام انسان ہے اس صورتِ معہودہ و مخصوصہ سے مراد، تندرست و بیمار ہونا اور آلہ موسومہ سے مُراد مجنون و پاگل ہے اور غافل ہونا ہے۔ باتفاق جو خلقت میں صحیح تر ہوگا وہ اتنا ہی کامل تر ہوگا۔

کامل تر انسان

واضح ہو کہ محققین کے نزدیک کامل تر انسان، باعتبارِ ترکیب، تین معنی سے ہوتا ہے ایک تو روح، دوسرے نفس، تیسرے جسم۔ اور اس کے ہر ذات وجود کے لئے ایک صفت ہوتی ہے۔ روح کے لئے عقل، نفس کے لئے خواہش (ہوا) اور جسم کے لئے احسان۔ انسان سارے عالم کا نمونہ ہے اور عالم نام دونوں جہان کا ہے۔ انسان میں دونوں جہان کی نشانیاں موجود ہیں۔ اس جہان کی نشانی پانی، مٹی، ہوا اور آگ ہے۔ اسی سے بلغم، خون، صفراء اور سودا کی ترکیب ہے۔ اور اُس جہان کی نشانی جنت و دوزخ اور میدانِ قیامت ہے۔ انسان میں جنت کی لطافت کے قائم مقام رُوح ہے۔ اور دوزخ کی آفت اور اس کی ہولناکیوں کے قائم مقام نفس ہے۔ اور میدانِ قیامت کا قائم مقام جسم ہے۔ ان دونوں معنی کا جمال دیر تو قہر و محبت ہے۔ لہٰذا جنت خدا کے رضا کی تاثیر اور دوزخ اس کی ناراضگی کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح مومن کی روح معرفت

کی راحت، اوراس کا نفس حجاب وضلالت سے ہے۔ جب تک مومن روزِ قیامت دوزخ سے نجات حاصل کر کے جنت میں نہ پہنچے وہ دیدارِ الٰہی کی حقیقت سے بہرہ ور نہیں ہوسکتا۔ اور مراد کی تحقیق سے ہمکنار نہیں ہوسکتا۔ اور نہ قربت ومعرفت کی حقیقت جو روح ہی کی اصل ہے حاصل کر سکتا ہے۔

جو شخص دنیا میں خدا کو پہچانتا ہے وہ دوسروں سے منہ موڑ کر راہِ شریعت پر قائم رہتا ہے وہ روزِ قیامت نہ دوزخ میں جائے گا اور نہ پل صراط کی دشواریوں سے دوچار ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ مومن کی روح اسے جنت کی طرف بلاتی ہے۔ کیونکہ رُوح دنیا میں جنت کا نمونہ ہے۔ اور نفس دوزخ کی طرف لے جانے والا ہوتا ہے۔ کیونکہ نفس دنیا میں دوزخ کا نمونہ ہے۔ مومن وعارفِ ربانی کے لئے عقل مدبر کامل ہے اور جاہل ونادان کے لئے نفس کی خواہشیں، نکمی قائد ہیں۔ عارف کے عقل کی تدبیر درست وصواب اوران کے ماسوا کی خطا وغلط۔ لہٰذا طالبانِ راہِ حق پر واجب ہے کہ ہمیشہ نفس کی مخالفت کی راہ پر جمے رہیں تاکہ اس کی مخالفت میں عقل وروح مدد کرتی رہے۔ کیونکہ وہ اسرارِ الٰہی کا مقام ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

حقیقت نفس میں مشائخ کے اقوال

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

اشد العذاب رویة النفس و تدبیرھا۔	بندے کے لئے سخت ترین حجاب نفس کو دیکھنا اوراس کی تدبیر کی پیروی کرنا ہے

کیونکہ نفس کی پیروی میں حق تعالیٰ کی مخالفت مخفی ہے۔ اور حق تعالیٰ کی مخالفت حجاب کا منبع ہے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

النفس صفة لا تسکن الا بالباطل۔	نفس کی خُو ایسی ہے کہ وہ باطل ہی سے چین پاتا ہے۔

اور راہِ حق سے اسے کبھی فرحت محسوس نہیں ہوتی۔

حکیم ترمذی حضرت محمد بن علی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

تریدان تعرف الحق مع بقاء نفسك فيك و نفسك لاتعرف نفسها فكيف تعرف غيرها۔

تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے نفس کی بقاء کے باوجود جو تمہارے اندر ہے حق تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جائے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جب کہ تمہارا نفس اپنے وجود کے باقی رکھنے کی تدبیر سے بھی آشنا نہیں ہے وہ اپنے غیر کو کیسے پہچان سکے گا۔؟

مطلب یہ ہے کہ نفس تو خود اپنی بقا کی حالت سے نابلد اور محجوب ہے اور جو خود اپنے آپ سے نابلد و محجوب ہو وہ حق تعالیٰ کو کس طرح پہچان سکے گا۔؟

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

اساس الکفر قیامك علی مراد نفسك۔

کفر کی بنیاد، اپنے نفس کی آرزو پر تیرا قائم رہنا ہے۔

گویا نفس کی خواہشات پر قائم رہنے میں بندے کے لئے کفر کی بنیاد ہے۔ کیونکہ اسلام کی لطافت کے ساتھ نفس کو کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ لہٰذا خواہشات نفس سے اعراض کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہئے۔ اس سے پہلو تہی کرنے والا منکر ہوتا ہے بلکہ منکرِ بیگانہ۔

حضرت ابو سلیمان درانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

النفس خائنة بالامانة ومانعة من الرضا وافضل الاعمال خلافها۔

نفس، امانت میں خیانت کرنے والا اور رضائے الٰہی سے روکنے والا ہے اور سب سے بہتر عمل نفس کشی ہے۔

کیونکہ امانت میں خیانت بیگانگی اور رضائے الٰہی کے ترک میں گمشدگی ہے۔ اس سلسلے میں مشائخ کے اقوال بکثرت ہیں۔ جن کی تفصیل پیش کرنا دشوار ہے۔

اب میں اپنے مقصود کی طرف آتا ہوں اور حضرت سہیل رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے اثبات اور ان کے مجاہدۂ نفس، ریاضت اور حقیقت کو بیان کرتا ہوں۔ وباللہ التوفیق۔

مجاہدۂ نفس کی بحث

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:۔

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا۔	جنھوں نے ہماری راہ میں مجاہدہ کیا یقیناً ہم نے انھیں اپنا راستہ دکھایا۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ:۔

المجاھد من جاھد نفسہ فی اللّٰہ۔	مجاہد وہ ہے جس نے راہِ خدا میں اپنے نفس کے ساتھ جہاد کیا۔

اور آپ نے فرمایا کہ:۔

رجعنا من الجھاد الاصغر الی الجھاد الاکبر قیل یا رسول اللّٰہ ما الجھاد الاکبر قال الا وھی مجاھدۃ النفس۔	اب ہم چھوٹے جہاد یعنی غزوے سے جہاد اکبر کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ جہاد اکبر کیا ہے؟ فرمایا سن لو! وہ نفس سے مجاہدہ ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے مجاہدۂ نفس کو جہاد یعنی غزوات پر فضیلت دی اس لئے کہ اس میں رنج و مشقت زیادہ ہے اور اس میں پائمال کرنا واجب ہے اور مجاہدۂ نفس میں نفس کو مغلوب و مقہور کرنا ہے۔

تو اے عزیز! اللہ تعالیٰ تمہیں عزت بخشے، آگاہ رہو کہ مجاہدۂ نفس کا طریقہ کتاب و سنت سے واضح و ظاہر ہے۔ اور تمام دینوں اور سب ملتوں میں اس کی تعریف کی گئی ہے اہلِ طریقت تو خاص طور سے اسے ملحوظ رکھتے ہیں اور تمام عام و خاص مشائخ میں اس کے معمولات جاری و مستعمل ہیں۔ اس بارے میں مشائخ کے بکثرت رموز و اشارات ہیں۔ حضرت سہیل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ تو اس خصوص میں بہت زیادہ اصرار کرتے ہیں۔ مجاہدے کے سلسلہ میں ان کے دلائل و براہین بکثرت ہیں۔ عرفاء فرماتے ہیں کہ حضرت سہیل کی عادت تھی کہ ہر پندرھویں روز ایک مرتبہ کھانا کھاتے تھے۔ اتنی قلیل غذا پر انھوں نے طویل عمر پائی۔ تمام محققین نے مجاہدے کو ثابت کیا ہے اور اسے مشاہدے کا ذریعہ بتایا ہے۔ مشائخ فرماتے ہیں کہ حضرت سہیلؒ نے بھی مجاہدے کو مشاہدے کی علّت قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ طالب کے لئے عرفانِ حق میں مجاہدہ

نہایت مؤثر عمل ہے۔

حضرت سہیل رحمتہ اللہ علیہ دنیاوی زندگانی کو جو طالبِ عرفانِ حق میں ہو اُس آخرت کی زندگانی کے مقابلہ میں جو حصول مراد سے تعلق رکھتی ہے افضل بتاتے ہیں۔ اسی بنا پر ان کا یہ ارشاد ہے کہ اخروی حصول سے مراد، اِس دنیوی مجاہدے کا ثمرہ ہے جب تم دنیا میں خدمت و عبادت کرو گے تو آخرت میں قربت پاؤ گے۔ بغیر خدمت کے وہ قربت حاصل نہیں ہو سکتی حتی کہ یہ اتنا ضروری ہے کہ وصولِ حق کی علت، بندہ کا مجاہدہ ہے۔ بشرطیکہ خدا اس کی توفیق بخشے۔

''المشاهدة مواريث المجاهدات'' مجاہدوں کی میراث مشاہدہ ہے۔

اس کے برعکس دیگر مشائخ یہ فرماتے ہیں کہ وصولِ حق کے لئے کوئی علت وسبب نہیں ہے جو بھی واصل ہوتا ہے وہ فضلِ الٰہی سے ہوتا ہے۔ فضل کے مقابلہ میں بندے کے افعال کی کیا حقیقت؟ مجاہدہ تو تہذیب نفس اور اس کے تزکیہ کے لئے ہے نہ کہ حقیقت قرب کے لئے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجاہدے کی طرف رجوع ہونا بندے کی جانب سے ہے اور مشاہدہ کے احوال، حق تعالٰی کی طرف، اس صورت میں محال ہے کہ بندے کے افعال اس کا سبب یا اس کا آلہ بن سکیں۔

اس مسئلہ میں ان کے خلاف حضرت سہیل یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ:

والذين جاهدوا فينا لنهدينهم سبلنا۔	جس نے ہماری راہ میں مجاہدہ کیا یقیناً ہم اسے اپنی راہ دکھاتے ہیں۔

مطلب یہ کہ جو مجاہدہ کرتا ہے وہ مشاہدہ پاتا ہے۔ نیز انبیائے کرام علیہم السلام کی بعثت، شریعت کا قیام، کتابوں کا نزول، اور تمام احکام مکلفہ یہ سب مجاہدے ہی تو ہیں۔ اگر مجاہدہ مشاہدے کی علت نہ ہو تو ان سب کا حکم باطل قرار پاتا ہے۔ نیز دنیا و آخرت کے تمام احکام، علل و حکم کے ساتھ ہی متعلق ہیں۔ جو حکم سے علت کی نفی کرتا ہے وہ شریعت اور اس کے احکام کو اٹھاتا ہے۔ اس صورت میں، نہ اصل میں احکام مکلفہ کا ثبوت درست ہوگا اور نہ فرع میں۔ کھانا بھوک کو ختم کرنے اور لباس سردی کو دور کرنے کی علت ہوتے ہیں لہٰذا علتوں کی نفی سے تمام مقصود و معانی میں تعطل و خلل واقع ہوتا ہے لہٰذا افعال میں اسباب پر نظر توحید اور اس کی نفی تعطیل ہے۔ اس بارے میں ان کے مسلک کے بموجب مشاہدے کے اثبات میں دلائل

ہیں۔اور مشاہدہ کا انکار، مکابرہ اور ہٹ دھرمی ہے۔کیا تم نے نہیں دیکھا کہ سرکش گھوڑے کو چابک کے ذریعہ سدھا کر بہادری کی شان پیدا کی جاتی ہے اور اس کی سرکشی کو ختم کیا جاتا ہے اور آخر میں وہی چابک زمین سے اٹھا کر گھوڑا خود مالک کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔اور اپنے منہ میں لگام لے لیتا ہے۔اس طرح نادان عجمی بچے پر محنت کر کے عربی زبان سکھا دی جاتی ہے اور اس کی طبعی بولی کو بدل دیا جاتا ہے پھر یہ کہ وحشی جانوروں کو ریاضت کے ذریعہ ایسا سدھا دیا جاتا ہے کہ جب اسے چھوڑتے ہیں تو وہ خود چلا جاتا ہے اور جب بلاتے ہیں تو آ جاتا ہے۔ پنجرے میں رہنا آزادی اور چھوڑنے سے زیادہ پسندیدہ ہے ناپاک کتے کو سدھا کر اس منزل تک پہنچا دیا جاتا ہے کہ اس کا شکار حلال ہو جاتا ہے حالانکہ آدمی کے بغیر سدھائے اس کا شکار حرام ہے۔اس قسم کی بے شمار مثالیں ہیں۔لہٰذا پوری شریعت اور اس کے احکام کا مدار مجاہدے پر ہے۔اللہ کے حبیب سید عالم ﷺ نے خود بکثرت مجاہدے فرمائے ہیں۔آپ کو حصولِ قرب، وصولِ مقصود، عافیت عقبیٰ اور قیام پر عصمت حاصل تھا۔اس کے باوجود بھوکے رہے، طویل مدت تک صومِ وصال رکھے اور کتنی ہی راتوں تک شب بیداری فرمائی۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

طٰہٰO ما انزلنا علیک القراٰن لتشقی۔	اے محبوب! آپ پر قرآن ہم نے اسلئے نازل نہیں کیا کہ اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مسجدِ نبوی کی تعمیر کے وقت رسولِ کریم ﷺ اینٹیں اٹھا رہے تھے اور میں دیکھ رہا تھا کہ حضور ﷺ کو تکلیف ہو رہی تھی میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! اینٹوں کا کام میرے سپرد فرما دیں میں یہ خدمت بجا لاؤں! حضور ﷺ نے فرمایا اے ابوہریرہ۔

خذ غیرھا فانہ لا عیش الا عیش الاٰخرۃ۔	تم اور کام کرو کیونکہ حقیقی عیش تو آخرت کی ہی عیش ہے۔

دنیا تو رنج و محنت کی جگہ ہے۔

حضرت حبان بن خارجہ مکی رحمتہ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا کہ جہاد کیا ہے؟ تو فرمایا:۔

ابدأ بنفسك فجاهدها وابدأ بنفسك فاغزها فانك ان قتلت فارا بعثك اللّٰه فارًا وان قتلت مرئیاً بعثك اللّٰه مرائیا وان قتلت صابراً محتسبا بعثك اللّٰه صابرًا محتسبا۔

پہلے اپنے نفس سے جہاد کی ابتداء کرو اور اس کے ساتھ جنگ شروع کرو اب اگر تم بھاگتے ہوئے مارے گئے تو اللہ تعالیٰ بھاگنے والوں میں تمہیں اٹھائے گا اور اگر تم ریا کاری میں مارے گئے تو اللہ تعالیٰ ریا کاروں میں اٹھائے گا اور اگر حصولِ اجر و ثواب کے لئے صبر و تحمل میں مارے گئے تو اللہ تعالیٰ تمہیں صابروں اور شاکروں میں اٹھائے گا۔

لہٰذا حق تعالیٰ کے معانی کے بیان میں جتنی عبارتیں تصنیف و تالیف میں مروی د ماثور ہیں اتنی ہی مجاہدے کے اصولِ معانی اور اس کی ترکیب و تالیف میں مروی ہیں۔ جس طرح بغیر عبارت و ترکیب کے بیان درست نہیں ہوتا، اسی طرح وصولِ حق، بغیر ریاضت و مجاہدے کے درست نہیں۔ جو بغیر مجاہدے کے وصولِ حق کا دعویٰ کرتا ہے وہ غلطی پر ہے، اس لئے کہ جہان اور اس کے حدوث کا ثبوت اس کے پیدا کرنے والے کی معرفت کی دلیل ہے، وہاں معرفتِ نفس اور اس کا مجاہدہ، اس کے وصل اور مشاہدہ کی دلیل ہے۔

اہلِ طریقت کے ایک گروہ کی دلیل یہ ہے کہ تفسیر کے لحاظ سے کلمات آیۃ مقدم اور مؤخر ہیں۔

والذین جاهدو فینا لنهدینهم سبلنا ای والذین هدیناهم سبلنا جاهدوا افینا۔

جو ہماری راہ میں جہاد کرتے ہیں ہم انھیں اپنا راستہ دکھاتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کو ہم نے اپنی راہ دکھادی ہے وہ ہماری راہ میں جہاد کرتے ہیں۔

اور یہ کہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:۔

لم ینجو احدکم بعمله۔

تم میں سے کوئی اپنے عمل کے ذریعہ نجات نہیں پائے گا۔

قیل ولا انت یا رسول اللّٰه۔

کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا آپ بھی نہیں؟

قال ولا انا الا ان یتغمدنی اللّٰہ برحمتہ۔	فرمایا ہاں میں بھی نہیں؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت میں مجھے ڈھانپ رکھا ہے۔

لہٰذا مجاہدہ فعلِ بندہ ہے اور یہ محال ہے کہ اس کا فعل اس کی نجات کا موجب بنے کیونکہ بندے کی نجات مشیتِ الٰہی سے متعلق ہے نہ کہ مجاہدے سے؟ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

فمن یرد اللّٰہ اَن یھدیہ یشرح صدرہ لہ لاسلام، ومن یرد اللّٰہ ان یضلہ یجعل صدرہ ضیقًا حرجا۔	جس کے لئے اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ہدایت پائے تو اللہ تعالیٰ اسلام کے لئے اس کا سینہ کھول دیتا ہے اور جس کے لئے اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہو کہ وہ گمراہ ہے تو وہ اس کے سینہ کو بہت زیادہ تنگ کر دیتا ہے۔

ارشاد ہے کہ:۔

تؤتی الملک من تشاء و تنزع الملک ممن تشاء۔	جسے چاہتا ہے ملک دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ملک لے لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت کے اثبات میں سارے جہان کے افعال کی نفی فرمائی ہے۔

اگر مجاہدہ وصولِ حق کا وسیلہ ہوتا تو شیطان مردود نہ ہوتا؟ اگر مجاہدے کا ترک مردود ہونے کی علت ہوتی تو حضرت آدم علیہ السلام ہرگز مقبول و مصفانہ ہوتے۔ لہٰذا حصولِ مقصد، قضاً و عنایت الٰہی کی سبقت ہے نہ کہ کثرت مجاہدہ۔ اور یہ بات بھی نہیں کہ جو سب سے زیادہ مجاہدہ کرے وہ سب سے زیادہ محفوظ ہو بلکہ جس پر حق تعالیٰ کی عنایت زیادہ ہے وہی حق تعالےٰ سے زیادہ قریب ہے۔

کوئی کلیسا میں رہ کر ہمیشہ طاعت میں مشغول رہتے ہوئے حق تعالیٰ سے دور رہے اور کوئی شراب خانہ میں رہ کر معصیت میں مبتلا ہو کر حق تعالےٰ سے قریب ہے۔ ہر لحاظ سے بچے کا ایمان سب سے زیادہ مشرف ہے کیونکہ وہ مکلف نہیں ہے اس کا حکم، حکمی ایمان ہے۔ یہی حال دیوانوں کا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب عنایت الٰہی میں زیادہ مشرف ہونے کے لئے مجاہدہ وسیلہ نہیں ہے تو جو بھی اس سے کم ہو اس کے لئے بھی وسیلہ کی محتاجی نہیں۔؟

حضور سیدنا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ تعبیر دو طرح پر خلافِ عمل ہے کیونکہ ایک قول ہے۔ ''من طلب وجد ''جس نے چاہا پا لیا۔ اور دوسرا قول ہے'' من

وجد طلب ''جس نے پایا وہ طالب ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ پانے کا سبب طلب ہوتی ہے اور طلب کا سبب پانا ہے۔ ایک مجاہدہ کرتا ہے تاکہ مشاہدہ کرے، دوسرا مشاہدہ کرتا ہے تاکہ مجاہدہ کرے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ مشاہدے میں مجاہدہ، طاعت میں توفیق الٰہی میسر آنے کی وجہ سے ہے جو خاص اس کا فضل اور عطا ہے۔ لہٰذا جب بغیر توفیق کے حصول کی طلب محال ہے تو حصولِ توفیق بھی بے طاعت محال ہے۔ جب بغیر مشاہدے کے مجاہدے کا وجود نہیں تو بے مجاہدہ کے مشاہدہ بھی ممکن نہیں۔ اس کے لئے جمالِ الٰہی کا نور درکار ہے تاکہ مجاہدے میں بندے کی رہنمائی کر سکے۔ پھر جب مجاہدے کی علت، نور جمال الٰہی ہے تو مجاہدے پر ہدایت پہلے ہوئی لیکن یہ جماعت، یعنی حضرت سہیل اور ان کے اتباع جو دلیل دیتے ہیں کہ جو مجاہدے کا اثبات نہیں کرتا وہ تمام انبیاء، کتبِ سماوی اور شرائع کا منکر ہے کیونکہ تکلیف کا مدار مجاہدے پر ہے۔ اس سے بہتر یہ تھا کہ وہ یہ کہتے کہ تکلیف کا مدار حق تعالیٰ کی ہدایت پر منحصر ہے۔ مجاہدہ تو اثباتِ حجت کے لئے ہے نہ کہ وصلِ الٰہی کی حقیقت کے لئے۔ چونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:۔

ولو اننا نزلنا الیھم الملئکۃ وکلمھم الموتیٰ و حشرنا علیھم کل شئی قبلا ماکانو الیومنوا الا ان یشاء اللّٰہ ولٰکن اکثرھم یجھلون۔	اگر ہم اُن کی طرف فرشتوں کو اتاریں اور مردوں کو ان سے کلام کرائیں اور تمام چیزوں کو ان کے روبرو اٹھائیں تب بھی وہ ہرگز ایمان نہ لائیں گے۔ مگر یہ کہ اللہ اگر چاہے۔ لیکن اکثر لوگ نادان ہیں۔

کیونکہ ایمان کی علت، ہماری مشیّت ہے نہ کہ دلائل کے دیکھنے اور ان کے مجاہدے پر موقوف ہے نیز ارشاد حق ہے کہ:۔

ان الذین کفروا سواء علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یومنون۔	بے شک جنھوں نے کفر کیا ان کے لئے برابر ہے کہ آپ انھیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان لانے والے نہیں۔

کیونکہ کافروں کے لئے اظہار حجت اور ورود دلائل اور روزِ قیامت سے ڈرانا یا نہ ڈرانا دونوں برابر ہیں۔ وہ اس وقت تک ایمان لانے والے نہیں جب تک ہمیں انھیں اہل ایمان ہونے کی توفیق نہ بخشیں۔ اس لئے کہ ان کے دلوں پر شقاوت و بدبختی کی مہر لگ چکی ہے۔ لہٰذا انبیاء علیھم السلام کی بعثت، کتابوں کا نزول اور احکامِ شریعت کا ورود سب حق تعالیٰ سے ملنے کے اسباب ہیں نہ کہ

علت۔ اس لئے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ قبولِ اسلام میں ایسے ہی مکلف تھے جس طرح ابوجہل تھے۔ لیکن حضرت صدیق تو عدل اور فضلِ الٰہی کو پہنچ گئے لیکن ابوجہل بے عدل اور بے فضل ہی پڑا رہا۔ لہٰذا ابوجہل کے اس میں پڑے رہنے کی علت، عین وصول اور توفیق الٰہی سے محرومی ہے نہ کہ طلبِ وصول یعنی جدوجہد وغیرہ۔ کیونکہ اگر طلب اور مطلوب دونوں برابر ہوتے تو طالب واجد ہوتا جب واجد ہوتا تو طالب نہ رہتا۔ اس لئے کہ واجد تو واصل ہوتا ہے اور طالب کے لئے آرام درست نہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:۔

من استوی یوماہ فھو مغبون	جس کے دو دن یکساں رہیں وہ آفت زدہ ہے۔

مطلب یہ کہ طالبانِ حق کے لئے ہر دن پہلے دن سے برتر و بہتر ہونا چاہئے۔ کیونکہ اس کا ہر دن ترقی پذیر ہے۔ یہ طالبوں کا درجہ ہے پھر حضور ﷺ نے فرمایا:۔

استقیموا ولن تحصنوا۔	استقامت پہ رہو اور ایک حال پر نہ رہو۔

گویا حضور اکرم ﷺ نے مجاہدے کو سبب قرار دیا اور حجت کے اثبات کے لئے سبب کو اثبات فرمایا اور تحقیق الٰہیت کے لئے سبب سے وصول کی نفی کر دی اور وہ جو یہ کہتے ہیں کہ گھوڑے کو سدھا کر محنت و مشقت کے ذریعہ دوسری صفت میں بدلا جا سکتا ہے تو اسے یوں سمجھنا چاہئے کہ گھوڑے میں ایک خاص صفت پوشیدہ ہوتی ہے۔ جس کے اظہار کا سبب، محنت و مشقت ہے جب تک اس پر محنت و مشقت نہ کی جائے اس صفت کا اظہار نہ ہوگا اور چونکہ گدھے میں وہ صفت سرے سے ہے ہی نہیں اس لئے وہ گھوڑے کی مانند ہوشیار نہیں ہو سکتا۔ اور نہ گھوڑے کو محنت و مشقت کے ذریعہ گدھے کی مانند بنایا جا سکتا ہے۔ چونکہ وہ صفت سرے سے ہے ہی نہیں اس لئے کہ یہ قلبِ عین یعنی ذات کی تبدیلی ہے۔ لہٰذا جب کسی چیز کی عین و ذات نہیں بدل سکتی تو حق تعالیٰ کے لئے اس کا اثبات کرنا محال ہے حضرت سہیل تستری رحمتہ اللہ علیہ پر مجاہدے کا دور تھا کیونکہ وہ اس سے آزاد تھے اور ان کی ذات میں اس کا بیان منقطع تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے کہ جنھوں نے بغیر درستگیِ معاملہ، صرف بیان بازی کو اپنا مذہب بنا لیا ہو۔ یہ محال ہے کہ تمام اعمال و معاملات کی وضاحت صرف لفظ و بیان سے کی جائے۔ خلاصہ یہ

کہ باتفاق، اہل طریقت میں ریاضت ومجاہدہ موجود ہے۔لیکن مجاہدہ کی حالت میں مجاہدے کی دید آفت ہے، لہٰذا جو حضرات مجاہدے کی نفی کرتے ہیں ان کی مراد، عین مجاہدے کی نفی نہیں بلکہ ان کی مراد، عدمِ رویتِ مجاہدہ اور اپنے اُن افعال میں ہے جو بارگاہ قدس میں ظہور پذیر ہورہے ہوں اُن پر عجب وغرور نہ کرنا ہے؟ اس لئے کہ مجاہدہ بندے کا فعل ہے اور مشاہدہ من جانب اللہ ہے۔اور جب تک عطائے حق نہ ہو، بندے کے افعال کی کوئی قدر و قیمت نہیں؟ ایک زمانہ کے بعد وہ اپنے دل میں خود پالے گا کہ اس قدر دل کی آراستگی کی کوشش کی مگر فضلِ الٰہی کو نہ دیکھا اور کیوں اپنے افعال پر باتیں بنائیں۔اس کے بعد معلوم ہونا چاہئے کہ حق تعالیٰ کے دوستوں کا مجاہدہ، ان کے اپنے اختیار کے بغیر، محض حق تعالیٰ کے فضل، اس کے غلبہ اور اسکے سوز وگداز سے ہوتا ہے۔اور سوز وگداز کا ہونا سراسر حق تعالیٰ کی مہربانی ہے۔اور جاہلوں کا مجاہدہ خود ان کا اپنا فعل ہوتا ہے، جو پریشان کن ہے۔پریشان ہونا اور دل کی پراگندگی، آفت کی پراگندگی سے ہوتی ہے لہٰذا تم سے جہاں تک ہوسکے اپنے فعل کا اظہار و بیان نہ کرو اور کسی حال میں نفس کی پیروی نہ کرو کیونکہ تمہاری ہستی کا وجود تمہارے لئے حجاب ہے۔اگر تم کسی ایک فعل سے محجوب ہوئے تو دوسرا فعل اپنا سر اٹھائے گا۔چونکہ تم سراپا حجاب ہو لہٰذا جب تک تم بالکل فانی نہ ہوگے اس وقت تک تم بقا کے لائق نہیں بنوگے۔

لان النفس کلب باغ وجلد الکلب	نفس باغی کتا ہے اور کتے کی کھال دباغنے ہی
لا یطہر الا بالدباغ	سے پاک ہوتی ہے۔

درستگی معاملہ کی مثال

حضرت حسین بن منصور رحمتہ اللہ علیہ کوفہ میں محمد بن حسین علوی کے گھر مقیم تھے۔حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ جب کوفہ تشریف لائے تو انھوں نے ان سے ملاقات کی اور پوچھا کہ اے ابراہیم! طریقت میں آپ کو چالیس سال گزر چکے ہیں اس کے معانی میں آپ نے کیا حاصل کیا؟ انھوں نے فرمایا مجھے توکل کا طریقہ کامل طور سے حاصل ہوا ہے۔حضرت حسین بن منصور نے کہا:۔

ضیعت عمرک فی عمران باطنک فاین الفنا فی التوحید	آپ نے اپنے باطن کی بستی میں اتنی عمر ضائع کر دی پھر بھی آپ کو توحید میں فنا حاصل نہ ہوا۔

مطلب یہ ہے کہ توکل کے معنی تو یہ ہیں کہ اپنے معاملات کو حق تعالیٰ کے سپرد کر کے اپنے باطن کو اعتماد کے ساتھ درست رکھے۔اور جب کوئی ساری عمر، باطنی معاملات کی درستگی ہی میں صرف کر

دے تو ظاہری معاملات کی درستگی کے لئے اسے ایک اور عمر درکار ہوگی۔ یہ دونوں عمریں ضائع ہونے کے بعد بھی اس پر حق کا کوئی اثر نہ ہوگا۔

نفس کی سرکشی کی مثال

حضرت شیخ ابو علی سیاہ مروزی رحمتہ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نفس کو ایسی شکل میں دیکھا جو میری ہم صورت تھا کسی نے ان کے بال پکڑ رکھے تھے اس نے اسے میرے حوالہ کر دیا میں نے اسے ایک درخت سے باندھ دیا اس کے بعد میں نے اسے ہلاک کر دینے کا ارادہ کیا۔ اس نے مجھ سے کہا اے ابو علی! زحمت نہ اٹھاؤ میں خدا کا لشکری ہوں تم مجھے فنا نہیں کر سکتے۔

نفس کی الٹی خصلت کی مثال

حضرت محمد بن علیان نسوی جو حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کے اکابر اصحاب میں سے تھے بیان کرتے ہیں کہ ابتدائے حال میں جب میں نفس کی آفتوں پر بینا ہوا اور اس کی خفیہ پناہ گاہوں سے واقف ہوا اسی وقت سے میرے دل میں نفس کی طرف سے کینہ ہو گیا تھا۔ ایک دن لومڑی کے بچے کی مانند کوئی چیز میرے حلق سے باہر نکلی۔ حق تعالیٰ نے مجھے اس سے واقف کرایا اور میں جان گیا کہ وہ نفس ہے میں اسے پاؤں سے روندنے لگا اور ٹھوکریں مارنے لگا۔ مگر وہ بڑھتا ہی رہا۔ اس وقت میں نے کہا اے نفس! ہر چیز مارنے اور زخمی کرنے سے ہلاک ہو جاتی ہے تو اس کے برعکس بڑھتا ہی جاتا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ نفس نے کہا میری تخلیق الٹی ہے۔ اوروں کو جو چیزیں تکلیف پہنچاتی ہیں وہ مجھے آرام و راحت پہنچاتی ہیں اور جو چیزیں دوسروں کا آرام و راحت پہنچاتی ہیں وہ مجھے تکلیف دیتی ہیں۔

کتے کی شکل میں نفس کا ظہور

حضرت شیخ ابو العباس شقانی رحمتہ اللہ علیہ جو امام وقت تھے فرماتے ہیں کہ ایک دن میں گھر آیا تو زرد رنگ کے ایک کتے کو اپنے بستر پر سوتا ہوا پایا۔ میں نے خیال کیا کہ شاید محلّہ کا کتا گھس آیا ہے اسے باہر نکالنے کا ارادہ کیا مگر وہ میرے دامن میں گھس کر غائب ہو گیا۔

مختلف صورتوں میں نفس کا ظہور

حضرت شیخ ابو القاسم گرگانی جو آج قطب زمانہ اور طریقت کے دار المہام ہیں۔ ابقاہ اللہ تعالیٰ۔ وہ اپنے ابتدائے حال کی ایک نشانی بیان کرتے ہیں کہ میں نے نفس کو سانپ کی صورت میں دیکھا ہے اور ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نفس کو چوہے کی شکل میں دیکھا ہے تو میں نے اس سے پوچھا تو کون ہے؟ اس نے کہا میں غافلوں کو ہلاکت میں ڈالنے والا، ان کو شرارت و برائی کی طرف بلانے والا اور دوستوں کی نجات ہوں۔

چونکہ میرا وجود سراپا آفت ہے تو وہ اپنی پاکی وطہارت پر نازاں ہوکر اپنے افعال پر تکبر کرنے لگتے ہیں وجہ یہ کہ جب وہ دل کی پاکیزگی، سیرت کی صفائی، نورِ ولایت اور طاعت پر اپنی استقامت کو دیکھتے ہیں تو ہوا وتکبر ان میں پیدا ہو جاتا ہے پھر جب وہ اپنے پہلو میں مجھے دیکھتے ہیں تو وہ ان تمام عیبوں سے پاک ہو جاتے ہیں۔

یہ تمام امثال وحکایات اس بات کی دلیل ہیں کہ نفس مستقل ذات ہے نہ کہ صفت، البتہ نفس کی کچھ صفات بھی ہیں جن کو ہم ظاہر طور پر دیکھتے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:۔

اعدی عدوك نفسك التی بین جنبیك۔	تمہارا سب سے بڑا دشمن تمہارا وہ نفس ہے جو دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے۔

لہٰذا جسے نفس کی معرفت ہو جاتی ہے وہ جان لیتا ہے کہ اسے ریاضت ومجاہدے کے ذریعہ ہی قابو میں لایا جاسکتا ہے۔ چونکہ نفس کی اصل وماہیت اچھی نہیں ہے۔ اگر طالب کو اس کی صحیح طور پر پہچان ہو جائے تو اس کی موجودگی میں بھی اسے کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:۔

لان النفس کلب بناح وامساك	اس لئے کہ نفس آزاد کتا ہے سکھانے کے
الکلب بعد الریاضة مباح۔	بعد کتے کو باندھنا مباح ہے۔

لہٰذا مجاہدہ، نفس کی صفات کو فنا کر دیتا ہے لیکن اس کی ذات کو ناپید نہیں کرتا۔ اس بارے میں مشائخ کے اقوال بکثرت ہیں بخوف طوالت، اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ اب ہوا کی حقیقت اور ترکِ شہوت کی بحث شروع کرتا ہوں۔ وباللہ التوفیق۔

ہوا کی حقیقت اور ترکِ شہوت کی بحث

اے عزیز! اللہ تعالیٰ تمہیں عزت دے، جاننا چاہئے کہ ایک گروہ کے نزدیک اصناف نفس میں سے ایک وصف ہوا یعنی خواہش ہے۔ اور ایک گروہ کے نزدیک طبعی ارادہ خواہش کا متصرف ومدبّر ہے اس کا نام ہوا ہے۔ جس طرح روح کے لئے عقل ہے اور ہر وہ روح جس کی اپنی افزائش میں عقلی قوت نہ ہو ناقص ہوتی ہے اسی طرح ہر وہ نفس جس کے لئے ہوا کی قوت نہ ہو ناقص ہوتی ہے لہٰذا روح کا ناقص ہونا قربت کا نقص ہے اور نفس کا ناقص ہونا عین قربت ہے۔

بندہ کے لئے ہمیشہ ۲ دو دعوتیں ہوتی ہیں ایک عقل کی طرف سے دوسری ہوا کی طرف سے۔ جو عقل کی دعوت کو قبول کر کے اس کا مطیع بن گیا وہ صاحبِ ایمان ہو گیا۔ اور جو ہوا کی دعوت کو قبول کر کے اس کا فرمانبردار بن گیا وہ ضلالت و کفر میں پڑ گیا۔ لہٰذا ہوا، واصلوں کے لئے حجاب اور گمراہ کرنے والی چیز ہے۔ غافلوں کے لئے جائے قیام ہے اور طالبوں کے لئے محلِ اعراض ہے۔ بندے کو اس کے خلاف عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اسے اس کے ارتکاب سے روکا گیا ہے۔

لان من رکبھا ھلك ومن خالفھا ملك۔	جس نے اس کی سواری کی یعنی فرمانبرداری کی وہ ہلاک ہوا اور جس نے اس کے خلاف کیا وہ مالک ہوا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

واما من خاف مقام ربہٖ ونھی النفس عن الھویٰ فان الجنۃ ھی الماویٰ۔	جو اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے سے ڈرتے اور نفسانی خواہشوں سے بچتے ہیں یقیناً انہی کے لئے جنت میں ٹھکانا ہے۔

حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ:۔

اخوف ما اخاف علٰی امتی اتباع الھویٰ و طول الامل۔	میری امت پر سب سے زیادہ خوفناک ہوا کی پیروی اور امیدوں کی درازی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما آیہ کریمہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ:۔

افرأیت من اتخذ الٰھہٗ ھواہ ای الھویٰ الٰھاً معبوداً۔	کیا تم نے اسے دیکھا جس نے اپنی ہوا کو اپنا معبود بنا لیا ہے یعنی خواہش کو اپنا خدا بنا لیا ہے؟

وہ شخص قابلِ افسوس ہے جس نے حق تعالیٰ کے سوا اپنی خواہش کو اپنا خدا ٹھہرا کر اپنی طاقتیں رات دن اس کی اطاعت و فرمانبرداری میں صرف کر دی ہیں۔

خواہشات نفسانیہ کی قسمیں تمام نفسانی خواہشیں ۲ دو قسم کی ہوتی ہیں ایک لذت اور شہوت کی دوسرے لوگوں میں عزت و منزلت کی۔ جو شخص کسی لذت کا غلام ہے وہ شراب خانہ میں ہے لوگ اس کے فتنہ سے محفوظ ہیں لیکن جو شہوت اور لوگوں میں عزت و منزلت کا خواہش مند ہے وہ حرص و طمع اور خواہشات کے چکروں میں پھنسا ہوا ہے۔ وہ لوگوں کے لئے فتنہ ہے۔ خود تو راہِ حق سے

برگشتہ ہے ہی۔ دوسروں کو بھی اس گمراہی میں پھنساتا ہے۔ نعوذ باللّٰہ من متابعۃ الھویٰ۔

جس کی حرکتیں خواہش نفس کی پیرو ہیں اور وہ ان کا دلدادہ ہے وہ حق تعالےٰ سے دور ہے اگرچہ وہ تمہارے ساتھ مسجد میں شریکِ جماعت ہی کیوں نہ ہو؟۔ اور جس کی حرکتیں خواہشات سے پاک ہیں اور وہ اس کی پیروی سے نفرت کرتا ہے وہ حق تعالیٰ کے نزدیک ہے اگرچہ کسی دور ہی میں کیوں نہ ہو؟

ایک راہب کی نفس کشی

حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے سُنا کہ روم میں راہب ہے جو ستر سال سے کنیسہ میں زہد ورہبانیت میں مشغول ہے میں نے تعجب سے کہا کہ رہبانیت کی شرط تو چالیس سال ہوتی ہے یہ آدم زاد کس مذہب پر ستر سال سے کنیسہ میں بیٹھا ہوا ہے۔ چنانچہ میں اس سے ملنے گیا۔ اس نے کھڑی کھول کر مجھ سے بات چیت کی اور کہا کہ اے ابراہیم! میں جانتا ہوں کہ تم کس لئے آئے ہو میں یہاں رہبانیت کی غرض سے ستر سال سے نہیں بیٹھا ہوں بلکہ میرے پاس ایک کتا ہے جو خواہش میں سرکش ہے۔ میں اس کتے کی رکھوالی کر رہا ہوں تا کہ لوگ اس کے شر سے محفوظ رہیں ورنہ میں یہاں نہ ہوتا۔ میں نے جب راہب کی یہ بات سنی تو خدا سے مناجات کی کہ اے خدا تو بڑا قادر ہے، کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے شخص کو بھی صحیح راستہ دکھاتا ہے۔ پھر راہب نے مجھ سے کہا اے ابراہیم! تم کب تک لوگوں کی طلب میں رہو گے جاؤ پہلے اپنے آپ کو طلب کرو جب تم اپنے آپ کو پا جاؤ تو اس کی نگہبانی کرو کیونکہ ہر روز یہ ہوا یعنی نفسانی خواہش تین سو ساٹھ قسم کی الوہیت کا لباس پہن کر بندے کو گمراہی کی طرف بلاتی ہے۔

غرضکہ شیطان کا بندے کے دل اور باطن پر اس وقت تک قبضہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ معصیت ونافرمانی کا جذبہ اور خواہش اس کے اندر نہ ابھر آئے۔ جس وقت بندے کے اندر خواہش نے سر اٹھایا اسی وقت شیطان کا اس پر قبضہ ہو جاتا ہے وہ دل میں آرام کرتا ہے اور اس کے باطن میں جم کر بیٹھ جاتا ہے اس حالت کا نام "وسواس" ہے۔ اس کی ابتداء ہوا و خواہش سے ہوتی ہے "والبادی اظلم" پہل کرنے والا زیادہ ظالم ہوتا ہے۔ یہ مطلب اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ماخوذ ہے جو اللہ نے ابلیس سے فرمایا تھا اور اس نے کہا تھا میں تمام آدمیوں کو راہِ حق سے ورغلاؤں گا حق تعالیٰ نے فرمایا:۔

اے ابلیس میرے خاص بندوں پر تیرا کوئی قبضہ واختیار نہیں ہے۔	ان عبادی لیس لك علیھم سلطان۔

درحقیقت شیطان ہی بندے کا نفس وہوا ہے۔ اسی وجہ سے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ

کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس پر اس کا شیطان غالب نہ آتا ہو بجز حضرت عمر فاروقؓ کے کہ وہ اپنے شیطان پر غالب آ گئے ہیں۔	وما من احد الا وقد غلبه شیطانه الا عمر فانه غلب شیطانه۔

اس حدیث میں شیطان سے مراد بندے کی نفسانی خواہشیں ہیں۔ لہٰذا آدمی کے سرشت میں ہی ہوا کہ ترکیب ہے۔ جیسا کہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے

ہوا اور شہوت سے ابن آدم کا خمیر مرکب ہے۔	الھویٰ والشھوۃ معجونة بطینة ابن ادم۔

ترک ہوا بندے کو امیر کرتا ہے اور اس کا ارتکاب امیر کو اسیر بناتا ہے۔ چنانچہ زلیخا نے ہوا یعنی خواہش کا ارتکاب کیا وہ امیر تھی اسیر ہوگئی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے ترک ہوا کیا تو وہ اسیر تھے پھر امیر بن گئے۔

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا "ما الوصل قال ترک ارتکاب الھویٰ" وصل کیا ہے فرمایا خواہش کے ارتکاب کو ترک کرنا۔

جو شخص چاہتا ہے کہ حق تعالیٰ کے وصال سے مشرف ہو اس سے کہو کہ جسم کو خواہش کے خلاف کرے کیونکہ بندہ کو کوئی عبادت حق سے اتنا قریب نہیں کرتی جتنی ہوا کی مخالفت۔ ہوا کی مخالفت کرنے والا ہی زیادہ بزرگ ہے کیونکہ آدمی کے لئے ناخن سے پہاڑ کھودنا اس سے زیادہ آسان ہے کہ وہ اپنی خواہش کے خلاف کرے۔

خواہش پر قدم رکھ کر اڑنا

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کو دیکھا جو فضا میں اُڑ رہا تھا میں نے اس سے پوچھا کہ تمہیں یہ کمال کیسے حاصل ہوا؟ اس نے کہا میں ہوائے نفس پر قدم رکھ کر ہوا میں اُڑ جاتا ہوں۔

حضرت محمد بن فضل بلخی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس شخص پر تعجب ہوتا ہے جو نفسانی خواہش کو لے کر خانہ کعبہ جاتا ہے اور اس کی زیارت کرتا ہے۔ وہ ہوائے نفس پر قدم کیوں نہیں رکھتا تا کہ وہ حق تعالیٰ تک پہنچے اور اس کا دیدار پائے۔

نفسانی شہوت نفس کی سب سے بڑھ کر ظاہر صفت شہوت ہے اور شہوت کے معنی آدمی کے تمام اعضا میں انتشار پیدا ہونا ہے بندے کو اُن کے تحفظ کی تکلیف دی گئی ہے قیامت کے دن ہر ایک عضو کے افعال کی بابت سوال ہوگا۔ چنانچہ آنکھ کی شہوت، دیکھنا، کان کی شہوت، سُننا، ناک کی شہوت، سونگھنا، زبان کی شہوت، بولنا، تالو کی شہوت چکھنا، جسم کی شہوت چھونا، اور سینہ کی شہوت سوچنا ہے۔ لہٰذا طالب پر لازم ہے کہ وہ اپنے وجود کا حاکم ونگہبان بنے اور دن ورات اس کی حفاظت کرے یہاں تک کہ خواہش کے ہر داعیہ کو جو اس میں ظاہر ہوا اپنے سے جدا کردے۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے کہ وہ اسے وہ صفت عطا فرمائے تاکہ اس کے باطن سے ہر خواہش دور ہوجائے۔ کیونکہ جو شہوت کے بھنور میں پھنسا رہتا ہے وہ ہر لحاظ سے محجوب رہتا ہے۔ اگر بندہ اپنی طاقت سے اسے دور کرنا چاہے تو یہ بندے کے لئے سخت دشوار ہوتا ہے اور اُس کی جنس کا ورود پے در پے ہوتا ہے۔ اس کا چارہ کار طریق تسلیم ہے تاکہ مراد حاصل ہو۔

مقام عبرت حضرت ابوعلی سیاح مروزی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ایک دن حمام میں گیا اور سنت کے مطابق استرہ استعمال کر رہا تھا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ اے ابوعلی اس عضو کو جو تمام شہوتوں کی جڑ ہے اور اس سے تجھے کتنی آفتوں میں مبتلا ہونا پڑتا ہے، اپنے سے جدا کر کے کیوں نہیں پھینک دیتا تاکہ تو شہوت کی ہر آفت سے محفوظ رہے۔ اسی لمحہ ایک آواز محسوس ہوئی کہ اے ابوعلی! تم ہماری ملک میں تصرف کر رہے ہو ہمارے بنائے ہوئے کسی عضو سے کوئی دوسرا عضو زیادہ بہتر نہیں ہے۔ مجھے اپنی عزت کی قسم اگر تم نے اسے کاٹ کر پھینک دیا تو میں تمہارے ہر بال کو ننو گنا شہوت دے کر اس کا قائم مقام بنادوں گا۔ اسی مفہوم میں یہ شعر ہے۔

تبتغی الاحسان دع احسانك

اترك بخشي الله ريحانك

تو احسان کا متلاشی ہے۔ اپنے احسان کو چھوڑ......

خوفِ خدا سے سب کو چھوڑ دے اسی میں تیری راحت ہے

بندے کے لئے اس کے جسم کے کسی حصہ کی بنا پر فساد نہیں ہے بلکہ تبدیلِ صفت میں خرابی وفساد ہے۔ اور توفیق الٰہی اور تسلیم اوامر ونواہی میں اپنے تصرف اختیار اور قوت کے ذریعہ تغیر وتبدل سے خرابی پیدا ہوتی ہے۔

درحقیقت جب تسلیم کا مرتبہ حاصل ہوجاتا ہے تو اس میں عصمت وحفاظت آجاتی ہے

اور بندہ خدا کی حفاظت میں رہ کر مجاہدے کے مقابلہ میں زیادہ محفوظ اور فنائے آفت میں نزدیک تر ہو جاتا ہے۔

لان نفی الذباب بالمکنسۃ ایسر من نفیہ بالمذبۃ۔	اس لئے کہ مکھی کو جھاڑو سے دور کرنا آسان ہے بمقابلہ لاٹھی کے۔

لہٰذا خدا کی حفاظت، تمام آفتوں سے بچانے والی ہے اور تمام علتوں کو دور کرنے والی ہے اور کسی صفت میں بھی بندہ اس کا شریک نہیں ہے۔ جیسا کہ اس کا ارشاد ہے کہ اس کے ملک میں کوئی تصرف کر ہی نہیں سکتا۔ جب تک کہ عصمتِ الٰہی مقدر نہ ہو جائے بندہ اپنی قوتوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اگر توفیق الٰہی میسر نہ ہو تو اس کی تمام کوششیں رائیگاں اور بے فائدہ ہو جاتی ہیں۔ بندے کی تمام کوششیں دو ہی صورتوں کے لئے ہو سکتی ہیں یا تو اس لئے کہ کوشش کے ذریعہ اپنی جانب سے تقدیر الٰہی کو بدل دے یا تقدیر کے خلاف اپنے لئے کوئی اور چیز بنائے حالانکہ یہ دونوں صورتیں ممکن نہیں ہیں۔ نہ تو کوشش سے تقدیر کو بدلا جا سکتا ہے اور نہ بغیر تقدیر کے کوئی کام ہو سکتا ہے؟

اہل تقدیر کی مثال حضرت شبلی علیہ الرحمتہ جب بیمار ہوئے تو ایک طبیب ان کے پاس آیا اور اس نے مشورہ دیا کہ پرہیز کیا جائے۔ آپ نے پوچھا کس چیز سے پرہیز کیا کروں کیا اس سے جو میری روزی ہے یا اس چیز سے جو میری روزی نہیں ہے۔ اگر پرہیز روزی سے متعلق ہے تو یہ ممکن ہی نہیں۔ اگر اس کے سوا کچھ اور ہے تو وہ اللہ تعالیٰ مجھے دیتا ہی نہیں۔

ان المشاھدۃ لا تجاھد	جسے مشاہدہ حاصل ہو جاتا ہے وہ مجاہدہ نہیں کرتا۔

اس مسئلہ کو کسی اور جگہ مزید بیان کروں گا۔

۷۔ فرقہ حکمیہ

فرقہ حکمیہ کے پیشوا حضرت ابو عبداللہ محمد بن علی حکیم ترمذی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ جو اپنے زمانہ کے امامِ وقت، تمام ظاہری و باطنی علوم کے ماہر، صاحبِ تصانیف کثیرہ ہیں۔ ان کے مذہب کی خصوصیت اثباتِ ولایت اور اس کے قواعد و درجات کا بیان ہے۔ آپ حقیقت کے معانی اور اولیاء کے درجات اس ترتیب اور ایسے انداز سے واضح فرماتے تھے گویا وہ ایک بحرِ بے پایاں تھے جس میں بکثرت عجیب و غریب چیزیں تھیں۔ ان کے مذہب کی ابتدائی وضاحت یہ ہے کہ وہ ہر

شخص کو یہ بتانا اور سکھانا چاہتے تھے کہ اولیاء اللہ کی شان یہ ہے کہ حق تعالیٰ ان کو دنیا میں برگزیدہ کر کے ان کی ہمتوں کو متعلقات سے جدا کر کے اور نفس و ہوا کے ہر داعیہ سے منزہ بنا کر کسی نہ کسی درجہ پر فائز فرماتا ہے اور جو معانی کا دروازہ ان پر کھول دیا گیا ہے اس کا کلام طویل ہے۔ چند اصول و قواعد کے لئے بھی شرح درکار ہے۔ اب میں بر سبیل اختصار اس تحقیق کو ظاہر کرتا ہوں اور ان کے کلام کے اسباب و اوصاف بیان کرتا ہوں۔

اثباتِ ولایت کی بحث

واضح رہنا چاہئے کہ تصوف و معرفت کے طریقہ کے اصول و قواعد، اور تمام ولایتوں کی پہچان اور اس بات کے سلسلہ میں اتنا جان لینا کافی ہے کہ تمام مشائخ کا اس پر اتفاق ہے۔ البتہ ہر ایک نے ولایت کا اثبات جداگانہ انداز میں کیا ہے۔ چنانچہ حکیم ترمذی حقیقت و طریقت کے معانی کے بیان و اطلاق میں خاص کمال رکھتے تھے۔

ولایت کی تحقیق

ولایت، واؤ کے زبر سے اس کے لغوی معنی ''تصرف کرنا'' ہے اور وِلایت، واؤ کے زیر سے اس کے معنی امارت و حکومت کے ہیں۔ دونوں کا مصدر بروزنِ فعلی ولیۃ ہے۔ نیز ولایت کے معنی ربوبیت کے بھی ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''ھنالک الولایۃ للّٰہ الحق'' اس جگہ ولایت یعنی ربوبیت اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے۔ کیونکہ کفار اس سے التجا کرتے ہیں اور اپنے خداؤں سے اظہارِ بیزاری کرتے ہیں۔ نیز ولایت کے ایک معنی محبت کے بھی ہیں۔

لفظ وَلی کی تحقیق

لفظ وَلی فعیل کے وزن پر مفعول کے معنی میں بھی ممکن ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''وھو یتولی الصالحین'' اللہ تعالیٰ نیکوں کا کارساز ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو ان کے افعال و اوصاف کے ساتھ نہیں چھوڑتا اور اپنی حفاظت و پناہ کی چادر میں چھپا لیتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے لفظ وَلی اسم فاعل کے معنی میں مبالغہ کے طور پر آیا ہو؟ کیونکہ بندہ طاعت میں خوب محبت کا اظہار کرتا ہے اور اس کے حقوق کی ہمیشہ نگہبانی کرتا ہے اور اس کے غیر سے منہ موڑ لیتا ہے۔ ایسا شخص مُرید کہلائے گا اور اللہ تعالیٰ مراد۔ یہ تمام معانی، حق کا بندہ کے ساتھ ہونا یا بندہ کا حق کے ساتھ ہونا دونوں صورتوں میں جائز ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کا مددگار ہو کیونکہ اس نے ان کی مدد کا وعدہ فرمایا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے

اپنے ان دوستوں سے جو نبی کریم ﷺ کے صحابہ ہیں مدد کا وعدہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:۔

الا ان نصر اللہ قریب۔	آ گاہ رہو اللہ کی نصرت قریب ہے۔

نیز ارشاد ہے:۔

وان الکافرین لا مولٰی لھم ای لا ناصر لھم۔	یقیناً کافروں کا کوئی مولیٰ یعنی مددگار نہیں ہے۔

جب کافروں کا کوئی مددگار نہیں ہے تو لامحالہ مسلمانوں کا کوئی مددگار ضرور ہونا چاہئے جو ان کی مدد کرے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ جو آیات و دلائل کے لانے میں ان کی عقلوں کے اور معانی کے بیان کرنے میں اور ان کے اسرار منکشف کرنے کے لئے ان کے دلوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔ اور تمام مسلمانوں کو نفس و شیطان کی مخالفت اور احکامِ الٰہیہ کی متابعت کرنے میں مدد دیتا ہے۔

دوسرے یہ بھی جائز ہے کہ محبت وخلت میں انھیں مخصوص فرما کر دشمنی کے مقامات سے محفوظ رکھے جیسا کہ ارشاد ہے "یحبھم و یحبونہ" وہ خدا سے محبت کرتے ہیں اور خدا انھیں محبوب رکھتا ہے۔ تا کہ ان کی دوستی خدا کے لئے ہو اور انھیں کو دوست رکھے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ کسی کو ولایت عطا فرما کر طاعت پر قائم رکھے اور اپنی حفاظت و پناہ میں رکھے تا کہ وہ اطاعتِ الٰہی پر قائم رہیں اور اس کی مخالفت سے اجتناب کریں یہاں تک کہ ان کی حسنِ طاعت کو دیکھ کر شیطان ذلیل ہو کر بھاگے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ کسی کو ولایت اس لئے عطا فرمائے کہ اس کی عقدہ کشائی سے ملک میں عقدہ کشائی ہو۔ اور تمام بندوبست اور امور تکوینیہ ان کے قبضہ میں دے کر ان کی دعاؤں کو مستجاب اور ان کے انفاس کو مقبول بنائے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:۔

رب اشعث اغبرذی طمرین لا یعبأ بہ لواقسم علی اللہ لابرہ۔	بکثرت بندگانِ خدا پریشان حال، غبار آلود بال بکھرے، کپڑے پھٹے، ایسے ہیں جن کی لوگ پرواہ نہیں کرتے اگر وہ کسی معاملہ میں اللہ کی قسم کھائیں تو اللہ ان کی قسموں کو ضرور پورا کرتا ہے۔

فاروق اعظم کی حقیقی امارت کی مثال

مشہور واقعہ ہے کہ سیدنا فاروق اعظم عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں حسبِ قدیم دریائے نیل کا پانی خشک ہو گیا۔ چونکہ زمانہ جاہلیت میں دستور تھا کہ ہر سال ایک جوان خوبصورت لڑکی زیورات سے آراستہ کر کے دریا کو بھینٹ

چڑھائی جاتی تھی تب جاکر دریا جاری ہوتا تھا۔ (مصر کے گورنر نے یہ واقعہ لکھ کر آپ کی خدمت میں بھیجا آپ نے گورنر کے حکم کی توثیق کرتے ہوئے) ایک کاغذ کے پرچہ پر لکھ کر ارسال فرمایا (اور گورنر کو حکم دیا کہ یہ رقعہ دریائے نیل میں پڑھ کر ڈال دیں۔ اس رقعہ پر تحریر تھا کہ) اے پانی! اگر تو اپنی مرضی سے رکا ہے تو جاری نہ ہو اور اگر خدا کے حکم سے رُکا ہے تو عمر کہتا ہے کہ جاری ہو جا۔ جب رقعہ پڑھ کر پانی میں ڈالا گیا تو پانی جوش مارتا ہوا جاری ہو گیا (اس کے بعد آج تک اس کا پانی خشک نہیں ہوا) فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی یہ امارت حقیقی تھی۔

میری مراد، ولایت اور اس کے اثبات سے یہی حقیقی امارت ہے۔ اب تم سمجھ لو کہ وَلی کا نام اسی کے لئے جائز ہے جس میں مذکورہ معانی موجود ہوں جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے اور وہ صاحبِ حال ہو نہ کہ صاحبِ قال اور مالکِ بحث وجدال۔ اسی لئے گزشتہ مشائخ نے اس سلسلہ میں بکثرت کتابیں تصنیف فرمائی ہیں جو نایاب ہوتی جارہی ہیں۔ اب صاحبِ مذہب حضرت حکیم ترمذی رحمتہ اللہ علیہ کی مراد اور اس کی خوبیاں بیان کرتا ہوں کیونکہ مجھ کو ان سے حد درجہ حسنِ عقیدت ہے خدا کرے کہ ہر طالبِ راہ حق اور اس کتاب کے پڑھنے والے کو فائدہ پہنچے اور سعادت حاصل کرے۔

نام ولی کے اطلاقات

واضح رہنا چاہیئے کہ لفظِ ولی لوگوں میں بہت مستعمل ہے اور کتاب وسنت اس پر ناطق وشاہد ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

الا ان اولیاء اللّٰہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔	خبردار! اللہ کے اولیاء وہ ہیں جن پر نہ خوف ہوتا ہے اور نہ حزن وملال۔

اور ارشاد ہے:۔

نحن اولیاء کم فی الحیوۃ الدنیا و فی الاٰخرہ۔	ہم تمہاری دنیاوی اور اخروی زندگانی میں مددگار ہیں۔

اور ارشاد ہے:۔

اللّٰہ ولی الذین امنوا۔	ایمان داروں کا مددگار اللہ ہی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

ان من عباد اللّٰہ لعباد یغبطھم الانبیاء والشہداء۔

بلاشبہ بندگان خدا میں سے کچھ بندے ایسے ہیں جن پر انبیاء وشہداء غبطہ (رشک) کرتے ہیں۔

صحابہ نے عرض کیا ''یا رسول اللّٰہ صفھم لنا لعلنا نحبھم ''یارسول اللہ! ہمیں ان کی پہچان بتایئے تاکہ ہم ان سے محبت قائم رکھیں۔

آپ نے فرمایا:۔

قوم تحابوا بروح اللّٰہ من غیر اموال و اکتساب وجوھھم نور علی منابر من نور لا یخافون اذا خاف الناس ولا یحزنون اذا حزن	یہ وہ لوگ ہیں جو مال و محنت کے بغیر صرف ذات الٰہی سے محبت رکھتے ہیں۔ ان کے چہرے نور کے مناروں پر روشن وتاباں ہیں۔ لوگوں کے خوف کے وقت یہ بے خوف اور
الناس ثم تلاالا ان اولیاء اللّٰہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔	ان کے غموں کے وقت یہ بے غم ہیں پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی کہ بے شک
	اللہ کے اولیاء وہ ہیں جن پر نہ خوف ہے اور نہ حزن وملال۔

ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

من اٰذیٰ ولیاً فقد استحل محاربتی۔	جس نے میرے ولی کو ایذا دی اس سے میرا لڑنا حلال ہوگیا۔

کتاب وسنت کے ان دلائل سے مراد یہ ہے کہ اولیاء اللہ کی شان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی دوستی وولایت سے مخصوص کر کے اپنے ملک کا والی بنایا ہے اور ان کے احوال کو برگزیدہ کر کے اپنے فعل واظہار کا مرکز بنایا ہے اور متعدد کرامتوں سے سرفراز کر کے ان کی طبع کی آفتوں اور نفس وہوا کی پیروی سے پاک ومنزہ فرمایا ہے تاکہ ان کے تمام ارادے خدا کے لئے ہی ہوں اور ان کی محبت اسی سے ہو۔ زمانہ ماضی میں ہم سے پہلے بھی اولیاء اللہ گزرے ہیں اور آج بھی موجود ہیں اور قیامت تک ہوتے رہیں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو تمام گذشتہ امتوں پر شرافت وبزرگی عطا فرمائی ہے اور ضمانت دی ہے کہ میں شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی ہمیشہ حفاظت فرماؤں گا۔ اس پر دلائل نقلیہ اور براہین عقلیہ علماء کے درمیان آج بھی موجود ہیں اور غیبی دلائل بھی۔ کہ اولیاء اللہ اور خاصانِ خدا کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اس مسئلہ میں ہمارا اختلاف دو گروہ سے ہے ایک معتزلہ سے دوسرے حشویوں سے۔ معتزلہ، ایمانداروں

میں ایک کی دوسرے پر تخصیص کا انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ ولی کے خاص ہونے سے انکار کرنا نبی کے انکار کو مستلزم ہے اور یہ کفر ہے اور عام حشوی، اگرچہ تخصیص کو جائز تو رکھتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ کہتے ہیں کہ ولی ہوئے تو ہیں لیکن آج نہیں ہیں۔ حالانکہ ماضی وحال و مستقبل کا انکار سب برابر ہے اس لئے کہ انکار کا ایک رُخ دوسرے رُخ سے زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالےٰ نے براہین نبوت کو آج تک باقی رکھا ہے اور اولیاء کو اس کے اظہار کا سبب بنایا ہے تاکہ آیات حق، اور حضور اکرم ﷺ کی صداقت کے دلائل ہمیشہ ظاہر ہوتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اولیاء کو جہان کا والی بنایا ہے یہاں تک کہ وہ خالص سنت نبوی ﷺ کے پیروکار ہو کر رہے ہے اور نفس کی پیروی کی راہوں کو چھوڑ دیا۔ آسمان سے رحمتوں کی بارش انہی کے قدموں کی برکت سے ہوتی ہے اور زمین میں جو کچھ اُگتا ہے وہ انہی کی برکت اور ان کے احوال کی صفائی کی بدولت پیدا ہوتا ہے۔ کافروں پر مسلمانوں کی فتح یابی انہی کے ارادے سے ہے۔

مخفی اولیاء کی تعداد اولیاء اللہ میں سے چار ہزار تو وہ ہیں جو پوشیدہ رہتے ہیں وہ نہ تو ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں اور نہ اپنے حال کی خوبی و جمال کو جانتے ہیں۔ ان کی حالت خود اپنے سے اور تمام لوگوں سے پوشیدہ رہتی ہے۔ اس بارے میں متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں اور اولیاء کرام کے اقوال اس پر شاہد و ناطق ہیں۔ مجھ پر خود بحمد اللہ اس کے معانی ظاہر ہو چکے ہیں۔

اولیاء کی اقسام جو اولیاء حق تعالےٰ کی بارگاہ کے لشکری اور مشکلات کو حل کرنے والے اور حل شدہ کو بند کرنے والے ہیں، ان کی تعداد تین سو ہے۔ ان کو اخیار کہا جاتا ہے۔ اور چالیس وہ ہیں جن کو ابدال اور سات وہ ہیں جن کو ابرار اور چار وہ ہیں جن کو اوتاد اور تین وہ ہیں جن کو نقباء اور ایک وہ ہے جسے قطب اور غوث کہا جاتا ہے۔ یہ اولیاء وہ ہیں جو ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں اور امور و معاملات میں ایک دوسرے کی اجازت کے محتاج ہوتے ہیں۔ اس پر مروی صحیح حدیثیں ناطق ہیں۔ اور اہل سنت و جماعت کا ان کی صحت پر اجماع ہے۔ یہاں شرح و بسط کی گنجائش نہیں ہے۔

اعتراضات اور ان کے جوابات عام لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ میں نے جو یہ کہا ہے کہ "یہ ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں کہ ہر ایک ان میں سے ولی ہے۔ اس سے لازم آتا ہے کہ وہ اپنی عاقبت سے بے خوف ہوں۔ حالانکہ یہ محال ہے کہ معرفت الٰہی، اور منصب ولایت، بے خوفی کا اقتضاء کرے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب یہ جائز ہے کہ مومن اپنے ایمان کا عارف ہوتے ہوئے بے خوف نہیں ہوتا تو یہ بھی جائز ہے کہ ولی اپنی ولایت کا عارف ہوتے ہوئے بے خوف نہ ہو۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ بھی جائز ہے کہ حق تعالیٰ کرامت کے طور پر ولی کو اس کے حال کی صحت اور مخالفت خدا کی حفاظت بتا کر اسے اپنی عاقبت کے محفوظ ہونے پر عارف اور مشرف فرمادے۔

چونکہ اس جگہ مشائخ کا اختلاف ہے اور اختلاف کی وجہ میں نے ظاہر کردی ہے کہ کچھ اولیاء وہ ہیں جو چھپے رہتے ہیں جن کی تعداد چار ہزار ہے ان کو اپنے ولایت سے آگاہی جائز نہیں۔ لیکن مشائخ کی ایک جماعت ایسی ہے جو اس آگاہی کو جائز رکھتی ہے۔ تو یہ وہ اولیاء ہیں جن کی تفصیل اس کے بعد بیان کی گئی ہے۔ بکثرت فقہاء و متکلمین پہلے گروہ کی بھی موافقت کرتے ہیں اور دوسری جماعت کے نظریہ کی بھی۔ چنانچہ استاد ابو اسحاق اسفرائنی اور متقدمین کی ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ ولی اپنے آپ کو نہیں پہچانتا کہ وہ ولی ہے؟ اور استاد ابو بکر بن موزک اور متقدمین کی ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ ولی اپنی ولایت کو پہچانتا ہے۔

جب ہم پہلے گروہ سے دریافت کرتے ہیں کہ ولی کو اپنی آگاہی میں کیا آفت و نقصان ہے تو وہ کہتے ہیں کہ آگاہ ہونے پر وہ عجب و غرور میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس پر ہم کہتے ہیں کہ ولایت کی شرط تو یہ ہے کہ وہ حق تعالیٰ کی حفاظت میں رہ کر ہر آفت سے محفوظ رہے بھلا خدا کی حفاظت میں رہ کر اس پر عجب و غرور کا صدور جائز ہی کب ہے؟ اور یہ بات تو بہت ہی عامیانہ اور بودی ہے کہ جو ولی ہو اور اس سے خرق عادات اور کرامتوں کا صدور بھی ہو پھر بھی وہ اتنا نہ جانے کہ میں ولی ہوں اور یہ کہ یہ کرامتیں ہیں۔؟ عوام میں سے کچھ لوگوں نے پہلے گروہ کی تقلید کی اور کچھ لوگوں نے دوسرے گروہ کی۔ اور ان کی باتوں کو قابل اعتناء نہیں سمجھا۔ لیکن معتزلہ تو سرے سے تخصیص ایمان اور کرامتوں ہی کا انکار کرتے ہیں حالانکہ ولایت کی حقیقت تخصیص اور کرامت ہی سے ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ تمام وہ مسلمان جنھوں نے ایمانی احکام کو قائم رکھا اور حق کی فرمانبرداری کی وہ سب اولیاء اللہ ہیں۔ اور جس نے ایمانی احکام کو قائم نہ رکھا، صفات الٰہی اور دیدارِ خدا کا انکار کیا، مومن کے لئے خلودِ دوزخ کو جائز رکھا اور انبیاء و مرسلین کی بعثت اور نزول کتب سماویہ کے بغیر، محض عقل کے ذریعہ احکام کے جواز کا قائل ہوا۔ اُن کے نزدیک وہ ولی ہے۔ بلاشبہ جس کے معتقدات ایسے ہوں تمام مسلمانوں کے نزدیک وہ ولی ہے مگر وہ خدا کا ولی نہیں بلکہ شیطان کا ولی ہوگا؟ نعوذ باللہ منہا۔

معتزلہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ولایت کے لئے اگر کرامت واجب ہوتی تو لازم تھا کہ ہر مسلمان کے لئے کرامت ہوتی کیونکہ تمام مسلمان ایمان میں مشترک ہیں جب کہ وہ اصل میں

مشترک ہیں تو لامحالہ وہ فرع میں بھی مشترک ہوں گے۔اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ یہ جائز ہے کہ مسلمان اور کافر سے کرامت صادر ہو جائے اور یہ ایسا ہی ہوگا جیسا کہ سفر میں کوئی بھوکا ہو اور اسے کوئی میزبان مل جائے اور کھانا کھلا دے یا تھکا ہوا ہو اور اسے کوئی سواری مل جائے وغیرہ وغیرہ۔وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کسی کے لئے طویل مسافت ایک رات میں طے کرنا جائز ہوتا تو حضور اکرم ﷺ کے لئے بھی یہ بات جائز ہوتی۔حالانکہ جب آپ نے مکّہ مکرّمہ کا عزم فرمایا تو اللہ تعالٰی نے فرمایا کہ:۔

وتحمل اثقالکم الٰی بلدلم تکونوا بالغیہ الا بشق الانفس۔	اور وہ تمہارے بوجھ اٹھا کر لے جاتے ہیں ایسے شہر کی طرف کہ تم اس تک نہ پہنچتے مگر آدھ مرے ہو کر

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ تمہارا یہ قول باطل ہے اس لئے کہ اللہ تعالٰی فرماتا ہے:۔

سبحان الذی اسرٰی بعبدہٖ لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ الآیہ۔	پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندۂ خاص کو رات کے مختصر حصہ میں مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک لے گیا۔

لیکن جس آیت کو تم پیش کرتے ہو اس میں بوجھ اٹھانے کے معنی، صحابہ کو جمع کر کے ان کو مکہ کی طرف لے جانا ہے۔کیونکہ کرامت خاص ہے عام نہیں ہی اگر کرامت سے ان سب کو مکہ مکرمہ لے جاتے تو کرامت عام ہو جاتی۔اور ایمان بالغیب ضروری نہ رہتا۔اور غیبی ایمان کے تمام احکام اور غیبی خبروں کا وجود سب جاتا رہتا۔کیونکہ ایمان مطیع و عاصی میں محلِ عموم ہے اور ولایت، محل خاص ہے۔لہٰذا اللہ تعالٰی نے اس حکم کو محلِ عام نہیں رکھا اور نبی کریم ﷺ کو صحابۂ کرام کی موافقت پر بوجھ اٹھانا فرمایا ہے اور اللہ تعالٰی نے دوسری جگہ حکم کو محلِ خاص میں رکھا اور اپنے نبی ﷺ کو رات کے مختصر حصہ میں مکہ سے بیت المقدس تک لے گیا۔اس کے بعد وہاں سے ''قاب قوسین'' اور عالم کے دونوں کناروں پر لے جا کر سب کچھ دکھایا اور جب واپس تشریف لائے تو رات کا بیشتر حصہ باقی تھا۔خلاصہ یہ کہ ایمان کا حکم عام ہے اور عام لوگوں سے متعلق ہے اور کرامت کا حکم خاص ہے۔اور خاص لوگوں سے وابستہ ہے۔تخصیص کا انکار تو کھلا مکابرہ اور ہٹ دھرمی ہے اسے یوں سمجھو جیسے کہ بادشاہ کے دربار میں حاجب، دربان، امیر اور وزیر ہوتے ہیں حالانکہ خدمت و نوکری کے اعتبار سے وہ سب برابر ہوتے ہیں۔لیکن ایک کو دوسرے پر فراق

مراتب کے لحاظ سے فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح ایمان کی حقیقت میں تمام مسلمان برابر ہیں اس کے باوجود کوئی عاصی، کوئی مطیع، کوئی عالم اور کوئی جاہل ہے۔ اسی بنا پر خصوصیت کے انکار سے ہر معنی کا انکار ثابت ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

ولایت کے رموز واشارات ولایت کے معنی کی تحقیق میں مشائخ کے متعدد رموز واشارات ہیں حتی المقدور ان کے مختار رموز کو بیان کرتا ہوں۔

(۱) حضرت ابو علی جرجانی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

الولی ھو الفانی فی حالہ والباقی فی مشاھدۃ الحق لم یکن لہ عن نفسہ اخبار ولا مع غیر اللہ قرار۔	ولی وہ ہے جو اپنے حال میں فانی اور مشاہدۂ الٰہی میں باقی ہے۔ اس کے لئے ممکن نہ ہو کہ اپنے حال کی خبر دے اور نہ اسے غیر اللہ سے سکون وقرار حاصل ہو۔

کیونکہ خبر دینا تو بندے کے احوال کے قبیل سے تعلق رکھتی ہے جب بندے کے احوال ہی فنا ہو گئے تو اس کی خبر دینا کیسے درست ہو سکتا ہے۔ جب وہ خدا کے سوا کسی سے آرام پا ہی نہیں سکتا تو اپنے احوال کی خبر کسی دوسرے کو کیسے دے سکتا ہے کیونکہ اپنے حال کی خبر کسی دوسرے کو دینا گویا حبیب کے اسرار کو منکشف کرنا ہے جو غیبی حال سے متعلق ہے اور حبیب کا اسرار کا انکشاف غیر حبیب پر محال ہے نیز جب ولی مشاہدے سے ہوتا ہے تو مشاہدے میں غیر کی رویت محال ہوتی ہے۔ جب غیر کی رویت تک کا امکان نہیں تو غیر سے سکون وقرار تو بعید از قیاس ہے۔

(۲) حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

"الولی من لا یکون لہ خوف لان الخوف ترتب مکروہ یحل فی المستقبل او انتظار المحبوب یفوت فی المستانف والولی این وقتہ لیس لہ وقت مستقبل فیخاف شیئًا کما لا خوف لہ ولا رجاء لہ لان الرجاء انتظار محبوب یحصل او مکروہ یکشف و ذالک فی الثانی من الوقت۔ و کذالک لا یحزن من حزونۃ الوقت من کان فی ضیاء الرضاء و نورا لشکر و روضۃ الموافقۃ فانّٰی یکون لہ حزن قال اللہ تعالٰی الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔"

اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ولی کو خوف نہیں ہوتا کیونکہ خوف اس مکروہ چیز کو کہتے ہیں جس کے آنے سے دل میں ناگواری یا جسم پر کوئی سختی آئے یا حاصل شدہ محبوب چیز کے گم ہونے کا خدشہ ہو۔ ولی کے پاس اتنا وقت ہی کہاں کہ وہ آنے والے لمحات کا خوف کرے۔ جس طرح ولی کو خوف نہیں ہوتا اسی طرح اسے امید بھی نہیں ہوتی، اس لئے کہ "امید" نام ہے کہ کسی محبوب چیز کے حاصل ہونے کا انتظار کرنا یا کسی ناگوار چیز کے دُور ہونے کا انتظار کرنا۔ یہ دوسری بات بھی وقت کے قبیل سے ہے۔ اور ان کے پاس اتنا وقت ہوتا نہیں۔ اسی طرح وَلی کو کوئی غم بھی نہیں ہوتا کیونکہ غم وقت کی تلچھٹ ہے جو شخص رضا کی روشنی اور شکر کی چاندنی میں ہوا سے غم کہاں؟ اللہ تعالیٰ اسی کی خبر دیتا ہے کہ خبر دار، اللہ کے ولیوں کے لئے نہ کوئی خوف ہے اور نہ کوئی غم و فکر؟

اس قول سے عوام یہ خیال کرتے ہیں کہ اولیاء کو جب نہ کوئی خوف و غم ہے اور نہ امید و رجا تو ضرور انھیں امن ہوگا حالانکہ انھیں امن بھی نصیب نہیں۔ کیونکہ امن، غیب کے نہ دیکھنے اور وقت کے منہ موڑنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ تمام اوصاف ان کے ہوتے ہیں جنھوں نے اپنی بشریت کو نہ دیکھا ہو۔ وہ تو ہر صفت سے بے نیاز ہو سکتے ہیں۔ خوف و غم اور امید سب نفس کے نصیبہ میں ہیں۔ جب بندہ اپنے نفس کو فنا کر لیتا ہے اس وقت بندہ کی صفت رضا و تسلیم بنتی ہے۔ اور جب رضا کا حصول ہو گیا تو مشاہدۂ الٰہی میں استقامت پیدا ہو کر تمام احوال سے کنارہ کشی ظاہر ہو گئی۔ پھر کہیں جا کر ولایت دل پر منکشف ہوتی ہے اور اس کے معنی باطن پر ظاہر ہوتے ہیں۔

(۳) حضرت ابو عثمان مغربی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:۔

الولی قدیکون مشهورا ولا یکون مفتونا۔	ولی مشہور تو ہو سکتا ہے لیکن فتنہ میں نہیں پڑ سکتا۔

(۴) ایک بزرگ بیان فرماتے ہیں:۔

الولی قدیکون مستورا ولا یکون مشهورا۔	ولی گمنام تو ہو سکتا ہے لیکن مشہور نہیں ہو سکتا۔

اِن بزرگوں کے نزدیک ولی کی گمنامی کی وجہ یہ ہے کہ وہ شہرت سے بچتا ہے کیونکہ شہر میں فتنہ ہوتا ہے۔ اس پر حضرت ابو عثمان نے فرمایا ہے کہ جائز ہے کہ ولی مشہور ہو لیکن اس کی شہرت موجب فتنہ نہ ہوگی اس لئے کہ جھوٹی شہرت میں فتنہ ہوتا ہے مگر جب ولی اپنی ولایت میں صادق ہے تو یہ شہرت موجب فتنہ نہیں اور جھوٹے پر ولایت کا اطلاق نہیں ہوتا اور جھوٹے کے ہاتھ

پر کرامت کا ظہور بھی ناممکن ومحال ہے۔اس ارشاد کے بموجب لازم آتا ہے کہ صادق ولی کے زمانہ سے فتنہ دور ہو جاتا ہے اوران دونوں قول سے یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ ولی خود کو نہیں جانتا کہ وہ ولی ہے۔ کیونکہ اگر آگاہی ہو جائے تو مشہور ہو جائے اوراگر آگاہی نہ ہو تو فتنہ میں پڑ جائے۔اس کی تشریح طوالت چاہتی ہے یہاں اس کی گنجائش نہیں۔

مستغرقِ ولایت کی مثال

(۵) حضرت ابراہیم ادھم علیہ الرحمتہ نے ایک شخص سے پوچھا کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کے ولی ہو جاؤ؟اس نے کہا خواہش تو ہے۔آپ نے فرمایا:۔

لا ترغب فی شئی من الدنیا والاٰخرۃ و فرغ نفسک للّٰہ واقبل بوجھک علیہ۔	اے عزیز!دنیا وآخرت کی کسی چیز سے رغبت نہ رکھو کیونکہ دنیا کی طرف راغب ہونا،حق تعالیٰ کی طرف سے منہ موڑ کر فانی چیز کی طرف متوجہ ہونا ہے۔

اوراُخروی چیز کی رغبت رکھنا گویا حق تعالیٰ کی جانت سے منہ موڑنا ہے۔

جب فانی چیز سے اعراض ہو تو وہ فانی چیز فنا ہو جاتی ہے اوراعراض نابود ہو جاتا ہے اور جب کسی چیز سے اعراض باقی ہو تو بقا پر فنا جائز نہیں ہے۔

لہٰذا اس اعراض پر بھی فنا جائز نہیں۔اس قول سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اپنی دنیا وآخرت کی خاطر اللہ تعالیٰ کو نہ چھوڑو۔آخر میں حضرت ابراہیم نے نصیحت فرمائی کہ اپنے آپ کو خدا کی دوستی کے لئے وقف کردو۔دنیا وآخرت کو اپنے دل میں راہ نہ دو اوردل کا لگاؤ صرف خدا ہی کے ساتھ ہو۔جس وقت یہ اوصاف تمہارے اندر پیدا ہو جائیں گے تو تم ولی بن جاؤ گے۔

شریعت کی پاسداری

(۶) حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا ولی کون ہے؟ انھوں نے فرمایا:۔

الولی ھو الصابر تحت الامر والنھی۔	ولی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے امر ونہی کے تحت صبر کرے۔

کیونکہ جس کے دل میں محبت زیادہ ہوگی اتنی ہی وہ اس کے حکم کی دل سے تعظیم کرے گا اوراس کی مخالفت سے دور رہے گا۔نیز یہ بھی انہی سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ لوگوں نے مجھے بتایا کہ فلاں شہر میں اللہ کا ایک ولی رہتا ہے۔میں اٹھا اوراس کی زیارت کی غرض سے سفر شروع کر دیا۔جب میں اس کی مسجد کے پاس پہنچا تو وہ مسجد سے نکل رہا تھا میں نے دیکھا کہ منہ کا تھوک

فرشِ مسجد پر گر رہا ہے۔ میں وہیں سے واپس لوٹ پڑا۔ اسے سلام تک نہ کیا۔ میں نے کہا کہ ولی کے لئے شریعت کی پاسداری ضروری ہے تاکہ حق تعالیٰ اس کی ولایت کی حفاظت فرمائے۔ اگر یہ شخص ولی ہوتا تو اپنے منہ کے تھوک سے مسجد کی زمین کو آلودہ نہ کرتا اس کا احترام کرتا۔ اسی رات حضور اکرم ﷺ کو میں نے خواب میں دیکھا حضور اکرم ﷺ نے مجھ سے فرمایا اے بایزید! جو کام تم نے کیا ہے اس کی برکتیں تم ضرور پاؤ گے دوسرے دن ہی میں اس درجہ پر فائز ہو گیا جہاں آج تم سب مجھے دیکھ رہے ہو۔

(۷) حضرت ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک شخص آیا اس نے مسجد میں پہلے بایاں قدم رکھا۔ انھوں نے حکم دیا کہ اسے نکال دو جو شخص دوست کے گھر میں داخل ہونے کا سلیقہ نہیں رکھتا اور بایاں قدم رکھتا ہے وہ ہماری مجلس کے لائق نہیں ہے۔؟

ملحدوں کی ایک جماعت اس بزرگ کے ساتھ تعلق کا اظہار کرتی ہے۔ (خدا ان پر لعنت کرے) وہ ملحدین کہتے ہیں کہ خدمت یعنی عبادت اتنی ہی کرنی چاہئے جس سے بندہ ولی بن جائے۔ جب ولی ہو جائے تو خدمت و عبادت ختم۔ یہ کھلی گمراہی ہے کیونکہ راہِ حق میں کوئی ایسا مقام نہیں ہے جہاں خدمت و عبادت کے ارکان میں سے کوئی رکن ساقط ہو جائے۔ اس کی تشریح اپنی جگہ انشاء اللہ آئے گی۔

اثباتِ کرامت

واضح رہنا چاہئے کہ صحیح طور پر مکلف ہونے کی حالت میں ولی کے لئے کرامت کا ظہور جائز ہے۔ اہل سنت و جماعت کے دونوں فریق یعنی علماء و مشائخ کا اس پر اتفاق ہے اور عقل کے نزدیک بھی یہ ناممکن و محال نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ از قسم قدرت الٰہی ہے اور شریعت کے اصول میں اس کے اظہار کے منافی ہونے پر کوئی اصل نہیں ہے۔ اور یہ ارادۂ حسن اور وہم و عقل سے بعید بھی نہیں ہے۔ کرامت ولی کی صداقت کی علامت ہے۔ جھوٹے پر کرامت کا ظہور جائز ہی نہیں ہے۔ اور ولایت کا جھوٹا دعویٰ، کرامت نہ ہونے سے ثابت ہے بلکہ اس کے جھوٹے دعوے کا نشان ہے۔

کرامت کی تعریف کرامت ایسا فعل ہے جو اس کی مانند لانے پر انسانی عادتوں کو عاجز کر دے۔ معرفتِ الٰہی کے لیئے استدلالی قوتوں سے صدق کے مقابل باطل کو عاجز کر دینا بھی کرامت ہے۔ اہلِ سنت وجماعت کے ایک طبقہ کے نزدیک کرامت حق ہے لیکن معجزے کی حد تک نہیں۔ مثلاً دعاؤں کا لازمی قبول ہونا یا مرادوں کا ضروری حاصل ہونا یا اس قسم کی باتیں جو انسانی عادتوں کو توڑنے والی ہوں۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مکلّف ہونے کی حالت میں ولیِ صادق سے ایسا فعل سرزد ہو جس سے عادتِ انسانی ٹوٹتی ہو تو اس میں فساد کی بابت تمہارا کیا خیال ہے؟ اگر تم یہ کہو کہ از قسم قدرتِ الٰہی نہیں ہے تو یہ خود گمراہی ہے۔ اور اگر یہ کہو کہ یہ از قسمِ قدرتِ الٰہی تو ہے لیکن ولیِ صادق سے اس کا ظہور، ابطالِ نبوت اور انبیاء علیہم السلام کی خصوصیت کی نفی ہے تو ہم جواب دیں گے کہ یہ بھی محال ہے اس لئے کہ ولی کرامتوں کے ساتھ مخصوص ہے اور نبی معجزات کے ساتھ۔

"والمعجزۃ لم تکن معجزۃ بعینھا انما کانت معجزۃ لحصولھا و من شرطھا اقتران دعوی النبوۃ فالمعجزۃ تخقص للانبیاء و الکرامات یکون للاولیاء۔"

معجزہ فی نفسہٖ عاجز کرنے والا نہیں ہوتا البتہ اس کا حاصل کرنا عاجز کرنے والا ہوتا ہے اور معجزہ کی شرط یہ ہے کہ دعویٰ نبوت بھی شامل ہو۔ لہٰذا معجزہ انبیاء کے لئے مخصوص ہے اور کرامات اولیاء کے لئے ہیں۔

چونکہ ولی ولی ہے اور نبی نبی۔ اور ان کے درمیان کوئی وجہ التباس واشتباہ بھی نہیں ہے جس سے احتراز کیا جائے۔ اور یہ کہ انبیاء علیہم السلام کے مراتب کی بزرگی اور ان کی عظمت و برتری، عصمت اور صفائے باطنی کی وجہ سے ہے نہ کہ صرف معجزہ یا کرامت یا ایسے افعال کے صدور کی وجہ سے ہے جو خرق عادات ہوں۔ باتفاق تمام نبیوں کے تمام معجزات، خارقِ عادات ہوتے ہیں اور اصل اعجاز میں سب برابر ہیں البتہ فضیلت میں ایک دوسرے پر فائق ہے۔ جب کہ یہ بات جائز ہے کہ انبیاء کے معجزات خرقِ عادات میں مساوی ہونے کے باوجود ایک کو دوسرے پر فضیلت ہے تو یہ کیوں جائز نہیں کہ یہ کرامت بھی ہو اور وہ کرامت خارقِ عادت بھی ہو اور جب کہ انبیاء، اولیاء سے افضل ہیں جب وہاں خرقِ عادت فعل، فضیلت کی علت اور ان کے

ساتھ ایک دوسرے سے خصوصیت نہیں رکھتے تو اس جگہ بھی خرقِ عادت فعل وَلی کی خصوصیت کی علت نہیں ہوسکتی۔ اور نبی کے ساتھ ان کی برابری و مساوات نہیں ہوسکتی۔ ہر صاحبِ عقل و خرد، جب اس بات کو دلیل سے سمجھے گا تو اس کے دل سے یہ شبہ جاتا رہے گا۔

اب اگر کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ وَلی کی کرامت اگر خارقِ عادت ہوتی تو وہ نبوت کا دعویٰ کرلیتا؟ تو یہ بات محال ہے اس لئے کہ ولایت کی شرط راست گوئی اور صداقت ہے اور خلاف معنی دعویٰ کرنا جھوٹ و کذب ہے جھوٹا آدمی ولی نہیں ہوسکتا اگر وَلی نبوت کا دعویٰ کرے تو بلاشبہ یہ معجزے میں دست درازی ہے اور یہ کفر ہے۔ اور کرامت فرمانبردار مومن کے سوا دوسرے سے ظاہر نہیں ہوتی اور کذب و جھوٹ معصیت ہے نہ کہ طاعت؟ جب حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ ولی کی کرامت نبی کی حجت کے اثبات کے موافق ہوگی۔ اس لئے کرامت اور معجزے کے درمیان کسی قسم کا شبہ اور طعنہ واقع نہیں ہوتا۔ کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے اپنی نبوت کا اثبات معجزے کے اثبات سے کیا ہے۔ اور وَلی بھی اپنی ولایت کے ساتھ کرامت کے ذریعہ، حضور اکرم ﷺ کی نبوت کا اثبات کرتے ہیں۔ لہٰذا سچا ولی اپنی ولایت کے اثبات میں وہی کہتا ہے جو نبی صادق اپنی نبوت میں فرماتے ہیں۔ ولی کی کرامت، نبی کے اعجاز کا عین ہوتی ہے اور مومن کے لئے ولی کی کرامت دیکھنا، نبی کی صداقت پر زیادہ مہر یقین ثبت کرنا ہے نہ کہ اس میں شبہ ڈالنا؟ کیونکہ ان کے دعویٰ بعینہ دوسرے کے دعویٰ کی دلیل ہی۔ چنانچہ شریعت میں جب اک گروہ وراثت کے دعویٰ میں متفق ہو تو جس وقت ایک کی حجت ثابت ہوجائے تو اس کے دعوی میں متفق ہونے کی وجہ سے دوسرے کی حجت بھی ثابت ہو جاتی ہیں۔ اور جب دعویٰ میں تضاد ہو اس وقت ایک حجت دوسرے کی حجت نہیں ہوتی۔ جب نبی معجزے کی دلالت سے نبوت کی صحت کا مدعی ہوتا ہے تو وَلی، نبی کے دعویٰ میں اس کا تصدیق کرنے والا ہوتا ہے۔ اس میں شبہ کا ثابت کرنا محال ہے واللہ اعلم۔

معجزات اور کرامتوں کے درمیان فرق وامتیاز

جب کہ یہ بات صحیح ہے کہ جھوٹے سے معجزہ، اور کرامت محال ہے تو لامحالہ خوب واضح کوئی فرق وامتیاز ہونا چاہئے تاکہ اچھی طرح معلوم و ظاہر ہوجائے۔ جاننا چاہئے کہ معجزات کی شرط، اظہار ہے اور کراماتِ اولیاء کی شرط اخفاء ہے۔ اس لئے کہ معجزے کا فائدہ دوسروں کو پہنچتا ہے (کہ لوگ نبی کی صداقت پر یقین کر کے ایمان لائیں) اور کرامت کا فائدہ خاص وَلی یعنی

صاحبِ کرامت کو پہنچتا ہے (کیونکہ اس میں وَلی کی عزت افزائی اور اس کی بزرگی کی نشانی پوشیدہ ہے) اور ایک فرق یہ بھی ہے کہ صاحبِ معجزہ یعنی نبی، اسے دور بھی کرسکتا کیونکہ یہ کرامت بمعنی عزت افزائی ہے یا استدراج ہے (اصل کتاب فارسی کی عبارت سے ایک مفہوم یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ صاحب معجزہ یقین رکھتا ہے کہ یہ خالص اعجاز ہے اور وَلی یقین نہیں کرسکتا کہ یہ کرامت ہے یا استدراج ہے۔ واللہ اعلم۔ مترجم غفرلہٗ)۔

ایک فرق یہ بھی ہے کہ صاحبِ معجزہ یعنی نبی، شریعت میں تصرف کرسکتا ہے اور اس کی ترتیب میں بفرمان خدا، نفی و اثبات کرسکتا ہے۔ لیکن صاحب کرامت یعنی وَلی کو اس میں بجز تسلیم کرنے اور احکام پر عمل کرنے کے سوا کوئی صورت ممکن ہی نہیں ہے۔ کیونکہ ولی، اپنی کرامت کے ذریعہ نبی کے کسی شرعی حکم میں کسی قسم کی منافات اور ردوبدل نہیں کرسکتا۔

اگر کوئی یہ کہے کہ جب تم معجزے کو خرقِ عادت سے اور ولایت کو نبی کی صداقت سے تعبیر کرتے ہو اور اسے نبی کے علاوہ بصورتِ کرامت دوسروں کے لئے جائز سمجھتے ہو تو اثبات معجزہ پر کرامت کے اثبات کی تمہاری عین حجّت باطل ہو جاتی ہے اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ تمہاری یہ بات اُس صورت کے برخلاف ہے جس پر تمہارا اعتقاد ہے اس لئے کہ معجزہ وہ ہے جو لوگوں کی عادت کو توڑنے والا ہو۔ جب ولی کی کرامت نبی کا ہی عین معجزہ ہے تو وہی دلیل دکھائے گی جو نبی کے معجزے کی ہے اور ایک معجزہ دوسرے معجزے کا توڑ نہیں ہوتا۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جب صحابیِ رسول ﷺ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو کافروں نے مکہ مکرمہ میں سولی پر چڑھایا تو مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ نے مسجد نبوی میں تشریف فرما ہو کر وہ سب کچھ دیکھ لیا اور صحابہ کو بتا دیا کہ کفارِ مکہ حضرت خبیب کے ساتھ ظلم و ستم کر رہے ہیں۔ ادھر اللہ تعالیٰ نے حضرت خبیب کی آنکھوں سے بھی درمیان کے پردے اٹھا دیئے حتیٰ کہ انھوں نے بھی حضور اکرم ﷺ کو دیکھا اور آپ پر درود و سلام بھیجا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا سلام حضور ﷺ کے گوشِ مبارک میں پہنچایا اور حضور ﷺ نے ان کے سلام کا جواب دیا اور یہ جواب حضرت خبیب کے کانوں نے سُنا اور دُعا کی یہاں تک کہ وہ روبقبلہ ہو گئے۔

حضور اکرم ﷺ کا مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ میں ان کو دیکھنا ایسا فعل تھا جو خارق عادت یعنی معجزہ تھا۔ اسی طرح حضرت خبیب کا مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ میں حضور ﷺ کو دیکھنا خارق عادت یعنی ان کی کرامت تھی۔ باتفاق غائب کو دیکھنا خرق عادت ہے لہٰذا غیبتِ زمان اور غیبت مکان میں بالاتفاق کچھ فرق نہ رہا۔ اس لئے کہ حضرت خبیب کی یہ کرامت اس حالت میں ہے

جب کہ ان کو حضور ﷺ سے غیب مکانی تھی یہی صورت حال متاخرین اولیاء کے لئے ہے کیونکہ وہ حضور ﷺ سے غیبِ زمانی کی حالت میں ہیں اور یہ ظاہر فرق اور واضح دلیل اس بات کی ہی کہ کرامت، معجزے کے برخلاف نہیں ہوتی۔ (اگرچہ صورت میں یکساں اور برابر ہوتی ہے مگر معنی اور اعتقاد میں فرق ہوتا ہے۔ مترجم) کیونکہ کرامت، صاحب معجزہ کی تصدیق کے بغیر، کسی اور حالت میں ثابت نہیں ہوتی۔ اور تصدیق کرنے والے عبادت گزار مومن کے سوا کسی اور سے بھی ظاہر نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ امت کی کرامت درحقیقت نبی ہی کا معجزہ ہے۔ کیونکہ آپ کی شریعت باقی ہے، اس لئے لازمی ہے کہ اس کی حجت بھی باقی رہے۔ لہٰذا اولیاء امت، رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی صداقت کے گواہ ہیں۔ یہ جائز نہیں ہے کہ غیر امتی سے کرامت کا ظہور ہو۔ اسی مفہوم کی ایک حکایت یہ ہے۔

ایک ولی کی کرامت اور ایک نصرانی کا مقابلہ

حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں اپنی عزلت نشینی کی عادت کے تحت جنگل میں چلا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد بیابان کے ایک جانب سے ایک شخص آیا اس نے مجھ سے ساتھ رہنے کی اجازت مانگی۔ جب میں نے اس پر گہری نظر ڈالی تو میرے دل میں اس کی طرف سے نفرت پیدا ہوئی اور میں نے خیال کیا یہ کس لائق ہے؟ اس نے مجھ سے کہا اے ابراہیم آپ آزردہ خاطر نہ ہوں میں نصرانی راہب ہوں۔ آپ کی صحبت کی آرزو میں ملک روم سے آ رہا ہوں۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ شخص غیر ہے تو میرے دل کو اطمینان ہوا اور صحبت کا طریق اور اس کا حق مجھ پر بہت آسان ہو گیا۔ میں نے کہا اے نصرانی راہب! میرے ساتھ کھانے پینے کی چیزیں نہیں ہیں۔ مجھے خوف ہے کہ اس جنگل میں تمہیں کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ راہب نے کہا اے ابراہیم! جہان میں آپ کا بڑا شہرہ ہے لیکن آپ ابھی تک کھانے پینے کے ہی غم میں مبتلا ہیں۔ فرماتے ہیں کہ راہب کی اس بات پر مجھے تعجب ہوا اور تجربہ کے طور پر اس کی صحبت کو قبول کر لیا کہ وہ اپنے دعوے میں کتنا سچا ہے۔ جب ہمیں سات دن اور سات راتیں سفر کرتے ہوئے گزر گئے تو ہمیں پیاس معلوم ہوئی۔ تو راہب رک کر کہنے لگا کہ اے ابراہیم! جہان میں آپ کا نقارہ بج رہا ہے۔ اب کچھ لائیے آپ کیا رکھتے ہیں پیاس کی شدت نے بے جان کر رکھا ہے۔ بجز آپ کی جناب میں

گستاخی کے کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنا سر زمین پر رکھا اور دعا مانگی کہ اے خدا مجھے اس بیگانہ کے سامنے ذلیل و رسوا نہ کرنا کیونکہ وہ اپنی بیگانگی میں مجھ سے نیک گمان رکھتا ہے۔ کیا مضائقہ ہے اگر ایک کافر کا گمان مجھ پر پورا ہو جائے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے سجدے سے سر اٹھایا تو دیکھا کہ ایک طشت میں دو روٹی اور دو گلاس پانی کے رکھے ہوئے ہیں۔ ہم نے اسے کھایا پیا اور وہاں سے چل دیئے۔ جب سات روز اسی طرح گزر گئے تو میں نے دل میں خیال کیا کہ میں اس کافر کا تجربہ کروں قبل اس کے کہ وہ مجھ سے کسی اور چیز کا سوال کرے۔ اور میرا امتحان لے اور اپنے مطالبہ میں مجھ سے اصرار کرے اور میں ذلت محسوس کروں۔ میں نے کہا اے نصرانیوں کے راہب! آج تمہاری باری ہے۔ دیکھوں کہ اتنا عرصہ ریاضت کر کے تم نے کیا پایا ہے؟ اس نے بھی سر زمین پر رکھا اور کچھ دعا مانگی اسی وقت ایک طشت نمودار ہوا جس میں چار روٹی اور چار گلاس پانی رکھے ہوئے تھے۔ میں یہ دیکھ کر سخت متعجب ہوا اور آزردہ خاطر ہوا اور اپنے احوال سے نا اُمید ہو گیا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا میں اسے نہیں کھاؤں گا کیونکہ یہ کافر کے لئے آسمان سے اترا ہے اس میں اس کی معونت یعنی مدد ہے میں اسے کیسے کھا سکتا ہوں۔ راہب نے مجھ سے کہا اے ابراہیم! کھایئے۔ میں نے کہا میں نہیں کھاؤں گا۔ راہب نے پوچھا کیا وجہ؟ میں نے کہا تم اس کے اہل نہیں ہو۔ اور بات تمہارے حال کے جنس سے نہیں ہے۔ میں اس معاملہ میں سخت حیران ہوں۔ اگر اسے کرامت پر محمول کروں تو کافر پر کرامت جائز نہیں اور اگر اسے معونت کہوں تو مدعی شبہ میں پڑ جائے گا۔ راہب نے مجھ سے کہا کھایئے اور دو چیزوں کی بشارت سنیئے۔ ایک تو میرے اسلام کی، کہ میں کلمہ پڑھتا ہوں کہ "اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له واشهد ان محمداً عبدهٗ ورسولهٗ" دوسرے یہ کہ خدا کی جناب میں آپ کا بڑا مرتبہ ہے۔ میں نے پوچھا وہ کیسے؟ اس نے کہا اس لئے کہ اس جنس میں سے میرے پاس تو کچھ نہیں تھا۔ میں نے صرف شرمساری کی وجہ سے زمین پر سر رکھا تھا اور دعا مانگی تھی کہ اے خدا۔ اگر دینِ محمد (ﷺ) حق ہے اور تیرا

پسندیدہ ہے تو تو مجھے دو روٹی اور دو گلاس پانی کے دے اور اگر ابراہیم خواص تیرا بندہ ولی ہے تو دو روٹی اور دو گلاس پانی اور عطا فرما۔ جب میں نے سر اٹھایا تو اس طشت کو موجود پایا۔ یہ ماجرا سُن کر حضرت ابراہیم نے اسے کھایا پیا۔ وہ راہب، جوانمرد اور بزرگانِ دین میں گذرا ہے۔ یہ معنی ہیں عینِ اعجاز نبی کے۔ جو ولی کی کرامت سے قریب تر ہے۔ یہ حکایت عجیب ہے نبی کی غیبت میں غیر کے لئے دلیل رونما ہو اور ولی کے حضور میں اس کے غیر کے لئے اس کی کرامت میں حصہ ملے۔ درحقیقت ولایت کی منتہی کو اس کے مبتدی کے سوا کوئی نہیں جانتا اس لئے کہ وہ راہب، فرعون کے جادوگروں کی طرح تھا اس کا ایمان پوشیدہ تھا لہٰذا حضرت ابراہیم خواصؒ نے نبی کے معجزے کی صداقت ثابت کی۔ اور راہب نے بھی نبوت کی صداقت کا مطالبہ کیا اور ساتھ ہی ولایت کی عزت کا مطالبہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے بحُسنِ عنایتِ ازلی، اس کے مقصود کو پورا فرما دیا۔ کرامت و اعجاز کے درمیان یہ ایک ظاہر فرق ہے۔

اولیاء کرام کا کرامت ظاہر فرمانا یہ ان کی مزید کرامت ہے کیونکہ ولایت کی شرط تو پوشیدہ رکھنا ہے نہ کہ بالقصد اظہار کرنا۔ میرے شیخ و مرشد رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی ولایت ظاہر کرے اور اس سے اپنے حال کی درستگی ثابت کرے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن اگر اسے تکلف سے ظاہر کرے تو یہ رعونت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

خدائی دعوی کرنے والے کے ساتھ سے

از قسم معجزہ ظاہر ہونے کی بحث

طریقت کے مشائخ اور تمام اہل سنت و جماعت کا اس پر اتفاق ہے کہ کسی کافر کے ہاتھ سے معجزہ و کرامت کے مشابہ کسی خرقِ عادت فعل کا ظاہر ہونا، جائز ہے۔ کیونکہ شبہات کے مواقع کو اس فعل کا ظہور دور کر دیتا ہے۔ اور کسی کو اس کے جھوٹے ہونے میں شک نہیں رہتا۔ اور اس فعل کا ظہور اس کے جھوٹے ہونے پر گواہ بن جاتا ہے۔ جس طرح فرعون تھا اس نے چار سَو سال عمر پائی لیکن اس دوران وہ کبھی بیمار تک نہ ہوا اس کا حال یہ تھا کہ دریا کا پانی اس کی پشت کے عقب میں اونچا ہو جاتا اور جب وہ کھڑا ہوتا تو پانی بھی ٹھہر جاتا اور جب چلنے لگتا تو پانی بھی چلنے

لگتا۔لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بھی کسی عقلمند کو اس کے دعوی خدائی کے جھوٹے ہونے میں شبہ نہ ہوا۔ کیونکہ عقلمند کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالے مجسم و مرکب نہیں ہے۔ اس قسم کی باتیں اور افعال عاقل کے لئے اس کے جھوٹے مدعی ہونے میں شبہ نہیں ڈالتے۔ باغ ارم کے مالک شداد و نمرود کے بارے میں بھی اس قسم کی باتیں سنی جاتی ہیں ان کو بھی اسی پر قیاس کرنا چاہیئے۔ اسی کے ہم معنی حضور اکرم ﷺ نے ہمیں خبر دی ہے کہ آخری زمانہ میں دجال نکلے گا جو خدائی کا دعویٰ کرے گا اور دو پہاڑ ایک داہنی جانب ایک بائیں جانب ساتھ ساتھ لے کر چلے گا۔ داہنی جانب کے پہاڑ کو وہ جنت کہے گا اور بائیں جانب کے پہاڑ کو دوزخ۔ وہ لوگوں کو اپنی طرف بلائے گا۔ جو اس کی دعوت قبول نہ کرے گا وہ اسے سزا دے گا اور وہ لوگوں کو اپنی گمراہی کے سبب ہلاک کرے گا۔ پھر انہیں زندہ کرے گا۔ سارے جہان میں اسی کا حکم چلے گا۔ اگر وہ اس سے بڑھ کر سو گنا خرقِ عادات افعال ظاہر کرے تب بھی کسی عقلمند کو اس کے جھوٹے ہونے میں کوئی شبہ نہ ہوگا۔ ہر ذی شعور بخوبی جانتا ہے کہ خدا گدھے پر نہیں بیٹھتا۔ اور متغیر و متلون نہیں ہوتا ایسی باتوں کی نمائش کو استدراج کہتے ہیں۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ کسی جھوٹے مدعیِ نبوت سے خرق عادات فعل صادر ہو جو اس کے جھوٹ پر دلالت کرتا ہو۔ جیسے صادق نبی سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور معجزہ اس کے صدق کی دلیل ہوتا ہے۔ لیکن یہ جائز نہیں ہے کہ اس سے ایسا فعل سرزد ہو جس سے صاحبِ عقل کو شبہ پڑ جائے۔ اگر ہم شبہ کو بھی جائز مان لیں تو پھر کاذب سے صادق کو اور صادق سے کاذب کو نہیں پہچان سکیں گے۔ اس وقت طالب کو دشوار ہوگا اور کس کی تصدیق کریں اور کس کی تکذیب، اس طرح حکم ثبوت بالکل باطل ہو جاتا ہے۔

ظہور کرامت کی حالت جائز ہے کہ مدعیِ ولایت سے از قسم کرامت کوئی فعل ظاہر ہو کیونکہ وہ دین میں تو درست ہے اگرچہ معاملاتِ طریقت میں بہتر نہیں ہے۔ وہ ظہور و کرامت سے حضور اکرم ﷺ کی صداقت کا اثبات اور خود پر فضل حق کو ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ یہ فعل اس کی اپنی قوت و طاقت سے نہیں ہے اور جو اصل ایمان میں بلا دلیل راست گو ہو وہ اعتقاد کے تمام اصول اور ولایت میں دلیل کے ساتھ راست گو ہوگا اس لئے کہ اس کا اعتقاد ہر حال میں ولی کے اعتقاد کی صفت میں ہوگا۔ اگرچہ اِس کے اعمال، اس کے اپنے اعتقاد کے موافق نہ ہوں۔ اس کے دعوئ ولایت پر ولایت کے معاملات نہ کرنے سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جس طرح ایمان کا دعویٰ،

احکام و عمل نہ کرنے سے باطل قرار نہیں پاتا۔ درحقیقت کرامت اور ولایت، حق تعالیٰ کی عطا و بخشش سے متعلق ہے نہ کہ بندے کے کسب و اختیار سے۔ لہٰذا بندے کا کسب و مجاہدہ، درحقیقت ہدایت کے لئے علت نہیں ہوتا۔ اس سے قبل بتا چکا ہوں کہ اولیاء معصوم نہیں ہیں۔ کیونکہ عصمت نبوت کے لئے ہے لیکن اولیاء آفتوں سے محفوظ ہیں۔ کیونکہ ان کے وجود سے نفی، مقتضی ہو سکتی ہے۔ اور ولایت کا نفی میں آفت کا وجود، ایمان کی نفی کا حکم رکھتی ہے۔ اس میں ارتداد از قسم معصیت نہیں ہے۔ یہ مذہب محمد بن علی حکیم ترمذی کا ہے۔ اور حضرت جنید، حضرت ابوالحسن نوری اور حضرت محاسبی رحمہم اللہ اور ان کے بکثرت محقق اتباع کا بھی یہی مسلک ہے لیکن اہل معاملات جیسے حضرت سہیل بن عبداللہ تستری، ابوسلیمان درانی اور ابوحمدون قصاب وغیرہ رحمہم اللہ کا مشرب ہے کہ ولایت کی شرط ہمیں طاعت پر قائم رہنے کی ہے جب ولی کے دل پر کبیرہ کا گزر ہو جائے تو وہ ولایت سے معزول ہو جاتا ہے۔ میں پہلے ظاہر کر چکا ہوں کہ امت کا اجماع ہے کہ کبیرہ کے ارتکاب سے بندہ ایمان سے خارج نہیں ہوتا۔ لہٰذا کوئی ولایت، دوسری ولایت سے بہتر نہیں ہے۔ اور جب معرفت کی ولایت جو تمام کرامتوں کی جڑ ہے معصیت سے ساقط نہیں ہوتی۔ تو یہ ناممکن ہے کہ جو چیز شرف و کرامت میں اس سے کم درجہ پر ہو وہ معصیت سے زائل ہو جائے۔ مشائخ کے درمیان یہ اختلاف بہت طویل بحث بن چکا ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم بات، علمِ یقین سے اس کا جاننا ہے کہ ولی سے ظہورِ کرامت کس حالت میں ہوا ہے؟ آیا حالتِ صحو میں ہوا ہے یا حالتِ سکر میں؟ غلبہ حال میں ہوا ہے یا محل استقامت میں؟ صحو و سکر کی تفصیل طیفوری مذہب کے ذکر میں آ چکی ہے۔

حضرت بایزید بسطامی، حضرت ذوالنون مصری، حضرت محمد بن خفیف، حضرت حسین بن منصور، حضرت یحییٰ بن معاذ رازی رحمہم اللہ اور ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ ولی سے ظہور کرامت، بجز حالت سکر کے ممکن نہیں۔ اور جو حالت صحو میں واقع ہوتا ہے وہ نبی کا معجزہ ہے۔ ان کے مذہب میں کرامت و معجزے کے درمیان یہ فرق واضح ہے۔ کیونکہ ولی پر اظہارِ کرامت سکر کی حالت میں ہوگا یعنی وہ مغلوب الحال اور دعویٰ سے بے نیاز ہوگا اور نبی پر معجزے کا اظہار اس کے صحو کی حالت میں ہوگا۔ کیونکہ وہ تحدی کرتا اور لوگوں کو اپنے مقابلہ میں بلاتا ہے اور صاحب معجزہ حکم کے دونوں اطراف میں مختار کیا گیا ہے۔ ایک اس کے اظہار میں جب کہ وہ اعجاز کی لئے معارضہ میں لائے۔ دوسرے اس کے پوشیدہ رکھنے میں۔ چونکہ اولیاء کے لئے یہ صورت متصور

نہیں کہ انھیں کرامت میں اختیار دیا گیا ہے۔ کیونکہ بسا اوقات وہ ظہور کرامت چاہتے ہیں اور ظہور نہیں ہوتا اور کبھی چاہتے نہیں مگر ظہور ہو جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ولی داعی نہیں ہوتا ہے کہ اس کا حال قیام سے منسوب ہو بلکہ وہ پوشیدہ ہے اور اس کا حال صفتِ فنا سے موصوف ہے۔ لہٰذا ایک صاحبِ شرع ہے اور دوسرا صاحبِ اسرار۔ اس لئے سزاوار یہ ہے کہ کرامت، خوف اور غیبت حال کے سوا ظاہر نہ ہو۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس کا تصرف حق تعالیٰ کے تصرف سے وابستہ ہے۔ جس وقت ولی کا ایسا حال ہو جائے اس وقت اس کی ہر بات حق تعالیٰ کی مدد سے وجود میں آتی ہے۔ اس لئے کہ صفتِ بشریت کی برقراری یا اہل لہو کو ہو گی یا اہل سہو کو یا مطلقِ الٰہی کو۔ لہٰذا انبیاء علیہم السلام کی بشریت لہو اور سہو کی بنا پر نہیں ہو گی اور انبیاء کے سوا کوئی مطلقِ الٰہی نہیں ہو گا۔ (جن پر اطلاقِ بشریت خدا کی طرف سے ہو اور اصل حقیقت عوام سے مخفی ہو۔ فافہم مترجم) اس جگہ ایک تردد تلون رہ جاتا ہے جو تحقیق و تمکین کے سوا ہے۔

اولیاء کی بشریت جب تک قائم و باقی رہتی ہے وہ محجوب رہتے ہیں اور صفاتِ بشریت کو فنا کر کے مکاشف اور مشاہدے میں ہوتے ہیں تو وہ الطاف حق کی حقیقت میں مدہوش ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا حالتِ کشف کے بغیر، اظہار کرامت صحیح نہیں ہوتا اور یہ ان کا قرب کا درجہ ہے۔ اس حال میں ان کے دل میں پتھر اور سونا دونوں برابر ہیں۔ یہ حال انبیاء کے سوا کسی صورت میں کسی اور کے لئے ممکن نہیں۔ اگر کسی کا ہو بھی جائے تو وہ عارضی حالت ہو گی۔ یہ حال بجز سکر و مدہوشی کے نہ ہو گا۔ جس طرح حضرت حارث محاسبی ایک دن دنیا سے گم ہوئے کہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی عقبیٰ سے جا ملے اس وقت انھوں نے فرمایا:۔

عرضت نفسی من الدنیا فاستوت عندی حجرھا و ذھبھا و فضتھا و مدرھا۔	میں نے دنیا سے اپنے آپ کو جدا کیا تو اس وقت میرے نزدیک دنیا کا سونا چاندی اور پتھر ڈھیلے سب برابر ہو گئے۔

دوسرے دن لوگوں نے جب باغ میں کام کرتے دیکھا تو پوچھا اے حارث کیا کر رہے ہو؟ انھوں نے فرمایا روزی حاصل کر رہا ہوں کیونکہ اس کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں۔ ایک دن ان کا وہ حال تھا اور دوسرے دن ان کا یہ حال۔؟

اولیاء کے نزدیک صحو، عوام کا درجہ ہے اور ان کے سکر کا مقام، انبیاء کا درجہ ہے۔ جب وہ اپنے آپ میں واپس آتے ہیں تو اس وقت وہ خود کو دیگر لوگوں کی مانند ایک فرد جانتے ہیں۔ اور

جب وہ اپنے آپ سے غائب ہو جاتے ہیں اس وقت وہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کا سکر انھیں مہذب اور شائستہ بنانے والا ہوتا ہے۔ اور وہ حق تعالیٰ کے ساتھ شائستہ ہو جاتے ہیں۔ اور سارا جہان مثل سونے کے ہو جاتا ہے۔

حضرت شبلی علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں کہ

ذھب اینما ذھبنا و درحیثما درنا وفضۃ فی الفضاء''	جہاں ہم گئے سونا تھا اور جس جگہ پہنچے موتی تھے اور فضاء میں چاندی تھی۔

استاذ و امام ابوالقاسم قشیری رحمتہ اللہ عیہ فرماتے ہیں کہ میں نے طبرانی سے ابتدائی حال کی بابت پوچھا تو انھوں نے کہا ایک دن مجھے ایک پتھر کی ضرورت لاحق ہوئی سرخس کی شاہراہ سے جو پتھر اٹھاتا تھا وہ جوہر و پارس ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک دونوں برابر تھے بلکہ یہ اس لئے تھا کہ جو لعل ان کے ہاتھ میں آتا تھا وہ ان کی مراد کے مقابلہ میں پتھر سے زیادہ حقیر چیز تھی۔

مجھ سے خواجہ امام خرامی نے سرخس میں فرمایا کہ میں بچہ تھا اور مایہ قرز کی لئے شہتوت کے پتوں کی تلاش میں وہاں کے ایک محلہ میں پہنچا۔ اور ایک درخت پر چڑھ کر ٹہنی سے پتے جھاڑنے لگا۔ شیخ ابوالفضل بن حسن رحمۃ اللہ علیہ اس کوچہ سے گزرے انھوں نے مجھے درخت پر چڑھا ہوا نہ دیکھا مجھے اس میں کوئی شک نہیں وہ اس وقت اپنے آپ سے غائب تھے اور ان کا دل خدا کے ساتھ خوش و خرم تھا، حضرت ابوالفضلؒ نے اپنا سر اٹھا کر کہا اے خدا ایک سال سے زیادہ گزر گیا تو نے مجھے ایک دمڑی تک نہ دی کہ میں سر کے بال ہی بنوالیتا دوستوں کے ساتھ ایسا کرتا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ اس وقت درخت کے تمام پتے، ٹہنیاں اور جڑیں سونے کی ہو گئیں یہ دیکھ کر حضرت ابوالفضل نے کہا، عجیب بات ہے؟ میری کنارہ کشی پر میرے دل کی کشادگی کے لئے یہ سب پھبتی اور استہزاء ہے۔ میں تجھ سے ایک بات بھی نہیں کہہ سکتا۔

حضرت شبلی علیہ الرحمتہ کا واقعہ ہے کہ انھوں نے چار ہزار اشرفیاں دریائے دجلہ میں پھینک دیں۔ لوگوں نے کہا یہ کیا کرتے ہو؟ انھوں نے فرمایا پتھر پانی میں اچھے ہوتے ہیں۔ لوگوں نے کہا اسے مخلوقِ خدا میں تقسیم کیوں نہ کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ سبحان اللہ! اپنے دل سے حجاب اٹھا کر مسلمان بھائیوں کے دلوں پر ڈال دوں۔ میں خدا کو کیا جواب دوں گا کیونکہ دین میں اس کی گنجائش کہاں ہے کہ مسلمان بھائیوں کو اپنے سے بدتر سمجھوں۔ یہ سب سکر و مدہوشی کے حالات ہیں جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں۔ اس جگہ مقصود، اثبات کرامت ہے۔

حضرت جنید بغدادی، ابوالعباس سیاری، ابوبکر واسطی اور صاحبِ مذہب محمد بن علی حکیم ترمذی رحمہم اللہ کا مذہب یہ ہے کہ کرامت، صحو و تمکین یعنی استقامت کی حالت میں بغیر سکر کے ظاہر ہوتی ہے کیونکہ اولیاء اللہ، حق تعالیٰ کی طرف سے مدبرانِ عالم اور برگزیدہ حضرات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جہان کا حاکم بنا کر دنیا کا حل وعقد وبسط وکشادان سے وابستہ کیا ہے۔ اور انھیں کے ارادوں پر جہان کے لئے احکام منحصر فرمائے ہیں۔ لہٰذا سزاوار یہی ہے کہ ان کی رائے سب سے زیادہ صحیح اور خلقِ خدا پر ان کا دل سب سے بڑھ کر مہربان ہو کیونکہ وہ واصل بحق ہیں، تلوین وسکر تو ان کا ابتدائی حال ہے جب بلوغ حاصل ہو جاتا ہے تو تلوین وسکر، تمکین واستقامت سے بدل جاتا ہے اس وقت وہ حقیقی ولی اور ان کی کرامت صحیح ہوتی ہے صوفیاء کے درمیان مشہور ہے کہ اوتاد کے لئے لازم ہے کہ وہ رات بھر میں سارے جہان کا گشت مکمل کرلیں۔ اور اگر کوئی جگہ ایسی رہ جائے جہاں ان کی نظر نہ پڑے تو دوسرے دن اس جگہ کوئی خلل واقع ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ اوتاد، اپنے غوث وقطب کی طرف رجوع ہوتے ہیں تا کہ وہ اپنی قوت اُس طرف مبذول فرمائے۔ اللہ تعالیٰ اسی غوث وقطب کی برکت سے جہان کے اس خلل کو دور فرمادیتا ہے۔

جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ "سونا اور پتھر ان کے نزدیک برابر ہیں" یہ بات سکر اور دیدار الٰہی میں نادرستی کی علامت ہے اس کے لئے یہ حالت بزرگی کی نہیں ہے۔ مردانِ خدا کی بزرگی تو صحیح اور راست پندار میں ہے اور ان کے نزدیک سونا سونا اور پتھر پتھر ہے مگر وہ اس کی آفت سے باخبر ہو، تا کہ انھیں دیکھ کر یہ کہہ سکے کہ اے زرد سونے اے سفید چاندی، مجھے کیوں فریب دیتے ہو میں تمہارے دھوکے میں نہیں آسکتا۔ کیونکہ میں نے تمہاری آفتوں کو دیکھ لیا ہے اور جس نے ان کی آفتوں کو دیکھ لیا اس کے لئے وہ محلِ حجاب نہیں بنتا۔ جب وہ ان کے چھوڑنے کو کہتا ہے تو وہ ثواب پاتا ہے پھر یہ کہ جب وہ سونے کو پتھر کہتا ہے تو پتھر کو چھوڑنے کی تلقین، کسی طرح درست نہیں ہوسکتی۔ تم نے نہیں دیکھا کہ حضرت حارث جب حالت سکر میں تھے تو انھوں نے فرمایا۔ سونا چاندی اور پتھر ڈھیلے مرے نزدک سب برابر ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ صاحبِ صحو تھے دنیا کے قبضہ کی آفت کو دیکھا اور اس کی جدائی میں اجر وثواب معلوم ہوا مال وزر سے ہاتھ اٹھالیا یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا اے صدیق گھر والوں کے لئے کیا چھوڑا؟ عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ﷺ۔

واقعہ حضرت ابوبکر رواق رحمتہ اللہ علیہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک دن حکیم ترمذیؒ نے مجھ سے فرمایا اے ابوبکر آج میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا میں نے عرض کیا شیخ کا حکم سر

آنکھوں پر۔ میں ان کے ساتھ چل دیا زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ میں نے ایک نہایت گھنا جنگل دیکھا اور اس جنگل کے درمیان، ایک سرسبز درخت کے نیچے ایک زرنگار تخت بچھا ہوا دیکھا جہاں ایک چشمہ پانی کا جاری تھا۔ ایک شخص عمدہ لباس پہنے ہوئے اس تخت پر بیٹھا ہوا تھا جب حکیم ترمذیؒ اس کے نزدیک پہنچے تو وہ شخص کھڑا ہو گیا اور انھیں اس تخت پر بٹھا دیا تھوڑی دیر کے بعد ہر طرف سے لوگ آنے لگے یہاں تک کے چالیس آدمی جمع ہو گئے۔ انھوں نے اشارہ کیا اسی وقت آسمان سے کھانے کی چیزیں اترنے لگیں۔ ہم سب نے کھایا۔ حکیم ترمذی نے کوئی سوال کیا اس مرد نے اس کا بہت طویل جواب دیا جس کا میں ایک کلمہ بھی نہ سمجھ سکا کچھ عرصہ بعد اجازت مانگی اور واپس آ گئے۔ مجھ سے فرمایا تم نیک بخت ہو۔ جب کچھ مدت بعد پھر تشریف لائے تو میں نے عرض کیا اے شیخ! وہ کونسی جگہ تھی؟ اور وہ کون شخص تھا؟ انھوں نے فرمایا بنی اسرائیل کا جنگل تھا اور وہ مرد "قطب مدار علیہ" تھا۔ میں نے عرض کیا اے شیخ! اتنی مختصر گھڑی میں ترمذ سے بنی اسرائیل کے جنگل میں کیسے پہنچ گئے؟ وہ بولے اے ابوبکر! تمہیں پہنچنے سے کام ہے نہ کہ پوچھنے اور سبب دریافت کرنے سے؟ یہ حالت صحو کی علامت ہے نہ کہ سکر کی۔ مختصراً کرامت کے اثبات میں تمام پہلو پر گفتگو کر چکا ہوں مزید تفصیل وتشریح کی یہاں گنجائش نہیں۔ اب اس ضمن میں یہاں کچھ حکایات لطیف بیان کرتا ہوں جن کے درمیان کچھ دلائل بھی ہوں گے تاکہ ہر طبقہ کے لئے سودمند ثابت ہوں۔ وباللہ التوفیق۔

کرامات اولیاء کے ثبوت میں دلائل نقلیہ

واضح رہنا چاہیے کہ جب کرامت کی صحت پر دلائل عقلیہ اور اس کے ثبوت میں براہین ساطعہ قائم ہو جائیں تو مناسب ہے کہ کچھ دلائل نقلیہ بھی بیان کر دیے جائیں چنانچہ اہل اللہ کی کرامتیں اور ان سے خرق عادات افعال کے صدور ہونے کی صحت پر کتاب وسنت اور احادیثِ صحیحہ مروی ہیں اس کا انکار تمام نصوصی احکام کا انکار ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن میں خبر دی ہے کہ

وظللنا علیکم الغمام وانزلنا علیکم المن والسلویٰ۔	اور ہم نے تم پر بادلوں کا سایہ کیا اور ہم نے من وسلویٰ اتارا جو ہر رات تازہ اترتا تھا۔

اگر کوئی منکر یہ کہے کہ یہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا تو ہم جواب دیں گے کہ ٹھیک ہے اولیاء کی کرامتیں بھی تو ہمارے حضور ﷺ ہی کے معجزے ہیں اگر کوئی یہ کہے کہ اولیاء کی

کرامت، نبی کی غیبت میں واجب نہیں کیونکہ وہ نبی کا معجزہ ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس وقت ان میں موجود تھے؟ تو ہم کہیں گے کہ جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل سے غائب ہو کر کوہِ طور پر گئے تھے اس وقت بھی تو یہ معجزہ برقرار تھا۔ لہٰذا غیبت مکان اور غیبت زمان برابر ہے جب کہ وہ معجزہ غیبت مکان میں درست تھا تو اس وقت غیبت زمان میں بھی درست ہے۔

دوسری دلیل یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آصف بن برخیا کی کرامت کی بھی ہمیں خبر دی ہے جس وقت کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے چاہا تھا کہ بلقیس کا تخت ان کے سامنے پیش کیا جائے۔ اور انھوں نے اس جگہ حاضر کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ حضرت آصف کی شرافت و بزرگی لوگوں پر ظاہر ہو جائے اور وہ اپنی کرامت لوگوں کے روبرو ظاہر کریں کیونکہ کرامتِ اولیاء جائز ہے۔ چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے دربار میں فرمایا تھا کون ہے جو بلقیس کے آنے سے پہلے اس کا تخت ہمارے سامنے لے آئے؟ اللہ نے ہمیں اس طرح خبر دی ہے کہ

قال عفریت من الجن انا اتیك به قبل ان تقوم من مقامك۔	جنات میں سے ایک دیو نے کہا میں آپ کی مجلس برخاست ہونے سے پہلے لے آؤں گا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا اس سے جلدی درکار ہے۔ حضرت آصف بن برخیا نے عرض کیا۔

انا اٰتیك به قبل ان یرتد الیك طرفك فلما راٰه مستقرا۔	میں اسے آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے لے آؤں گا پھر جب نظر اٹھائی تو تخت موجود تھا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے حضرت آصف کی اس تعمیل پر نہ حیرت کا اظہار فرمایا نہ انکار کیا اور نہ اسے محال جانا۔ حالانکہ یہ کسی حال میں معجزہ نہ تھا۔ کیونکہ حضرت آصف نبی نہ تھے لامحالہ یہی کہا جائے گا کہ یہ کرامت تھی۔ اگر معجزہ ہوتا تو اس کا ظہور حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ سے ہونا چاہئے تھے۔

تیسری دلیل پر سب کا اتفاق ہے کہ حضرت مریم سلام اللہ علیہا نبی نہ تھیں۔ اللہ تعالےٰ نے ان کے حال کی صریح طور پر خبر دی کہ

وھزی الیك بجذع النخلة تساقط علیك رطبا جنیا	اے مریم کھجور کے درخت کی ٹہنی اپنی طرف ہلاؤ وہ تم پر تر و تازہ کھجوریں گرائے گا۔

اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں کے قصہ میں ہمیں خبر دی کہ جب زکریا علیہ السلام ان کے

پاس تشریف لاتے تو ان کے پاس گرمی کے موسم میں سردی کے میوے اور سردی کے موسم میں گرمی کے میوے موجود پاتے۔ چنانچہ حضرت زکریا علیہ السلام نے ان سے پوچھا۔

انّی لک ھٰذا قالت ھو من عند اللّٰہ۔	تمہارے پاس یہ میوے کہاں سے آئے تو مریم نے کہا یہ اللہ تعالیٰ نے بھیجے ہیں۔

چوتھی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اصحابِ کہف کے حالات میں ان کے کتے کا ان سے کلام کرنے اور غار میں دائیں بائیں پہلو بدلتے رہنے کی خبر دی ہے کہ

و نقلبھم ذات الیمین و ذات الشمال و کلبھم باسط ذراعیہ	ہم انھیں دائیں اور بائیں پہلو بدلتے رہتے ہیں اور ان کا کتا دونوں بازو پھیلائے بیٹھا ہے۔

مذکورہ تمام افعال خرق عادات سے تعلق رکھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ معجزے نہیں ہیں۔ لامحالہ انھیں کرامت ہی کہنا چاہئے۔ خواہ یہ کرامتیں قبولیت دعا کے معنی میں ہوں جو تکلیف کے زمانے میں امور موہوم کے حاصل ہونے کے لئے ہوں، خواہ طویل مسافت، مختصر وقت میں طے کرنا ہو، خواہ طعام کا ظاہر ہونا غیر متوقع جگہ سے ہوا ہو۔ خواہ لوگوں کے ذہنوں میں شرافت و بزرگی جمانی مقصود ہو یا کسی اور سلسلہ میں ہو۔

احادیث سے کرامت کا ثبوت

احادیثِ صحیحہ میں حدیث غار مشہور و معروف ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک روز صحابہ کرامؓ نے حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا! یارسول اللہ! گزشتہ امتوں کے احوال میں سے کوئی عجیب چیز بیان فرمایئے؟ حضور ﷺ نے فرمایا گزشتہ زمانہ میں تین شخص کہیں جا رہے تھے۔ جب رات کا وقت آیا تو ایک غار میں چلے گئے اور وہاں سو گئے۔ جب رات کا ایک پہر گزرا تو پہاڑ سے ایک بڑا پتھر لڑھکا اور غار کے منہ پر آ گرا جس سے دہانہ بند ہو گیا۔ سب پریشان ہو کر کہنے لگے اب یہاں سے ہماری خلاصی ممکن نہیں جب تک کہ ہر ایک اپنے اپنے اُن افعال کو یاد کر کے (جو بغیر ریاکاری کیے ہوں) خدا کی بارگاہ میں توبہ نہ کرلے۔ چنانچہ ایک نے کہا میرے ماں باپ بوڑھے اور ضعیف تھے اور میرے پاس سوائے ایک بکری کے کوئی دنیاوی مال نہ تھا میں بکری کا دودھ انھیں پلاتا تھا اور خود روزانہ لکڑیاں کاٹ کر لاتا اور انھیں فروخت کر کے اپنا اور ان کا کھانا تیار کرتا تھا۔ اتفاق سے ایک رات دیر

سے آیا اور وہ بغیر دودھ پیے اور کھانا کھائے سو گئے، میں بھی کچھ کھائے پیے بغیر دودھ کا پیالہ ہاتھ میں لئے ان کی بیداری کے انتظار میں کھڑا رہا یہاں تک کہ ساری رات بیت گئی صبح دم وہ بیدار ہوئے اور کھانا کھایا اس کے بعد میں بیٹھا۔ پھر اس نے دعا مانگی کہ اے خدا اگر میں صحیح کہہ رہا ہوں تو ہمارے لئے راستہ کھول دے اور ہماری فریاد کو قبول فرما۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس وقت اس پتھر نے جنبش کی اور تھوڑا سا دہانہ سے سرک گیا۔ اس کے بعد دوسرے نے کہا میرے چچا کی ایک خوبصورت لڑکی تھی میں اس پر فریفتہ تھا میں اسے بلاتا تھا مگر وہ منظور نہ کرتی تھی یہاں تک کہ میں نے ایک دن بہانے سے دو ہزار اشرفیاں بھیجیں تا کہ ایک رات میرے پاس گزارے۔ جب وہ میرے پاس آئی تو میرا دل خوفِ خدا سے کانپ اُٹھا اور میں نے اسے چھوڑ دیا اور اشرفیاں بھی اس کے پاس رہنے دیں اس کے بعد اس نے دعا مانگی کہ اے خدا اگر میں سچ کہہ رہا ہوں تو ہمارے لئے راستہ کھول دے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ پتھر نے جنبش کی اور وہ دہانہ سے کچھ اور ہٹ گیا لیکن ابھی اتنا راستہ نہ ہوا تھا کہ اس سے گزر سکیں۔ پھر تیسرے شخص نے کہنا شروع کیا میرے پاس کچھ مزدور کام کرتے تھے۔ جب کام ختم ہو گیا تو تمام مزدوروں کو اجرت دے کر رخصت کر دیا۔ لیکن ایک مزدور ان میں سے غائب تھا۔ میں نے اس کی مزدوری سے ایک بھیڑ خریدی دوسرے سال وہ ۲ ہو گئیں۔ تیسرے سال وہ چار ہو گئیں ہر سال وہ اسی طرح بڑھتی رہیں یہاں تک کہ چند سالوں میں ایک ریوڑ بن گیا۔ اس وقت وہ مزدور آیا اس نے کہا تم کو یاد ہو گا کہ فلاں وقت میں نے تمہاری مزدوری کی تھی اب مجھے اس کی مزدوری چاہئے۔ میں نے کہا وہ تمام بھیڑیں لے جاؤ وہ سب تمہارا مال ہے تم اس کے مالک ہو اس نے کہا تم مجھ سے مذاق کرتے ہو میں نے کہا نہیں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں میں نے وہ تمام مال تمہارے لئے ہی جمع کر کے رکھا ہے تم انھیں لے جاؤ اس کے بعد اس نے دعا مانگی کہ اے خدا اگر میں سچ کہہ رہا ہوں تو ہمارے لئے راستہ کھول دے۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ پتھر غار کے دہانہ سے بالکل ہٹ گیا اور یہ تینوں باہر نکل آئے۔ یہ فعل بھی خرقِ عادت ہی تھا۔

(۲) جریج راہب والی ایک حدیث مشہور ہے جسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شیر خوارگی کے زمانہ میں کسی نے جھولے میں کلام نہ کیا بجز تین شخصوں کے ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جن کا حال سب کو معلوم ہے اور دوسرے بنی اسرائیل میں جریج نامی ایک راہب نے جو ایک مجتہد شخص تھا اس کی ماں پردہ نشین عورت

تھی۔ ایک دن وہ اپنے بیٹے جریج کو دیکھنے آئے وہ خانہ ءخدا کے حجرے میں نماز پڑھ رہا تھا۔ دروازہ نہ کھلا، دوسرے اور تیسرے دن بھی ایسا ہی ہوا اس کی ماں نے دل برداشتہ ہو کر بددعا کی کہ اے خدا میرے بیٹے کو میرے حق میں نکال کر رسوا کر دے۔ اسی دوران ایک فاحشہ عورت نے ایک گروہ کی خوشنودی اور خوشامد کی خاطر وعدہ کیا کہ میں جریج کو بے راہ کر دوں گی۔ چنانچہ وہ اس کے حجرے میں گھس آئی لیکن جریج نے اس کی طرف التفات تک نہ کیا۔ واپسی پر اسی عورت نے راستہ میں ایک چرواہے کے پاس رات گزاری اور وہ اس سے حاملہ ہو گئی جب وہ بستی میں آئی تو کہنے لگی کہ یہ حمل جریج نامی راہب کا ہے۔ جب اس عورت نے بچہ جنا تو لوگوں نے جریج کے حجرے میں گھس کر اسے پکڑ لیا اور بادشاہ کے سامنے لے گئے جریج نے نوزائیدہ بچے کی طرف متوجہ ہو کر کہا اے بچے! بتا تیرا باپ کون ہے؟ بچے نے جواب دیا اے جریج! میری ماں نے تم پر الزام و بہتان باندھا ہے۔ میرا باپ فلاں چرواہا ہے۔

شیر خوارگی میں کلام کرنے والا تیسرا بچہ اس عورت کا ہے جو اپنے گھر کے دروازے پر بن سنور کر بیٹھی تھی ایک حسین و جمیل سوار عورت کے آگے سے گزرا۔ اس عورت نے دعا مانگی کہ اے خدا میرے بچہ کو اس سوار کی مانند بنا دے۔ اس شیر خوار بچے نے کہا اے خدا! مجھے ایسا نہ کر۔ کچھ دیر بعد ایک بدنام عورت گزری۔ بچہ کی ماں نے کہا۔ اے خدا! میرے بچہ کو اس جیسا نہ بنا۔ اس وقت بچہ نے کہا اے خدا! مجھے اس عورت جیسا کر دے۔ بچہ کی ماں نے متعجب ہو کر پوچھا ایسا کیوں کہتا ہے؟ بچے نے جواب دیا وہ سوار متکبر اور ظالم ہے اور یہ عورت اصلاح پسند ہے لیکن لوگ اسے بُرا کہتے ہیں۔ حالانکہ وہ اسے پہچانتے نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میں ظالموں اور متکبروں میں سے ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اصلاح کرنے والا بنوں۔

(۳) ایک اور حدیث امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی باندی زائدہ کی مشہور ہے۔ ایک دن زائدہ حضور اکرم ﷺ کی بارگاہ میں آئی۔ اس نے سلام عرض کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا زائدہ اتنے دنوں کے بعد کیوں آئی ہے حالانکہ تو فرمانبردار ہے اور میں تجھے پسند بھی کرتا ہوں۔ اس نے عرض کیا یارسول اللہ میں ایک عجیب بات عرض کرنے کے لئے حاضر ہوئی ہوں۔ فرمایا وہ کیا بات ہے؟ اس نے کہا، صبح کے وقت میں لکڑیاں تلاش کرنے نکلی اور ایک گٹھڑ باندھ کر پتھر پر رکھا تاکہ اسے میں اٹھا کر سر پر رکھوں اتنے میں ایک سوار کو آسمان سے زمین پر اترتے دیکھا اس نے پہلے مجھے سلام کیا اور پھر کہا حضور اکرم ﷺ سے میرا سلام عرض کرنا اور کہنا

کہ خازنِ جنت رضوان نے سلام پیش کیا ہے اور آپ کو بشارت دی ہے کہ جنت کو آپ کی کرامت کے لئے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک حصہ تو ان لوگوں کے لئے ہے جو بے حساب جنت میں داخل ہوں گے اور ایک حصہ ان لوگوں کی لئے ہے جن پر حساب آسان ہو گا۔ اور ایک حصہ ان لوگوں کے لئے جو آپ کی سفارش اور آپ کے وسیلہ سے بخشے جائیں گے۔ یہ کہہ کر وہ سوار آسمان پر چڑھنے لگا پھر زمین و آسمان کے درمیان میری طرف رُخ کر کے اس نے دیکھا میں لکڑی کا گٹھڑ اٹھا کر سر پر رکھنا چاہتی ہوں لیکن وہ مجھ سے اٹھایا نہیں جا رہا تھا۔ اس سوار نے کہا اے زائدہ اسے پتھر پر ہی رہنے دو۔ پھر پتھر سے کہا اے پتھر! اس پتھر کو زائدہ کے ساتھ حضرت عمرؓ کے مکان تک پہنچا دے اس پتھر نے ایسا ہی کیا۔ اور وہ پتھر گھر تک پہنچا گیا۔ نبی کریم ﷺ اُٹھے اور اپنے صحابہ کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لائے اور پتھر کے آنے اور جانے کا نشان ملاحظہ فرمایا۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا الحمد للہ! خدا نے مجھے دنیا سے اس حال میں رخصت فرمایا ہے کہ رضوان کے ذریعہ میری امت کی بشارت مرحمت فرمائی اور میری امت میں سے ایک عورت جس کا نام زائدہ ہے اسے مریم سلام اللہ علیہا کے درجہ پر فائز کیا ہے۔

(۴) مشہور واقعہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت علاء بن حضرمیؓ کی سرکردگی میں ایک لشکر روانہ فرمایا۔ سفر کے دوران ایک نہر پڑی لشکریوں نے اس میں قدم ڈال دیئے۔ سب گذر گئے اور کسی کا پاؤں تک نہ بھیگا۔

اولیائے امتِ محمدیہ کے کرامات

(اولیائے امتِ محمدیہ کے کرامات اگرچہ اس کتاب میں جا بجا ہیں تکرار کے لحاظ سے ان کا اعادہ نہیں کیا جا رہا ہے مزید چند جھلکیاں پیش کی جا رہی ہیں جو اہم ہیں)

(۱) حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا واقعہ ہے کہ وہ کسی سفر میں جا رہے تھے آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ سرِ راہ ایک جماعت خوفزدہ کھڑی ہے اور ایک شیر ان کا راستہ رو کے کھڑا ہوا ہے۔ حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے شیر کو مخاطب کر کے فرمایا اے کتے! اگر تو اللہ تعالٰے کے حکم سے راستہ رو کے کھڑا ہے تو ہمیں راستہ نہ دے اگر خدا کے حکم سے نہیں تو راستہ چھوڑ دے۔ شیر اٹھا اور ان کے آگے سر جھکا دیا اور راستہ سے ہٹ گیا۔

(۲) ایک بہادر عجمی شخص مدینہ منورہ آیا اس نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی بابت دریافت کیا لوگوں نے بتایا کسی جھونپڑے میں سو رہے ہوں گے۔ چنانچہ اس حال میں ان کو سوتا پایا

کہ کوزہ ان کے سر کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے دل میں کہا جہان میں سارا فتنہ انھیں کے دَم کا ہے اس وقت ان کا مار ڈالنا۔ بہت آسان ہے۔ اس نے قتل کے ارادہ سے تلوار سونتی۔ اتنے میں دو شیر نمودار ہوئے دونوں نے اس پر حملہ کر دیا اس نے مدد کے لئے پکارا اس کی چیخ و پکار سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیدار ہو گئے۔ پھر اس نے سارا قصہ بیان کیا اور اسلام قبول کر لیا۔

(۳) حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانہء خلافت میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ (امیر لشکر اسلام) کے پاس، سوادِ عراق سے تحفوں میں ایک ڈبہ لائے جس میں زہر قاتل تھا۔ اس سے زیادہ مہلک زہر اور کوئی نہ تھا۔ حضرت خالد نے اس ڈبہ کو کھولا اور زہر کو ہتھیلی میں رکھ کر بسم اللہ پڑھی اور منہ میں ڈال لیا۔ زہر نے انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ لوگ حیران رہ گئے اور ان میں سے بکثرت لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔

(۴) حضرت ابوالدرداء اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہما دونوں ایک جگہ کھانا کھا رہے تھے اور کھانے میں تسبیح کی آواز سُن رہے تھے۔

(۵) حضرت ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ انھوں نے ایک شخص کو ہوا میں بیٹھا دیکھا۔ انھوں نے اس سے پوچھا اے بندۂ خدا، تجھے یہ کمال کس چیز سے حاصل ہوا۔ اس نے کہا تھوڑی سی چیز سے۔ پوچھا وہ کیا چیز ہے؟ اس نے کہا میں نے دُنیا سے منہ موڑ لیا ہے۔ اور خدا کے فرمان سے دل لگا لیا ہے اس نے کہا اب تم کیا چاہتے ہو؟ میں نے کہا یہ ایک مکان ہوا میں ہوتا کہ میرا دل لوگوں سے جدا ہو جائے۔

(۶) حضرت حسن بصری رحمتہ الہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ ایک حبشی عابد ویرانوں میں رہا کرتا تھا۔ ایک دن میں بازار سے کچھ خرید کر اس کے پاس لے گیا۔ اس نے پوچھا کیا چیز ہے؟ میں نے کہا کچھ کھانے کی چیزیں ہیں اس خیال سے لایا ہوں کہ شاید تمہیں حاجت ہو؟ وہ میری طرف دیکھ کر ہنسا اور ہاتھ کا اشارہ کیا میں نے دیکھا کہ اس ویران مکان کے تمام اینٹ پتھر سونے کے بن گئے ہیں میں اپنے کئے پر شرمندہ ہوا اور جو لے گیا تھا اسے چھوڑ کر عابد کے رعب سے بھاگ کھڑا ہوا۔

(۷) حضرت ابراہیم ادہم رحمتہ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک چرواہے کے پاس سے گزرا اور اس سے پانی مانگا۔ اس نے کہا میرے پاس دودھ ہے پانی کیوں مانگتے ہو؟ میں نے کہا مجھے پانی ہی چاہیئے وہ اٹھا اور ایک لکڑی کو پتھر پر مارا اس پتھر سے صاف و شیریں پانی جاری ہو گیا اس کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا؟ اس نے مجھ سے کہا حیرت و تعجب نہ کرو جب بندہ حق تعالیٰ کا

فرمانبردار ہو جاتا ہے تو سارا جہان اس کے حکم کے تابع ہو جاتا ہے۔

حضرت ابوسعید خراز رحمتہ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میں جنگل میں سفر کر رہا تھا میرا معمول تھا کہ ہر تیسرے دن کھانا کھاتا تھا جب تیسرے دن کے بعد پھر تیسرا دن گزر گیا تو کھانا نہ ملنے کی وجہ سے مجھے کمزوری معلوم ہونے لگی۔ بدن غذا مانگ رہا تھا۔ میں نقاہت سے ایک جگہ بیٹھ گیا غیب سے آواز آئی اے ابوسعید نفس کے آرام کے لئے کھانا چاہتے ہو یا وہ سبب چاہتے ہو جو بغیر غذا کے کمزوری دور کر دے؟ میں نے عرض کیا اے خدا مجھے قوت چاہئے۔ اسی وقت توانائی آ گئی اور اٹھ کر سفر شروع کر دیا اور بغیر کھائے پئے بارہ منزلیں (بارہ دن میں) اور طے کر لیں۔

(۹) مشہور ہے کہ شہر تستر میں حضرت سہل بن عبداللہ تستری کے گھر کو لوگ بیت السباع کہتے ہیں اور تستر کے باشندوں کا کہنا ہے کہ ان کے پاس بکثرت درندے اور شیر وغیرہ آتے ہیں اور وہ ان کو کھلاتے اور خاطر داری کرتے ہیں۔

(۱۰) حضرت ابوالقاسم مروزی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابوسعید خرازی کے ساتھ دریا کے کنارے جا رہا تھا۔ میں نے ایک گدڑی پوش جوان کو دیکھا پہاڑ کی کھوہ میں ایک توشہ دان لٹکا ہوا تھا۔ حضرت ابوسعید نے فرمایا اس نوجوان کی پیشانی سے ظاہر تھا کہ یہ طریقت میں ضرور کوئی مقام رکھتا ہے جب اس نوجوان کی طرف دیکھتا تھا تو کہتا تھا کہ یہ واصل ہے اور جب توشہ دان پر نظر پڑتی تھی تو خیال آتا تھا کہ یہ ابھی طالب راہ ہے۔ انھوں نے فرمایا آؤ اس سے دریافت کریں کہ کیا حال ہے؟ چنانچہ حضرت خراز نے پوچھا اے نوجوان خدا کی راہ کون سی ہے؟ اس نے جواب دیا خدا کے دو راستے ہیں ایک عوام کی راہ دوسری خواص کی لیکن تمہیں خواص کی راہ کا تو پتہ ہی نہیں۔ البتہ عوام کی راہ وہ ہے جس پر تم گامزن ہو اور اپنی ریاضت و مجاہدے کو وصولِ حق کا ذریعہ بنائے ہوئے ہو اس توشہ دان کو حجاب کا ذریعہ سمجھے ہوئے ہو۔

(۱۱) حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں کچھ لوگوں کے ساتھ کشتی میں سفر کر رہا تھا اور مصر سے جدہ کا ارادہ تھا۔ ایک جوان بھی گدڑی پہنے شریک سفر ہو گیا۔ مجھے خواہش ہوئی کہ میں اس کی صحبت میں بیٹھوں۔ مگر اس کے رعب و ہیبت سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی کیونکہ وہ بہت ہی معزز تھا اور اسکا کوئی لمحہ عبادت سے خالی نہ تھا۔ یہاں تک کہ ایک دن ایک شخص کے جواہرات کی تھیلی گم ہو گئی۔ اس تھیلی کے مالک نے اس جوان پر الزام لگایا اور وہ چاہتا تھا کہ اس پر سختی کرے۔ میں نے اس سے کہا تم اس سے بات نہ کرو۔ میں

اس سے ابھی معلوم کیئے لیتا ہوں۔ چنانچہ میں اس کے پاس گیا اور نرمی سے بات کر کے بتایا کہ یہ لوگ تم پر ایسا شک کرتے ہیں۔ اور میں نے ان کو ظلم وسختی سے روکا ہے۔ اب کیا کرنا چاہیئے؟ اس نے آسمان کی طرف سر اٹھایا اور کچھ پڑھا۔ میں نے دیکھا کہ مچھلیاں منہ میں ایک ایک موتی دبائے نکل آئیں۔ اس جوان نے ان میں سے ایک موتی لیا اور اس شخص کو دے دیا۔ کشتی میں تمام لوگ اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ وہ جوان اٹھا اور پانی پر قدم رکھ کر چلا گیا۔ جس نے وہ تھیلی چرائی تھی وہ کشتی ہی میں تھا اس نے اسے نکال کر ڈال دیا۔ تمام کشتی والے شرمندہ ہو کر رہ گئے۔

(۱۲) حضرت ابراہیم رقیؒ علیہ الرحمتہ بیان کرتے ہیں کہ میں ابتدائے احوال میں حضرت مسلم مغربی کی زیارت کرنے گیا۔ جب میں مسجد میں داخل ہوا تو وہ نماز کی امامت کر رہے تھے اور قراءت میں الحمد غلط پڑھ رہے تھے میں نے دل میں خیال کیا کہ میری محنت ضائع گئی۔ اس رات میں وہیں رہا دوسرے دن طہارت کے وقت اٹھا تاکہ نہر فرات کے کنارے جا کر وضو کر لوں۔ راستہ میں ایک شیر سوتا دکھائی دیا۔ میں واپس آنے لگا اتنے میں ایک اور شیر چیختا ہوا میرے عقب میں آگیا۔ میں مجبور ہو کر رک گیا۔ اس وقت حضرت مسلم مغربی اپنے حجرے سے باہر تشریف لائے جب شیروں نے انہیں دیکھا تو سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے دونوں کے کان پکڑ کر سرزنش کی اور فرمایا اے خدا کے کتو! میں نے تم سے نہیں کہا ہے کہ میرے مہمانوں کو پریشان نہ کیا کرو۔ اور میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا اے ابوالحسن! تم لوگوں کی ظاہری درستگی کے درپے ہو اور حال یہ ہے کہ تم مخلوق خدا سے ڈرتے ہو۔ اور میں حق تعالیٰ سے ڈرتا ہوں اور باطن کی درستگی کے درپے ہوں۔ مخلوقِ خدا ہم سے ڈرتی ہے۔

(۱۳) ایک دن میرے مرشد (علی بن عثمان ہجویری کے مرشد) برحق رحمتہ اللہ علیہ نے بیت الجن سے دمشق جانے کا ارادہ فرمایا۔ بارش ہو رہی تھی مجھے کیچڑ میں چلنے سے دشواری ہو رہی تھی۔ مگر جب میں نے اپنے مرشد کی طرف دیکھا تو ان کے کپڑے اور جوتیاں خشک تھیں میں نے اُن سے عرض کیا تو فرمایا ہاں! جب سے میں نے توکل کی راہ میں اپنے قصد اور ارادہ کو ختم کر کے باطن کو لالچ کی وحشت سے محفوظ کر لیا ہے اس وقت سے اللہ تعالٰے نے مجھے کیچڑ سے بچا لیا ہے۔

(۱۴) حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ اس کا حل میرے لئے دشوار ہو گیا۔ میں حضرت شیخ ابوالقاسم گرگانی کی زیارت کرنے طوس پہنچا میں نے ان کو اپنے مکان کی مسجد میں تنہا پایا۔ انھوں نے بعینہ میری مشکل کو مسجد کے ستون کو مخاطب کر کے بیان کرنا شروع کر دیا۔ میں نے عرض کیا اے شیخ! یہ بات آپ کس سے فرما رہے

ہیں۔ انھوں نے فرمایا اے فرزند! حق تعالےٰ نے اسی وقت اس ستون کو مجھ سے بات کرنے کا حکم دیا اور اس نے مجھ سے یہ سوال کیا اور میں نے اس کو یہ جواب دیا (اس طرح میرے باطن کی عقدہ کشائی بغیر عرض کئے انھوں نے فرمادی)۔

(۱۵) فرغانہ میں ایک گاؤں سلانگ نامی ہے، وہاں ایک بزرگ زمین کے اوتاد میں سے تھے جنھیں لوگ بابِ عمر کہتے تھے چونکہ اس شہر کے تمام مشائخ سب سے بڑے بزرگ کو باب کہا کرتے تھے۔ ان کے یہاں فاطمہ نام کی ایک بوڑھی عورت تھی میں نے ان کی زیارت کا ارادہ کیا۔ جب ان کے روبرو پہنچا تو انھوں نے پوچھا کس لئے آئے ہو؟ میں نے عرض کیا آپ کی زیارت کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ شیخ نے شفقت و مہربانی سے میری طرف دیکھا اور فرمایا اے فرزند! میں فلاں روز سے برابر تمہیں دیکھ رہا ہوں اور جب تک تم مجھ سے روپوش نہ ہو جاؤ گے میں تم کو برابر دیکھتا رہوں گا جب میں نے ان کے بتائے ہوئے دن پر غور کیا تو وہی دن اور سال تھا جو میری توبہ اور بیعت کا ابتدائی دن تھا۔ پھر فرمایا اے فرزند! مسافت طے کرنا بچوں کا کام ہے لہٰذا اس ملاقات کے بعد ہمت کرو کہ حضورِ قلب حاصل ہو اس سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔ اس کے بعد فرمایا اے فاطمہ! جو ہو لے آؤ تا کہ اس درویش کی کچھ خاطر کی جاسکے۔ وہ ایک طباق میں تازہ انگور لائی حالانکہ وہ موسم انگوروں کا نہ تھا۔ اس طباق میں کچھ تازہ کھجوریں بھی تھیں حالانکہ فرغانہ میں کھجوریں ہوتی ہی نہ تھیں۔

(۱۶) مہنہ میں ایک دن حضرت شیخ ابوسعید رحمۃ اللہ کے مزار پر حسبِ عادت تنہا بیٹھا تھا۔ ایک سفید کبوتر دکھائی دیا جو قبر کے اوپر پڑی ہوئی چادر کے نیچے چلا گیا میں نے خیال کیا کہ غالباً یہ کبوتر کسی کا چھوڑا ہوا ہے۔ میں اٹھا اور چادر اٹھا کر دیکھا مگر وہاں کچھ نہ تھا دوسرے اور تیسرے دن بھی میں نے ایسا ہی دیکھا۔ میں حیرت و تعجب میں پڑ گیا۔ یہاں تک کہ ایک رات میں نے انھیں خواب میں دیکھا اور اس واقعہ کی بابت ان سے دریافت کیا۔ انھوں نے فرمایا وہ کبوتر میرے معاملہ کی صفائی ہے جو روزانہ قبر میں میری ہم نشینی کے لئے آتا ہے۔

(۱۷) حضرت ابوبکر وراق رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن حضرت محمد بن علی حکم ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف کے کچھ اوراق مجھے دیئے کہ میں اسے دریائے جیحون میں ڈال دوں۔ جب باہر آکر میں نے دیکھا تو وہ لطائف و نکات سے پُر تھے۔ میرے دل نے کسی طرح قبول نہ کیا کہ دریا میں یونہی ضائع کردوں۔ انھیں اپنے گھر رکھ کر واپس آگیا۔ اور کہہ دیا کہ میں

نے دریا برد کردیئے۔ انھوں نے پوچھا تم نے کیا ماجرا دیکھا؟ میں نے عرض کیا میں نے تو کچھ بھی نہیں دیکھا۔ فرمایا تم نے دریا میں نہیں ڈالے۔ جاؤ انھیں دریا میں ڈال کر آؤ۔ حضرت ابوبکر وراقؒ بیان کرتے ہیں کہ اس وقت میرے لئے دو مشکلیں تھی ایک یہ کہ پانی میں ڈالنے کا کیوں حکم دیا جارہا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ کیا خاص بات ظاہر ہوگی جس کی بابت مجھ سے پوچھا جارہا ہے؟ ناچار میں اٹھا اور دردِ دل کے ساتھ ان اوراق کو جیحون کے کنارے لاکر خود انھیں اپنے ہاتھ سے پانی میں ڈال دیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ پانی کی سطح پھٹی اور ایک صندوق برآمد ہوا جس کا ڈھکنا کھلا ہوا تھا یہ اوراق اس صندوق میں جا گرے اور اس کا ڈھکنا بند ہو کر پانی کے تہہ میں روپوش ہو گیا۔ واپس آکر تمام سرگزشت بیان کردی۔ انھوں نے فرمایا ہاں اب تم نے ڈالا ہے۔ میں نے عرض کیا یا شیخ! آپ کو عزتِ ذوالجلال کی قسم! یہ کیا اسرار ہیں؟ مجھ پر واضح فرمایئے؟ انھوں نے فرمایا اے فرزند! میں نے علم مشائخ پر یہ کتاب لکھی تھی چونکہ ان کی تحقیق معقولات کے لئے دشوار تھی میرے بھائی حضرت خضر علیہ السلام نے مجھ سے مانگا تھا وہ آہنی صندوق ان کے حکم سے آیا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے پانی کو حکم دیا کہ وہ ان تک پہنچادے۔

اس طرح کی حکایات وکرامات اس قدر ہیں کہ وہ ختم ہی نہیں ہوسکتیں چونکہ میرا مقصد اصولِ طریقت کا اثبات ہے اس لئے اس پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اب میں مذاہب کے بارے میں چند اہم عنوان شامل کتاب کرتا ہوں تاکہ حصولِ معنی کے لئے کسی اور جگہ نہ جانا پڑے۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔

اولیاء پر انبیاء کی فضیلت

واضح رہنا چاہئے کہ تمام احوال وواقعات میں باتفاق تمام مشائخ طریقت، اولیاء کرام انبیاء کے متبع اور ان کے دعووں کی تصدیق کرنے والے ہیں۔ اور انبیاء علیہم السلام، اولیاء سے افضل ہیں۔ اس لئے کہ جہاں ولایت کی انتہا ہے وہاں سے نبوت کی ابتداء ہے۔ تمام انبیاء لازماً اولیاء ہیں۔ لیکن اولیاء میں سے کوئی نبی نہیں۔ اور انبیاء علیہم السلام صفاتِ بشریت کی نفی میں متمکن و برقرار ہیں۔ اور اولیاء اس میں عارضی ہیں اس لئے کہ اولیاء پر جو خاص کیفیت طاری ہوتی ہے وہ انبیاء کا دائمی مقام ہے۔ اور اولیاء کا جو مقام ہوتا ہے وہ انبیاء کے لئے حجاب ہوتا ہے۔

علمائے اہلِ سنت اور محققین اہل طریقت کا اس معنی میں کوئی اختلاف نہیں ہے البتہ خراسان کے فرقہ حشویہ نے اختلاف کیا ہے جو سراپا عیب مجسم ہیں انھوں نے اصل توحید میں

متناقض اور متخالف باتیں کہی ہیں حالانکہ انھیں طریقت کی ہوا تک نہیں لگی ہے۔ بایں جہالت وہ ولایت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے وہ ولی ضرور ہیں لیکن وہ شیطان کے ولی ہیں رحمٰن کے نہیں۔

حشوی ٹولہ کہتا ہے کہ اولیاء انبیاء سے افضل ہیں (معاذ اللہ) ان کی گمراہی کے لئے یہی قول کافی ہے کہ وہ ایک جاہل کو حضور اکرم ﷺ سے افضل کہتے ہیں۔ ایک گروہ اور ہے جن کو مشبہ کہتے ہیں وہ بھی طریقت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے لئے نزول وحلول بمعنی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کو جائز جانتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لئے تجزی یعنی اعضاء وجوارح کو جائز مانتے ہیں۔ طریقت میں یہی دُو مذہب مذموم و مردود ہیں۔ میں حسبِ وعدہ آخر کتاب میں ان دونوں فرقوں کا مکمل تذکرہ انشاء اللہ ضرور کروں گا خلاصہ یہ کہ یہی دُو گروہ مدعیِ اسلام ایسے ہیں جو انبیاء کرام علیہم السلام کی تخصیص کی نفی میں برہمنوں کے ہم نوا ہیں۔ اور جو بھی انبیاء کی تخصیص کے انکار پر اعتقاد رکھے گا وہ کافر ہے چونکہ انبیاء علیہم السلام حق تعالےٰ کی طرف بلانے والے اور امامِ مطلق ہیں۔ اور اولیاء کرام حسنِ اعتقاد کے ساتھ انبیاء کے متبع اور پیروکار ہیں۔ یہ محال ہے کہ مقتدی و ماموم، اپنے امام و رہنما سے افضل ہو۔ مختصراً یوں سمجھنا چاہئے کہ تمام اولیاء کے اقوال وانفاس اور ان کے معاملات کو صدق نبی کے پہلو میں رکھا جائے تو وہ تمام احوال انفاس پریشان اور معدوم نظر آئیں گے۔ اس لئے کہ اولیاء راہ حق کے طالب وسالک ہیں اور انبیاء بارگاہِ الٰہی کے واصل اور مقصود کو حاصل کئے ہوئے ہیں جو حکمِ دعوت وتبلیغ کے تحت رجوع ہو کر دعوت وتبلیغ فرماتے ہیں۔

ملحدوں کے اعتراضوں کے جوابات اگر کوئی مذکورہ ملحدوں میں سے (اللہ تعالیٰ ان پر لعنت کرے) یہ کہے کہ یہ قاعدہ ہے کہ جب کسی ملک کا قاصد دوسرے ملک میں آتا ہے تو وہ مبعوث الیہ یعنی جس کی طرف وہ بھیجا گیا ہو وہ ملک اس قاصد سے افضل ہوتا ہے جس طرح انبیاء علیہم السلام حضرت جبریل سے افضل ہیں۔ (حالانکہ ان کی پیدا کردہ یہ صورت غلط ہے) میں جواب میں کہتا ہوں اگر کسی ملک سے ایک شخص کی طرف قاصد آئے تو جس کی طرف وہ بھیجا گیا ہے قاصد سے افضل ہوگا۔ جیسے جبریل علیہ السلام ایک ایک رسول و نبی کے پاس آتے رہے تو وہ سب نبی ورسول جبریل علیہ السلام سے افضل ہیں۔ لیکن جب قاصد ورسول کی ایک جماعت کو اور کسی قوم کی طرف بھیجا جائے تو وہ قاصد ورسول یقیناً اس قوم وجماعت سے افضل ہوگا۔ جس

طرح ہر نبی اپنی اپنی امت کی طرف مبعوث ہوا۔ اور اس میں کسی ذی فہم کو حکم احادیث کے تحت اشتباہ نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا انبیاء علیہم السلام کا ایک ایک سانس اولیاء کی پوری زندگی سے افضل ہے۔ اسلئے کہ اولیاء جب اپنی عادت وعرف کے مطابق انتہا کو پہنچتے ہیں تب وہ مشاہدے کی خبر دیتے ہیں اور حجابِ بشریت سے خلاصی پاتے ہیں خواہ وہ کتنے ہی عین بشر کیوں نہ ہوں؟ لیکن نبی و رسول کا پہلا قدم ہی مشاہدے میں ہوتا ہے جب نبی و رسول کی ابتداء ولی کی انتہا ہوتی ہے تو ان کے ساتھ انھیں قیاس بھی نہیں کیا جاسکتا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ تمام طالبانِ حق، اولیاء کا اتفاق ہے کہ تفرقہ سے نکل کر مقام جمع میں ہونا کمالِ ولایت کی معراج ہے۔

تفرقہ وجمع کی صورت اس کی صورت یہ ہے کہ جب بندہ غلبہ محبت میں کسی منزل پر فائز ہوتا ہے تو اس کی عقل، فعل پر نظر کرنے سے عاجز ہو جاتی ہے اور شوقِ محبت میں فاعل حقیقی کا فعل ہی سارے جہان میں نظر آتا ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت ابو علی رودباری رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ:۔

لوزالت عنا رویته ماعبدناہ	اگر اس کا دیدار ہم سے جدا ہو جائے تو ہم سے بندگی کا نام جاتا رہے۔

اس لئے کہ عبادت کا شرف اس کے دیدار کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔ انبیاء کے لئے یہ معنی ان کے حال کی ابتداء ہے۔ کیونکہ انبیاء کی تمام زندگی میں تفرقہ کی صورت پیدا ہی نہیں ہوتی۔ اور ان کی نفی واثبات، مسلک ومقطع، اقبال واعراض اور بدایۃ ونہایۃ سب کے سب عین ہیں چنانچہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کا ابتدائی حال یہ ہے کہ جب آفتاب کو دیکھا تو فرمایا "ہٰذا ربّی" اور چاند ستاروں کو دیکھا تو فرمایا "ھذا ربی" اس کی وجہ یہ کہ آپ کے دل پر حق کا غلبہ تھا اور عین جمع میں اپنے اجتماع کے اندر غیر نظر آیا ہی نہیں۔ اگر نظر ڈالی بھی تو دیدہ جمع کی نظر ڈالی، اور اپنی رویت سے بیزاری کے اظہار میں فرمایا:۔

لا احب الاٰفلین۔	یعنی میں روپوش ہونے والے کو پسند نہیں کرتا۔

گویا آپ کی ابتداء میں بھی جمع ہے اور انتہا میں بھی جمع۔ بلا شک وشبہ یہی ولایت کی ابتدا وانتہا ہے اور نبوت کی تو کوئی انتہا ہی نہیں ہے یہاں تک کہ ان کی ابتداء بھی نبوت سے ہے اور انتہا بھی نبوت پر۔ اور اس سے قبل جب کہ مخلوق موجود نہ تھی اس وقت بھی حق تعالیٰ کی مراد وہی تھے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا انبیاء علیہم السلام کے احوال کی بابت کچھ فرمایئے۔؟ انھوں نے فرمایا افسوس کہ ہمیں ان کے بارے میں کوئی اختیار نہیں۔ جو کچھ بھی ان کے بارے میں ہم کہیں گے وہ سب ہم ہی ہم ہوں گے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے نفی واثبات کو اس درجہ میں رکھا ہے کہ وہاں تک مخلوق کی نظر نہیں پہنچ سکتی۔ جس طرح اولیاء کے مرتبہ کے ادراک سے عام لوگ عاجز ہیں کیونکہ ان کا ادراک نہاں ہے اسی طرح اولیاء بھی انبیاء کے مرتبہ کے ادراک سے عاجز ہیں کیونکہ ان کا ادراک ان سے پوشیدہ ہے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ اپنے زمانہ کے مسلمہ صاحب حجت تھے وہ فرماتے ہیں کہ:۔

اول ما سرت الی الوحدانیة فصرت طیرًا جسمہ من الاحدیة وجناحه من الدیمومیة فلم ازل اطیرفی هواء الهویة حتی الی هواء التنزیهة ثم اشرفت علی میدان الازلیة ورأیته شجر الاحدیة فنظرت فعلمته ان هذا کله غیره

یعنی میں نے دیکھا کہ سب سے پہلے میرا باطن آسمانوں پر لے جایا گیا۔ (میں نے کسی چیز کی طرف نگاہ نہ ڈالی۔ جنت و دوزخ دکھائے گئے اس کی طرف بھی نگاہ نہ کی موجودات اور حجابات سے گزارا گیا ان کی طرف بھی التفات نہ کیا)''فصرت طیرًا''اس وقت میں ایک پرندہ بن گیا جس کا جسم، احدیت کا، اور اس کے بال و پر دیمومیت کے تھے۔ میں ذاتِ حق کی محبت میں مسلسل پرواز کرتا رہا یہاں تک کہ میں مقام تنزیہہ سے گزرا اور ازلیت کے میدان سے مشرف ہوا وہاں میں نے احدیت کے درخت دیکھے پھر جب میں نے نگاہ ڈالی تو وہ سب کچھ میں ہی میں تھا۔

اس وقت میں نے مناجات کی کہ اے خدا، میری خودی کو تیرا راستہ ہی نہیں ملتا۔ اور مجھے اپنی خودی سے نکلنے کی کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ میری رہنمائی فرما اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ فرمانِ حق آیا کہ اے بایزید! تمہاری اپنی خودی سے نجات، ہمارے دوست (یعنی محمد رسول اللہ ﷺ) کی متابعت سے وابستہ ہے۔ ان کے قدم مبارک کے نیچے کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بناؤ اور ان کی پیروی

میں ہمیشہ مصروف رہو۔ یہ حکایت بہت طویل ہے اہلِ طریقت اس کو حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ کی معراج کہتے ہیں معراج سے ان کی مراد قرب حق ہے۔

انبیاء کی معراج از روئے اظہار، ان کی ذات وجسم کے ساتھ ہے اور اولیاء کی معراج از روئے ہمت واسرار ہے۔ انبیاء کے اجسام صفاء و پاکیزگی اور قرب سے متصف ہیں۔ جس طرح اولیاء کے دل ان کے اسرار کا مسکن۔ اور یہ فضیلت ظاہر ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ولی کو اپنے حال میں مغلوب کر کے مدہوش کر دیا جاتا ہے پھر اس کے باطنی درجات کو اس سے غائب کر کے قربِ حق سے سرفراز کر دیا جاتا ہے جب ان کی واپسی حالت صحو کی طرف ہوتی ہے تو وہ تمام دلائل ان کے دل میں نقش زن ہوتے ہیں۔ اور ان کا علم اسے حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ ہستی جس کے جسم کو قربِ حق میں لے جایا جائے۔ یعنی نبی کو، اور وہ شخص جس کے فکر و باطن کو قرب میں لے جایا جائے یعنی ولی کو۔ ان دونوں کے درمیان بڑا فرق ہے واللہ اعلم بالصواب۔

فرشتوں پر انبیاء واولیاء کی فضیلت

واضح رہنا چاہئے کہ اہلِ سنت وجماعت اور جمہور مشائخ طریقت کا اس پر اتفاق ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور وہ اولیاء جو محفوظ ہیں فرشتوں سے افضل ہیں۔ اس مسئلہ میں معتزلہ کا اختلاف ہے۔ وہ فرشتوں کو انبیاء سے افضل کہتے ہیں۔ ان کا مذہب ہے کہ فرشتوں کا مرتبہ بلند، ان کی خلقت لطیف تر، اور وہ اللہ تعالیٰ کے سب سے بڑے فرمانبردار ہیں۔ اسی لئے بہتر ہے کہ انھیں افضل کہا جائے۔ ہم جواب میں کہتے ہیں کہ حقیقت تمہارے اس گمان کے خلاف ہے اس لئے کہ بدنی اطاعت بلند مرتبت اور لطیف خلقت فضل الٰہی کے لئے علت نہیں ہے فضیلت وہاں ہوتی ہے جہاں حق تعالیٰ رکھے جو کچھ تم فرشتوں کے لئے کہتے ہو وہ سب ابلیس کو بھی حاصل تھا لیکن باتفاق وہ ملعون ورسوا ہوا۔ لہٰذا فضیلت اسی کو ہے جسے حق تعالیٰ عطا فرما کر خلق پر برتری عطا فرمائے۔

انبیاء علیہم السلام کی افضلیت کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں۔ یہ قاعدہ مسلّم ہے کہ جسے سجدہ کیا جائے اس کا حال سجدہ کرنے والے کے حال سے بلند ہوتا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ خانہ کعبہ جو پتھر اور بے حس وحرکت جماد ہے مسلمان اس سے افضل ہو کر اس کی طرف سجدہ کرتے ہیں لہٰذا جائز ہے کہ فرشتے حضرت آدم علیہ السلام

سے افضل ہوں اگر وہ انھیں سجدہ کریں اس کا جواب ہم یہ دیں گے کہ کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ مسلمان خانہءکعبہ یا مسجد کے محراب و دیوار کو سجدہ کرتا ہے سب یہی کہتے ہیں کہ خدا کا سجدہ کرتے ہیں۔اور ہمارا یہ کہنا ہے کہ فرشتوں نے آدمؑ کو سجدہ کیا تھا اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے خدا کے حکم کی تعمیل میں سجدہ کیا تھا چنانچہ حق تعالیٰ نے حکم دیا کہ "اسجد وا لآدم "یعنی ہم فرشتوں کو حکم دیتے ہیں کہ وہ آدم کو سجدہ کریں۔اور جب مسلمانوں کو سجدہ کا حکم دیا گیا تو اس طرح فرمایا کہ:۔

واسجدو و اعبدوا ربکم وافعلوا الخیر الآیہ	اپنے رب کو سجدہ کرو اور اس کی بندگی بجالاؤ اور نیک کام کرو۔

لہٰذا خانہءکعبہ، آدم علیہ السلام کی مانند نہیں ہے۔ کیونکہ مسافر جب عبادت کرنا چاہتا ہے تو سواری کی پشت پر خدا کی نفلی عبادت کرتا ہے اگر سواری کا رخ خانہ کعبہ کی طرف نہ ہو تو معذور متصور ہوتا ہے۔اسی طرح وہ شخص جس پر سمتِ قبلہ ظاہر نہ ہو اور جنگل میں کوئی بتانے والا بھی نہ ہو تو وہ تحری کر کے جدھر دل متوجہ ہو کر رُخ کرے نماز ادا کر سکتا ہے؟ فرشتوں کو حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے میں عذر نہ ہوا۔اور جس نے اپنے لئے خود عذر گھڑا وہ معلون و رسوا ہوا۔اہلِ بصیرت کے لئے یہ دلائل واضح اور کافی ہیں۔

نیز یہ بھی واضح رہنا چاہئے کہ فرشتے اگرچہ معرفتِ الٰہی میں انبیاء کے برابر ہیں لیکن اس سے ان کے درجوں میں برابری کسی طرح ضروری نہیں کیونکہ فرشتوں کی خلقت میں نہ شہوت ہے نہ دل میں حرص و آز۔اور نہ طبع میں ذوق وحیلہ ہے۔ان کی غذا طاعت، ان کا پینا فرمانِ الٰہی پر اقامت ہے۔پھر یہ کہ آدمی کی سرشت شہوت سے مرکب ہے اس سے معاصی کا ارتکاب ممکن ہے اور دنیا کی زیب و زینت اس کے دل پر اثر انداز ہو سکتی ہے اس کی طبیعت میں حرص وحیلہ موجیں مار سکتا ہے اور شیطان کو اس کی ذات پر اتنا غلبہ حاصل ہے کہ وہ لوگوں میں خون کے ساتھ گردش کرتا ہے اور وہ اس نفس کے ساتھ چمٹا ہوا ہے جو تمام برائیوں اور آفتوں کا سرچشمہ ہے۔جس کے وجود میں یہ تمام باتیں شامل ہوں پھر وہ غلبہءشہوت کے امکان کے ساتھ فسق وفجور سے اجتناب کرے، سراپا حریص ہو کر دنیا سے منہ موڑ لے، دل میں شیطانی وسوسے باقی رہتے ہوئے معاصی سے رجوع وتوبہ کرے اور نفسانی آفتوں سے روگردانی کر

کے بندگی پر قائم اور طاعت پر مستحکم ہو کر مجاہدۂ نفس اور مجادلہ ءشیطان میں مشغول ہو در حقیقت وہ فرشتوں سے افضل ہے۔ کیونکہ فرشتوں کی خلقت میں نہ تو شہوت سے معرکہ آرائی ہے اور نہ ان کی طبیعت میں غذا و لذت کی خواہش۔ نہ بیوی بچوں کا غم نہ خویش و اقرباء کی مشغولیت نہ سبب و وسیلہ کے محتاج نہ امید و آفت کا استغراق ہے۔ ان میں سے مجھے اس شخص پر تعجب ہوتا ہے جو افعال و کردار میں فضل کو دیکھتا ہے یا خوبی و جمال میں عزت کو دیکھتا ہے یا عزت و مال میں بزرگی کو تلاش کرتا ہے وہ جلد ہی اس نعمت و بزرگی کو اپنے سے زائل دیکھے گا۔ وہ مالک الاعیان حق تعالیٰ کے افضال کو کیوں نہیں دیکھتا؟ رضائے الٰہی میں عزت اور معرفت و ایمان میں بزرگی کو کیوں نہیں دیکھتا تا کہ اس نعمت کو ہمیشہ موجود پائے اور اپنے دل کو دونوں جہان میں خوش اور شادماں دیکھے۔ جبریل علیہ السلام نے ہزار ہا سال خلعت کے انتظار میں خدا کی بندگی کی لیکن ان کی خلعت حضور سید عالم ﷺ کی خدمت گزاری میں تھی۔ یہاں تک کہ شب معراج حضور ﷺ کی سواری کی خدمت کی وہ کس طرح حضور ﷺ سے افضل ہو سکتے ہیں۔؟

جن بندگانِ خدا نے دنیا میں نفس کو مارنے میں ریاضتیں کیں رات دن مجاہدے کئے، حق تعالےٰ نے ان کے ساتھ مہربانی فرمائی اور اپنے دیدار سے سرفراز کر کے تمام خطرات سے محفوظ رکھا۔

جب فرشتوں کی نخوت حد سے بڑھ گئی اور ہر ایک نے اپنے معاملہ کی صفائی کو دلیل بنا کر بنی آدم کے بارے میں زبانِ ملامت دراز کی تو حق تعالیٰ نے چاہا کہ ان کا حال ان پر ظاہر فرمائے چنانچہ فرمایا اے فرشتو! اپنے میں سے تین ایسے بزرگ افراد کو منتخب کر لو جن پر تمہیں اعتماد ہو وہ زمین پر جا کر زمین کے خلیفہ ہو جائیں اور مخلوق خدا کو راہِ راست پر لائیں اور بنی آدم میں عدل و انصاف قائم کریں۔ فرشتوں نے تین فرشتے چن لئے ان میں سے ایک تو زمین پر آنے سے پہلے ہی زمین کی آفتوں کو دیکھ کر پناہ مانگ گیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس فرشتہ کو روک لیا اور باقی دو فرشتے زمین پر آئے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی سرشت اور خلقت کو بدل دیا۔ تا کہ کھانے پینے کے خواہشمند ہو کر شہوت کی طرف مائل ہوں۔ یہاں تک کہ اس پر انہیں مستوجبِ سزا بنایا۔ اس طرح فرشتوں نے بنی آدم کی فضیلت کا اندازہ کر لیا۔

خلاصہ ءکلام یہ کہ خواصِ مومن، خواصِ ملائکہ سے افضل اور عوام مومن، عام فرشتوں سے افضل ہیں۔ لہٰذا وہ جو معصوم و محفوظ نہیں وہ حفظہ اور کراماً کاتبین سے افضل ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اس معنی میں بکثرت اقوال ہیں ہر شیخ نے اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ فرمایا ہے اللہ تعالٰے جسے چاہتا ہے بزرگی سے سرفراز فرماتا ہے۔ وباللہ التوفیق۔

تصوف میں حکیمیوں کے مذہب کے متعلقات اور صوفیاء کے باہمی اختلافات یہ ہیں جن کو بطور اختصار ہم نے بیان کر دیا۔

درحقیقت ولایت اسرار الٰہی میں سے ایک سر ہے جو ریاضت و مجاہدہ اور تربیت شیخ کے بغیر ظاہر نہیں ہوتا۔ اور ولی کو ولی ہی پہچانتا ہے اگر اس حقیقت کا اظہار ہر صاحب عقل پر جائز ہوتا تو دوست و دشمن کی تمیز نہ رہتی۔ اور واصل بحق، غافل سے ممتاز نہ ہوتا۔ لہٰذا مشیت الٰہی یہی ہے کہ دوستی و محبت کے جوہر کو ذلّت وخواری کی سیپ یعنی صدف میں لوگوں سے محفوظ رکھا جائے اور اسے بلاؤں کے دریا میں چھپایا جائے۔ تاکہ اس کا طالب اپنی جانِ عزیز کو اس کے فرمان کے تحت خطرے میں ڈالے اس جان لیوا دریا میں گزارہ کرے اور دریا کی گہرائی میں غوطہ زن ہو کر اپنی مراد کو حاصل کرے۔ یا اسی طلب میں دنیا سے کوچ کر جائے۔ واللہ اعلم۔

۸۔ فرقۂ خرازیہ

خرازی فرقہ کے پیشوا، حضرت ابوسعید خرازی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ طریقت میں ان کی تصانیف، بکثرت ہیں اور تجرید وانقطاع میں ان کا مرتبہ عظیم ہے۔ فنا و بقا کے حال پر سب سے پہلے انھوں ہی نے گفتگو فرمائی اور طریقت کے تمام رموز کو آپ نے ان ہی ۲ دو کلموں میں پوشیدہ کر دیا ہے۔

اب میں ان کے معنی بیان کر کے جنھوں نے اس میں غلطیاں کی ہیں ظاہر کرتا ہوں تا کہ ان کے مذہب کی معرفت کے ساتھ ان کے استعمال کا مقصد سمجھا جا سکے۔

بقا اور فنا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

ما عندکم ینفدُ وما عند اللّٰہ باقٍ۔	جو تمہارے پاس ہے وہ فنا ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے باقی رہنے والا ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے کہ:۔

کل من علیها فانٍ ویبقیٰ وجهه ربك ذوالجلالِ والاکرام	روئے زمین پر جو کچھ ہے وہ فانی ہے اور تمہارے رب کی عزت و جلال والی ذات باقی رہنے والی ہے۔

واضح رہنا چاہئے کہ علم زبان میں فنا و بقا کے معنی اور ہیں اور اصطلاحِ طریقت اور زبانِ حال میں اس کے معنی اور ہیں، علماء ظواہر جس قدر ان کے معنی میں حیران ہیں اتنے اور کسی معنی میں نہیں ہیں۔ لہٰذا بقا کے معنی علم زبان اور اقتضائے لغت میں تین قسم کے ہیں، ایک یہ کہ بقا وہ ہے جس کا ابتدائی کنارہ بھی فنا ہو اور اس کا آخری کنارہ بھی فنا۔ مثلاً دنیا کہ یہ ابتداء میں بھی نہ تھی اور انتہا میں بھی نہ ہوگی اور موجودہ وقت باقی ہے۔ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ بقا سرے سے موجود ہی نہ ہو اور جب موجود ہو جائے تو پھر وہ فنا ہی نہ ہو۔ جیسے بہشت و دوزخ اور جہانِ آخرت اور اس کے رہنے والے ہیں۔ تیسرے معنی یہ ہیں کہ بقا نہ آگے معدوم ہو اور نہ پہلے معدوم تھی۔ یہ حق تعالیٰ کی ذات قدس اور اس کے صفات ہیں۔ جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ اپنی قدیم صفات کے ساتھ باقی رہے گا۔ اور دائمی بقا سے مراد اس کا دائمی وجود ہے اور کوئی بھی کسی نوعیت سے اس کی ذات و صفات میں شریک و سہیم نہیں ہے۔

فنا کا علم یہ ہے کہ تم نے جان لیا ہے کہ دنیا فانی ہے اور بقا کا علم یہ ہے کہ تم نے جان لیا ہے کہ آخرت باقی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

والاٰخرة خیر و ابقیٰ۔ آخرت بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔

اس آیت میں ابقیٰ کا کلمہ مبالغہ کے لئے ہے کیونکہ آخرت کی عمر کے لئے اس جہان میں فنا نہیں ہے لیکن طریقت کے اصطلاح میں بقائے حال اور فنائے حال سے مراد یہ ہے کہ جہالت کے لئے یقیناً فنا ہے اور علم باقی رہنے والا ہے۔ چنانچہ معصیت فانی ہے اور طاعت باقی؟ بندہ جب اپنی طاعت کا علم حاصل کر لیتا ہے تو غفلت و جہالت معدوم ہو کر بقا کے ذکر میں باقی ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ بندہ جب حق تعالیٰ کو پہچان جاتا ہے تو وہ اس کے علم کے ساتھ باقی ہو جاتا ہے اور اسے جہل فنا ہو جاتا ہے۔ اور جب سے فنا ہوتا ہے تو وہ غفلت کے ذکر میں باقی ہوتا ہے۔

یہ بیان مذموم قبیح اوصاف کے دور کرنے اور محمود و پسندیدہ اوصاف کے قائم کرنے میں ہے۔ لیکن خواصِ اہل طریقت کے نزدیک یہ مراد نہیں ہے، ان کے اشارات، اصلِ طریقت میں علم و حال

سے متعلق نہیں ہیں وہ فنا و بقا کا استعمال ولایت کے درجہءِ کمال کے سوا نہیں کرتے۔

خواصِ اہلِ طریقت کے نزدیک فنا و بقا سے متصف وہ حضرات ہیں جو مجاہدے کی مشقت سے آزاد ہیں اور مقامات کی قید سے اور احوال کے تغیر سے نجات پا کر حصولِ مقصود میں فائز المرام ہو چکے ہیں۔ ان کے دیکھنے کی تمام صلاحیتیں حق تعالیٰ کے دیدار کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ان کے سننے کی تمام قوتیں کلام الٰہی کی سماعت کے ساتھ پیوست ہیں اور دل سے جاننے کی تمام استعداد، اسرارِ الٰہی کے حصول میں منہمک ہو چکی ہے یہ صاحبانِ ولایت، اپنے اسرار کے حصول میں خود بینی کی آفت کو دیکھ چکے ہیں۔ وہ سب سے کنارہ کش ہو کر مراد میں ہیں ان کے ارادے فنا ہو چکے ہیں۔ وہ واصل بحق ہو کر ہر دعوے سے بیزار اور ہر لحاظ سے منقطع، کرامتوں سے، محجوب مقامات کو دیکھنے والے ہوتے ہیں اور عین مراد میں آفتوں کا لباس پہننے سے بے مراد ہوتے ہیں۔ اور ہر مشرب سے جدا ہو کر ہر مانوس شئے کی انسیت سے علحدہ ہوتے ہیں۔

"لیھلك من ھلك عن بینۃ ویحیٰی من حیّ عن بینۃ" تا کہ ہلاک ہوں تو مشاہدے میں ہلاک ہوں اور زندہ رہیں تو مشاہدے میں زندہ رہیں۔ اسی معنی میں میں (داتا علی ہجویری) کہتا ہوں کہ

فنیت فنائی بفقد ھوائی

فصار ھوائی فی الامور ھواك

فاذافنی العبد عن اوصافه

ادرك البقاء بتمامه

"یعنی میں نے فنا کو اپنی خواہش ناپید کر کے فنا کیا ہے۔

ہر امر میں میری خواہش صرف تیری محبت ہے۔

بندہ جب اپنے صفات بشری کو کریدتا ہے تو

وہ بقا کے تمام معانی جان لیتا ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ بندہ وجود اوصاف کی حالت میں جب وصف کی آفتوں سے فانی ہو جاتا ہے تب مراد کی فنا میں مراد کی بقا کے ساتھ باقی ہو جاتا ہے حتیٰ کہ قرب و بعد بھی نہیں رہتا۔ نہ وحشت وانس رہتا ہے نہ صحو و سکر۔ نہ فراق و وصال رہتا ہے نہ مایوس و خلع۔ نہ اسماء و اعلام رہتے ہیں نہ نقوش و رسوم۔ اسی معنی میں ایک بزرگ فرماتے ہیں

وطاح مقامی الرسوم کلاھما
فلست اریٰ فی الوقت قربا ولا بعدا
فنیت بہ عنی فبان لی الھدیٰ
فھذا ظھور الحق عند الفناء قصدا

میرا مقام اور رسوم دونوں فنا ہو گئے۔
اب نزدیکی اور دوری کچھ نہیں رہی۔
جب یہ مجھ سے فنا ہو گئے تب میرے لئے ہدایت کی راہ کھلی
اب راہِ حق کا ظہور بالقصد فنا کے بعد ہے۔

درحقیقت اشیاء کی فناء، ان کی آفتوں کو دیکھے بغیر اور ان کی خواہش کی نفی کے بغیر درست نہیں ہو سکتی۔ جسے یہ خیال ہے کہ اشیاء کی فنا، اس چیز کے حجاب میں ہونے کے بغیر درست نہیں وہ غلطی پر ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ آدمی کسی چیز کو دوست رکھے اور کہے کہ میں اس کے ساتھ باقی ہوں یا یہ کہ وہ کسی چیز سے دشمنی رکھے اور یہ کہے کہ میں اس کے ساتھ فانی ہوں۔ کیونکہ یہ دونوں صفتیں طالب کی ہیں۔ فنا میں محبت و عداوت نہیں ہے۔ اور نہ بقا میں جمع و تفرقہ کی رویت۔ ایک گروہ کو اس معنی میں غلطی لاحق ہوئی ہے۔ ان کا گمان ہے کہ ذات کے گم ہونے اور وجود کو ناپید کرنے کا نام فنا ہے اور بقا یہ ہے کہ بندے کے ساتھ حق کی بقا مل جائے یہ دونوں صورتیں محال ہیں۔

میں نے (غیر منقسم) ملک ہندوستان میں ایک شخص کو دیکھا جو تفسیر و تذکیر اور علم و فہم کا مدعی تھا۔ اس معنی میں اس نے مناظرہ کیا۔ جب میں نے اس سے گفتگو کی تو پتہ چلا کہ وہ نہ تو فنا کو جانتا ہے اور نہ بقا کو۔ قدم و حدوث کے فرق کو بھی نہیں جانتا۔ ایسے جاہل قسم کے لوگ بہت ہیں جو فنائے کلیت کو جائز جانتے ہیں حالانکہ یہ کھلی ہوئی ہٹ دھرمی اور مکابرہ ہے۔ کسی چیز کے اجزائے ترکیبی کی فنا اور اس سے ان اجزاء کا انفکاک قطعاً جائز ہی نہیں۔ میں ان جاہل غلط کاروں سے پوچھتا ہوں کہ ایسی فنا سے تمہارا مدعا کیا ہے؟ اگر یہ کہو کہ ذات فنا مقصود ہے تو یہ محال ہے اور اگر یہ کہو کہ وصف کی فنا مراد ہے تو اسے ہم جائز رکھتے ہیں۔ کیونکہ فنا ایک علیحدہ صفت ہے اور بقا ایک علیحدہ صفت بندہ ان دونوں صفات سے متصف ہوگا۔ اور یہ محال ہے کہ کوئی شخص اپنے سوا کسی دوسرے کی صفت سے قائم ہو۔

نسطوریوں کا مذہب جو رومی نصرانیوں کا ہے یہ ہے کہ حضرت مریم رضی اللہ عنہا

مجاہدے کے ذریعہ تمام ناسوتی صفات کو فنا کر کے لاہوتی بقا کے ساتھ قائم ہوگئیں۔ اور انھوں نے ایسی بقا پائی ہے کہ معبود کی بقا کے ساتھ باقی ہوگئیں۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی کا نتیجہ اور ثمرہ ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عناصر ترکیبی کی بنیاد، انسانی عناصر نہیں کہ انسان کے ساتھ بقا پائیں ان کا تحقق بقائے الوہیت کے ساتھ ہوا ہے لہٰذا وہ اور ان کی والدہ مریم اور اللہ تعالیٰ ایک ہی بقا کے ساتھ باقی ہیں جو کہ قدیم ہے اور حق تعالیٰ کی صفت ہے (معاذ اللہ) یہ سب باتیں ان حشویوں کے قول کے موافق ہیں جو مجسمہ و مشبّہ کے قائل ہیں اور حق تعالیٰ کو محلِ حوادث کہتے ہیں۔ اور قدیم کے لئے صفتِ حدوث جائز مانتے ہیں (معاذ اللہ)

میں ان سب کے جواب میں کہتا ہوں کہ کیا محدث، قدم کا محل ہوتا ہے؟ کیا قدیم کے لئے حدوث کی صفت ہوسکتی ہے؟ اور کیا حادث کے لئے قدیم صفت بن سکتی ہے؟ اس کا جائز رکھنا دہریوں کا مذہب ہے وہ حدوثِ عالم کی دلیل کو باطل کرتے ہیں اور اس سے مصنوع اور صانع دونوں کو قدیم کہنا چاہتے ہیں۔ یا دونوں کو حادث یعنی مخلوق کا ترکیب وامتزاج نامخلوق یعنی خدا کے ساتھ اور نامخلوق (خدا) کا حلول مخلوق کے ساتھ بنانا چاہتے ہیں۔ ایسی خرابی و بدنصیبی انھیں کو سزاوار ہو۔ کیونکہ وہ قدیم کو محل حوادث یا حوادث کو محل قدیم کہتے ہیں۔ لہٰذا مصنوع اور صانع دونوں کو قدیم ہی کہنا چاہئے اور جب دلیل سے ثابت ہے کہ مصنوع حادث ہے تو لامحالہ صانع کو بھی محدث ہی کہنا چاہئے کیونکہ کسی چیز کا محل اس چیز کے عین کی مانند ہوتا ہے جب محل حادث ہے تو چاہئے کہ حال بھی حادث ہو۔ لہٰذا ان سب باتوں سے لازم آتا ہے کہ محدث کو قدیم کہیں یا قدیم کو محدث؟ حالانکہ یہ دونوں ضلالت و گمراہی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ جو چیز کسی دوسرے کے ساتھ متصل و متحد اور ممتزج ہو ان دونوں کا حکم یکساں ہوتا ہے۔ لہٰذا ہماری بقا ہماری صفت ہے اور ہماری فنا ہماری صفت۔ اور ہمارے اوصاف کی خصوصیت میں ہماری فنا ہماری بقا کی مانند اور ہماری بقا ہماری فنا کی مانند ہے اور ہماری فنا ایسی صفت ہے جو ہماری بقا کے ساتھ ایک اور صفت ہے۔

اس کے بعد اگر کوئی فنا سے یہ مراد لے کہ بقا کا اس سے کوئی تعلق نہیں تو یہ جائز ہے اور اگر بقا سے یہ مراد لے کہ فنا کا اس سے کوئی تعلق نہیں تو یہ بھی جائز ہے کیونکہ اس کی مراد اس فنا سے غیر کے ذکر کی فنا ہے اور بقا سے حق تعالیٰ کے ذکر کی بقا ہے

من فنا من المراد بقی بالمراد	جو اپنی مراد سے فانی ہوگیا۔ وہ مرادِ حق سے باقی ہوگیا۔

اس لئے کہ بندے کی مراد فانی ہے اور حق تعالیٰ کی مراد باقی ہے۔ جب تم اپنی مراد سے وابستہ ہو گئے تو تمہاری مراد فانی ہوگی اور فنا کے ساتھ اس کا قیام ہوگا۔ پھر جب حق تعالیٰ کی مراد کے ساتھ متصف ہو گے تو حق کی مراد کے ساتھ باقی ہو گے۔ اور بقا کے ساتھ باقی ہو گے۔ اسکی مثال ایسی ہے کہ جو چیز آگ کے غلبہ میں ہوگی اس کے غلبہ کی وجہ سے اس میں بھی وہی صفت پیدا ہو جائے گی جو آگ کی ہے۔ تو جب آگ کا غلبہ اس چیز کی صفت کو دوسری صفت کے ساتھ بدل دیتا ہے تو حق تعالیٰ کے ارادہ کا غلبہ آگ کے غلبہ سے بدرجہ اولیٰ بہتر ہے۔ لیکن آگ کا یہ تصرف لوہے کے وصف میں ہے نہ کہ لوہے کی ذات میں؟ کیونکہ لوہا ہرگز آگ نہیں بن جاتا۔ واللہ اعلم۔

فنا و بقا میں مشائخ کے رموز و لطائف

فنا و بقا کی تعریف میں ہر بزرگ نے لطائف و رموز بیان کئے ہیں۔ چنانچہ صاحب مذہب حضرت ابوسعید خراز رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

الفناء فناء العبد عين رؤية العبودية والبقاء بقاء العبد بمشاهدة الالٰهية	فنا یہ ہے کہ بندہ اپنی بندگی کی دید سے فانی ہو اور بقا یہ ہے کہ بندہ مشاہدۂ الٰہی سے باقی ہو۔

مطلب یہ ہے کہ افعال بندگی کی رویت میں آفت ہے اور بندگی کی حقیقت سے وہ اس وقت روشناس ہوتا ہے جب کہ وہ اپنے افعال کو نہ دیکھے۔ اور ان افعال کو دیکھنے سے وہ فانی ہو اور فضلِ الٰہی کی دید سے باقی ہو۔ تاکہ اس کے معاملہ کی نسبت حق کی ساتھ وابستہ ہو نہ کہ اس کے ساتھ۔ کیونکہ بندہ کے ساتھ جب تک اُن افعال کا تعلق رہے گا اس وقت تک وہ ناقص رہے گا۔ اور جب حق تعالےٰ کے ساتھ اس کی نسبت ہو جائے گی تو وہ پورے طور پر کامل ہو جائے گا۔ لہٰذا جب بندہ اپنے متعلقات سے فانی ہو جاتا ہے تب کمالِ الٰہی سے باقی ہو جاتا ہے۔

حضرت یعقوب نہرجوری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

صحة العبودية فى الفناء والبقاء۔	بندگی کی صحت و درستگی فنا و بقا ہے۔

کیونکہ جب تک بندہ اپنے ہر تعلق و نسبت سے بیزاری نہ کرے خلوص کے ساتھ خدمتِ الٰہی کے لائق نہیں بنتا۔ لہٰذا انسان کا اپنے تعلق سے بیزاری کرنا فنا ہے۔ اور بندگی میں خلوص کا ہونا بقا ہے۔

حضرت ابراہیم شیبانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

علم الفناء و البقاء یدور علی الاخلاص والوحدانیة وصحة العبودیة وما کان غیر ھذا فھو المغالیط والزندقة۔	اخلاص وحدانیت اور بندگی کی درستگی پر منحصر ہے اور جو اس کے ماسوا ہے وہ غلط اور بے دینی ہے۔

مطلب یہ کہ فنا و بقا کے علم کا قاعدہ اخلاص و وحدانیت پر ہے۔ چونکہ جب بندہ حق تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو حکمِ الٰہی میں مغلوب و مجبور دیکھتا ہے اور جو مغلوب ہوتا ہے وہ غالب کے غلبہ میں فانی ہوتا ہے جس وقت اس کی فنا درست ہو جاتی ہے اور اپنے عجز کا اقرار کرتا ہے تب وہ بجز بندگی کے کچھ نہیں دیکھتا۔ اور اپنی تمام صلاحیتیں بارگاہِ الٰہی میں گم کر دیتا ہے۔ جو کوئی فنا و بقا کی اس کے سوا تعریف کرتا ہے اور وہ فنا کو ذات کی فنا اور بقا کو بقائے حق سے تعبیر کرتا ہے "وہ زندیق ہے۔ یہ مذہب تو نصاریٰ کا ہے"۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ تمام اقوال باعتبار معنی قریب قریب ہیں۔ اگرچہ عبارات مختلف ہیں۔ ان سب کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ کے لئے فنا، جلالِ حق کی دید اور اس کی عظمت کا کشف و مشاہدہ دل سے تعلق رکھتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے جلال کے غلبہ میں اس کے دل سے دنیا و آخرت فراموش ہو جاتی ہے اور اس کی ہمت کی نظر میں، احوال و مقام حقیر معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اور اس کی حالت میں ظہورِ کرامت پراگندہ، اور عقل و نفس سے فانی ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ فنا سے بھی فانی ہو جاتا ہے اور عین فنا میں گم ہو کر اس کی زبان حق کے ساتھ گویا ہو جاتی ہے اور اس کے دل میں خشیت اور جسم میں عاجزی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس طرح کہ ابتداء میں حضرت آدم علیہ السلام کے صلب سے ذریت کے اخراج کے وقت بندگی کے اقرار میں آفت شامل نہ تھی۔

ایک بزرگ اس مفہوم کو اس طرح ادا کرتے ہیں کہ

ان کنت ادری کیف السبیل الیک

فنیت عن جمیعی فصرت ابکی الیک

اگر مجھے تجھ تک پہنچنے کی راہ معلوم ہوتی تو میں سب سے

اپنے آپ کو فنا کر دیتا اور تیری یاد میں روتا رہتا۔

اور ایک بزرگ یوں فرماتے ہیں کہ:

ففی فنائی فناء فنائی
وفی فنائی وجدت انت
محوت اسمی و رسم جسمی
سالت عنی فقلت انت

یعنی...... میری فنا میں اپنی فنا کی فنا ہے۔
اور خود کو فنا کرنے میں تیرا پانا ہے
لہٰذا میں نے اپنے نام و جسم کی آسائشوں کو مٹا دیا ہے
اگر تو نے مجھ سے کچھ پوچھا تو میں یہی کہوں گا تو ہی علیم ہے

فقر و تصوف میں فنا و بقاء کے احکام اور اس کا بیان یہ تھا جسے اختصار کے ساتھ ذکر کر دیا اس کتاب میں جہاں بھی فنا و بقاء کا ذکر ہے اس سے یہی مراد ہے۔ اور یہ قاعدہ خرازیوں کے مذہب کا ہے اور تمام مشائخ اسی اصل پر گامزن ہیں۔ اس جماعت کا عام مقولہ ہے کہ جو جدائی دلیل وصال ہو وہ بے اصل نہیں ہوتی۔ واللہ اعلم۔

۹۔ فرقہ خفیفیہ

خفیفیہ فرقے کے پیشوا، حضرت ابو عبداللہ محمد بن خفیف شیرازی رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو اکابر سادات مشائخ میں سے مقبول و محبوب تھے اور اپنے زمانہ میں ظاہری و باطنی علوم کے ماہر تھے۔ طریقت کے علوم و فنون میں ان کی تصانیف مشہور ہیں۔ آپ کے فضائل و مناقب بے حد و شمار ہیں۔ آپ مقبولِ زمانہ، عزیز نفس اور پاکیزہ صفات تھے۔ نفسانی خواہشوں کی پیروی سے کنارہ کش تھے۔ میں نے سنا ہے کہ انھوں نے چار سو نکاح کیے تھے اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جس وقت انھوں نے توبہ کی تو شیراز کے تمام لوگ آپ سے بہت زیادہ محبت کرنے لگے۔ جب آپ کا حال ارفع و اعلیٰ ہوا تو شاہی خاندان اور رئیسوں کی لڑکیوں نے حصولِ برکت کی خاطر آپ سے نکاح کی استدعا کی۔ آپ ان سے نکاح کرتے اور دخول سے پہلے، باکرہ حالت میں طلاق دے دیا کرتے تھے۔ البتہ چالیس بیویاں ایسی خوش

نصیب تھیں جنھوں نے ایک ایک دو دو یا تین تین راتیں گزاری تھیں۔ ان میں سے صرف ایک بی بی چالیس سال تک ان کی صحبت میں رہی وہ ایک وزیر کی لڑکی تھی۔

حضرت ابوالحسن علی بن بکران شیرازی رحمتہ اللہ علیہ نے مجھ سے بیان کیا کہ ان کے زمانہ حکومت میں عورتوں کی ایک جماعت اس پر متفق تھی کہ اس شخص سے خلوت میں کوئی خاص شہوانی جذبات نہیں دیکھے گئے۔ ہر ایک کے دل میں قسم قسم کے وسوسے پیدا ہوتے اور حیرت و تعجب کا اظہار کرتی تھیں۔ اس سے قبل سب یہ جانتے تھے کہ وہ شہوت میں خاص مزاج رکھتے ہیں۔ اور سب یہی کہتے تھے کہ ان کی صحبت کا راز وزیرزادی کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ کیونکہ ان کی صحبت میں وہی سالہا سال رہی ہیں اور ان کی چہیتی بیوی ہیں۔ حضرت ابوالحسن فرماتے ہیں کہ ہم نے دو آدمیوں کو منتخب کر کے وزیرزادی کے پاس بھیجا۔ انھوں نے ان سے پوچھا شیخ کو تم سے بڑی محبت رہی ہے اس لئے ہمیں ان کی صحبت کی کوئی خاص بات بتاؤ؟ وزیرزادی نے کہا جس دن میں ان کے نکاح میں آئی اس وقت کسی نے مجھ سے کہا کہ آج شیخ تمہارے پاس رہیں گے۔ میں نے عمدہ قسم کا کھانا تیار کیا اور خود کو خوب بنایا سنوارا۔ جب وہ میرے پاس تشریف لائے تو میں نے کھانا لا کے آگے رکھا اس کے بعد انھوں نے میری طرف کچھ دیر غور سے دیکھا پھر کھانے کی طرف کچھ دیر نظریں جمائیں۔ بعد ازاں میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی آستین میں لے گئے میں نے سینہ سے لے کر ناف تک پندرہ گرہیں پڑی ہوئی پائیں۔ انھوں نے فرمایا اے وزیر کی دختر! پوچھو کہ یہ گرہیں کیسی ہیں؟ میرے دریافت کرنے پر فرمایا یہ سب سوزش اور صبر کی شدت سے پڑی ہوئی گرہیں ہیں۔ کیونکہ میں نے ہمیشہ ایسے خوبصورت وحسین چہروں اور ایسے لذیذ خوشبودار کھانوں پر صبر کیا ہے یہ فرما کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ سب سے بڑا معاملہ جو میرے ساتھ ان کا ہوا وہ یہی تھا۔

تصوف میں ان کے مذہب کی خصوصیت غیبت اور حضور ہے۔ جس کو عبارت میں بیان نہیں کیا جا سکتا تاہم مقدور بھر بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

غیبت اور حضور

غیبت وحضور، ایسی دو عبارتیں اور کلمے ہیں جو مقصود کے عین مفہوم کو بیان کرتے ہیں

عکس وسایہ کی مانند ہیں (گویا لفظوں میں ان کے مقصود اک حقیقی مفہوم ادا کرنا ناممکن ہے) یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جو ارباب زبان اور اہل معانی کے درمیان بکثرت مستعمل

ہیں۔ لہٰذا حضور سے مراد وہ حضورِ قلب ہے جو یقینی ولایت کے ساتھ ہوتا ہے کہ اس کے لئے غیبی حکم عینی حکم کی مانند ہو جائے۔

اور غیب سے مُراد، ماسوئٰ اللہ سے دل کا غائب ہونا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے آپ سے بھی غائب ہو کر اپنی غیبت سے بھی غائب ہو جائے اور اپنی غیبت کو بھی وہ خود نہ دیکھ سکے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ وہ رسمی حکموں سے بھی کنارہ کش ہو۔ جس طرح نبی ارتکاب حرام سے معصوم ہوتا ہے۔ لہٰذا اپنے سے غیبت، حق سے حضور ہے اور حق سے حضوری اپنے سے غیبت ہے۔ چنانچہ جو اپنے سے غائب ہو گیا وہ حق تعالےٰ کے حضور پہنچ گیا اور جو حق تعالےٰ میں حاضر ہو گیا۔ وہ اپنے سے غائب ہو گیا۔ کیونکہ دل کا مالک حق تعالیٰ ہے جب کسی جذبہء حق سے طالب کا دل مغلوب ہو جائے تو اس کے نزدیک دل کی غیبت، حضوری کی مثل ہو جاتی ہے اور اس وقت دل سے شرکت وقسمت اٹھ جاتی ہے اور اپنے سے بھی نسبت منقطع ہو جاتی ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ

ولی فواد وانت مالکه
بلا شریك فکیف ینقسم

میرے دل کا تو ہی بلا شریک مالک ہے
اب وہ کیسے تقسیم ہو؟

جب دل کا مالک اللہ تعالےٰ کے سوا اور کوئی نہیں رہتا تو اس وقت وہ خواہ غائب ہو یا حاضر، اسی کے قبضہ وتصرف میں ہوتا ہے اور نظری حکم میں عین کے ساتھ ہوتا ہے۔ تمام اربابِ طریقت کی دلیل یہی سلوک ہے۔ البتہ مشائخ کو جو اختلاف ہے وہ اس میں ہے کہ ایک گروہ حضور کو غیبت پر مقدم رکھتا ہے اور دوسرا گروہ غیبت کو حضور پر ترجیح دیتا ہے۔ جیسا کہ سکر وصحو میں ہم نے بیان کیا۔ لیکن فرق یہ ہے کہ صحو وسکر صفاتِ بشریہ کے باقی رہنے کی نشاندہی کرتے ہیں اور غیبت وحضور ان کے فنا ہونے کا پتہ دیتے ہیں۔ لہٰذا میدان تحقیق میں اس کا بڑا اعزاز ہے اور جو مشائخ، غیبت کو حضور پر مقدم رکھتے ہیں ان میں حضرت ابن عطاء، حسین بن منصور، ابوبکر شبلی، بندار بن حسین، ابو حمزہ بغدادی اور سمنون محب رحمہم اللہ ہیں۔

اہل عراق کی ایک جماعت کہتی ہے کہ راہِ حق میں سب سے بڑا حجاب تو خود ہے جب تو نے اپنے آپ کو غائب کر لیا تو تجھ سے تیری ہستی کو برقرار ثابت رکھنے والی تمام آفتیں فنا ہو جاتی

ہیں۔ اور زمانہ کے قاعدے بدل جاتے ہیں۔ مریدوں کے تمام مقامات تیرے لئے حجاب، طالبوں کے تمام احوال، تیری آفت گاہ بن جاتے ہیں۔ اسرارِ زمانہ نابود ہو کر ارادہ کو قائم رکھنے والی چیزیں ذلیل ہو جاتی ہیں۔ اپنے وجود اور غیر اللہ کے وجود کو دیکھنے سے آنکھیں جل جاتی ہیں اور بشری اوصاف اپنی جگہ، قربت کی آگ سے خود بخود نیست و نابود ہو جاتے ہیں اور ایسی صورت ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اس غیبت کی حالت میں تجھے آدم کی پیٹھ سے نکالا اور اپنا کلام عزیز تجھے سنایا پھر خلعتِ توحید اور مشاہدہ کے لباس سے تجھے سرفراز فرمایا۔ جب تک تو اپنے سے غائب رہے گا بارگاہِ حق میں بے حجاب حاضر رہے گا اور جب تک اپنی صفات کے ساتھ حاضر رہے گا تو قربتِ حق سے غائب رہے گا۔ تیری ہلاکت، تیرے بشری صفات کی حاضری میں ہے۔ اللہ تعالےٰ کے ارشاد کا یہی مطلب ہے کہ

ولقد جئتمونا فرادیٰ کما خلقنٰکم اول مرۃٍ الآیہ	یقیناً تم ہمارے حضور اکیلے آئے جس طرح ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا فرمایا۔

حضرت محاسبی، حضرت جنید بغدادی، سہیل بن عبد اللہ تستری، ابو حفص حداد، ابو حمدون قصار، ابو محمد جریری، صاحبِ مذہب حضرمی اور محمد بن خفیف رحمہم اللہ کے علاوہ ایک اور جماعت کا مذہب یہ ہے کہ حضور غیب سے مقدم ہے اس لئے کہ تمام خوبیاں حضور میں حاصل ہوتی ہیں اور اپنے سے غیبت تو حضورِ حق کا راستہ ہے۔ جب حضورِ حق حاصل ہو گیا تو پہنچنے کا راستہ تو آفت ہے۔ لہٰذا جو شخص اپنے سے غائب ہو گیا، یقیناً وہ بارگاہِ حق میں حاضر ہو گیا۔ غیبت کا فائدہ تو حضور ہے۔ بے حضور غیبت دیوانگی اور مغلوبیت ہے۔ مناسب یہی ہے کہ تارک غفلت ہو جاؤ تاکہ غیبت کا جو مقصود ہے یعنی حضور، وہ حاصل ہو جائے۔ جس وقت مقصود حاصل ہو جاتا ہے اس وقت علت ساقط ہو جاتی ہے اسی معنی میں یہ شعر ہے

لیس الغائب من غاب من البلاد

انما الغائب من غاب من المراد

ولیس الحاضر من لیس له المراد

انما الحاضر من لیس له الفواد

حتیٰ استقرفیه المراد

"غائب وہ نہیں جو شہروں سے غائب ہے

بلکہ غائب وہ ہے جو مقصود و مراد سے غائب ہے

وہ حاضر نہیں جس کی مراد موجود نہ ہو۔
بلکہ وہ حاضر ہے جسے قلبی خواہشیں کچھ نہ ہوں
یہاں تک کہ وہ مراد سے مالا مال ہو جائے''

مطلب یہ ہے کہ جو بستی و شہر سے غائب ہے وہ دراصل غائب نہیں ہے بلکہ وہ غائب ہے جو اپنے ہر ارادہ سے غائب ہو حتیٰ کہ حق تعالیٰ کا ارادہ ہی اس کا ارادہ بن جائے اور جس میں چیزوں کا ارادہ نہ ہو اسے حاضر نہیں کہتے بلکہ حاضر وہ ہے جس کے دل میں رعنائی اور دل پسندی نہ ہوتا کہ اس میں دنیا و آخرت کی فکر نہ رہے اور خواہش سے اسے راحت نہ ہو۔ اسی معنی میں ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ

من لم یکن فانیا عن نفسہ وعن الھویٰ
بالانس والاحباب فکانما بین المراتب
واقف لمنال حظ اولحسن مآب۔

''جس کا حال یہ نہ ہو کہ وہ اپنے سے اور نفسانی خواہشوں سے انسان اور عزیزوں سے فانی ہو وہ گویا نفسانی خواہشوں کے حصول اور نیک انجام کی تمنا میں مراتب کے درمیان ٹھہرا ہوا ہے''

مشہور واقعہ ہے کہ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مرید، حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کے ارادہ سے گیا۔ دروازہ پر پہنچ کر اس نے دستک دی۔ حضرت بایزیدؒ نے پوچھا کون ہے؟ کیا چاہتے ہو جواب دیا کہ حضرت بایزید کی زیارت کو آیا ہوں۔ پوچھا بایزید کون ہے؟ کہاں ہے اور وہ کیا ہے میں مدت سے بایزید کو تلاش کر رہا ہوں، مگر وہ نہیں ملتا۔ جب مرید نے واپس ہو کر حضرت ذوالنون مصریؒ سے یہ حال بیان کیا تو انھوں نے فرمایا:۔

اخی بویزید ذھب فی الذاھبین	میرا بھائی بایزید بسطامی تو خدا کی طرف
الی اللّٰہ۔	جانے والوں میں جا ملا۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آ کر ایک شخص نے درخواست کی کہ تھوڑی دیر میرے پاس رہ کر کچھ باتیں کر لیجئے مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے؟

آپ نے فرمایا اے جوانمرد تم مجھ سے وہ چاہتے ہو جسے عرصہ سے میں خود چاہتا ہوں برسوں سے

اسی تمنا میں ہوں کہ ایک لحہ کے لئے اپنے آپ میں موجود ہو جاؤں لیکن اب تک ایسا وقت نہیں آیا۔ پھر ہمیں بتاؤ میں تمہارے ساتھ کیسے رہ سکتا ہوں۔؟ اس سے معلوم ہوا کہ غیبت میں حجاب کی وحشت ہے اور حضور میں مشاہدے کی راحت۔ تمام احوال میں مشاہدہ حجاب کی مانند نہیں ہوتا۔ اسی معنی میں حضرت ابوسعید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں

تقشع غیم الھجر عن قمر الحب

واسفر نور الصبح عن ظلمۃ الغیب

محبت کے چاند سے ہجرت کے بادل ناپید ہو گئے

اور غیبت کی تاریکی سے صبح کا تڑکا چمک اٹھا

غیبت و حضور کے فرق میں مشائخ کے بکثرت لطائف، حالات اور ظاہری اقوال ہیں جن کا مفہوم باہم قریب قریب ہے۔ یعنی بارگاہ حق کا حضور اور اپنے سے غیب برابر ہے۔ کیونکہ اپنے سے غیبت کا مقصود، حضور ہے اور جو اپنے سے غائب نہیں ہے وہ بارگاہِ حق میں حاضر نہیں ہے اور جو حاضر ہے وہ غائب ہے۔ جس طرح حضرت ایوب علیہ السلام نے نزول بلا کے وقت، فریاد میں اپنے آپ کو نہ دیکھا بلکہ وہ اس حال میں اپنے آپ سے غائب تھے اس لئے حق تعالیٰ نے ان کی عین فریاد کو صبر سے جدا نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے فریاد کی کہ "انی مسنی الضر وانت ارحم الراحمین" اے خدا میں تکلیف میں ہوں تو ہی بہت مہربان ہے حق تعالیٰ نے فرمایا:۔

فاستجبنا له فكشفنا ما به من ضر الآیہ	(ایوب صابر تھا) لہٰذا ہم نے اس کی فریادسنی اور اس کی ہر تکلیف کو دور کر دیا۔

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ مجھ پر ایسا زمانہ بھی گزرا ہے کہ تمام زمین و آسمان والے میری پریشانی پر روتے تھے۔ پھر ایسا زمانہ بھی آیا ہے میں ان کی غیبت پر روتا تھا۔ اب ایسا زمانہ آگیا ہے کہ مجھے نہ اپنی خبر ہے نہ زمین و آسمان کی۔ یہ حضورِ حق کے متعلق بہترین اشارہ ہے۔

یہ ہیں غیبت و حضور کے معنی۔ جسے میں نے اختصار کے ساتھ بیان کر دیا تاکہ خفیفیوں کا مسلک معلوم ہو جائے کہ غیبت و حضور سے ان کی کیا مراد ہے۔

۱۰۔ فرقہ سیاریہ

سیاری فرقہ کے پیشوا، حضرت ابوالعباس سیاری رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو مرو کے امام، تمام علوم کے عالم اور حضرت ابوبکر واسطیؒ کے مصاحب تھے۔ شہر نساء اور مرو میں ان کے مریدین بکثرت ہیں۔ تصوف کا کوئی مذہب اپنے حال پر باقی نہیں ہے لیکن ان کا مسلک اب بھی اپنے حال پر باقی ہے کیونکہ یہ دونوں اس مذہب کے رہنماؤں سے کبھی خالی نہ رہے۔ ان کے مریدین و تلامذہ نے ان کے مذہب کی ہمیشہ حفاظت کی ہے۔ اور انھوں نے ان کے لئے بکثرت رسائل لکھے ہیں۔

میں نے شہر مرو میں ان کے کچھ خطوط و رسائل دیکھے ہیں جو نہایت جامع و عمدہ ہیں سیاری مذہب کی خصوصیت جمع و تفرقہ ہے جو تمام اہلِ علم کے درمیان مستعمل ہے۔ ہر گروہ نے اپنی مراد اور اپنی عبارتوں کے سمجھانے میں ان دونوں کلمات کا استعمال کیا ہے لیکن ہر ایک کی وضاحت ایک دوسرے سے مختلف رہی ہے۔ چنانچہ مذہب محاسبی میں جمع و تفرقہ سے مراد، کسی چیز کے شمار میں جمع اور افتراق لیا گیا ہے اور نحوی اور اصحابِ لغت ان سے مراد، ناموں کو جمع کرنا اور ان کا فرق لیتے ہیں۔ حضرات فقہا نے نص کا جمع کرنا اور ان کی صفات کو جدا کرنا یا نص کا جمع کرنا اور قیاس کو جدا کرنا مراد لیا ہے اور اصولِ کلام والوں نے صفات ذات کا جمع اور صفات فعل کا تفرقہ مراد لیا ہے لیکن مشائخ طریقت کے نزدیک ان میں سے کوئی مراد نہیں ہے بلکہ ان کی مراد وہ ہے جسے ہم بیان کر رہے ہیں۔

جمع و تفرقہ

اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ اپنی دعوت میں تمام مخلوق کو جمع کر کے فرمایا:۔

والله يدعوا الى دار السلام	اللہ تعالیٰ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔

دوسری جگہ ہدایتِ حق میں انھیں تفرقہ کے ساتھ بیان کیا کہ:۔

ويهدى من يشاء الى صراط مستقيم۔	اللہ جسے چاہتا ہے صراط مستقیم کی ہدایت فرماتا ہے۔

دعوت میں تو اللہ تعالیٰ نے سب کو جمع کر کے پکارا اور اظہار مشیت میں ایک گروہ کو حکم

سے خارج کر کے بیان کیا۔ اور باقی کو حکم میں جمع کر دیا۔ گویا ایک گروہ کو تو مردود رسوا کر کے فرق کر دیا اور انھیں جدا کر دیا۔ اور کچھ کو توفیق دے کر مقبول بنایا اور کچھ کو ممانعت کے ذریعہ جمع کر کے نکالا۔ ایک گروہ کو عصمت دی اور ایک گروہ کو آفت کی طرف میلان دیا۔ لہٰذا اس معنی میں حقیقت و اسرار اور حق تعالیٰ کی معلوم و مراد میں لفظ جمع ہے اور امر و نہی کے اظہار میں لفظ تفرقہ ہے چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قربان کر دیں حالانکہ مشیتِ الٰہی یہ تھی کہ ایسا نہ ہو۔ ابلیس کو حکم دیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرے اور مشیت الٰہی یہ تھی کہ وہ سجدہ نہ کرے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا کہ دانہء گندم نہ کھانا مگر مشیتِ الٰہی یہ تھی کہ وہ کھائیں۔ اس قسم کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔

جمع و تفرقہ کی تعریف

تصوف میں جمع و تفرقہ کی تعریف یہ ہے کہ:۔

الجمع ماجمع باوصافه و التفرقة ما فرق بافعاله۔	جمع وہ ہے جو اپنے اوصاف کے ساتھ جمع ہو اور تفرقہ وہ ہے جو اپنے افعال سے جدا ہو

اس سے مراد، مکمل ارادہ کا انقطاع، اور ارادۂ الٰہی کے اثبات میں خلق کے تصرف کا مکمل ترک ہے۔ اس تعریف پر معتزلہ کے سوا تمام اہلِ السنّت والجماعت اور تمام مشائخ کا اجماع ہے۔ البتہ ان کے استعمال میں مشائخ کا اختلاف ہے چنانچہ ایک گروہ ان دونوں کلمات کو توحید پر محمول کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جمع کے دو درجے ہیں ایک حق تعالیٰ کے اوصاف میں دوسرا بندوں کے اوصاف میں۔ حق تعالےٰ کے اوصاف سے جس کا تعلق ہے وہ توحید کا بھید ہے جس پر بندہ کا کوئی اختیار نہیں ہے اور جو بندوں کے اوصاف میں ہے اس سے مراد، توحید میں صدقِ عقیدت اور صحتِ عزیمت ہے۔ یہ قول حضرت ابو علی رودباری علیہ الرحمتہ کا ہے۔ دوسرا گروہ حق تعالیٰ کے اوصاف پر محمول کرتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ جمع، حق تعالیٰ کی صفت ہے اور تفرقہ حق تعالیٰ کا فعل۔ حق تعالیٰ کے صفت و فعل میں بندے کو کوئی اختیار نہیں ہے۔ اس لئے کہ حق تعالےٰ کی الوہیت میں کوئی شئی متنازعہ نہیں ہے۔ جمعِ ذات وصفات اسی کے لئے ہے۔

کیونکہ ''الجمع التسویۃ فی الاصل '' جمع اصل میں برابری کا مقتضی ہے حق تعالیٰ کی ذات وصفات میں کوئی اس کا مساوی نہیں اور اس کی جدائی میں خلق کی تفصیل وعبارت مجتمع نہیں ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالےٰ کے صفات قدیم ہیں اور وہ اس کے ساتھ مختص ہیں۔اور ان کا قیام بھی اسی کے ساتھ ہے اور ان کی خصوصیات بھی اسی سے وابستہ ہیں چونکہ حق تعالےٰ کی ذات وصفات میں دوئی نہیں ہے۔اور نہ اس کی وحدانیت میں فرق وعدد روا ہے اس لحاظ سے جمع کا استعمال حق تعالیٰ کے سوا کسی اور کے لئے جائز نہ ہوگا۔

لیکن حکم میں تفرقہ، اللہ تعالیٰ کے افعال سے متعلق ہے کیونکہ تمام احکام متفرق ہیں۔ کسی کے لئے وجود کا حکم ہے اور کسی کے لئے عدم کا۔اس لحاظ سے جمع کا استعمال ہو اس میں ایک کو فنا کو حکم ہے اور دوسرے کو بقا کا حکم۔

ایک گروہ وہ ہے جو تفرقہ کو علمِ الٰہی پر محمول کرتا ہے۔چنانچہ وہ کہتا ہے کہ:۔

الجمع علم التوحید والتفرقۃ علم الاحکام۔	توحید کا علم جمع، اور احکام کا علم تفرقہ ہے۔

اس لحاظ سے علمِ اصول، جمع اور علمِ فروع، تفرقہ ہوں گے۔ایک بزرگ کا قول یہ ہے کہ:۔

الجمع ما اجتمع علیہ اھل العلم والتفرقۃ مااختلفوا فیہ۔	جس پر اہل علم کا اجماع ہو وہ جمع اور جس میں ان کا اختلاف ہو وہ تفرقہ ہے۔

لیکن جمہور محققین تصوف کی عبارات واشارات میں تفرقہ سے مکاسب (بندے کے اختیار اعمال) اور جمع سے مواہب (مجاہدے اور مشاہدے) مراد لئے ہیں۔لہٰذا جو بندہ مجاہدے کے ذریعہ واصل بحق ہو وہ تفرقہ ہے اور حق تعالیٰ کی طرف سے بندہ پر جو خاص عنایت وہدایت ہو وہ جمع ہے اور بندے کی عزت وتکریم اس میں ہے کہ وہ اپنے وجودی افعال اور جمال حق کے لئے مجاہدے کی قدرت میں اپنے افعال کی آفتوں سے محفوظ رہے۔اور اپنے افعال کو باعطائے فضلِ الٰہی جان کر مشاہدے کو ہدایت الٰہی کے دامن میں منفی دیکھے۔لہٰذا ایسا بندہ اپنی ہر اقامت میں حق تعالیٰ کے ساتھ قائم ہو کر اس کا نائب اور اوصاف میں اس کا وکیل ہوگا۔اور اس کے تمام افعال کی نسبت اسی کی طرف ہوگی یہاں تک کہ وہ اپنے کسب کی نسبت سے محفوظ ہو جائے گا۔جیسا کہ حق تعالےٰ نے حبیب ﷺ کے ذریعہ بالواسطہ حضرت جبریل علیہ السلام حدیث قدسی میں فرمایا

لا یزال عبدی یتقرب الیّ بالنوافل حتٰی احببتہ، فاذا احببتہ‘ کنت سمعا و بصرا وید اولسانا فبِی یسمع و بی یبصر وبی ینطق وبی یبطش۔	میرا بندہ نوافل کے ذریعہ میری قربت کا ہمیشہ خواہاں رہتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اسے اپنا محبوب بنا لیتا ہوں پھر جب میں اپنے کسی بندے کو اپنا محبوب بنا لیتا ہوں تو میں اس کے کان آنکھ ہاتھ اور زبان ہو جاتا ہوں۔ وہ مجھ سے سنتا ہے، مجھ سے ہی دیکھتا، مجھ سے ہی بولتا اور مجھ سے پکڑتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ہمارا بندہ مجاہدے کے ذریعہ جب ہمارا مقرب ہو کر محبوب ہو جاتا ہے تو ہم اس کے وجود کو اس سے فنا کر دیتے ہیں اور اس کے افعال کی نسبت کو اس سے اٹھا لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ ہمارے ذریعہ ہی سنتا ہے جب وہ سنے اور ہمارے ہی ذریعہ بولتا ہے جب وہ بولے۔ اور ہمارے ہی ذریعہ دیکھتا ہے جب وہ دیکھے۔ اور ہمارے ذریعہ پکڑتا ہے جب وہ پکڑے۔ گویا وہ ہمارے ذکر میں ایسا مستغرق ہو جاتا ہے کہ وہ ذکر کا مغلوب بن جاتا ہے۔ اور اس کے ذکر میں اس کا کسب مفقود ہو جاتا ہے اور ہمارا ذکر اس کے ذکر کا سلطان بن جاتا ہے اور اس کے ذکر سے آدمیت کی نسبت جدا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس کا ذکر، ہمارا ہی ذکر ہوگا۔ حتیٰ کہ بحالت غلبہ وہ اسی کے ساتھ موصوف ہوگا۔ چنانچہ حضرت بایزید بسطامیؒ غلبۂ حال میں نعرہ لگاتے ہیں کہ "سبحانی ما اعظم شانی" (پاک ہے مجھے، کتنی ہی بڑی میری شان) یہ جو کچھ فرمایا حق تعالیٰ کی گفتار سے تھا اور جو کہا حق کہا۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:۔

الحق ینطق علی لسان عمر۔	حق تعالیٰ حضرت عمر کی زبان میں بولتا ہے۔

اس کی حقیقت اس طرح پر ہے کہ آدمیت پر جب حق تعالیٰ کے غلبہ کا ظہور ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اس کی ہستی سے نکال دیتا ہے یہاں تک کہ اس کی تمام باتیں حق تعالیٰ ہی کی فرمودہ ہوتی ہیں۔ اس استحالہ کے باوجود کہ حق تعالیٰ کسی میں حلول نہیں کرتا اور نہ کسی مخلوق یا مصنوع میں ممتزج و متحد ہو جاتا ہے۔ اور نہ کسی چیز میں وہ پیوست ہوتا ہے۔

تعالی اللّٰہ عن ذالك و عمایصفه الملاحدة علوا کبیرا

البتہ یہ جائز ہے کہ حق تعالیٰ کی محبت بندے کے دل پر غالب ہو جائے اور اس کے غلبہ کی زیادتی میں اس کی عقل و طبع اس کی برداشت سے عاجز آ جائے اور اس کا امر اس کے کسب سے

ساقط ہو جائے۔ اس درجہ میں اس حالت کا نام جمع ہے جس طرح کہ حضور اکرم ﷺ محبتِ الٰہی میں ایسے مستغرق و مغلوب تھے کہ جو فعل آپ سے رونما ہوتا اللہ تعالیٰ اس فعل کی نسبت کو آپ سے دور فرماتا اور فرماتا کہ وہ فعل میرا تھا آپ کا نہ تھا۔ ہر چند کہ اس فعل کا ظہور و صدور آپ سے ہوا۔ چنانچہ ارشاد حق ہے:۔

وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ۔	اے محبوب وہ مشتِ خاک جو آپ نے دشمنوں پر پھینکی تھی وہ آپ نے نہیں بلکہ ہم نے پھینکی تھی۔

اسی قسم کا فعل، جب حضرت داؤد علیہ السلام سے صادر ہوا تو حق تعالیٰ نے اس فعل کی نسبت ان کی طرف کرتے ہوئے فرمایا:۔

وقتل داؤد جالوت۔	حضرت داؤد نے جالوت کو قتل کیا۔

یہ حالت تفرقہ کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں نبیوں کے افعال میں فرق و امتیاز رکھا۔ ایک کے فعل کی نسبت ان کی طرف ہی رکھی۔ اور یہ نسبتِ فعل محل آفت و حوادث ہے۔ اور دوسرے کے فعل کی نسبت اپنی طرف فرمائی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ قدیم ہے لہٰذا اس کی طرف نسبتِ فعل، آفت و حوادث سے پاک ہے۔ بنا بریں اگر آدمی سے ایسا فعل سرزد ہو جو آدمی کے افعال کی جنس سے اور اس کے قبیل سے نہ ہو تو یقیناً اس کے فعل کا فاعل، حق تعالیٰ ہے۔ اور اعجاز و کرامت سب کچھ اس کے ساتھ شامل ہے۔ لہٰذا تمام عادی افعال تفرقہ ہیں اور تمام ناقصِ عادت فعل، جمع ہیں کیونکہ ایک رات میں ''قاب قوسین'' پہنچنا فعل عادی نہیں ہے اور یہ بجز فعلِ الٰہی ممکن نہیں۔ اسی طرح غایت درجہ سچی اور درست بات کہنا فعل عادی نہیں یہ بھی فعل الٰہی کے سوا ممکن نہیں۔ اور آگ سے نہ جلنا بھی فعلِ عادی نہیں یہ بھی فعل الٰہی کے بغیر ممکن نہیں۔ اور غیبوبت میں درست و صحیح بات کہنا بھی فعل عادی نہیں یہ بھی اس کے فعل کے بغیر ممکن نہیں۔ غرضکہ اللہ تعالےٰ نے انبیاء و اولیاء کو یہ معجزات و کرامات عطا فرما کر ان کے افعال کو اپنی طرف منسوب فرمایا اور ان افعال کو اپنا ہی فعل بتایا۔ جب کہ محبوبوں کا فعل، اسی کا فعل قرار پایا تو ان کی بیعت، خدا کی بیعت اور ان کی اطاعت، خدا کی اطاعت ہوئی چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

ان الّذین یبایعونک انما یبایعون اللہ لاآیہ	یقیناً جنھوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی انھوں نے اللہ سے بیعت کی۔

نیز فرمایا:۔

ومن یطع الرسول فقد اطاع اللّٰہ۔	جس نے رسول کی اطاعت کی بلاشبہ اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

خلاصہ یہ کہ محبوبانِ خدا اولیاء اللہ، اسرارِ الٰہی سے تو مجتمع اور معاملات و اظہار سے مفترق ہیں۔ یہاں تک کہ اجتماع کے ساتھ دوستی و محبت کے اسرار مستحکم ہیں۔ اور افتراق کے ساتھ بندگی کی اقامت کا اظہار صحیح و درست ہے۔

ایک بزرگ بحالت جمع فرماتے ہیں کہ

قد تحققت بسرّی فنا جاك لسانی
فاجتمعنا لمعان وافترقنا لمعانی
فلیس عینك التعظیم لحظة عن عیانی
ولقد صیرك الواجد من الاجساد امانی

میرا باطن محقق ہوا تو میری زبان نے تیری مناجات کی
لہٰذا ہم کچھ معانی میں جمع اور کچھ معانی میں مفترق ہیں

اس شعر میں اجتماع اسرار کو جمع اور زبان کی مناجات کو تفرقہ کہا گیا ہے۔ اس کے بعد جمع و تفرقہ کا اپنے وجود میں نشانی بتائی اور اس قاعدہ کو اپنے پر محمول کیا۔ یہ بہت لطیف بات ہے۔ وباللہ التوفیق۔

جمع و تفرقہ کے معنی میں مشائخ کا اختلاف

اب اس جگہ ایک اختلاف کا بیان باقی ہے جو ہمارے اور مشائخ کے اس گروہ کے درمیان ہے جو یہ کہتا ہے کہ جمع کا اظہار، تفرقہ کی نفی ہے۔ اس لئے کہ یہ دونوں ضدیں ہیں کیونکہ جب ہدایت کا غلبہ اور استیلا ہوتا ہے تو بندے سے کسب و مجاہدے کا اختیار جاتا رہتا ہے اور یہ تعطیلِ محض ہے۔ اس کا جواب ہم یہ دیں گے کہ یہ بات خود تمہارے عقیدے ہی کے خلاف ہے اس لئے کہ جب تک معاملہ کی قدرت اور کسب و مجاہدے کی طاقت موجود رہتی ہے اس وقت تک بندے سے وہ ہرگز ساقط نہیں ہوتی۔ اسی لئے جمع تفرقہ سے جدا نہیں ہے جیسے آفتاب سے نور، جوہر سے عرض اور موصوف سے صفت جدا نہیں کی جاسکتی۔ اسی طرح ہدایت سے مجاہدہ اور شریعت

سے طریقت وحقیقت اور طلب سے وجدان بھی جدا نہیں۔ البتہ یہ مجاہدہ کبھی مقدم ہوتا ہے اور کبھی مؤخر۔ لیکن مجاہدہ جہاں مقدم ہو اس پر مشقت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ وہ غیبت میں ہوتا ہے اور مجاہدہ جہاں مؤخر ہو اس پر رنج وکلفت نہیں ہوتی کیونکہ وہ حضور میں ہوتا ہے۔ اور جو اعمال کے مشرب و مذہب کی نفی کرتا ہے وہ عینِ عمل کی نفی کرتا ہے۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ البتہ یہ جائز ہے کہ بندہ ایسے درجہ پر فائز ہو جائے جہاں اسے اپنے افعال معیوب نظر آنے لگیں۔ جب کہ وہ اپنے اوصاف محمودہ کو بھی عیب کی نظر سے ناقص دیکھتا ہے تو لامحالہ وہ اوصاف قبیحہ مذمومہ کو تو بدرجہ اولیٰ عیب دار دیکھے گا۔

میں نے یہ معنی اس لئے بیان کئے ہیں کہ میں نے ایک جاہل قوم کو اس غلطی میں آلودہ پایا ہے۔ چونکہ وہ بحالت بیگانگی میں ہیں اس لئے کہتے ہیں کہ یافت کے لئے کسی ریاضت کی حاجت نہیں۔ اور ہمارے افعال وطاعات معیوب اور مجاہدات ناقص ہیں۔ اس لئے انھیں کرنے سے نا کرنا بہتر ہے۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ ہمارے افعال باتفاق فعل ہیں۔ اور ہمارے ہر قسم کے فعل، محلِ علت، اور منبع شر و آفت ہیں بایں ہمہ "نہ کرنے" کو بھی فعل ہی کہا جائے گا جب کہ دونوں فعل ہی ہوئے اور فعل محل علت ہوئے تو کس وجہ میں "نہ کرنے" کو "کرنے" سے بہتر جانتے ہو؟ یہ تو ظاہری بد نصیبی ونقصان اور واضح عیب ہے۔ لہٰذا یہ کفر و ایمان کے درمیان بہترین فرق ہے۔ کیونکہ مومن و کافر دونوں متفق ہیں کہ ان کے افعال محل علت ہیں۔ مگر مومن بحکم فرمان خدا، "کرنے کو نہ کرنے" سے زیادہ بہتر جانتا ہے اور کافر بحکم تعطیل نہ کرنے کو کرنے سے زیادہ بہتر سمجھتا ہے۔ لہٰذا جمع یہ ہے کہ آفت کے دیکھنے میں آفت تفرقہ اور حکم تفرقہ ساقط نہ ہو۔ اور تفرقہ یہ ہی کہ جمع کے حجاب میں تفرقہ کو جمع جانے۔

حضرت مزین کبیر اس معنی میں فرماتے ہیں کہ:۔

الجمع الخصوصية والتفرقة العبودية موصول احدهما بالآخر غير مفصول عنه	بندے کے لئے حق تعالیٰ کی خصوصیت، جمع ہے۔ اور بندے کی بندگی اس کے لئے تفرقہ۔ یہ دونوں بندے سے جدا نہیں ہیں۔

اس لئے کہ خصوصیت کی علامت بندگی کی حفاظت ہے۔ معاملہ میں جب مدعی معاملہ کے ساتھ قائم نہ ہوگا تو وہ اپنے دعوے میں جھوٹا ہوگا۔ البتہ یہ جائز ہے کہ حکمِ الٰہی بجالانے اور مجاہدے کا حق ادا کرنے میں جو تکلیف ومشقت ہوتی ہے اس کا بوجھ بندے پر نہ پڑے۔ لیکن یہ کسی طرح جائز

نہیں ہے کہ عینِ جمع میں بغیر واضح عذر کے کوئی حکم شریعت یا مجاہدہ جو شریعت میں عام ہو بندے سے وہ عین حکم اُٹھ جائے۔ اس مسئلہ کو کچھ وضاحت سے بیان کرتا ہوں۔

واضح رہنا چاہیئے کہ جمع کی دو قسمیں ہیں ایک جمع سلامت اور دوسری جمع تکسیر۔ جمع سلامت یہ ہے کہ حق تعالیٰ بحالتِ غلبہ، قوت، وجد شدت اور شوق کو ظاہر فرما کر بندے کی حفاظت فرمائے۔ اور اپنا حکم ظاہر طور پر بندے پر جاری کر کے اسے بجالانے میں اس کی نگہبانی کرے۔ اور اسے مجاہدے سے آراستہ بنا دے چنانچہ حضرت سہل بن عبداللہ تستری، ابوحفص حداد، ابوالعباس سیاری مروزی صاحبِ مذہب ہذا، بایزید بسطامی، ابوبکر شبلی، ابوالحسن حضرمی اور مشائخ کی ایک جماعت قدس سرہم ہمیشہ مغلوب الحال رہتے تھے۔ بایں ہمہ جب بھی نماز کا وقت آتا تو وہ اپنے حال پر لوٹ آتے تھے اور جب نماز ادا کر چکتے تو پھر مغلوب الحال ہو جاتے تھے۔ اس لئے کہ جب تک تم محلِ تفرقہ میں ہو گے تو "تم" ہو گے اور خدا کا حکم بجالانا تم پر لازم ہوگا اور جب حق تعالیٰ تمہیں جذب کر کے مغلوب الحال بنا دے گا تو بہتر ہے کہ حق تعالیٰ اپنے حکم میں دو باتوں میں تمہاری حفاظت کرے گا۔ ایک یہ کہ بندگی کی علامت تم سے نہ اٹھے دوسرے یہ کہ وعدے کے حکم پر قائم رکھے۔ کیونکہ اس کا ارشاد ہے کہ میں کبھی بھی شریعت محمدی کو منسوخ نہ کروں گا۔

اور جمع تکسیر یہ ہے کہ بندہ حکم میں دیوانہ اور مدہوش ہو جائے۔ اور اس کا حکم پاگلوں کی مانند بن جائے۔ ایسا شخص معاملہ میں معذور ہوتا ہے اور پہلا شخص مشکور۔ اور جو مشکور ہوتا ہے اس کے حالات دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ قوی ہوتے ہیں کیونکہ دوسرا بہر حال معذور ہے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ جمع کے لئے نہ کوئی مخصوص مقام ہے اور نہ کوئی ایک حال۔ کیونکہ جمع اپنے مطلوب کے معنی میں ہمت کا جمع کرنا ہے۔ چنانچہ کسی گروہ کے لئے اس معنی کا کشف مقامات میں ہوتا ہے اور کسی گروہ کا کشف احوال میں ہوتا ہے اور دونوں وقتوں میں صاحبِ جمع کی مراد، نفی مراد سے حاصل ہوتی ہے۔ "لان التفرقة فصل والجمع وصل" اس لئے کہ تفرقہ جدائی ہے اور جمع وصل و ملاپ۔ اور یہ قول تمام اقوال میں صحیح و درست ہے جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی ہمت، حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ جمع تھی کیونکہ انہیں حضرت یوسف علیہ السلام کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا اسی طرح مجنوں کی ہمت، لیلیٰ کے ساتھ جمع تھی کیونکہ اسے لیلیٰ کے سوا کچھ نظر آتا ہی نہ تھا۔ اُسے سارے جہان میں ہر چیز کے اندر لیلیٰ نظر آتی تھی۔ اس قسم کی بے شمار مثالیں ہیں۔

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ ایک دن حجرے میں تشریف فرما تھے کسی نے دستک

دی اور پوچھا کیا بایزید حجرے میں ہیں؟ انھوں نے فرمایا بجز حق کے حجرے میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ایک درویش مکہ مکرمہ آیا اور وہ ایک سال تک خانہء کعبہ کے روبرو اس طرح بیٹھا رہا کہ نہ اس نے کچھ کھایا نہ پیا، نہ سویا نہ رفع حاجت کو کہیں گیا۔ اس کی تمام ہمتیں خانہء کعبہ کے مشاہدے ہی میں مجتمع رہیں۔ اس نے اپنے آپ کو خانہ کعبہ سے اس طرح منسوب کر دیا کہ اس کا دیدار ہی اس کے جسم کی غذا اور اس کے روح کی توانائی بن گئی۔

ان حقائق کی اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کے خمیر کو جو کہ جوہر ہے حصّہ حصّہ کر کے اس کا ایک ایک حصّہ اپنے ہر محبوب کے لئے اس کی تقدیر و لیاقت کے موافق مخصوص کر دیا ہے۔ اس وقت اس سے انسانی جوش، طبعی لباس مزاجی پردے اور روح کے حجاب اٹھ جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ جزو محبت جو اسے عطا ہوا ہے اپنی صفت پر اسے ڈھال لیتا ہے۔ اور سر تا پا محبت کا پیکر بن جاتا ہے اس کی تمام حرکتیں اور مشاہدے اسی سے مربوط ہو جاتے ہیں۔ اسی بناء پر ارباب معانی و اصحاب زبان اس کیفیت کو جمع کے نام سے موسوم کرتے ہیں اسی معنی میں حضرت حسین بن منصور فرماتے ہیں کہ

لبیک لبیک یا سیدی و مولائی

لبیک لبیک یا مقصدی و معنائی

یا عین، عین وجودی یا منتہی ھممی

یا منطقی و اشاراتی و ایمائی

یا کل کلی و یا سمعی و یا بصری،

و یا جملتی و تباعض و اجزائی

یعنی حاضر ہوں حاضر ہوں اے میرے سردار اے میرے مولا

حاضر ہوں حاضر ہوں اے میرے مقصد و معنی،

اے ذات، تو میرے وجود کا عین ہے، اے منتہٰی تو میری ہمتوں کا منتہٰی ہے

اے مجھے گویائی دینے والے، میرا کلام، میرا اشارہ، اور میرا کہنا تو ہی ہے

اے میرے کل کے کل! اے میرے کان اور میری آنکھ،

اے میرے تمام بدن اور میرے کل اعضاء و اجزاء سب تجھ سے ہی ہیں

لہٰذا جو اپنی صفات میں مستعار ہوتا ہے وہ اپنی ہستی میں عار اور لائق شرمسار ہوتا ہے اور دونوں جہان میں اس کی توجہ کفر ہوتی ہے اور موجودات میں اس کی ہمت موجبِ ذلت ورسوائی ہوتی ہے۔

اربابِ زبان کا ایک گروہ، اپنی عبارت وبیان کو مشکل ومحیر العقول بنانے کے لئے جمع الجوامع یعنی "جمع کی جمع بول جاتے ہیں اگرچہ یہ کلمہ عبارت میں تو اچھا ہے مگر معنی میں یہی بہتر ہے کہ جمع کی جمع نہ بولا جائے اس لئے کہ اولاً تفرقہ ہو تو اس پر جمع درست ہوسکتی ہے اور جب کہ جمع خود جمع ہے تو تفرقہ کیسے ہوگا؟ اور جمع کو اپنے حال سے کیسے گرایا جائے گا۔اس طرح یہ عبارت یعنی جمع الجمع تہمت کی جگہ بن جائے گی۔اس لئے کہ جو جمع ہو جائے وہ فوق وتحت میں اپنے سے باہر نہیں دیکھ سکتا۔تم نے نہیں دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کو شبِ معراج، سارا جہان دکھایا گیا مگر آپ نے کسی چیز کی طرف التفات نہ فرمایا کیونکہ آپ جمع کے ساتھ جمع تھے۔اور مجتمع کو مشاہدے کی تفریق جدا نہیں کرسکتی۔اور وہ تفرقہ کو نہیں دیکھتا اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مازاغ البصر وما طغیٰ	محبوب کی آنکھ نہ ادھر ادھر پھری اور نہ حد سے گزری۔

میں نے اس معنی میں ایک کتاب بنام "کتاب البیان لاہل العیان" شروع میں لکھ دی ہے۔اور کتاب "بحر القلوب" میں جمع کے بیان میں چند واضح فصلیں تحریر کردی ہیں۔اس جگہ اظہار حقیقت کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ساری مذہب، تصوف میں مقبول ومحقق ہے۔اب میں ان نام نہاد صوفیوں کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جو ملحدین کا گروہ ہے۔اور اُن کی عبارتوں کو بیان کرتا ہوں جن کو پھیلا کر وہ خود ذلیل وخوار ہوئے ہیں۔اور اپنی عزت گنوائی ہے۔ضروری ہے کہ ان کی غلطیاں ظاہر ہو جائیں اور صاحبِ ارادت، ان کے جھوٹے دعووں اور ان کے مکروفریب سے محفوظ ہو جائیں۔اور خود کو ان سے بچائیں۔والامر کل بیدہٖ

۱۱۔۲ ملحدوں کے حلولی فرقے

حلولیوں کے دُو مردود گروہ ہیں۔جو صوفیاء کے ساتھ محبت کا دم بھرتے ہیں مگر حقیقت میں وہ اپنی گمراہی کے اندر ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں۔اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے۔

فماذا بعد الحق الا الضلال فانّی تصرفون۔	اب حق کے بعد گمراہی کے سوا کچھ نہیں تم کہاں بھٹک رہے ہو۔

ایک مردود گروہ، اپنا پیشوا ابوحلمان دمشقی کو بتاتا ہے اوران کی طرف ایسی روایتیں منسوب کرتا ہے جواُن کے برخلاف ہیں جن کو مشائخ اپنی کتابوں میں ان سے منقول لکھ چکے ہیں اور مشائخ ان کو اربابِ ولایت میں سے جانتے ہیں لیکن ملحد و بے دین گروہ ان کی طرف حلول و امتزاج اور تنسخ ارواح کی باتیں منسوب کرتے ہیں میں نے متقدمین کی کتابوں میں ان کے اوپر طعنوں کو پڑھا ہے۔اور علماء اصول بھی ان کے ساتھ اسی قسم کا برتاؤ کرتے ہیں صحیح حقیقتِ حال کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

اور دوسرا مردود گروہ وہ ہے جو فارس کی طرف نسبت کرتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ یہ حضرت حسین بن منصور کا مذہب ہے حالانکہ ان ملحوں کے سوا، حضرت حسین بن منصور کے اصحاب و تلامذہ میں سے کسی کا بھی یہ مذہب نہیں ہے۔ میں نے ابو جعفر صیدلانی کو دیکھا ہے جو چار ہزار لوگوں کے ساتھ عراق میں پھیلا ہوا ہے۔ اور اپنے آپ کو حلاجی کہلاتا ہے۔ ان کے اقوال کے سبب فارس پر تمام بزرگ لعنت کرتے ہیں حالانکہ حضرت حسین بن منصور کی مصنفات میں بجز تحقیق کے کسی قسم کی لغویت نہیں ہے۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ فارس اور ابوحلمان کون ہے؟ اور ان کے کیا اقوال ہیں؟ لیکن جو بھی کوئی ایسی بات کا قائل ہو جو توحید و تحقیق کے خلاف ہو دین میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ چونکہ دین میں جو چیز اصل ہے وہ توحید و تحقیق کا استحکام ہے جب کہ وہ اس میں ہی مستحکم نہیں تو تصوف جو کہ دین کی فرع اور اس کا نچوڑ ہے بدرجہ اولیٰ خلل پذیر ہوگا۔ اس لئے کہ ظہور کرامات کشف اور مشاہدۂ آیات الٰہیہ اہل توحید اور دینداروں کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان باطل اقوال کے ماننے والوں کی روح میں تو سراسر غلطیاں ہی غلطیاں ہیں (انھیں دین و ولایت سے کیا علاقہ) اب میں قانون سنت کے مطابق ان کے احکام اور ملحدوں کے اقوال و مغالطے اور ان کے شبہات کو بیان کرتا ہوں تاکہ تم جان سکو کہ اس میں کتنے فساد پھیلائے گئے ہی۔ وباللہ التوفیق۔)

روح کی بحث

واضح رہنا چاہیے کہ روح کے وجود کا علم ضروری ہے لیکن اس کی حقیقت و معرفت میں عقل عاجز ولاچار ہے۔ امت مسلمہ کے ہر عالم و دانشور نے اپنے اپنے فہم و قیاس کے موافق کچھ نہ کچھ کہا ہے اور کفار و ملحدین نے بھی اس میں خامہ فرسائی کی ہے۔ جس وقت کفارِ قریش نے

یہودیوں کے سکھلانے پر نضر بن حارث کو بھیجا کہ وہ رسول کریم ﷺ سے روح کی کیفیت اور اس کی ماہیت دریافت کرے تو اللہ تعالیٰ نے پہلے روح کا اثبات کرتے ہوئے فرمایا:۔

ویسئلونك عن الروح۔	اے محبوب تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے روح کی قدامت کی نفی کرتے ہوئے فرمایا۔

قل الروح من امرِ ربّی۔	اے محبوب کہہ دو کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:۔

"الارواح جنود مجندة فما تعارف منها ائتلف وماتنا کرمنها اختلف"

روحیں لشکر پیوستہ ہیں تو جو اس کی معرفت کی کوشش کرتا ہے وقت ضائع کرتا ہے اور جو اس کا انکار کرتا ہے وہ غلطی پر ہے۔ اس قسم کے بکثرت دلائل ہیں لیکن ان میں روح کی ماہیت پر بحث نہیں کی گئی جو روح کے وجود پر کیفیت میں تصرف کے بغیر شاہد ہے۔ چنانچہ ایک گروہ کہتا ہے کہ

الروح هو الحيوة التی يحيى به الجسد۔	روح ایک زندگی ہے جس سے بدن زندہ رہتا ہے۔

متکلمین کی ایک جماعت کا بھی یہی مذہب ہے۔ اس معنی میں روح ایک عرض ہے جس سے حکم خدا کے تحت جاندار زندہ ہوتا ہے اور تالیف و حرکت کے اقسام کے اجتماع اسی سے وابستہ ہے۔ جس طرح دیگر اعراض ہوتے ہیں جو ہر شخص کو ایک حال سے دوسرے حال کی طرف لے جاتے ہیں۔

ایک اور گروہ یہ کہتا ہے کہ:۔

"هو غير الحيوة ولا يوجد الحيوة الامعها كمالا يوجد الروح الامع البنيه وان لا يوجد احد هما دون الأخر كالالم، والعلم بها لا نهما شيئا لا يفترقان۔"

روح زندگی کے سوا ایک شئے ہے۔ اور زندگی اس کے بغیر نہیں پائی جاتی اور روح، جسم کے بغیر نہیں پائی جاتی اور دونوں میں کوئی بھی ایک دوسرے کے بغیر نہیں پائی جاتی، جیسے الم اور اس کا علم۔ کیونکہ یہ دونوں جداگانہ شئے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ حیٰوۃ کے سوا روح کا وجود، علیحدہ ہے اس کا وجود بغیر حیات کے ممکن

نہیں ہے۔ جیسے کہ غیر معتدل شخص کی روح، جو ایک دوسرے کے بغیر نہیں پائی جاتی مثلاً الم و تکلیف اور اس کا علم، کہ یہ دونوں وجود میں تو مختلف ہیں لیکن وقوع میں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ اسی معنی میں اسے عرضی بھی کہا جاتا ہے جس طرح کہ حیات کہا جاتا ہے۔

جمہور مشائخ اور اکثر اہل سنت و جماعت کا مذہب یہ ہے کہ روح نہ عینی ہے نہ وصفی، اللہ تعالیٰ جب تک روح کو انسانی قالب میں رکھتا ہے تو وہ دستور کے مطابق قالب میں حیات پیدا کرتا ہے۔ اور حیات انسان کی صفت ہے اور وہ اسی سے زندہ رہتا ہے۔ اور یہ کہ روح جسمِ انسانی میں عاریۃً ہے ممکن ہے کہ وہ انسان سے جدا ہو جائے اور حیات کے ساتھ زندہ رہے۔ جس طرح کہ نیند کی حالت میں روح نکل جاتی ہے مگر وہ حیات کے ساتھ زندہ رہتی ہے اور یہ ممکن ہے کہ جسم سے روح نکل جانے کے وقت اس میں عقل و علم باقی رہے۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ شہداء کی روحیں سبز پرندوں کی شکل میں ہوتی ہیں۔ یقیناً اس سے یہ لازم آتا ہے کہ روح عینی ہے۔ نیز آپ نے فرمایا "الارواح جنود مجندۃ" روحیں صف بستہ لشکر ہیں۔ لامحالہ جنود باقی ہوتا ہے اور عرض پر بقا جائز نہیں اور نہ عرض از خود قائم ہو سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ روح ایک جسم لطیف ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے آتی جاتی ہے۔ نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم فرماتے ہیں کہ شب معراج میں نے، حضرت آدمؑ صفی اللہ، یوسف صدیق، موسیٰ کلیم اللہ، ہارون حلیم اللہ، عیسیٰ روح اللہ اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہم السلام کو آسمانوں پر دیکھا۔ بلاشبہ وہ ان کی ارواحِ مقدسہ تھیں۔ اگر روح شے عرضی ہوتی تو از خود قائم نہ ہوتی اور اسے ہستی دوجود کی حالت میں نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ اگر وہ عرضی ہوتی تو اس کے وجود کے لئے کوئی مقام درکار ہوتا۔ تاکہ عارض اس مقام میں قیام کرے اور وہ مقام اس کا جوہر ہوتا اور جواہر مرکب و کثیف ہوتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ رُوح کے لئے، جسمِ لطیف ہے۔ جب کہ وہ صاحبِ جسم ہے تو اس کا دیکھنا بھی ممکن ہے۔ خواہ دل کی آنکھ سے ممکن ہو یا سبز پرندوں کی شکل میں یا صف بستہ لشکری کی صورت میں جن سے وہ آئیں اور جائیں۔ اس پر حدیثیں شاہد ہیں اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:-

قل الروح من امر ربی۔	اے محبوب تم کہہ دو کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے۔

اب بے دینوں کے ایک اختلاف کا بیان اور باقی ہے وہ یہ کہ روح کو قدیم کہتے ہیں اور اس کو پوجتے ہیں۔ اشیاء کا فاعل اور ان کا مدبّر اسی کو جانتے ہیں۔ وہ ارواح کو آلہ کہتے اور

اسے ہمیشہ مدبّر سمجھتے ہیں اور ایک سے دوسرے کی طرف الٹنے پلٹنے والا جانتے ہیں (گویا وہ آواگون اور تناسخ کے قائل ہیں) ان لوگوں نے عوام میں جس قدر شبہات پھیلائے ہیں کسی نے اتنے نہیں پھیلائے اور نصاریٰ کا مذہب اسی پر ہے۔ اگرچہ ان کی ظاہری عبارتیں اس کے برخلاف ہیں اور تمام اہل ہنود تبت وچین اور ماوراء چین کے لوگ بھی اسی کے قائل ہیں۔ گروہ شیعہ، قرامط اور باطنی لوگ بھی اس کے قائل ہیں اور یہ دونوں مردود و باطل گروہ بھی انھیں خیالاتِ فاسدہ کے قائل ہیں اور ہر گروہ اسے مقدم جانتا اور دلائل پیش کرتا ہے۔ ہم ان کے تمام دعوؤں میں سے صرف لفظ قدم کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ اس سے تمہاری کیا مراد ہے؟ کیا شئی محدِث اپنے وجود میں متقدم ہے یا ہمیشہ قدیم۔

اگر وہ یہ کہیں کہ ہماری مراد، محدث، وجود میں متقدم ہے تو اس بنیاد پر اصل سے اختلاف ہی جاتا رہتا ہے۔ کیونکہ ہم بھی روح کو محدث کہتے ہیں یا یہ کہ اس شخص کے وجود پر روح کا وجود متقدم ہے۔ کیونکہ سید عالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

ان اللّٰہ تعالٰی خلق الارواح قبل الاجساد بمأتی الف عام	اللہ تعالیٰ نے اجسام کی تخلیق سے دو لاکھ برس قبل ارواح کو پیدا فرمایا۔

چونکہ ارواح کا محدث ہونا صحیح ہے تو لامحالہ محدث کے ساتھ جو محدث ہو وہ بھی محدِث ہوتا ہے۔ اور دونوں ایک جنس کے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے تخلیق میں ایک کو دوسرے کے ساتھ ملایا ہے اور اس اتصال سے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے حیات پیدا فرمائی ہے۔ مطلب یہ کہ تخلیق میں روح ایک جدا جنس ہے اور اجسام ایک جنس جداگانہ۔ اللہ تعالیٰ جب کسی کو حیات عطا فرماتا ہے تو روح کو جسم کے ساتھ ملنے کا حکم دیتا ہے اور اس سے زندگانی حاصل ہو جاتی ہے۔ البتہ ایک جسم سے دوسرے جسم کی طرف روح کا منتقل ہونا جائز نہیں ہے اس لئے کہ جب ایک جسم کے لئے دو قسم کی حیات جائز نہیں تو ایک روح کے لئے دو مختلف جسم یا وجود بھی جائز نہیں۔ اگر اس پر احادیث ناطق نہ ہوتیں اور حضور اکرم ﷺ اپنے ارشاد میں صادق نہ ہوتے از روئے عقل، صرف معقول روح، حیات کے بغیر نہ ہوتی اور وہ صفتی ہوتی عینی نہ ہوتی۔

اگر یہ ملحدین یہ کہیں کہ قدم سے مراد، قدیم و دوام ہے تو ہم دریافت کرتے ہیں کہ یہ از خود قائم ہے یا کسی دوسرے کے ساتھ۔؟ اگر یہ کہیں کہ قائم بنفسہٖ ہے تو ہم دریافت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کا جاننے والا ہے یا نہیں؟ اگر کہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کا جاننے والا نہیں ہے تو دوسرا

قدیم ثابت ہوتا ہے اور یہ عقلاً محال ہے کیونکہ قدیم محدود نہیں ہوتا۔ حالانکہ ایک ذات کا وجود دوسرے کی ضد ہوتی ہے اور یہ محال ہے۔ اگر کہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کا جاننے والا ہے تو ہم جواب دیں گے کہ وہ تو قدیم ہے اور مخلوق محدث اور یہ محال ہے کہ محدث کا قدیم کے ساتھ امتزاج ہو یا اتحاد و حلول یا محدث قدیم کی جگہ ہو یا قدیم محدث کی جگہ اور جب ایک دوسرے سے ملایا جائے گا تو دونوں ایک ہو جائیں گی۔ اور جدائی محدثات کے سوا جائز نہیں۔ کیونکہ جنسیں مختلف ہیں۔

تعالى الله عن ذالك علوا كبيرا۔

اور اگر یہ کہیں کہ وہ قائم بنفسہٖ نہیں ہے اور اس کا قیام غیر کے ساتھ ہے تو یہ صورت دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ صفتی ہو گا یا عرضی۔ اگر عرضی کہیں تو لامحالہ اسے یا کسی محل میں کہیں گے یا لامحل میں۔ اگر اسے محل میں کہیں تو وہ محل بھی اس کی مانند ہو گا اور قدم کا نام ہر ایک سے باطل ہو جائے گا اور اگر لامحل میں کہیں تو یہ محال ہے جب کہ عرض خود ہی قائم بنفسہٖ نہیں تو لامحل میں کس طرح متصور ہو گا اور اگر کہیں کہ صفت قدیم ہے جیسے کہ حلول و تناسخ والے کہتے ہیں اور وہ صفت کو حق تعالیٰ کی صفت کہتے ہیں۔ تو یہ بھی محال ہے کہ حق تعالیٰ کی قدیم صفت کسی مخلوق کی صفت بن جائے اور اگر یہ جائز ہو کہ خدا کی حیات، مخلوق کی صفت ہو جائے تو یہ بھی جائز ہو گا کہ اس کی قدرت، مخلوق کی قدرت ہو جائے۔ اس طرح صفت موصوف کے ساتھ قائم ہو جائے۔ لہٰذا یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ قدیم صفت کے لئے حادث موصوف ہو لامحالہ قدیم کو حادث سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔ بہر طور اس بارے میں ملحدوں کا قول باطل ہے۔

فرمانِ الٰہی کے موافق روح مخلوق ہے جو اس کے خلاف کہے گا وہ کھلا مکابرہ ہے اور وہ حادث و قدیم کا فرق نہیں جانتا۔ اور ولی کے لئے یہ کسی طور پر جائز نہیں ہے کہ وہ صحتِ ولایت کے ساتھ حق تعالیٰ کے اوصاف سے بے بہرہ ہو۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں بدعت و ضلالت اور وسواس شیطانی سے محفوظ کر کے عقل سلیم عطا فرمائی ہے۔ جس کے ذریعہ غور و فکر اور استدلال کرتے ہیں اور بحمدہٖ تعالیٰ اس نے ہمیں دولتِ ایمان سے سرفراز فرمایا ہے جس سے ہم اسے پہچانتے ہیں۔ وہ حمد ہی کیا جو حمد اپنی غایت کو نہ پہنچے کیونکہ نامتناہی نعمتوں کے مقابلہ میں حمد متناہی ہوتی ہے۔ وہ نامقبول ہوتی ہے۔ جب اہل ظواہر نے ارباب اصول سے اس قسم کی باتیں سنی تو گمان کرنے لگے کہ تمام صوفیاء کا ایسا ہی اعتقاد ہو گا۔ اس لئے وہ ان نیکوکار بزرگوں کے

بارے میں کھلے نقصان اوران کے جمال سے محجوب ہوگئے اوروہ ولایتِ حق کے لطائف اور شعلہ ہائے رموزِ ربانی کے ظہور سے پوشیدہ رہ گئے۔اس لئے اکابر سادات کی راہوں سے برگشتہ ہونا اورانھیں رد کرنا ان کے قبول کرنے کی مانند اوران کا قبول کرنا ان کے رد کرنے کی مانند ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

رُوح کے بارے میں اقوال مشائخ

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ

الروح فی الجسد کالنار فی الحطب فالنار مخلوقة والفحم مصنوعة	جسم میں روح، لکڑی میں آگ کی مانند ہے آگ مخلوق ہے۔اور کوئلہ مصنوع۔

اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے سوا کسی چیز کا قدیم ہونا باطل ہے۔

حضرت ابوبکر واسطی رحمتہ اللہ علیہ نے روح کے بارے میں مفصل بحث کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ:۔

الارواح علی عشر مقامات	دس مقامات پر روحیں قائم ہیں۔

(۱) مفسدوں کی روح تاریکی میں مقید ہے......اور جانتی ہیں کہ ان کے ساتھ کیا ہوگا؟

(۲) نیک ومتقی حضرات کے جسموں کی روحیں آسمان کے نیچے اعمالِ صالحہ کے باعث خوش اورطاعت الٰہی میں مسرور ہوکر اس کی طاقت سے چلتی ہیں۔

(۳) محسنین کے جسموں کی روح نورانی قندیلوں عرشِ الٰہی سے آویزاں ہیں جن کی غذا محبت اوران کا پانی شرابِ لطف وقربتِ ربانی ہے۔

(۴) مریدین کے جسموں کی روح کا مسکن چوتھے آسمان پر ہے وہاں صدق کی لذت پاتے ہیں اوراپنے اعمال کے سایہ میں فرشتوں کے ساتھ ہیں۔

(۵) اہلِ وفا کے جسموں کی روح حجابِ صفا اور مقامِ اصطفا میں خوش ہے۔

(۶) شہداء کے جسموں کی ارواح سبز پرندوں کے قالب میں جنت اوراس کے باغوں میں رہتی ہیں۔وہ جہاں چاہیں اورجب چاہیں جائیں۔

(۷) مشتاقوں کے جسموں کی ارواح ادب کے فرش پر انوار صفات کے پردوں میں قیام کرتی ہیں۔

(۸) عارفوں کے جسموں کی روحیں قدس کے توشک میں صبح وشام کلامِ الٰہی کی سماعت کرتی ہیں۔ اور وہ دنیا اور جنت میں اپنے مساکن کو ملاحظہ کرتی ہیں۔

(۹) محبوبوں اور دوستوں کے جسموں کی ارواح مشاہدۂ جمالِ الٰہی اور مقامِ کشف میں محو ہیں اس کے سوا وہ کسی چیز کی خبر نہیں رکھتیں اور نہ کسی سے انھیں بجز اس کے چین و راحت ملتی ہے۔

(۱۰) درویشوں کے جسموں کی روحیں محلِ فنا میں مقرب ہوکر اور اپنی صفات کو بدل کر احوال میں متغیر ہوتی ہیں۔

اربابِ طریقت بیان کرتے ہیں کہ مشائخ نے ہر ایک کو ان کی جداگانہ صورتوں میں دیکھا ہے اور یہ دیکھنا جائز ہے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ وہ موجود ہیں اور ان کے اجسام لطیف ہیں ان کو دیکھا جا سکتا ہے اور اللہ تعالٰے جب چاہے اور جس طرح چاہے اپنے کسی بندے کو دکھا دیتا ہے۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میری زندگانی ہر حال میں حق تعالٰے کے ساتھ ہے اور اسی سے قیام بھی ہے اور ہمیں زندہ رکھنا حق تعالیٰ کا فعل ہے۔ ہمارا وجود اور ہماری حیات سب اسی کی پیدا کردہ ہے۔ اس کی ذات وصفات سے نہیں ہیں۔ حلولیوں کا قول سراسر باطل ہے اور وہ بہت بڑی گمراہی ہے ان کا پہلا باطل قول یہ ہے کہ وہ روح کو قدیم کہتے ہیں اگرچہ ان کی عبارتیں مختلف ہیں لیکن ان کے مفہوم یکساں ہیں، اور ان کا ایک گروہ نفس وہیولیٰ کہتا ہے اور ایک گروہ نور وظلمت کہتا ہے اور اس طریقت کو باطل ٹھہرانے والے لوگ اسے یا تو فنا اور بقا کہتے ہیں یا جمع وتفرقہ وغیرہ۔ اس قسم کی بیہودہ باتیں گھڑلی ہیں اور اپنے اس کفر کی داد چاہتے ہیں۔ صوفیاء کرام، ایسے گمراہ گروہوں سے بیزار اور متنفر ہیں۔ کیونکہ اثباتِ ولایت اور محبتِ الٰہی کی حقیقت بجز معرفتِ الٰہی کے درست نہیں ہوسکتی اور جب کوئی قدیم کو محدث سے جدا کرکے پہچان نہ سکے اس بارے میں وہ جو کچھ کہے گا وہ جہالت پر مبنی ہوگا۔ عقلمند جاہلوں کی باتوں کی طرف التفات نہیں کرتے میں نے ان دونوں مردود گروہوں کا مقصد اور ان کا بطلان واضح کردیا ہے۔ اگر مزید علم کی خواہش ہو تو میری دیگر تصانیف کی طرف رجوع کریں۔ میں اس کتاب کو طول دینا نہیں چاہتا۔

اب میں طریقت وتصوف کے حجابات کا کشف اور معاملات وحقائق کے ابواب کو روشن دلائل کے ساتھ بیان کرتا ہوں تاکہ آسان طریقہ سے مقصود کا علم ہوسکے۔ اور منکرین کے لئے سامان بصیرت فراہم ہوجائے اور یہ انکار سے باز آجائیں اس طرح مجھے دعا وثواب حاصل ہوجائے۔

پہلا کشف، معرفتِ الٰہی میں

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:۔

وما قدرو اللّٰہ حق قدرہ۔	انھوں نے اللہ تعالےٰ کی قدر نہ جانی، جیسا کہ اس کی قدر کا حق ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ

لو عرفتم اللّٰہ حق معرفتہ لمشیتم علی البحور ولزالت بدعائکم الجبال۔	اگر تمہیں اللہ تعالیٰ کی معرفت کما حقہ حاصل ہوتی تو تم دریاؤں پر (خشک قدم) چلتے اور تمہاری دعاؤں سے پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جاتے۔

معرفت کی اقسام معرفتِ الٰہی کی دو قسمیں ہیں ایک علمی دوسری حالی۔ معرفتِ علمی تو دنیا و آخرت کی تمام نیکیوں کی جڑ ہے۔ جو بندے کے لئے ہمہ وقت اور ہر حالت میں تمام چیزوں سے زیادہ بہتر ہے۔

معرفتِ علمی کے دلائل اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون ای لیعرفون۔	ہم نے جن وانس کو اپنی معرفت ہی کیلئے پیدا کیا ہے۔ مگر اکثر لوگ اس سے ناواقف اور روگرداں ہیں۔

لیکن وہ حضرات جن کو اللہ تعالیٰ نے برگزیدہ فرما کر دنیاوی تاریکیوں سے محفوظ رکھا اور ان کے دلوں کو زندہ و تابندہ بنایا ان میں سے ایک حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے حال کی خبر دیتے ہوئے حق تعالیٰ نے فرمایا:۔

وجعلنا لہ نورا یمشی بہ فی الناس یعنی عمر	اور ہم نے ان کے لئے نور مقرر کیا جس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتے ہیں یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ۔

اور اللہ تعالیٰ نے جن کے دلوں پر مہر لگائی اور دنیاوی تاریکیوں میں مبتلا کیا ان میں سے ایک ابوجہل لعنۃ اللہ علیہ کے حال کی خبر دیتے ہوئے حق تعالےٰ نے فرمایا ہے۔

کمن مثلہ فی الظلمات لیس	کون ہے اس کی مثل جو تاریکیوں میں ہے جو
بخارج منہا یعنی ابوجہل	کبھی اس سے نکلتا ہی نہیں۔ یعنی ابوجہل لعنۃ اللہ علیہ

لہٰذا معرفت کی حقیقت یہ ہے کہ دل اللہ تعالیٰ کے ساتھ زندہ ہو اور اس کا باطن ماسوی اللہ سے خالی ہو۔ اور ہر ایک کی قدر و منزلت معرفت سے ہے اور جسے معرفت نہیں وہ بے قیمت ہے۔ اسی لئے تمام علماء وفقہا، علم کی صحت اور درستگی کو معرفتِ الٰہی کے ساتھ موسوم کرتے ہیں اور تمام مشائخ طریقت، حال کی صحت اور اس کی درستگی کو معرفتِ الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی بنا پر وہ معرفت کو علم سے افضل کہتے ہیں۔ کیونکہ صحتِ حال، صحتِ علم کے بغیر ممکن نہیں اور صحتِ علم کے لئے صحتِ حال لازمی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بندہ اس وقت تک عارف نہیں ہوسکتا جب تک کہ عالمِ بحق نہ ہو۔ البتہ عالم کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ عارف نہ ہو۔ جو لوگ اس معنی اور حقیقت سے ناواقف اور بے خبر ہیں خواہ کسی طبقہ سے متعلق ہوں ان سے مناظرہ کرنا بے فائدہ ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو طریقت کے منکر ہیں اور طبقہ صوفیاء ان سے جدا ہے۔ اس اجمال کے بعد اب میں اس مسئلہ کے اسرار واضح کرتا ہوں تاکہ دونوں طبقوں کو فائدہ پہنچے۔

معرفت میں نظریاتی اختلاف

اے عزیز واضح ہو کہ معرفت الٰہی اور اس کے علم کی صحت کے متعلق لوگوں میں بہت اختلاف ہے۔ چنانچہ معتزلہ کہتے ہیں کہ خدا کی معرفت عقلی ہے۔ عاقل کے سوا اس کی معرفت جائز نہیں یہ قول باطل ہے اس لئے کہ وہ دیوانے جو دارالاسلام میں ہوں ان کے لئے حکمی معرفت ہے۔ اسی طرح وہ بچے جو عاقل نہیں ان کے لئے حکمی ایمان ہے۔ اگر حکم معرفت میں عقل شرط ہوتی تو جنہیں عقل نہیں وہ معرفت کے حکم میں نہ ہوتے اور کافروں میں چونکہ عقل ہے تو ان پر کفر نہ ہوتا اور اگر معرفت کے لئے عقل علّت ہوتی تو ہر عاقل کو عارف کہا جاتا اور ہر بے عقل کو جاہل یہ کھلا مکابرہ ہے۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ حق تعالیٰ کی معرفت کی علت، استدلال ہے اور جس میں استدلال کی استعداد نہ ہو اس کے لئے یہ جائز نہیں یہ قول بھی ابلیس کی مثال سے باطل ٹھہرتا ہے اس لئے کہ ابلیس نے بکثرت نشانیاں اور آیات الٰہیہ دیکھیں مثلاً جنت، دوزخ، عرش و کرسی، وغیرہ لیکن اس کے لئے ان کی دید بھی معرفت کی علت نہ بنی اور اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔

ولوانـنا نزلنا اليهم الملئكة وكلهم الموتٰى وحشرنا عليهم كل شئى قبلا ما كانو اليومنوا الا ان يشاء الله۔	اگر ہم فرشتوں کو کفار کے پاس بھیجتے اور مردے ان سے کلام کرتے اور ان کے سامنے ہر چیز کو اٹھاتے جب بھی وہ ہرگز ایمان لانے والے نہ تھے مگر جسے اللہ چاہے۔

اگر آیاتِ الٰہیہ کی دید اور ان کا استدلال معرفت حق کی علت ہو تو اللہ تعالیٰ معرفت کی علت انھیں قرار دیتا نہ کہ اپنی مشیت کو۔

اہل سنت و جماعت کے نزدیک، صحتِ عقل، اور رویتِ آیاتِ الٰہیہ معرفت کا سبب ہے نہ کہ اس کی علت۔ اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ معرفت کی علت، بجز عنایت الٰہی اور اس کی مشیت کے کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ بغیر عنایت الٰہی، عقل اندھی ہوتی ہے کیونکہ عقل بجائے خود جاہل ہے۔ بکثرت عقلاء نے حق تعالیٰ کی حقیقت کو نہ جانا۔ جب کہ عقل بجائے خود جاہل ہے تو بغیر عنایت الٰہی وہ اپنے غیر کو کس طرح جانے گی۔؟ اسی طرح آیات الٰہیہ کی رویت میں تفکر و استدلال بھی خطا ہے کیونکہ اہلِ ہوا اور ملحدوں کی جماعت، استدلال ہی کرنے والے ہوتے ہیں بایں ہمہ وہ عرفان سے محروم رہتے ہیں۔ پھر یہ کہ جو عنایت الٰہی سے اہل عرفان ہیں ان کی تمام حرکتیں معرفت کی علامت ہیں اور ان کا استدلال اور ان کا ترک وطلب سب مسلم ہے اور صحتِ معرفت میں تسلیم طلب سے افضل نہیں ہے۔ کیونکہ طلب ایسی اصل اور بنیاد ہے جس کا ترک جائز نہیں ہے اور تسلیم ایسی اصل اور بنیاد ہے کہ اس میں اضطراب جائز نہیں ہے اور ان دونوں کے لئے معرفت حقیقت نہیں ہے لیکن یہ بھی ملحوظ رہنا چاہیئے کہ حقیقت میں بندے کے دل کو کھولنے والا اور اس کی رہنمائی کرنے والا، حق تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ محض عقل و دلائل، ہدایت کی قدرت نہیں رکھتے اور دلیل اس سے زیادہ واضح نہیں ہوتی۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے:۔

ولوردو العادو المهانهوا الآیہ	اگر انھیں لوٹائیں تو یقیناً وہ اسی طرف پلٹیں گے جس سے انھیں روکا گیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر کافروں کو قیامت کے بعد دوبارہ دنیا میں بھیجا جائے تو پھر وہ اپنے اسی کفر میں آلودہ ہو جائیں گے جس سے انھیں منع کیا گیا ہے۔

حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ سے جس وقت معرفت کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا:۔

عرفت اللّٰہ باللّٰہِ و عرفت مادون اللّٰہ بنور اللّٰہ۔	میں نے خدا کو اس کی مدد سے پہچانا اور ماسوی اللہ کو اسی کے نور سے جانا۔

چونکہ اللہ تعالیٰ نے جسم کو پیدا کر کے اس کی حیات کو روح کے حوالہ کر دیا۔ لیکن دل کو پیدا کر کے اس کی حیات کو اپنے قبضہ میں رکھا۔ ظاہر ہے کہ جب عقل اور آیات کو جسم کے زندہ کرنے کی قدرت نہیں دی تو محال ہے کہ وہ دل کو زندہ کر سکے۔ چنانچہ ارشادِ حق تعالیٰ ہے کہ:۔

اومن کان میتا فاحییناہ۔	جو شخص مردہ تھا اسے ہم نے زندہ کیا۔

اس فرمان میں ہر قسم کی زندگانی کا اپنے قبضہ میں ہونا بیان فرمایا ہے۔ پھر ارشاد ہوتا ہے:۔

وجعلنا لہ نورا یمشی بہ فی الناس۔	اور ہم نے اس کے لئے نور مقرر کیا جس کے ساتھ وہ چلتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ایسے نور کا پیدا کرنے والا جس کی روشنی میں مسلمان چلیں وہ میں ہوں۔ اور یہ بھی فرمایا کہ:۔

افمن شرح اللّٰہ صدرہٗ للاسلام فھو علیٰ نور من ربہ۔	کیا اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے جس کا سینہ کھولا۔ تو وہ اپنے رب کے نور پر ہے۔

اس ارشاد میں بتایا گیا ہے کہ دل کی کشادگی اللہ تعالےٰ کے قبضہء اختیار میں ہے اسی طرح اس کی بندش بھی اسی کے قبضہء اختیار میں ہے۔ دل کی قبض کے سلسلہ میں فرمایا ہے:۔

ختم اللّٰہ علیٰ قلوبہم و علیٰ سمعھم وعلیٰ ابصارھم غشاوۃ۔	اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے

اور فرمایا:۔

ولا تطع من اغفلنا قلبہ عن ذکرنا۔	(اے سننے والے) اس کی پیروی نہ کرنا جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے

جب کہ دل کا قبض وبسط اور اس کا ختم وشرح، اللہ تعالیٰ کے قبضہء اختیار میں ہے تو محال ہے کہ اس کے سوا کسی غیر کو رہنما بنایا جائے اور اللہ تعالیٰ کے سوا جو کچھ ہے وہ سب علت اور سبب ہے۔ ہرگز علت وسبب بغیر مسبب یعنی خدا کے راہ نہیں دکھا سکتا۔ کیونکہ حجاب راہزن ہوتا ہے نہ کہ راہبر۔؟ اللہ تعالےٰ یہ بھی فرماتا ہے کہ:۔

وَلٰکن اللّٰہ حبب الیکمُ الایمان وزینه فی قلوبکم ۔ الآیہ۔	لیکن اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے تمہیں ایمان کی محبت دی اور اسی نے تمہارے دلوں کو اس سے مزین فرمایا۔

اس ارشاد میں حق تعالیٰ نے دل کی تزئین اور محبت جاگزیں کرنے کی نسبت اللہ تعالےٰ نے اپنی طرف فرمائی ہے۔ تقویٰ اور خدا کی محبت میں قائم رہنا جو کہ عین معرفت ہے اسی کی جانب سے ہے اور ملزم کو اپنے الزام میں اس حالت کو اپنے سے جدا کرنے یا اپنی طرف لانے کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا جب تک اللہ تعالیٰ خود اپنی معرفت نہ کرائے لوگوں کے نصیب میں ہرگز اس کی معرفت ممکن نہیں ہے۔ مخلوق حصول معرفت الٰہی میں عاجز ہے۔

حضرت ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

لا دلیل علی اللّٰہ سواہ انما العلم یطلب لآداب الخدمة	اللہ تعالیٰ پر اس کے سوا کوئی دلیل و رہنما نہیں۔ علم تو خدمت (عبادت) کا طریقہ سیکھنے کے لئے حاصل کرتے ہیں۔

مطلب یہ کہ کسی مخلوق کو یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ بندے کو خدا تک پہنچا دے۔ استدلال کرنے والا، حضرت ابوطالب سے بڑھ کر عاقل نہ ہوگا اور حضور اکرم ﷺ سے زیادہ بزرگ کوئی دلیل نہ ہو گی۔ جب کہ حضرت ابوطالب کو شقاوت پر اجرا کا حکم تھا تو حضور اکرم ﷺ کی دلالت انہیں فائدہ نہ پہنچا سکی۔ استدلال کی خرابیوں میں سے پہلا درجہ یہ کہ مستدل، حق تعالیٰ کی توفیق و عنایت سے روگرداں ہوتا ہے کیونکہ بوقت استدلال وہ غیر خدا پر غور و فکر کرتا ہے۔ حالانکہ معرفت کی حقیقت تو یہ ہے کہ وہ غیر خدا سے روگرداں ہو اور دلائل کی جستجو کرنے والوں کی عادت استدلال کے سلسلے میں یہی ہے اور حق کی معرفت کے خلاف ہے۔ لہٰذا جب معرفتِ الٰہی، بجز دوامی حیرانی عقل نہیں تو عنایتِ الٰہی کو اپنی طرف متوجہ کرنا بندے کے لئے اپنے اختیار میں کیسے ہوگا؟ کیونکہ اس راہ میں مخلوق کے کسب و اختیار کو کوئی دخل ہے ہی نہیں۔ اور خدا کے سوا بندے کی دلالت کرنے والا اور کوئی نہیں ہے۔ رہا شرح صدر اور کشادگیِ قلب کا معاملہ، تو یہ غیبی خزانوں سے متعلق ہے۔ اس لئے کہ جو کچھ خدا کے سوا ہے وہ سب حادث ہے اور اپنے جیسوں تک تو پہنچ سکتا ہے لیکن اپنے پیدا کرنے والے تک (خدا کی عنایت کے بغیر) نہیں پہنچ سکتا۔ باوجودیکہ اس کا کسب و اختیار بھی اسی

کا پیدا کردہ ہے۔ لیکن جب وہ کسی کے تحت آجاتا ہے تو کسبِ کاسِب، غالب ہو جاتا ہے اور حاصل شدہ مغلوب۔ لہٰذا اس میں عزت نہیں کہ عقلِ انسانی فعل کی دلالت سے فاعل کی ہستی کا اثبات کرے بلکہ عزت و کرامت اس میں ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے نور سے اپنی ہستی کی نفی کرے۔ اول شخص کو معرفتِ قولی حاصل ہے اور دوسرے کو معرفتِ حالی۔

لیکن وہ گروہ جو عقل کو معرفت کی علّت جانتا ہے اس سے کہو کہ تمہارے دل میں عینِ معرفت سے کیا چیز ثابت ہوتی ہے؟ کیونکہ جو کچھ عقل ثابت کرتی ہے معرفت اس کی نفی کا اقتضاء کرتی ہے مطلب یہ کہ دلالت عقلی کے ذریعہ دل میں جو خدا کی صورت بندھتی ہے کہ خدا ایسا ہے اس کی حقیقت اس کے برخلاف ہے۔ لہٰذا عقل کو کہاں قدرت ہے کہ استدلال کے ذریعہ خدا کی معرفت حاصل کرے اس لئے کہ عقل و وہم دونوں ہم جنس ہیں۔ جہاں جنس ثابت ہوتی ہے وہاں معرفت کی نفی ہوتی ہے۔ لہٰذا استدلالِ عقلی سے تشبیہ کا اثبات ہوتا ہے اور اس کی نفی سے تعطیل۔ عقل کی رسائی انھیں دونوں قاعدوں تک ہے اور یہ دونوں معرفت کے لئے بیکار ہیں۔ کیونکہ مشبّہ اور معطلہ موحد نہیں ہوتے۔ عقل کی رسائی وہیں تک ہے جہاں تک اس کا امکان ہے اور جو کچھ اس سے نمودار ہوتا ہے وہ سب امکان یعنی حادث و مخلوق ہے۔

اللہ تعالیٰ کے دوستوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ جستجو و تلاش کریں لامحالہ وہ خدا کے حضور میں حاضر ہو کر بغیر کسی علّت و سبب کے آ کھڑے ہوئے اور اپنے آرام میں بے آرام ہو کر آہ و زاری کے ساتھ ہاتھ پھیلا دیئے اور اپنے زخمِ دل کے لئے مرہم مانگنے لگے۔ کیونکہ ان کی راہ، اپنی قدرت و طلب کے اقسام سے ناواقف تھی تب قدرت حق اس جگہ ان کی طاقت بنی اور اس طرح وہ اس تک رسائی پا گئے اور غیبت کی تکلیف سے نجات حاصل کی محبت کے باغ میں جگہ بنا کر آرام کرنے لگے اور ان کی روح میں سرور پیدا ہوا۔ جب عقل نے دلوں کو فائز المرام دیکھا تو اس نے اپنا تصرف ظاہر کرنا چاہا مگر اس نے دخل نہ پایا تو تھک ہار کر بیٹھ گئی اور متحیر و پریشان ہو گئی۔ جب حیرت و پریشانی کا استیلاء ہوا تو عقل معزول ہو گئی اور جب عقل معزول ہوئی تو حق تعالیٰ نے خدمت کا لباس عطا کر کے فرمایا اے عقل جب تک تو باخود تھی اس وقت تک اپنے تصرف و اسباب کے ساتھ محجوب تھی۔ جب تیرے آلاتِ تصرف فانی ہو گئے اور تو تنہا رہ گئی جیسے کہ پہلے تھی تب تو نے رسائی حاصل کی اس طرح دل کو قربت اور عقل کو خدمت

نصیب ہوئی۔ چونکہ اپنی معرفت کے اندر معرفت پنہاں تھی جب اپنی معرفت ہوگئی تو اللہ تعالےٰ نے بندے کو اپنا عرفاں عطا کر کے منزلِ عرفان سے روشناس کرایا تا کہ بندہ عرفان سے معرفتِ الٰہی کو پہچانے نہ کہ اسباب کے ذریعہ۔ بلکہ اس کی شناخت اُس وجود کے ذریعہ ہے جو اسے عطا کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ عارف کی انانیت مکمل طور پر فانی ہو کر اس کا ذکر بغیر نسیان کے اور اس کا حال بغیر تقصیر کے بن گیا اب اس کی معرفت حال ہے نہ کہ گفتار۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ معرفتِ الٰہی الہامی ہے۔ حالانکہ یہ بھی محال ہے۔ اس لئے کہ معرفت کے لئے صادق و کاذب ہر طرح کی دلیلیں ہوسکتی ہیں اور الہام والوں کے لئے خطاو صواب پر محتمل دلیل نہیں ہوتی۔ اسلئے کہ ایک کہے گا مجھے الہام ہوا ہے کہ خدا مکان میں ہے اور دوسرا کہے گا کہ مجھے الہام ہوا ہے کہ اس کے لئے مکان نہیں ہے۔ لامحالہ ان دونوں مختلف دعووں میں ایک ہی حق پر ہوسکتا ہے۔ حالانکہ دونوں ہی الہام کے مدعی ہیں۔ یقیناً اس کے فیصلہ کے لئے کوئی ایسی دلیل درکار ہوگی جس سے صدق و کذب کے درمیان فرق ظاہر ہو جائے۔ اور یہ دونوں مدعی جان لیں کہ الہامی حکم باطل ہے۔ یہ قول برہمنوں کا ہے۔ میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو الہام کے مدعی ہیں اور اس میں بہت غلو کرتے ہیں۔ اور اپنے حالات کی نسبت، مردانِ پارسا کی طرح کرتے ہیں۔ حالانکہ ایسے لوگ گمراہی پر ہیں۔ ان کی باتیں نہ صرف مسلمانوں کے خلاف ہیں بلکہ کافروں کے عقلمندانہ نظریات کے بھی خلاف ہیں۔ اس لئے کہ یہ مدعیانِ الہام، یہ ہی متناقض و متخالف باتوں کا دعویٰ کرتے ہیں۔ جو حکم میں سب کے سب باطل ہیں۔ ان مدعیانِ الہام میں سے کوئی ایک بھی حق پر نہیں ہوتا۔

اگر کوئی یہ کہے کہ ''جو کچھ شریعت کے خلاف ہو وہ الہام نہیں ہوتا'' تو ہم جواب دیں گے کہ تم تو اپنے اصل و قاعدے میں غلطی پر ہو اس لئے کہ شریعت کو اپنے الہام پر قیاس کرتے ہوئے کہتے ہو کہ شریعت سے ہمارا الہام ثابت ہے۔ حالانکہ معرفتِ الٰہی شرعی، ثبوتی اور ہدایتی ہوتی ہے نہ کہ الہامی اور معرفت میں الہام کا حکم بہمہ وجوہ باطل ہے۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ معرفتِ حق ضروری یعنی بدیہی ہے۔ حالانکہ یہ قول بھی باطل ہے اس لئے کہ بندے کے لئے ہر وہ چیز جس کا اسے علم ہو اگر بدیہی ہو تو ضروری ہے کہ اس میں تمام عقلاء مشترک و متحد ہوں۔ میں نے عقلاء کی ایک جماعت ایسی دیکھی ہے جو بدیہی ہونے کی منکر ہے اور تشبیہ و تعطیل کو جائز سمجھتی ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ یہ ضروری اور بدیہی نہیں ہے۔ ایک وجہ

یہ بھی ہے کہ اگر معرفتِ الٰہی ضروری وبدیہی ہوتی تو اس پر تکلیف جائز نہ ہوتی۔ کیونکہ محال ہے کہ کسی ایسی چیز کی معرفت کی لئے جس کا علم ضروری و بدیہی ہو، اس پر تکلیف ہو مثلاً اپنی پہچان آسمان وزمین، دن ورات اور تکلیف وراحت وغیرہ وغیرہ کہ یہ سب بدیہی ہیں اور ان میں سے کسی کے وجود کے لئے عاقل کو شک وشبہ لاحق نہیں ہوتا اور نہ اسے اس کی حاجت ہوتی ہے کہ وہ پریشان ہو اور علم حاصل کرنا چاہے تو بھی حاصل نہ ہوسکے۔ البتہ صوفیوں کے ایک گروہ نے جب اپنے یقین کی صحت ودرستگی پر غور کیا تو کہنے لگے کہ ہم اسے ضروری وبدیہی جانتے ہیں۔ کیونکہ دل میں کوئی شک وشبہ واقع نہیں ہے۔ انھوں نے یقین کا نام ضروری وبدیہی رکھ لیا۔ یہ بات معنی کے لحاظ سے درست ہے لیکن تعبیر وبیان کے اعتبار سے غلط ہے اس لئے کہ ضروری و بدیہی علم میں، صحت ودرستگی کی تخصیص جائز نہیں ہوتی ہے۔ اور وہ تمام عقلوں میں مساوی ہوتی ہے۔ اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ضروری و بدیہی علم وہ ہوتا ہے جو زندوں کے دلوں میں بغیر سبب ودلیل ظاہر ہو۔ لیکن علم الٰہی اور معرفتِ ربانی سببی ہے۔

حضرت استاذ ابو علی دقاق اور شیخ ابو سہل صعلو کی اور ان کے والد جو نیشا پور کے امام ورئیس تھے۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ معرفت کی ابتداء استدلال سے ہے اور اس کی انتہا ضرورت وبداہت ہے۔

اہل سنت وجماعت کا ایک قول یہ ہے کہ جب جنت میں علمِ الٰہی ضروری و بدیہی ہو جائے گا اور یہ جائز بھی ہے تو یہاں بھی ممکن ہے کہ وہ ضروری و بدیہی ہو جائے۔ نیز ایک قول یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جب اللہ تعالےٰ کا کلام سنتے ہیں خواہ وہ بے واسطہ ہو یا فرشتہ یا وحی کے ذریعہ؟ تو وہ اسے ضروری و بدیہی جانتے ہیں اور ہم بھی یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اہلِ جنت، بہشت میں اللہ تعالیٰ کو ضرورت و بداہت سے جانیں گے۔ چونکہ جنت تکلیف کا گھر نہیں ہے اور انبیاء علیہم السلام مامون العاقبۃ اور قطعی طور پر محفوظ ہیں۔ ان کے لئے معرفتِ الٰہی ضروری و بدیہی ہے نیز انھیں خوف اور جدائی کا خطرہ بھی نہیں ہے ایمان و معرفت کو فضیلت اسی وجہ سے ہے کہ وہ غیب ہے۔ جب وہ عیاں ہو جائے تو ایمان خبر بن جائے اور اس کے عیاں ہونے کے بعد اختیار ختم ہو جائے اصول شرع مضطرب ہو جاتے ہیں اور ردت کا حکم باطل ہو جاتا ہے اور بلعم ابلیس اور برصیصا کی تکفیر درست نہیں رہتی۔ کیونکہ وہ سب باتفاق اللہ تعالےٰ کو پہچانتے تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے مردود مرجوم ہونے کے وقت کی خبر دیتے ہوئے شیطان کا قول بیان کیا کہ:۔

فبعزتك لاغوينهم اجمعين	اب تیری عزت کی قسم ہے میں ان سب کو ضرور بھکاؤں گا۔

درحقیقت بات کرنا اور کلام سننا معرفت کے مقتضیات میں سے ہے اور عارف جب تک عارف رہے وہ جدائی کے خطرے سے محفوظ ہے اور جب جدائی ہو جائے تو معرفت زائل ہو جاتی ہے۔ حالانکہ علم بدیہی کے لئے زوال کی کوئی صورت ممکن نہیں۔

یہ مسئلہ لوگوں کے درمیان خطرناک ہے۔ بس اسی قدر شرط ہے کہ اتنا جان لو جس سے آفت سے چھٹکارا مل جائے کیونکہ بندے کو علم اور حق تعالیٰ کی معرفت اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ حق تعالیٰ ازلی علم و ہدایت کی توفیق عطا نہ فرمائے۔

البتہ یہ جائز ہے کہ معرفت میں بندے کے یقین میں احیاناً کمی و بیشی ہو۔ لیکن اصل معرفت میں کمی و بیشی ممکن نہیں۔ کیونکہ معرفت میں زیادت موجب نقصان ہے اور کمی میں بھی۔

معرفتِ الٰہی میں تقلید جائز نہیں ہے حق تعالیٰ کو صفاتِ کمالیہ کے ساتھ پہچاننا لازم ہے اور یہ بات بجز حسنِ رعایت اور خالص عنایتِ ربانی کے صحیح نہیں ہو سکتی۔ تمام عقلی دلائل حق تعالیٰ کی مِلک اور اس کے قبضہء اختیار میں ہیں وہ اگر چاہے تو اپنے کسی ایک فعل کو اس کے لئے دلیل بنا دے اور اسی کے ذریعہ اپنی راہ دکھا دے اور اگر وہ چاہے تو اپنے تمام افعال کو اس کے لئے حجاب بنا دے اور وہ خدا تک رسائی سے محروم رہ جائے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جہاں مسلمانوں کی ایک جماعت کے لئے معرفتِ الٰہی کی دلیل بنے وہاں نصاریٰ کے ایک گروہ کے لئے معرفت کا حجاب بنے۔ مسلمانوں نے انھیں خدا کا بندہ اور رسول مانا۔ اور نصاریٰ نے انھیں خدا کا بیٹا گمان کیا (معاذ اللہ) یہی حال اصنام اور چاند اور سورج کا ہے۔ کسی کے لئے وہ معرفت کی دلیل ہیں اور کئی اس سے محروم رہے۔ اگر دلیل ہی معرفت کی علت ہوتی تو چاہئے تھا کہ ہر مستدل عارف ہوتا۔ حالانکہ یہ کھلا مکابرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے کہ وہ کسی کو برگزیدہ بنا کر ان چیزوں کو دلیل معرفت بنا دیتا ہے تا کہ ان ذرائع سے وہ خدا تک رسائی پائیں۔ اور خدا کو پہچانیں۔ معلوم ہوا کہ دلیل خدا کی معرفت کا سبب تو ہو سکتی ہے مگر علت نہیں بن سکتی اور کوئی سبب کسی سبب سے مسبب یعنی خدا کے لئے بہتر نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ مسبب کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے۔

لعمرك انهم لفي سكرتهم يعمهون	اے محبوب! آپ کی حیات کی قسم بے شک یہ کافر اپنے نشہ میں بہک رہے ہیں۔

کیونکہ عارف کے لئے سبب کا اثبات کفر ہے اور غیر کی طرف توجہ شرک ہے۔ ''ومن یضلل اللّٰہ فلا ھادی لہ '' جسے خدا دلیل سے اندھا بنائے اسے کون راہِ ہدایت دکھا سکتا ہے۔ لہٰذا جب کسی کے لئے لوحِ محفوظ میں لا (نہیں) لکھا ہوا ہے اور حق تعالیٰ کی مرادِ معلوم میں کسی کے نصیب میں شقاوت و بدنصیبی ہے تو اس کے لئے دلیل و استدلال کس طرح موجبِ ہدایت بن سکتی ؟ ''من التفت الی الاغیار فمعرفتہ زنار '' جس نے غیر کی طرف توجہ کی اس کی معرفت کفر ہے۔ جو بندے خدا کے غلبہ محبت میں مستغرق اور اس کے متلاشی ہیں ان کے لئے خدا کے سوا اور چیزیں راہ میں رکاوٹ کیسے بن سکتی ہیں؟

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام جب غار سے باہر تشریف لائے تو دن میں کوئی چیز نہ دیکھی حالانکہ دن میں بکثرت دلائل اور عجیب تر براہین موجود ہوتے ہیں۔ لیکن جب رات ہوئی تو ستاروں کو دیکھا۔ اگر معرفتِ الٰہی کی علت دلیل ہوتی تو دن میں زیادہ دلائل نظر آتے اور اس سے زیادہ عجیب نشانیاں ظاہر ہوتیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ جس طرح چاہتا ہے بندے کو اپنی راہ دکھاتا ہے اور اس پر معرفت کا دروازہ کھول دیتا ہے تاکہ عین معرفت میں اس درجہ تک پہنچے جہاں عین معرفت بھی اسے غیر نظر آئے اور اسے معرفت کی صفت آفت معلوم ہو۔ کیونکہ معرفت کے ساتھ معروف یعنی خدا سے وہ محجوب ہوتا ہے یہاں تک کہ اُسے معرفت کی تحقیق اس درجہ تک پہنچا دیتی ہے کہ معرفت اسکا دعویٰ بن جاتا ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

ایاك ان لاتكون بالمعرفة مدعیا۔	اے عزیز تم اس سے بچو کہ تم (بغیر تحقیق) معرفت کے مدعی بنو۔

کیونکہ

یدعی العارفون معرفتہ
اقر بالجھل ذاك معرفتی

عرفاء تو اپنے معرفت کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن
میں ناواقف ہونے کا اقرار کرتا ہوں اور یہی میری معرفت ہے

اس لئے تمہیں سزاوار نہیں کہ تم معرفت کا دعویٰ کرو کیونکہ اس میں تمہاری ہلاکت ہے اور تمہارا تعلق اسی خوبی کے ساتھ ہونا چاہئے جس میں تمہاری نجات ہو اسی لئے جسے حق تعالیٰ کا کشف و مشاہدہ حاصل ہو جاتا ہے اس کے لئے اپنی ہستی وبال بن جاتی ہے اور تمام صفتیں آفت بن جاتی ہیں اور

جو خدا کا ہو جائے اور خدا اس کا ہو جائے اس کے لئے کوئی چیز ایسی نہیں رہتی جس کی نسبت اس بندے کی طرف کرنا درست ہو، نہ اس دنیا میں نہ اُس جہان میں۔

معرفت کی حقیقت یہ ہے کہ ہر چیز خدا کی ملکیت سمجھے۔ جب بندہ یہ جان لیتا ہے کہ ہر چیز خدا کی ملکیت ہے اور اسی کے تحت تصرف میں ہے تو پھر اسے کسی مخلوق سے کوئی سروکار نہیں رہتا۔ حتیٰ کہ خود اپنے سے بھی نہیں۔ وہ اپنے آپ سے اور تمام مخلوق سے محجوب ہو جاتا ہے۔ اس کا جواب ہر شئے سے ناواقفیت ہے۔ جب یہ بھی فنا ہو جاتی ہے تو حجاب بھی پراگندہ ہو جاتا ہے اور دنیا بمنزلہ عقبیٰ ہو جاتی ہے۔

معرفت میں مشائخ کے رموز و لطائف

معرفت کے سلسلہ میں مشائخ کے بکثرت رموز و لطائف ہیں۔ حصولِ فائدہ کے لئے چند رموز درج کیے جاتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

المعرفة ان لا تتعجب من شيئي۔	معرفت یہ ہے کہ تم کسی چیز سے متعجب نہ ہو۔

کیونکہ تعجب "عجب" ایسے فعل پر ہوتا ہے جو بندے کی اپنی طاقت سے زیادہ ہو۔ اور جب اللہ تعالےٰ کمال پر قادر ہے تو عارف کے لئے خدا کے افعال میں حیرت و تعجب کا اظہار کرنا محال ہے۔ اگر کہیں عجب کی کوئی صورت ممکن ہو سکتی تو یہ بات تھی کہ اس نے ایک مٹھی خاک کو اس درجہ تک پہنچایا کہ وہ دنیا پر حکومت کرے ایک قطرہ خون کو اس مرتبہ تک پہنچایا کہ وہ معرفتِ الٰہی اور اس کی محبت و دوستی کی باتیں کرنے لگا اور وہ دیدارِ الٰہی اور اس کے قرب و وصال کا خواہشمند ہو گیا۔

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

حقيقة المعرفة اطلاع الحق على الاسرار بمواصلة لطائف	معرفت کی حقیقت حق تعالیٰ کا اسرار پر مطلع کرنا اور اپنی معرفت کے انوار سے
الانوار۔	سرفراز فرمانا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ اپنی عنایت سے بندے کو اپنے انوار سے آراستہ کر کے تمام آفتوں سے محفوظ کر دیتا ہے۔ چنانچہ جب تک بندے کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر مخلوق کا اثر رہتا ہے اس وقت تک وہ غیبی اسرار کے مشاہدے سے سرفراز نہیں کرتا اور نہ اس کے ظاہر کو مغلوب کرتا ہے۔ جب وہ بندے کے دل سے تمام تر اثرات نکال دیتا ہے تب وہ مشاہدات کا

معائنہ کراتا ہے۔

حضرت شبلی علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں کہ:۔

المعرفۃ دوام الحیرۃ	حیرت دوام ہی تو معرفت ہے۔

کیونکہ حیرت دو قسم کی ہوتی ہے ایک حیرت ہستی و وجود میں دوسری حیرت کیفیت میں۔ ہستی میں حیرت تو شرک ہے اور کیفیت میں حیرت معرفت ہے اس لئے کہ عارف کو اس کی ہستی و وجود میں شک کی کوئی گنجائش اور اس کی کیفیت میں عقل کو کوئی دخل نہیں۔ اس جگہ اسے وجود باری تعالیٰ میں یقین، اور کیفیت میں حیرت حاصل ہو جاتی ہے اسی بنا پر کسی نے کہا ہے کہ:۔

"یا دلیل المتحیرین زدنی تحیرا۔"	اے حیرت زدوں کے رہنما! میری حیرت کو اور زیادہ کر۔

اس قول کا مطلب یہ ہے کہ قائل نے پہلے تو حق تعالیٰ کے وجود کی معرفت اور اس کے اوصاف کا کمال ثابت کیا اور اقرار کیا کہ وہی مقصود خلق اور ان کی دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے اور حیرت زدوں کی حیرت اس کے سوا نہیں ہے۔ اس کے بعد قائل نے زیادتی حیرت کی استدعا کی اور اعتراف کیا کہ مطلوب کی معرفت میں عقل کا کوئی دخل نہیں وہاں حیرت و سرگردانی کے سوا اس کے لئے کوئی حصہ نہیں یہ معنی لطیف ہیں نیز اس کا بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ حق تعالیٰ کی ہستی و وجود کی معرفت، اپنی ہستی پر حیرت کا اقتضاء کرے۔ اس لئے کہ بندہ جب حق تعالیٰ کو پہچان لیتا ہے اور ہر چیز کو اس کے قبضہ و اختیار میں دیکھتا ہے اور یقین کر لیتا ہے کہ اس کا وجود بھی اسی سے ہے اور اس کا عدم بھی اسی سے۔ تو اس کی قدرت میں سکون و حرکت سے متحیر ہوتا ہے۔ کیونکہ جب کل کا قیام اسی سے ہے تو "میں کون ہوں اور کیا ہوں؟" (حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہے) میں مستغرق ہو کر رہ جاتا ہے۔

اسی معنی میں حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ:۔

من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔	جس نے اپنے آپ کو فنا سے پہچان لیا یقیناً اس نے حق تعالیٰ کو بقا سے پہچان لیا۔

کیونکہ فنا سے عقل وصفت باطل ہوتی ہے اور جب چیز کا عین، عقلی نہ ہو تو اس کی معرفت میں حیرت کے سوا کچھ ممکن نہیں۔

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

ان تعرف ان حرکات الخلق وسکنا تہم باللّٰہ۔	معرفت یہ ہے کہ تم جان لو کہ خلق کی تمام حرکت وسکون حق تعالیٰ سے ہے۔

اور کسی کو اس کی ملکیت میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کا اختیار نہیں۔ عین بھی اسی کے عین سے ہے۔ اثر بھی اسی کے اثر سے اور صفت بھی اسی کی صفت سے اور حرکت وسکون بھی اسی کے حرکت وسکون سے۔ کیونکہ جب تک حق تعالیٰ بندے کے وجود میں طاقت اور اس کے دل میں ارادہ پیدا نہ فرمائے بندہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ بندے کے افعال مجازی ہیں اور مخلوق کے تمام افعال خدا کے پیدا کردہ ہیں۔

حضرت محمد بن واسع رحمتہ اللہ علیہ عارف کی صفت میں فرماتے ہیں کہ:۔

من عرف اللّٰہ قل کلامہ و دام تحیرہ۔	جسے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوگئی وہ بات کم کرے گا اور اس کی حیرت دائمی ہوگی۔

کیونکہ الفاظ کا جامہ اسے پہنایا جا سکتا ہے جو تحت عبارت ہو اور اصول میں عبارت کی ایک حد ہے اور معبر چونکہ محدود نہیں ہے۔ تو عبارت کی بنیاد اس پر کیسے رکھی جا سکتی ہے۔؟ جب عبارت کی ایک حد ہے اور معبر یعنی اللہ تعالیٰ غیر محدود ہے تو اسے عبارت کی حد بندی میں کیسے لایا جا سکتا ہے۔ اور جب مقصود عبارت میں نہ سما سکے اور بندہ اس میں عاجز ولاچار رہ جائے تو بجز دائمی حیرت کے کیا چارۂ کار رہتا ہے۔

حضرت شبلی علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں کہ:۔

العجز عن المعرفۃ۔	یعنی معرفت کی حقیقت یہ ہے کہ معرفتِ الٰہی سے عاجز رہے۔

کیونکہ حق تعالیٰ کی حقیقت سے بندہ، سوائے عجز کے کوئی نشان نہیں رکھتا۔ ممکن ہے کہ بندے کو اس کے ادراک میں اپنے سے زیادہ دعویٰ نہ ہو۔ اس لئے کہ عجز اس کی طلب ہے اور جب تک طالب اپنی صفت اور اسباب پر قائم ہے اس وقت تک اس پر عجز کا اطلاق درست نہیں ہوتا البتہ جب وہ اسباب اور اوصاف سے گزر جاتا ہے تب اسے فنا حاصل ہوتی ہے نہ کہ عجز۔؟

مدعیوں کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ اس حالت میں جب کہ آدمیت کی صفت برقرار وثابت ہو اور صحت خطاب سے مکلّف ہو اور حق تعالیٰ کی حجت اس پر قائم ہو عاجز ہونے کا نام معرفت ہے۔

اور ہم عاجز ہو کر سب سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ یہ قول گمراہی اور زیاں کاری پر مبنی ہے۔ ہم دریافت

کرتے ہیں کہ تم کس چیز کی طلب میں عاجز ہوئے ہو؟ حالانکہ عجز کی دو نشانیاں ہیں اور وہ دونوں تم میں نہیں ہیں ایک نشانی طلب کے اسباب کی فنا ہے اور دوسری نشانی اظہار تجلّی ہے۔ جہاں اسباب کی فنا ہے وہاں عبارات گم ہوتی ہیں۔ اگر عجز کی تعبیر، عبارت سے کرو گے تو عجز کی عبارت بجز عجز کے نہ ہوگی اور جہاں اظہار تجلّی ہے وہاں نشان نہیں ہوتا اور تمیز کی کوئی صورت نظر نہیں آتی حتیٰ کہ عاجز بھی نہیں جانتا کہ وہ عاجز ہے یا یہ کہ وہ عجز سے منسوب ہے جس کی بنا پر اسے عاجز کہیں، اس کی بھی صورت نہیں۔ کیونکہ عجز غیر ہے اور غیر کی معرفت کا اثبات، معرفت نہیں ہے۔ جب تک دل میں غیر کی جگہ ہے یا عارف کو غیر کی تعبیر کی قدرت ہے اس وقت تک معرفت درست نہیں ہوتی اور جب تک عارف غیر سے کنارہ نہ کرے، اس وقت تک عارف عارف نہیں ہوتا۔ تو تمہارا یہ کہنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔

حضرت ابو حفص حداد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

مذ عرفت اللہ مادخل فی قلبی حق ولا باطل۔	مجھے جب سے عرفانِ حق ہوا ہے اس وقت سے میرے دل میں کسی حق و باطل کا خطرہ نہیں آیا

اس لئے کہ جب تک لوگوں سے تعلق اور خواہش رہے اس وقت تک وہ دل پر اثر انداز ہوتا ہے اور دل اس اثر کو لے کر نفس کے حوالہ کر دیتا ہے اور نفس باطل کا مقام ہے۔ اسی طرح جب کسی کی محبت دل میں ہمیشہ رہے گی تو وہ بھی دل پر اثر انداز ہوگی اور دل اس اثر کو لے کر روح کے سپرد کر دے گا کیونکہ روح حق اور حقیقت کا منبع ہے اور جب دل میں غیر کا دخل ہو تو اس کی طرف عارف کا رجوع کرنا معرفت کے منافی ہے۔ لہٰذا تمام لوگ معرفت کی دلیل کی طلب بھی دل سے کرتے ہیں اور حرص و ہوا کی طلب بھی دل ہی سے ہے اور جب انھیں اپنی مراد حاصل نہ ہوئی تو انھوں نے دل کی طرف رجوع نہ کیا اور غیرِ حق سے راحت نہ پائی اور صرف حق تعالےٰ کو پایا اور اسی سے لو لگائے رکھی اور جب نشان و دلیل کی ضرورت پیش آئی تو حق تعالیٰ کی طرف رجوع کیا اور دل کی طرف رجوع نہ کیا۔؟ یہ فرق ہے ان بندوں کے درمیان، جو دل کی طرف رجوع کرتے ہیں یا جو حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

حضرت ابو بکر داسطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

جس نے اللہ کو پہچان لیا وہ ہر ایک سے نہ صرف جدا ہو گیا بلکہ گونگا اور دل برداشتہ بھی ہو گیا۔	من عرف اللّٰہ انقطع عن الکل بل خرس وانقمع۔

مطلب یہ کہ جس نے اسے پہچان لیا اس نے دل سے تمام اغیار کو نکال دیا اور اس کی تعبیر میں گونگا بن کر اپنے اوصاف سے فانی ہو گیا۔

حضور اکرم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

تیری حمد وثنا کو میں گھیر نہیں سکتا۔	لا احصی ثناء علیك۔

جب تک آپ غیبت میں رہے آپ عرب میں سب سے زیادہ فصیح تھے آپ فرماتے ہیں کہ ''انا افصح العرب والعجم'' میں عرب وعجم میں سب سے زیادہ فصیح ہوں۔ اور جب آپ کو غیبت سے حضور میں بھیجا گیا تو بارگاہِ الٰہی میں عرض کناں ہوئے کہ میری زبان تیری حمد وثنا کے کمال کو گھیرنے کی تاب وتواں نہیں رکھتی۔ کس طرح تیری حمد وثنا کروں۔ قال سے بے قال اور حال سے بے حال ہوں تو وہی ہے جو تو ہے میری عرض یا تو میری وجہ سے ہو گی یا آپ کی وجہ سے۔ اگر اپنی وجہ سے کہوں تو محجوب ہوتا ہوں اگر تیری وجہ سے کہوں تو تیری قربت کی تحقیق میں اپنے اختیار میں معیوب ہوتا ہوں لہذا میں کچھ عرض نہیں کر سکتا۔

حق تعالیٰ کی طرف سے فرمان ہوا کہ اے محبوب اگر تم کچھ نہیں کہہ سکتے تو ہم فرماتے ہیں کہ لعمرك اذا سکت عن ثنائی فالکل منك ثنائی یعنی اے محبوب تمہاری زندگانی کی قسم، جب آپ ثنا سے ساکت ہو گئے ہیں تو میں جہان کی ہر چیز کو تمہارا قائم مقام بناتا ہوں جو بھی میری ثنا کرے گا وہ تمہاری طرف سے میری ثنا کرے گا۔ گویا اُن سب کی ثنا تمہارے حوالہ ہو گی، اور تم اپنی طرف سے میرے حضور پیش کرو گے۔

دُوسرا کشف، توحید کے بیان میں

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:۔

تمہارا معبود ایک ہی ہے۔	والٰھکم اللّٰہ واحد۔

نیز فرمایا:۔

تم فرما دو کہ اللہ اکیلا ہے۔	قل ھو اللّٰہ احد۔

نیز فرمایا:۔

لا تتخذوا الٰہین اثنین انما ھو الٰہ واحد۔	تم دو معبود نہ بناؤ بلاشبہ معبود ایک ہی ہے۔

حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ:۔

بینما رجل فیمن کان قبلکم لم یعمل خیراً قط الا التوحید فقال لاھلہ اذا مت فاحرقونی ثم استحقونی ثم ذرونی نصفی فی البر و نصفی فی البحر فی یوم رائح ففعلو فقال اللّٰہ عزوجل للریح والماء اجمعاما اخذتما فاذا ھو بین یدیہ فقال لہ ماحملک علے ماصنعت فقال استحیاء منک ففغفرلہ۔	تم سے پہلے ایک شخص گزرا ہے جس کی کوئی نیکی توحید کے سوا نہ تھی اس نے اپنے گھر والوں سے کہا جب میں مر جاؤں تو مجھے جلا دینا پھر خاکستر کو خوب باریک کر کے تیز ہوا کے دن آدھا خشکی میں اور آدھا دریا میں بہا دینا۔ گھر والوں نے ایسا ہی کیا اللہ تعالیٰ نے ہوا اور پانی سے فرمایا جو تم نے پھیلا ہے ان سب کو اکٹھا کرو اور میرے حضور لاؤ۔ جب خدا کے حضور وہ پیش ہوا تو حق تعالیٰ نے اس سے فرمایا تجھے کس چیز نے اپنے ساتھ ایسا سلوک کرنے پر آمادہ کیا۔ اس نے عرض کیا خدایا مجھے تیری حیا دامنگیر تھی اس لئے میں نے اپنی جان پر ایسا ظلم کیا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسے بخش دیا۔

توحید کی حقیقت یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو اکیلا جانے اور اس پر صحیح علم رکھے چونکہ اللہ تعالیٰ ایک ہے وہ بے مثل، اپنی ذات وصفات میں بے نظیر اور اپنے افعال میں لاشریک ہے توحید کے ماننے والے مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کو ان ہی خوبیوں کے ساتھ جانا ہے اور اس جاننے کو توحید کی یکتائی کہا ہے

توحید کی اقسام

توحید کی تین قسمیں ہیں ایک حق تعالیٰ کی توحید اسی کے لئے یعنی خود حق تعالیٰ کا علم ہے کہ وہ اکیلا ہے۔ دوسری حق تعالیٰ کی توحید، مخلوق کے لئے۔ یعنی خدا کا حکم کہ بندے توحید تسلیم کریں اور اس نے بندوں کے دل میں توحید پیدا فرمائی۔ تیسری مخلوق کی توحید، خدا کے لئے یعنی مخلوق کا جاننا کہ اللہ ایک ہے...... لہٰذا بندہ جب حق کے ساتھ عارف ہوتا ہے تو وہ اس

کی وحدانیت کی حقیقت معلوم کرسکتا ہے۔

اثبات توحید واضح رہنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے نہ وصل کو قبول کرتا ہے نہ فصل کو نہ اس پر دوئی جائز ہے اور نہ اس کی وحدانیت عددی ہے۔ جو کسی عدد کے ثابت ہو جانے پر دو ہو جائے۔ اور اس کی وحدانیت عدد بن جائے۔ اور نہ وہ محدود ہے کہ اس کے لئے جہات اور سمتوں کا تحقق ہو اور نہ اس کے لئے مکان ہے اور نہ وہ کسی مکان میں ہے کہ اس کے لئے مکان کے اثبات کی ضرورت لاحق ہو۔ اس لئے کہ اگر وہ مکان میں متمکن ہوتا تو مکان کے لئے بھی مکان کی حاجت ہوتی۔ اس طرح فعل، فاعل اور قدیم وحادث کا حکم باطل ہو جاتا ہے نہ وہ عرضی ہے کہ وہ کسی جوہر کا محتاج ہوتا کہ اپنے محل میں باقی رہے اور نہ وہ جوہر ہے کیونکہ اس کا وجود، اپنی ذات کے سوا درست ہی نہیں اور نہ وہ طبعی ہے کہ وہ مبداء حرکت وسکون ہو۔ اور نہ وہ روح ہے کہ کسی جسم کا محتاج ہو۔ نہ وہ جسمی ہے کہ اس کے اجزاء ترکیبی ہوں اور نہ وہ چیزوں میں قوت وحال ہے کہ چیزوں کی ہم جنس ہو۔ نہ کوئی چیز اس کے ساتھ پیوست و پیوند ہے کہ وہ چیز اس کا جزو ہو۔ اس کی ذات و صفات ہر عیب و نقص سے پاک اور ہر آفت سے منزہ ہے۔ اور نہ وہ کسی کے مانند ہے کہ اپنے مانند کے ساتھ دو ہو جائے۔ اور نہ کوئی اولاد ہے کہ جس کی مثل، اصل کی اقتضاء کرے اور نہ اس کی ذات وصفات پر تغیر جائز ہے کہ اس کا وجود اسے متغیر ہو۔ اور متغیر کے حکم میں تغیر کی مانند ہو۔

وہ اُن صفات کمالیہ سے متصف ہے جن کا اثبات تمام اہلِ توحید مسلمان بحکم بصیرت کرتے ہیں۔ کیونکہ خدا نے ان سے اپنی صفات خود بیان فرمائی ہیں اور وہ ان صفات سے پاک ہے جن کو ملحدین اپنی خواہش سے متصف قرار دیتے ہیں کیونکہ خدا نے ان سے اپنی صفات خود بیان نہیں کیں۔

اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے حیی، علیم، رؤف، رحیم، مرید، قدیر، سمیع، بصیر، متکلم، اور باقی ہے۔ اس کا علم اس کا حال نہیں ہے اور اس کی قدرت، اس میں سختی نہیں ہے۔ اس کی شنوائی و بصارت میں تجدد یعنی بار بار پیدائش نہیں ہے اور اس کا کلام ایسا ہے جس میں نہ بعضیت ہے نہ تجدید۔ وہ ہمیشہ اپنی صفات کے ساتھ قدیم ہے اور تمام معلومات، اس کے علم سے باہر نہیں اور کسی موجود کو اس کے ارادہ سے مفر کی راہ نہیں۔ وہی کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے اور وہی چاہتا ہے جو اس کی مشیت ہے مخلوق کو اس میں کوئی بزرگی نہیں۔ اس کا ہر حکم حق ہے۔ اس کے دوستوں کو بجز تسلیم کے کوئی چارہ نہیں اس کا حکم حتمی اور قطعی ہے اس کے دوستوں کو اس کی

فرمانبرداری کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ہر خیر وشر اس کا مقدر کیا ہوا ہے۔ اس کے سوا کسی سے امید و خوف رکھنا لائق نہیں۔ اس کے سوا کوئی نفع ونقصان کے پیدا کرنے والا نہیں۔ اس کا ہر حکم حکمت پر مبنی ہے۔ اس کا پورا ہونا ضروری ہے۔ ہر ایک کو اسی سے وصل اور اسی تک رسائی چاہیئے۔ اہلِ جنت کے لئے اس کا دیدار جائز ہے، وہ تشبیہ اور جہت سے پاک ہے۔ اس کی ہستی پر مقابلہ و مواجہ کی کوئی صورت نہیں۔ دنیا میں اس کے دوستوں کیلئے مشاہدہ جائز ہے۔ انکار کرنا شرط نہیں۔ جو خدا کو اس طرح جانتا ہے اہلِ قطعیت سے نہیں جو اس کے خلاف جانے اس کے لئے دیانت نہیں اصل معنی میں اصولی اور وصولی بکثرت اقوال ہیں جسے طوالت کے خوف سے مختصر کرتا ہوں

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابتدائے عنوان میں لکھ دیا ہے کہ توحید کسی چیز کی وحدانیت پر حکم کرنا ہے اور یہ حکم علم کے سوا نہیں کیا جاسکتا لہٰذا اہلسنت و جماعت تحقیق کے ساتھ وحدانیت کا حکم دیتے ہیں اس لئے کہ انھوں نے خدا کی لطیف صنعتوں، عجیب وبدیع فعلوں اور بکثرت لطائف کو دیکھا ہے اور اس پر غور وفکر کیا ہے۔ ان کا از خود ہونا محال جانا۔ انھوں نے ہر چیز کے اندر حدوث کی علامتوں کو موجود پایا۔ لامحالہ کوئی فاعل ایسا چاہیے جو ان کو عدم سے وجود میں لائے۔ مطلب یہ کہ خدا ہی کی وہ ذات ہے جس نے اس جہان، زمین و آسمان، چاند وسورج، خشکی وتری اور پہاڑ وصحراء کو وجود بخشا۔ اور اسی نے ان سب کو حرکت و سکون، علم ونطق اور موت وحیات کے ساتھ پیدا فرمایا۔ لہٰذا ان کے لئے کوئی بنانے والا اور پیدا کرنے والا لازمی ہونا چاہئے۔ اور یہ سب دو یا تین بنانے والوں سے مستغنی ہے۔ وہی ایک بنانے والا، کامل، حیی، قائم، قادر، مختار، اور ہر ایک شریک سے بے نیاز ہے۔ جب کوئی فعل، ایک فاعل سے مکمل نہ ہو تو مزید فاعلوں کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے شریک ہوتے ہیں۔ لامحالہ بلاشک وشبہ اور علم الیقین سے جاننا چاہئے کہ ایک ہی صانع اور فاعل ہے اس مسئلہ میں ثنویوں نے نور وظلمت کے اثبات میں ہم سے اختلاف کیا ہے۔ مجوسیوں نے یزداں (خالق خیر) اور اہرمن (خالقِ شر) کے اثبات میں اختلاف کیا ہے نیچریوں نے طبع وقوت کے اثبات کے ساتھ اختلاف کیا ہے۔ نجومیوں نے سات ستاروں کے اثبات کے ساتھ اختلاف

کیا ہے۔اور فرقہ معتزلہ نے تو بیشمار خالقوں اور صانعوں کے اثبات کے ساتھ اختلاف کیا ہے میں نے ان سب کے رد کے لئے مختصر مگر جامع ومکمل دلیل بیان کردی ہے۔ چونکہ یہ کتاب ان کے بیہودہ اقوال لانے کی نہیں ہے اس لئے طالب علم کو کسی اور کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے۔اب میں مشائخ کے ان رموز کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جو توحید کے سلسلے میں فرماتے ہیں۔

توحید کے سلسلہ میں مشائخ کے رموز واشارات

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

التوحید افراد القدم عن الحدث۔	توحید یہ ہے کہ قدیم کو حادث سے جدا جانے۔

مطلب یہ ہے کہ مومن قدیم کو محل حوادث اور حوادث کو محل قدیم نہ سمجھے اور جانے کے حق تعالیٰ قدیم ہے اور خود محدث اور جو تمہاری جنس سے مخلوق ہے وہ بھی حادث ہے اور کوئی مخلوق اس سے ملحق نہیں اور نہ اُس کی صفت، تم جیسی مخلوق میں شامل ہے۔ کیونکہ قدیم حادث کا ہم جنس نہیں ہے۔اس لئے کہ قدیم کا وجود محدثات کے وجود سے پہلے ہے۔ جب کہ محدثات کے وجود سے پہلے قدیم تھا اور محدث کا محتاج نہ تھا تو بعد وجودِ محدث بھی وہ اس کا محتاج نہ ہوگا یہ قاعدہ ان لوگوں کے برخلاف ہے جو ارواح کو قدیم کہتے ہیں۔ان کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے جب کوئی قدیم کو محدث میں نازل کہتا ہے یا محدث کو قدیم کے ساتھ متعلق جانتا ہے وہ حق تعالیٰ کی قدامت اور عالم کے حدوث پر دلیل نہیں رکھتا۔ یہی مذہب دہریوں کا ہے۔

خلاصہ یہ کہ محدثات کی تمام حرکتیں، توحید کے دلائل، حق تعالیٰ کی قدرت کی گواہ اور اس کے قدیم ہونے کا اثبات کرتی ہیں۔لیکن بندہ اس میں بہت زیادہ غافل ہے کہ وہ اس کے غیر سے مراد چاہتا ہے اور اس کے غیر کے ذکر سے راحت پاتا ہے۔ جب کوئی تمہارے وجود وعدم میں اس کا شریک نہیں ہے تو ناممکن ہے کہ تمہاری قربیت اور پرورش میں خدا کے سوا کوئی اور شریک ہو۔

حضرت حسین بن منصور حلاج رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

اول قدم فی التوحید فناء التفرید۔	توحید میں پہلا قدم تفرید کا فنا کرنا ہے۔

اس لئے کہ تفرید کا حکم یہ ہے کہ کسی کو آفتوں سے جدا کردے۔اور توحید کا حکم یہ ہے کہ خدا کو ہر چیز سے اکیلا جانے۔ تفرید میں غیر کا اثبات روا تھا اور اس کے غیر کے لئے اس کا اثبات درست۔ لیکن وحدانیت میں غیر کا اثبات ناروا ہے اور یہ کسی غیر کے لئے ثابت کرنا درست نہیں۔اور نہ ایسا

سمجھنا چاہئے کہ تفرید میں اشتراک کی تعبیر ہے اور توحید میں شرکت کی نفی۔ اس لئے توحید میں پہلا قدم ہی شریک کی نفی، اور راستہ سے مزاج کا دور کرنا ہے۔ کیونکہ راستہ میں مزاج کا ہونا ایسا ہے جیسے چراغ کی روشنی میں راستہ ڈھونڈا جائے۔

حضرت حضرمی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

اصولنا فی التوحید خسمة اشیاء رفع الحدث و اثبات القدم وهجر الاوطان و مفارقة الاخوان، ونسیان ما علم وجهل۔	یعنی توحید میں ہمارے پانچ اصول ہیں حدث کا ارتفاع، قدم کا اثبات، ترک اوطان، بھائیوں سے جدائی، اور ہر علم و جہل کا بھول جانا۔

لیکن حدث کے ارتفاع کا مطلب! توحید کی مقارنت سے محدثات کی نفی کرنا ہے اور خدا کی مقدس ذات پر حوادث کو محال جاننا ہے۔ اور اثبات قدم کا مطلب اللہ تعالےٰ کو ہمیشہ سے موجود ماننا ہے۔ اس کی تشریح حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے قول سے کی جا چکی ہے۔ اور ترک وطان کا مطلب! نفس کی الفتوں، دل کی راحتوں اور طبیعت کی قرارگاہوں سے ہجرت کرنا یعنی چھوڑنا ہے۔ اور مریدوں کے لئے دنیاوی رسموں، بلند مقاموں، عزت کی حالتوں اور اونچی منزلتوں سے ہجرت کرنا ہے۔ اور بھائیوں سے جدائی کا مطلب لوگوں کی صحبت سے کنارہ کشی کرنا اور صحبت حق کی طرف متوجہ ہونا ہے کیونکہ وہ ہر خطرہ جو موحد کے دل پر غیر کے اندیشہ سے لاحق ہو حجاب و آفت ہے۔ اور جتنا دل میں غیر کا اندیشہ ہوگا اتنا ہی وہ محجوب ہوگا۔ اس لئے کہ تمام امتوں کا اجماع ہے کہ توحید، تمام ہمتوں کا جمع کرنا ہے اور غیر کے ساتھ آرام پانا ہمت کا تفرقہ ہے۔ اور ہر علم و جہل کے بھول جانے کا مطلب توحید میں یہ ہے کہ مخلوق کا علم یا تو خوبی سے ہوگا یا کیفیت سے۔ یا جنس سے یا نوعیت سے۔ مخلوق جو علم بھی حق تعالےٰ کی توحید میں ثابت کرے گی توحید اس کی نفی کرے گی اور جو کچھ جہل سے ثابت کرو گے وہ اپنے علم کے برخلاف ہوگا کیونکہ توحید میں تو جہل ہے ہی نہیں۔ اور توحید کے متحقق ہونے میں علم تصوف کی نفی کے بغیر درست نہیں ہوگا۔ اور علم و جہل تصرف کے بغیر نہیں۔ ایک بصیرت پر ہے اور دوسرا غفلت پر۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں حضرت حضرمی رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس میں سو گیا میں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان سے دو فرشتے زمین پر آئے ہیں کچھ عرصہ میں ان کی گفتگو سنتا رہا۔

ایک نے دوسرے سے کہا کہ جو کچھ یہ شخص کہتا ہے توحید کا علم ہے نہ کہ عینِ توحید۔ جب میں بیدار

ہوا تو وہ توحید پر بیان فرما رہے تھے انھوں نے میری طرف رُخ کر کے فرمایا اے فلاں! توحید کا بیان علم کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

التوحید ان یکون العبد شخصا بین یدی اللّٰہ تعالٰی تجری علیہ تصارف تدبیرہ فی مجاری احکام قدرتہ فی لجج بحارِ توحیدِہٖ بالفناء عن نفسہ و عن دعوۃ الخلق لہ و عن استجابتہ لھم بحقائق وجود وحدانیتہ فی حقیقۃ قربہ بذھاب حسہٖ و حرکتہ لقیام الحق لہ فیما ارادمنہ ورد ان یرجع آخر العبد الٰی اولہ فیکون کما کان قبل ان یکون۔

اصل توحید یہ ہے کہ جب حق تعالٰی اپنی قدرت کی گزرگاہ میں اپنی تدبیر کا تصرف اس پر جاری فرمائے تو وہ خدا کے سامنے ایک پُتلا بن جائے اور دریائے توحید میں اپنے اختیار و ارادہ سے خالی ہو جائے اور اپنے نفس کو فنا کر کے لوگوں کے بلانے پر کان نہ دھرے۔ اور نہ اس کی طرف التفات کرے۔ اور محل خیریت میں اپنی حس و حرکت ختم کر دے۔ اور وحدانیت کی معرفت و حقیقت کے سبب وہ حق کے ساتھ قائم ہو حق نے جو اس کے لئے ارادہ فرمایا ہے اسے قبول کرے تاکہ اس محل میں بندہ کا اخیر پہلے کی مانند ہو جائے اور وہ ایسا ہو جائے کہ جو کچھ ہے اپنی ہستی سے پہلے ہے۔

لہٰذا اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ موحد کو اختیارِ حق میں اختیار نہ رہے اور اس کی وحدانیت میں بندہ اپنے آپ کو نہ دیکھے اس طرح کہ محل قربت میں بندہ کا نفس فانی، حواس گم، اور خدا جیسا چاہے اس پر اپنے احکام جاری کرے۔ اور بندہ اپنے تصرف کے فنا میں ایسا ہو جائے گویا کہ وہ ذرہ ہے جیسا کہ ازل میں حالتِ توحید کے اندر تھا جہاں کہنے والا بھی حق تعالٰی تھا اور جواب دینے والا بھی حق تعالٰی۔ اور اس ذرہ کا نشان بھی وہی، جس بندے کی حالت اس طرح کی ہو جائے وہ لوگوں سے راحت نہیں پاتا۔ کہ وہ لوگوں کی پکار کو قبول کرے۔ اسے کسی کے ساتھ انس و محبت نہیں ہوتی۔ کہ وہ ان کی دعوت کو قبول کرے۔ اس قول کا اشارہ فنائے صفت اور مشاہدۂ جلال کے غلبہ کی حالت میں صحتِ تسلیم کی طرف ہے تاکہ بندہ اپنے اوصاف سے فانی ہو کر آلہ اور جوہرِ لطیف بن جائے۔

یہاں تک کہ اگر اس کے جگر میں نیزہ مارا جائے اور وہ آر پار ہو جائے تو اسے خبر تک نہ ہو۔ اور اگر تلوار ماری جائے تو بے اختیاری میں کٹ جائے۔ گویا ہر حال میں سب سے فانی اور اس کا وجود مظہر اسرارِ الٰہی ہو جائے تا کہ اس کا کلام، حق کا کلام اس کے فعل کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف اور اس کے صفت کا قیام اسی کے ساتھ ہو جائے اور ثبوتِ حجت کے لئے شریعت کا حکم تو اس پر باقی ہو مگر وہ ہر ایک کی رویت سے فانی ہو۔

یہ شان اور یہ صفت حضور اکرم ﷺ کی تھی کہ شبِ معراج جب آپ کو مقام قرب میں پہنچایا گیا تو مقام کا تو فاصلہ تھا لیکن قرب میں فاصلہ نہ تھا اور آپ کا حال لوگوں سے دور اور ان کے اوہام سے ماورٰی تھا۔ یہاں تک کہ دنیا نے آپ کو گم کیا اور آپ خود اپنے سے گم ہو گئے۔ فنائے صفت میں بے صفت ہو کر متحیر ہو گئے ترتیب طبائع اور اعتدال مزاج پراگندہ ہو گئے۔ نفس، دل کی جگہ، جان کے درجہ میں، جان سر کے مرتبہ میں، اور سر، قرب کی صفت میں پہنچا گویا سب میں سب سے جدا ہو گئے۔ چاہا کہ وجود چھوڑیں، تشخص ختم کریں، لیکن حق تعالیٰ کی مراد، اقامت حجت تھی فرمان ہوا اے محبوب اپنے حال پر رہو! اس کلام سے قوت پائی وہ قوت اس کی قوت بنی اور اپنی فنا سے حق کا وجود ظاہر ہوا۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ:۔

انی لست کاحدکم انی ابیت عندربی فیطعمنی ویسقینی۔	میں تم میں سے کسی کی مانند نہیں۔ میں اپنے رب کے حضور رات گزارتا ہوں وہی مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے۔

نیز ایک مرتبہ فرمایا:۔

لی مع اللّٰہ وقت لا یسعنی فیہ ملک مقرب ولا نبی مرسل۔	بارگاہِ خداوندی میں میرا ایک وقت ایسا بھی ہوتا ہے جہاں میرے ساتھ مقرب فرشتہ یا کسی نبی مرسل کی بھی رسائی نہیں۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

ذات اللّٰہ موصوفة بالعلم غیر مدرکتہ بالاحاطة ولا موئیۃ بالابصار فی دارا الدنیا وھی موجودة بحقائق الایمان من غیر حد ولا حلول و تراہ العیون فی العقبیٰ ظاہراق باطنافی ملکہ و قدرتہ وقد حجب الخلق عن معرفة کنہ ذاتہ ولھم بآیاتہ والقلوب تعرفہ والعقول لا تدرکہ ینظر الیہ المومنون بالابصار من غیر احاطة ولا ادراک نہایتہ۔

توحید یہ ہے کہ تم اعتقاد رکھو کہ ذاتِ الٰہی علم کی ساتھ موصوف ہے بغیر اس کے کہ تم عقل سے سمجھ سکو یا حواس سے پا سکو دنیا میں آنکھیں اسے دیکھ نہیں سکتیں ذاتِ الٰہی ایمانی حقائق کے ساتھ بے حد و نہایت موجود ہے۔ جو اس سے پانے کے سوا آنے جانے میں موجود ہے اور اپنے ملک میں اپنی صنعت و قدرت سے ظاہر ہے وہ کسی میں حلول کیا ہوا نہیں ہے۔ آخرت میں اس کے ملک و قدرت میں ظاہری اور باطنی طور پر آنکھیں اسے دیکھیں گی۔ دنیا میں مخلوق، اس کی ذات کی حقیقت کی معرفت سے محجوب ہے۔ وہ عجائب و آیات کے اظہار کے ذریعہ راہ دکھاتا ہے۔ اور دل اسے پہچانتے ہیں۔ مخلوق کی عقلیں کیفیت کے ساتھ اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور آخرت میں مسلمان اسے سر کی آنکھوں سے دیکھیں گے بغیر اس کے کہ اس کی ذات کا احاطہ کریں یا اس کی حد و غایت کا ادراک کریں۔

توحید میں اس کے الفاظ جامع ہیں۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

اشرف کلمة فی التوحید قول ابی بکر رضی اللہ عنہ سبحان من لم یجعل لخلقہ سبیلا الی معرفة الا بالعجز عن معرفتہ۔

توحید کے بیان میں سب سے زیادہ بزرگ و اشرف کلام حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ پاک ہے وہ ذات جس نے مخلوق کو اپنی معرفت کی راہ نہ دکھائی بجز معرفت میں ان کی عاجزی کے۔

ایک جہان اس کلام سے غلطی میں مبتلا ہے۔ وہ گمان کرتے ہیں کہ معرفت سے عجز، بے معرفتی ہے۔ حالانکہ یہ محال ہے اس لئے کہ موجودگی کی حالت میں عجز کی شکل پیدا ہوتی ہے اور معدوم کی صورت میں عجز کی شکل ظاہر نہیں ہوتی۔ مثلاً مردے میں زندگی نہیں ہے بلکہ موت میں موت سے عاجز ہے۔ اس لئے کہ عجز کا نام اس کی قوت محال جانتی ہے۔ اسی طرح اندھا بینائی سے عاجز نہیں ہوتا بلکہ نابینائی، بینائی سے عاجز ہوتی ہے۔ اسی طرح لنگڑا، کھڑے ہونے سے عاجز نہیں ہوتا بلکہ بیٹھنے کی حالت میں بیٹھنے سے عاجز ہوتا ہے۔ یہی حال عارف کا ہے کہ وہ معرفت سے عاجز نہیں ہوتا چونکہ معرفت تو موجود ہے اور یہ اس کے لئے ضروری و بدیہی کی مانند ہے۔ لہٰذا حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے اس قول کو اس پر محمول کریں گے جیسا کہ حضرت ابو سہل صعلوکی اور استاذ ابو علی دقاق رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ معرفت ابتداء میں تو نظری اور کسبی ہوتی ہے لیکن انتہا میں ضروری و بدیہی بن جاتی ہے۔ اور علم ضروری یہ ہے کہ اس کا عالم، اس کے وجود کی حالت میں، اسے دور کرنے یا حاصل کرنے سے عاجز ہو۔ اس قول کے بموجب بندے کے دل میں توحید کا ہونا فعل حق ہوگا۔

حضرت شبلی علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں کہ:۔

التوحید حجاب الموحد عن جمال الاحدیۃ۔	توحید موحد کے لئے جمال احدیت سے حجاب ہے۔

اس لئے کہ وہ توحید کو بندہ کا فعل کہتے ہیں۔ لامحالہ بندہ کا فعل، مشاہدہ الٰہی کے لئے علت نہیں بن سکتا۔ اور جو چیز عین کشف میں، کشف کی علت نہ ہو وہ حجاب ہے۔ حالانکہ بندہ اپنے اوصاف کے ساتھ غیر ہوتا ہے اس لئے کہ جب بندہ اپنی صفت کو حق جانے گا تو جس کی یہ صفت ہے یعنی وہ موصوف بھی حق ہوگا۔ کیونکہ موصوف کی ہی تو یہ صفت ہے۔ اس وقت موحد، توحید اور احد، تین وجود قائم ہو جائیں گے جو ایک دوسرے کی علت ہوں گے۔ یہ بات نصاریٰ کے عقیدہ کے مطابق ثالث ثلثہ کے ہو بہو بن جائے گی۔ اور جب تک طالب کے لئے کوئی صفت بھی توحید میں فنا کے مانع رہے گی اس وقت تک وہ اس صفت میں محجوب رہے گا اور خالص موحد نہ بن سکے گا۔ ''لان سواہ من الموجودات باطل'' اس لئے کہ خدا کے سوا ہر موجود باطل ہے جب یہ بات درست ہے، تو ایسا طالب جمالِ حق کے مشاہدے میں صفتِ غیر کی طلب کی وجہ سے باطل ہوگا۔

یہی تفسیر کلمہ "لا الٰہ الا اللّٰہ" کی ہے۔

حکایت حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ کوفہ میں جب حضرت حسین بن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کرنے گئے۔ تو حضرت حسین بن منصور نے ان سے دریافت کیا کہ اے ابراہیم! اب تک تمہارے حالات کہاں اور کیسے گزرے ہیں؟ انھوں نے فرمایا اب تک میں اپنے توکل کو درست کرتا رہا ہوں۔ حضرت حسین نے فرمایا:۔

ضیعت عمرك فی عمران باطنك فاین انت عن الفنا فی التوحید۔	اے ابراہیم! اپنے باطن کی آبادی ہی میں تم نے تو عمر ضائع کر دی توحید میں فنا ہونے کا زمانہ کب آئے گا۔؟

غرض کہ بیان توحید میں مشائخ کے بکثرت اقوال ہیں کوئی ایسی فنا کہتا ہے جس کی فنا پر معیت درست نہ ہو اور کوئی کہتا ہے کہ اپنی فنا کے بغیر، صفتِ توحید درست نہیں ہوتی۔ حصولِ علم کے لئے اس بات کو جمع وتفرقہ پر قیاس کرنا چاہئے۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بندے کے لئے توحید الٰہی، ایسی مخفی حقیقت ہے جسے بیان وعبارت سے ظاہر نہیں کیا جاسکتا۔ حتیٰ کہ اگر کوئی اس کے بیان کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ یاوہ گو ہے۔ کیونکہ بیان کرنے والا اور اس کی عبارت دونوں غیر ہیں اور توحید میں غیر کا اثبات شرک ہے۔ اگر ایسا کرتا ہے تو یہ اس کی بیہودگی ہے۔ کیونکہ موحد، ربانی ہوتا ہے نہ کہ یاوہ گو اور کھلاڑی؟ واللہ اعلم بالصواب

تیسرا کشف حجاب ایمان کے بارے میں

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

یا ایها الذین اٰمنوا اٰمنوا باللّٰه ورسوله۔	اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔

اور "یا ایها الذین امنوا" بکثرت ارشاد فرمایا ہے۔

سید عالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ:۔

الایمان ان تومن باللّٰہ و ملٰئکتہٖ وکتبہٖ۔ الاخر۔	ایمان یہ ہے کہ تم اللہ، اس کے فرشتے، اور اس کی کتابوں پر ایمان لاؤ۔

ایمان کے لغوی معنی تصدیق یعنی دل سے ماننے کے ہیں۔ اور شریعت میں اثبات ایمان کے لئے بکثرت احکام واقوال اور باہم اختلاف مذکور ہے۔

معتزلہ، تمام طاعتوں کو ایمان کا علم اور اس کا معاملہ کہتے ہیں۔ ان کا مذہب یہ ہے کہ بندہ گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے خارج از ایمان ہو جاتا ہے۔ خوارج کا بھی یہی مذہب ہے وہ بھی مرتکب کبیرہ کو کافر کہتے ہیں۔ اور ایک گروہ ایمان کو قول مفرد کہتا ہے۔ ایک گروہ صرف معرفت کو ایمان کہتا ہے اور اہل سنت کے ارباب کلام کی ایک جماعت مطلق تصدیق کو ایمان کہتی ہے۔ میں نے اس بحث میں ایک مستقل کتاب علیحدہ لکھی ہے۔ یہاں تو صرف صوفیاء کے اعتقاد کا اثبات مقصود ہے۔

صوفیاء کا اعتقاد جمہور صوفیا کے نزدیک ایمان کی دو قسمیں ہیں۔ جس طرح کہ فقہاء کے نزدیک ہیں۔ چنانچہ اہلِ یقین کی ایک جماعت کا اعتقاد یہ ہے کہ قول وعمل اور تصدیق کے مجموعہ کا نام ایمان ہے۔ ان میں حضرت فضیل بن عیاض، بشر حافی، خیر النساج، سمنون المحب، ابوحمزہ بغدادی اور ابو محمد جریری رحمہم اللہ کے سوا بکثرت مشائخ ہم خیال ہیں۔

ایک گروہ کا یہ اعتقاد ہے کہ قول اور تصدیق کا نام ایمان ہے۔ ان میں حضرت ابراہیم بن ادہم، ذوالنون مصری، بایزید بسطامی، ابوسلیمان درانی، حارث محاسبی، جنید بغدادی، سہل بن عبداللہ تستری، شفیق بلخی، حاتم اصم، اور محمد بن فضل بلخی کے سوا بکثرت مشائخ اور فقہائے امت ہیں۔ چنانچہ امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل وغیرہ رحمہم اللہ پہلے قول کے قائل ہیں۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ حسن بن فضل بلخی اور امام اعظم کے دیگر تلامذہ جیسے امام محمد بن حسن، حضرت داؤد طائی، امام ابو یوسف رحمہم اللہ دوسرے قول کے قائل ہیں۔ درحقیقت یہ اختلاف لفظی ہے ورنہ معنی ومقصود میں سب متفق ہیں۔

ایمان کی اصل وفرع واضح رہنا چاہئے کہ اہلِ سنت و جماعت اور ارباب تحقیق و معرفت کے درمیان اتفاق ہے کہ ایمان میں اصل بھی ہے اور فرع بھی، اصل ایمان، تصدیق قلبی ہے اور اس کی فرع اوامر ونواہی کی بجا آوری ہے۔ اہلِ عرب کا عرف ہے کہ وہ کسی فرعی بات کو بطور استعارہ اصل کہتے ہیں۔ جیسے کہ تمام لغتوں میں شعاع آفتاب کو آفتاب کہا گیا ہے۔ اسی لحاظ

سے وہ گروہ طاعتوں کو ایمان کہتا ہے کیونکہ بندہ طاعت کے بغیر عذاب الٰہی سے محفوظ نہیں رہتا اور نہ محض تصدیق محفوظ رہنے کا اقتضاء ہے جب تک کہ وہ تصدیق کے ساتھ احکام بھی نہ بجالائے۔ لہٰذا جس کی طاعتیں زیادہ ہوں گی۔ وہ عذاب الٰہی سے زیادہ محفوظ ہوگا۔ چونکہ تصدیق وقول کے ساتھ، طاعت، محفوظ رہنے کی علت ہے۔ اس لئے اس کو بھی ایمان کہہ دیتے ہیں۔

ایک گروہ کا اعتقاد یہ ہے کہ عذاب الٰہی سے محفوظ رہنے کی علت معرفت ہے نہ کہ طاعت اگرچہ طاعت بھی موجود ہے۔ جب تک معرفت نہ ہو طاعت فائدہ نہیں پہنچاتی۔ لیکن جب معرفت موجود ہو اگرچہ طاعت موجود نہ ہو نتیجہ میں وہ نجات پا جائے گا۔ اگرچہ یہ بات مسلم ہے کہ نجات کا حکم تحتِ مشیت الٰہی ہے کہ اگر وہ چاہے تو وہ اپنے فضل سے درگزر فرمائے یا حضور اکرم ﷺ کی شفاعت سے بخش دے یا چاہے تو اس کے جرم کے مطابق سزا دے اور دوزخ میں بھیج دے اس کے بعد بندے کو جنت میں منتقل کر دیا جائے۔ لہٰذا اصحاب معرفت اگرچہ مجرم ہوں بحکمِ معرفت وہ ہمیشہ دوزخ میں نہ رہیں گے اور صرف اہلِ عمل جو بے معرفت ہیں، جنت میں نہیں آئیں گے اس سے معلوم ہوا کہ طاعت محفوظ رہنے کی علت نہیں ہو سکتی۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ:۔

لن ینجو احدکم بعملہ قیل ولا انت یا رسول اللّٰہ قال ولا انا الا ان یتغمدنی اللّٰہ برحمتہ۔	تم میں سے کوئی بھی اپنے عمل کی وجہ سے ہرگز نجات نہیں پائے گا۔ کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ بھی نہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں میں بھی نہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت میں مجھے ڈھانپ لیا ہے۔

لہٰذا بلا اختلاف امت، از روئے تحقیق و حقیقت، ایمان معرفت ہے اور اقرار عمل کو بجالانا ہے اور جسے خدا کی معرفت ہوگی اس کو اس کے کسی وصف کی بھی معرفت ہوگی۔

حق تعالیٰ کے اوصاف حسنیٰ تین قسم کے ہیں، جمال، جلال اور کمال۔ مخلوق کو اس کے کمال کی گہرائیوں تک رسائی نہیں بجز اس کے کہ وہ اس کے کمال کا اثبات واعتراف کرلے۔ اور اس سے نقص وعیب کی نفی کرے۔ اور جو جمال حق کا معرفت میں مشاہدہ کرتا ہے وہ ہمیشہ دید کا مشتاق رہتا ہے۔ جو جلال حق کا مشاہدہ کرتا ہے وہ ہمیشہ اپنے اوصاف سے متنفر رہتا ہے۔ اور اس کا دل محل ہیبت میں رہتا ہے۔ لہٰذا شوق، محبت کی تاثیر ہے اور بشری اوصاف سے نفرت بھی ایسی ہی ہے۔ اس لئے کہ بشری اوصاف کے حجاب کا کشف، عین محبت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس سے معلوم

ہوا کہ ایمان و معرفت کا نام محبت ہے اور علامات محبت، طاعت ہے۔ اس لئے کہ جب دل مشاہدے کا محل ہے اور آنکھیں دید کا مقام اور جان، جائے عبرت ہے۔ تو جسم اور دل مشاہدے کا مقام ٹھہرا۔ لہٰذا جسم کے لئے سزاوار یہی ہے کہ وہ تارکِ اوامر ونواہی نہ ہو۔ اور جس کا جسم تارک ہوا سے معرفت کی ہوا تک نہیں لگتی۔ آج کل یہ خرابی بناوٹی صوفیوں میں ظاہر ہے۔ کیونکہ ان ملحدوں نے جب اولیاء حق کے جمال کی خوبیاں دیکھیں اور ان کی قدر ومنزلت کو جانا تو وہ اپنے آپ کو ان جیسا بتانے لگے۔ اور کہنے لگے یہ رنج و مشقت تو اس وقت تک تھی جب تک معرفت نہ ہوا اور جب معرفت حاصل ہوگئی تو جسم سے طاعت کی مشقت جاتی رہی۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ جب معرفت حاصل ہوگئی تو دل شوق کا محل بن گیا۔ اس وقت فرمان کی تعظیم اور زیادہ ہو جاتی ہے نہ کہ سرے سے ہی معدوم؟ اگرچہ اسے ہم جائز جانتے ہیں کہ فرمانبردار اس درجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ اس سے طاعت کی مشقت اٹھ جاتی ہے اور اسے بالکل بار معلوم نہیں ہوتا۔ اور فرمان کی بجا آوری میں اسے اتنی زیادہ توفیق مل جاتی ہے کہ لوگ تو اسے مشقت سمجھتے ہیں لیکن وہ اسے بے مشقت ادا کرتا ہے۔ یہ بات اس وقت حاصل ہوتی ہے جب اس میں کمال تڑپ اور بے قراری پیدا ہو جائے۔

ایک گروہ کا یہ اعتقاد ہے کہ ایمان کلیتہً حق تعالےٰ کی طرف سے ہے اور ایک گروہ کے نزدیک کلیتہً بندے کی طرف سے ہے۔ یہ اختلاف ماوراء النہر کے لوگوں میں طول پکڑ گیا ہے لہٰذا جو لوگ اسے کلیتہً حق کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ خالص جبری ہیں اس لئے کہ بندہ کو چاہئے کہ وہ اس کے حصول میں بے قرار رہے۔ اور جو لوگ اسے کلیتہً بندہ کی طرف سے کہتے ہیں وہ خالص قدری ہیں۔ اس لئے کہ بندہ اعلام الٰہی کے بغیر اسے جان ہی نہیں سکتا۔ حالانکہ توحید کی راہ جبر و قدر کے درمیان ہے یعنی جبر سے نیچے اور قدر کے اوپر۔

درحقیقت ایمان بندے کا فعل ہے جو حق تعالیٰ کی ہدایت کے ساتھ شامل ہے کیونکہ جسے خدا گمراہ کرے اسے کوئی ہدایت پر لا نہیں سکتا۔ اور جسے خدا ہدایت پر لائے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام، ومن یرد ان یضلہ یجعل صدرہ ضیقا حرجا۔	جسے اللہ ہدایت پر لانا چاہے تو سینہ کو اسلام کیلئے کھول دیتا ہے اور جسے وہ گمراہ کرنا چاہے تو اس کے سینہ کو سخت اور تنگ کر دیتا ہے۔

اس ارشاد کے بموجب بندہ کے لئے یہی زیبا ہے کہ وہ ہدایت کی توفیق کو حق تعالےٰ

سے اور فعل ایمان کو خود اپنے سے منسوب کرے۔

علاماتِ ایمان ایمان کی علامتوں میں سے یہ ہے کہ بندہ دل سے توحید کا اعتقاد رکھے، آنکھوں کو ممنوعات سے بچائے، حق تعالیٰ کی نشانیوں اور آیتوں سے عبرت حاصل کرے، کانوں سے کلامِ الٰہی کی سماعت کرے، معدے کو حرام چیزوں سے خالی رکھے، زبان سے سچ بولے اور بدن کو منہیات سے اس حد تک محفوظ رکھے کہ باطن، ظاہر سے متحد ہو جائے۔ یہ سب ایمان کی علامات ہیں۔ اسی بناء پر ایک گروہ نے معرفتِ ایمان میں کمی وبیشی کو جائز رکھا ہے۔ حالانکہ سب کا اتفاق ہے کہ معرفتِ ایمان میں کمی وبیشی جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اگر معرفت میں کمی وبیشی کو مانا جائے تو معروف میں بھی کمی وبیشی لازم آتی ہے جب کہ معروف میں کمی وبیشی جائز وممکن ہی نہیں تو معرفت میں بھی جائز نہ ہونی چاہئے اس کی وجہ یہ ہے کہ معرفت میں نقص وکمی نہیں ہوتی ہے۔ لہٰذا یہی مناسب ہے کہ فرع اور عمل میں کمی بیشی نہ ہو۔ البتہ باتفاق طاعت میں کمی وبیشی جائز ہے اور حشویوں کے لئے جوان دونوں طبقوں سے نسبت کا دعویٰ کرتے ہیں یہ مسئلہ ان کے لئے دشوار ہے کیونکہ حشویوں کا ایک گروہ طاعت کو بھی جزوِ ایمان کہتا ہے۔ ایک گروہ تو صرف قول ہی کو ایمان کہتا ہے حالانکہ یہ دونوں باتیں بے انصافی کی ہیں۔

غرضکہ حقیقت ایمان یہ ہے کہ بندے کے اوصاف، طلبِ حق میں مستغرق ہوں۔ اور تمام اہلِ ایمان کو اس پر اتفاق کرنا چاہئے کہ سلطانِ معرفت کا غلبہ، نامرغوب اوصاف کو مغلوب کر دیتا ہے اور جہاں جہاں ایمان ہو وہاں وہاں سے اس سے انکار کے اسباب دور ہو جاتے ہیں جیسا کہ مقولہ ہے۔

اذا طلع الصباح عطل المصباح	جب صبح طلوع ہو جاتی ہے تو چراغ بیکار ہو جاتے ہیں۔

اور دن کے لئے کسی دلیل وبیان کی حاجت نہیں ہوتی۔ اسی کے ہم معنی کسی کا یہ مقولہ بھی ہے کہ:

"روزِ روشن را دلیلے نباشد"

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

ان الملوك اذا دخلوا قرية افسدوها۔ الآیہ	سلاطین جب کسی بستی پر غالب ہو کر داخل ہوتے ہیں تو اسے ویران کر دیتے ہیں۔

جب عارف کے دل میں معرفت کی حقیقت غالب ہو کر داخل ہو جاتی ہے تو ظن وشک اور انکار کی طاقت فنا کر دیتی ہے۔ اور سلطانِ معرفت (حق تعالیٰ) اس کے حواس اور خواہشات کو اپنا گرویدہ

بنالیتا ہے۔تا کہ وہ جو کچھ کرے، دیکھے اور جو کہے سب اسی کے زیر فرمان ہو۔

حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا فی الحال اس کا جواب نہیں دوں گا۔اس لئے کہ جو کچھ کہوں گا وہ لفظ وعبارت ہوں گے اور میرے لئے یہ ضروری ہے کہ میں معاملہ کے ساتھ جواب دوں۔ چونکہ میں مکہ مکرمہ جانے کا ارادہ رکھتا ہوں اس غرض کے لئے تم بھی میرے ساتھ چلو تا کہ تم اس کا جواب پا سکو۔ راوی کا کہنا ہے کہ میں نے ویسا ہی کیا جب میں ان کے ساتھ جنگل میں پہنچا تو ہر روز دو روٹی اور دو گلاس پانی غیب سے نمودار ہوتے رہے آپ ان میں ایک میرے آگے اور ایک اپنے آگے رکھ لیتے۔ یہاں تک کہ اس جنگل میں ایک روز ایک بوڑھا سوار آیا جب اس نے ان کو دیکھا تو گھوڑے سے اتر کر مزاج پرسی کی پھر کچھ دیر باتیں کر کے سوار ہو کر چلا گیا۔میں نے عرض کیا اے شیخ! یہ بوڑھا کون تھا؟ انھوں نے فرمایا یہ تمہارے سوال کا جواب تھا۔میں نے پوچھا کس طرح؟ فرمایا وہ حضرت خضر علیہ السلام تھے۔انھوں نے میرے ساتھ رہنے کی اجازت چاہی میں نے منظور نہیں کیا۔میں نے کہا آپ نے کیوں انکار فرمایا؟ انھوں نے جواب دیا مجھے خطرہ تھا کہ ان کی صحبت میں میرا اعتقاد، حق تعالیٰ کے سوا ان کے ساتھ نہ ہو جائے۔اس طرح میرا توکل برباد ہو جائے۔کیونکہ ایمان کی حقیقت توکل کی حفاظت ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وعلى الله فتوكلوا ان كنتم مومنين۔	اللہ تعالےٰ ہی پر توکل رکھو اگر تم صاحبِ ایمان ہو۔

حضرت محمد بن خفیف رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

الايمان تصديق القلب بما علم به الغيوب۔	ایمان یہ ہے کہ جو غیب سے اس کے دل پر انکشاف ہو اس پر یقین رکھے۔

اسی لئے ایمان غیب کے ساتھ ہے۔اور اللہ تعالیٰ سر کی آنکھوں سے غائب ہے۔جب تک معنی میں تقویت نہ ہو بندہ کا یقین ظاہر نہیں ہو سکتا۔اور یہ اللہ تعالیٰ کے معلوم کرانے سے حاصل ہوتا ہے۔جب عارفوں کا تعارف کرانے والا اور عالموں کو معلوم کرانے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے اور وہی ان کے دلوں میں معرفت وعلم پیدا کرتا ہے تو علم ومعرفت کا اختیار بندے کے کسب سے جاتا رہا۔ لہٰذا جس کا دل معرفتِ الٰہی پر یقین رکھتا ہے وہ مومن ہے اور حق تعالیٰ کے ساتھ واصل ہے۔اہلِ

بصیرت کے لئے اس قدر بیان کافی ہے چونکہ اس کتاب میں جگہ جگہ مقصود کی وضاحت کی جا چکی ہے۔اب اسرار معاملات کے حجابات کھولتا ہوں۔

چوتھا کشف حجاب

نجاست سے پاک ہونے کے بیان میں

ایمان کے بعد سب سے پہلا فرض طہارت ہے خاص کر نماز کی ادائیگی کیلئے طہارت بدنی یہ ہے کہ تمام جسم کو نجاست و جنابت سے پاک کرے اور شریعت کی اتباع میں تین انداموں کو دھو کر سر کا مسح کرے۔ اگر پانی میسر نہ ہو یا مرض کی زیادتی کا اندیشہ ہو تو تیمّم کرے۔ان کے احکام سب کو معلوم ہیں۔

واضح رہنا چاہیئے کہ طہارت دُو قسم کی ہے، ایک باطنی طہارت، دوسری ظاہری طہارت، چنانچہ ظاہری طہارت کے بغیر نماز درست نہیں اور باطنی طہارت کے بغیر معرفت درست نہیں ہے۔ بدنی طہارت کے لئے مطلق پانی کی حاجت ہے جو کہ ناپاک یا استعمال کیا ہوا نہ ہو۔اور دل کی طہارت کے لئے خالص توحید کے پانی کی ضرورت ہے۔ جو کہ مخلوط اور پراگندہ اعتقاد پر مشتمل نہ ہو۔ طریقت کے مشائخ ظاہری طور پر ہمیشہ پاک و طاہر ہوتے ہیں اور باطنی حالت میں بھی توحید کے ساتھ پاک و مطہر ہوتے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے ایک صحابی سے ارشاد فرمایا:۔

دُم علی الوضوء یحبک حافظاک۔	ہمیشہ وضو سے رہو تمہیں تمہارے محافظ دوست رکھیں گے۔

جو لوگ ظاہری طہارت پر عمل پیرا رہتے ہیں فرشتے ان کو دوست رکھتے ہیں۔اور جس کا باطن توحید سے پاک و مطہر ہے اللہ تعالیٰ ان کو دوست رکھتا ہے۔

سید عالم ﷺ ہمیشہ اپنی دعاؤں میں یہ کہا کرتے تھے کہ:۔

اللّٰھم طھر قلبی من النفاق۔	اے خدا میرے دل کو باطنی آلودگیوں سے پاک رکھ،

اور کسی قسم کی باطنی آلودگی آپ کے قلب اطہر تک نہیں پہنچ سکی۔ اپنے کمالات دیکھنا غیر خدا کا

اثبات کرنا ہے اور غیر کا اثبات، مقام توحید میں نفاق ڈالتا ہے۔ مانا کہ مریدانِ باصفا، اپنے مشائخ کی کرامتوں اور بزرگیوں کو سرمہ بصیرت بناتے ہیں۔ لیکن آخر کار ان کے کمال کے مقام میں بہت بڑا حجاب ہے اس لئے کہ جو بھی غیر ہو اس کی دید آفت ہے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

نفاق العارفین افضل من اخلاص المریدین۔	عارفوں کا نفاق، مریدوں کے اخلاص سے افضل ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جو مرید کا مقام ہوتا ہے وہ کامل کا حجاب ہے۔ مرید کی ہمت یہ ہوتی ہے کہ کرامت حاصل کرے اور کامل کی یہ ہمت ہوتی ہے کہ کرامت دینے والے کو پائے۔ غرضکہ اثباتِ کرامت، اہلِ حق کے لئے نفاق نظر آتا ہے۔ کیونکہ اس کی دید بھی معائنہ غیر ہے اسی طرح حق تعالیٰ کے دوست جسے آفت جانتے ہیں۔ اسے تمام گنہگار معصیت سے نجات سمجھتے ہیں اور گنہگاروں کے معاصی کو گمراہ لوگ نجات جانتے ہیں۔ کیونکہ اگر کافر، جانتے کہ ان کے گناہ خدا کو ناپسند ہیں جیسا کہ گنہگار جانتے ہیں تو وہ کفر سے نجات پاتے اور گنہگار جانتے کہ ان کے تمام معاملات محل علّت ہیں یعنی سقیم ہیں جیسا کہ محبوبانِ خدا جانتے ہیں تو وہ سب معاصی سے نجات پا کر تمام آفتوں سے پاک ہو جاتے۔ لہٰذا مناسب یہی ہے کہ ظاہری طہارت باطنی طہارت کی موافق ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جب ہاتھ دھوئے جائیں تو چاہئے کہ دل سے دنیا کی محبت دھو ڈالی جائے۔ اسی طرح جب استنجا کرے تو مناسب ہے کہ جس طرح ظاہری گندگی کو دور کیا جائے اسی طرح باطن سے بھی غیر خدا کی محبت کو دور کر دیا جائے۔ جب منہ میں پانی لیا جائے تو مناسب ہے کہ منہ کو غیر کی یاد سے پاک کرے۔ جب ناک میں پانی ڈالے تو سزاوار ہے کہ شہوتوں کو اپنے اوپر حرام گردانے جب چہرہ دھوئے تو مناسب ہے کہ تمام الفتوں سے یک دم کنارہ کش ہو جائے۔ اور حق کی طرف متوجہ ہو جائے اور جب ہاتھوں کو دھوئے تو اپنے نصیبوں سے دست کش ہو جائے اور جب سر کا مسح کرے تو مناسب ہے کہ اپنے معاملات کو حق تعالیٰ کے سپرد کر دے جب پاؤں دھوئے تو زیبا ہے کہ فرمانِ الٰہی کے خلاف ہر چیز پر قائم رہنے سے بچنے کی نیت کرے

جب اس پر عمل کرے گا تو اسے دونوں قسم کی طہارت حاصل ہو جائے گی۔ اس لئے کہ تمام ظاہری شرع امور باطن کے ساتھ ہوئے ہیں یہی خاصہء ایمان ہے کہ ظاہر میں زبان سے اقرار ہو تو باطن میں اس کی تصدیق بھی۔ نیت کا تعلق دل سے ہے۔ شریعت میں طاعت کے احکام جسم ظاہری پر ہیں۔ لہٰذا دل کی طہارت کا طریقہ، دنیا کی آفت میں غور و فکر کرنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ دنیا غداری کی جگہ اور محل فنا ہے۔ دل کو اس سے خالی کرے۔ یہ کیفیت کثرتِ مجاہدے کی ذریعہ حاصل ہوتی ہے اور مجاہدے میں اہم ترین بات ظاہری آداب کی حفاظت اور ہر حال میں اس پر مداومت ہے۔

حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے حق تعالیٰ کے حقوق ادا کرنے کے لئے دنیا میں ابدی عمر کی ضرورت ہے۔ یہاں تک کہ اگر ساری مخلوق خدا کو بھول جائے اور دنیاوی نعمتوں میں مست ہو جائے تو میں اکیلا و تنہا دنیا کی بلاؤں میں شریعت کے آداب کے تحفظ میں کھڑا ہو جاؤں اور حق تعالیٰ کی یاد میں منہمک رہوں واللہ اعلم بالصواب

حضرت ابو طاہر حرمی مکہ مکرمہ میں چالیس سال اس حال میں مقیم رہے کہ کبھی رفع حاجت نہ کی۔ جب بھی وہ حدودِ حرم سے باہر رفع حاجت کے لئے جاتے خیال آجاتا کہ یہ وہ زمین ہے جسے حق تعالیٰ نے اپنے ساتھ منسوب فرمایا ہے استعمال شدہ پانی کو بھی اس جگہ گرانا مکروہ سمجھا۔

حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ رَے کی جامع مسجد میں مرض اسہال لاحق ہوا۔ دن رات میں انھوں نے ساٹھ مرتبہ غسل کیا بالآخر ان کی وفات پانی ہی میں واقع ہوئی۔

حضرت علی رودباری رحمتہ اللہ علیہ عرصہ تک وسوسہء طہارت میں مبتلا رہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن دریا میں صبح سے ٹھہرا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ سورج نکل آیا اور میں پانی ہی میں رہا۔ اس وقت دل میں رنج پیدا ہوا میں نے خدا سے التجا کی کہ ''العافیہ العافیہ'' دریا سے مجھے غیبی آواز آئی کہ ''العافیة فی العلم'' عافیت علم میں ہے۔

حضرت ابو سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ نے بیماری کی حالت میں ایک نماز کے لئے ساٹھ مرتبہ طہارت کی۔ مرض موت میں انتقال کے دن خدا سے دعا مانگی کہ اے خدا موت کو حکم دے کہ وہ اس وقت آئے جب کہ میں پاک و صاف ہوں۔

حضرت شبلی علیہ الرحمتہ نے ایک دن مسجد میں جانے کے لئے طہارت کی۔ غیب سے ندا آئی کہ تم نے ظاہر کو تو آراستہ کر لیا باطن کی صفائی کہاں ہے؟ وہ لوٹ آئے اور تمام ساز وسامان صدقہ کر دیا اور ایک سال تک صرف اسی قدر لباس پہنا جس سے نماز جائز ہو سکے پھر جب حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس وہ حاضر ہوئے تو فرمایا اے ابو بکر! جو طہارت تم نے کی ہے وہ بہت سود مند ہے۔ اللہ تعالےٰ تمہیں اس طہارت پر ہمیشہ قائم رکھے اس کے بعد حضرت شبلی آخر وقت تک کبھی بے طہارت نہ رہے جب ان کے انتقال کا وقت آیا تو ان کی طہارت ٹوٹ گئی آپ نے اپنے مرید کی طرف اشارہ فرمایا کہ مجھے طہارت کرائے۔ مرید نے انھیں طہارت کرائی لیکن داڑھی میں خلال کرنا وہ بھول گیا اس وقت ان میں کلام کرنے کی سکت نہ تھی۔ مرید کا ہاتھ پکڑ کر داڑھی کی طرف اشارہ فرمایا اس نے داڑھی میں خلال کیا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے کبھی طہارت کا کوئی ادب ترک نہیں کیا جب ایسا ہوا میرے باطن پر نصیحت ظاہر ہوگئی۔

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب کبھی میرے دل پر دنیا کا اندیشہ گزرتا میں فوراً وضو کر لیتا اور جب عقبیٰ کا اندیشہ گزرتا تو غسل کر لیتا کیونکہ دنیا محدث ہے اس کا اندیشہ حدث ہے اور عقبیٰ محل غیبت و آرام ہے اس کا اندیشہ جنابت ہے۔ لہٰذا حدث سے وضو اور جنابت سے غسل واجب ہو جاتا ہے۔

حضرت شبلی علیہ الرحمتہ ایک دن وضو کے بعد جب مسجد کے دروازے پر آئے تو ان کے دل میں آواز آئی کہ اے ابو بکر تم ایسی طہارت رکھتے ہو اور اس گستاخی کے ساتھ ہمارے گھر میں داخل ہونا چاہتے ہو۔ جب یہ سنا تو واپس لوٹے پھر ندا آئی کہ ہمارے دروازے سے ہٹ کر کدھر کا ارادہ ہے؟ یہ سن کر ان کی چیخ نکل گئی۔ ندا آئی ہم پر طعنہ کرتے ہو۔ وہ اپنی جگہ خاموش کھڑے ہو گئے۔ پھر آواز آئی کہ تم ہمارے سامنے بلا کے تحمل کا دعویٰ کرتے ہو۔ اس وقت حضرت شبلی نے پکارا۔

المستغاث منك اليك۔	اے خدا تیری جانب سے تیری ہی طرف فریاد ہے۔

طہارت کی تحقیق میں مشائخ کے بکثرت ارشادات ہیں وہ ہمیشہ مریدوں کو ظاہر و باطن کی طہارت کا حکم دیتے رہے ہیں کہ جب بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہونے کا ارادہ کرو تو ظاہری عبادت کے لئے ظاہری طہارت کرو اور جب باطن میں قربت کا قصد کرو تو باطن کی طہارت کرو ظاہری طہارت پانی سے ہے اور باطنی طہارت توبہ و رجوع کے ذریعہ ہے۔ اب میں توبہ اور اس کے متعلقات کی تشریح کرتا ہوں۔

توبہ اور اس کے متعلقات کا بیان

واضح رہنا چاہیے کہ سالکانِ راہِ حق کا پہلا مقام توبہ ہے۔ جس طرح کہ طالبانِ عبادت کے لئے پہلا درجہ طہارت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

یا ایھا الذین اٰمنوا توبوا الی اللّٰہ توبۃ نصوحا الآیہ	اے ایمان والو! اللہ کے حضور میں دل سے توبہ کرو۔

نیز ارشاد ہے:۔

"وتوبوا الی اللّٰہ جمیعا ایھا المومنون لعلکم تفلحون" اے مومنو! تم سب اللہ کے حضور میں توبہ کروتا کہ فلاح پاؤ۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:۔

مامن شیئ احب الی اللّٰہ من شاب تائب۔	اللہ کے نزدیک کوئی چیز اس سے زیادہ پسند نہیں کہ جوان آدمی توبہ کرے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔

التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ۔	گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا کہ اس کا کوئی گناہ ہی نہیں۔

آپ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ:۔

اذا احب اللّٰہ عبدالن یضرہ ذنب۔	اللہ تعالیٰ جب بندہ کو محبوب بنالیتا ہے تو اسے گناہ کوئی نقصان نہیں پہنچاتا۔

کسی نے عرض کیا توبہ کی علت کیا ہے؟ فرمایا ندامت۔ لیکن یہ جو فرمایا کہ دوستوں کے لئے گناہ نقصان رساں نہیں ہوتا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ گناہ سے بندہ کافر نہیں ہوتا۔ اور نہ اس کے ایمان میں خلل ہوتا ہے۔ بشرطیکہ گناہ، ایمان کو ضائع نہ کرے۔ ایسی معصیت کا نقصان، جس کا انجام کار نجات ہے۔ درحقیقت نقصان وضیاع نہیں ہے۔

واضح رہنا چاہیے کہ لغت میں توبہ کے معنی رجوع کرنے کے ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ "تاب ای رجع" لہٰذا حق تعالیٰ کی ممنوعات سے باز رہنا اس لئے کہ اسے خدا کے حکم کا

خوف ہے۔ اصل میں یہی توبہ کی حقیقت ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”الندم التوبۃ“ ندامت و شرمندگی کا نام ہی توبہ ہے۔ یہ ایسا ارشاد ہے کہ جس میں توبہ کی تمام شرائط پنہاں ہیں۔

توبہ کی شرائط توبہ کی تین شرطیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ مخالفت پر اظہارِ ندامت و افسوس کرے۔ دوسرے یہ کہ ترکِ حالت میں ذلّت محسوس کرے۔ تیسرے یہ کہ دوبارہ گناہ نہ کرے۔ شرائط کی یہ تینوں باتیں ندامت میں موجود ہیں۔ کیونکہ جب دل میں ندامت پیدا ہوتی ہے تو پہلی دونوں شرطیں اور تیسری شرط ان کے ضمن میں پائی جاتی ہیں۔

ندامت کے بھی تین سبب ہیں جس طرح توبہ کی تین شرطیں ہیں۔ ندامت کا پہلا سبب یہ ہے کہ جب دل پر سزا کا خوف غلبہ پاتا ہے تب وہ برے افعال پر دل آزردہ ہوتا ہے اور ندامت پیدا ہوتی ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ جب نعمت کی خواہش اس کی دل پر غالب ہو جائے اور وہ جان لے کہ برے فعل اور نافرمانی سے وہ حاصل نہیں ہو سکتی تو وہ اس سے پشیمان ہو جاتا ہے۔ اور تیسرا سبب یہ ہے کہ اس کے دل میں اللہ کی شرم و حیا آ جاتی ہے اور وہ مخالفت پر پشیمان ہوتا ہے۔ لہٰذا پہلے کو تائب دوسرے کو منیب اور تیسرے کو اوّاب کہتے ہیں۔ اسی طرح توبہ کے بھی تین مقام ہیں۔ ایک توبہ دوسری انابت تیسری اوّابت۔ لہٰذا توبہ عذاب کے ڈر سے، انابت حصولِ ثواب کے لئے اور اوابت، فرمان کی رعایت سے ہے۔ اسی وجہ سے توبہ عام مسلمانوں کا مقام ہے جو گناہ کبیرہ سے پیدا ہوتا ہے کیونکہ حق تعالیٰ فرماتا ہے:

من خشی الرحمٰن بالغیب وجاء بقلب منیب۔	جو خدا سے بحالت غیوبت ڈرے اور انابت والا دل لائے۔

اوابت، انبیاء و مرسلین کا مقام ہے کیونکہ حق تعالیٰ فرماتا ہے:

نعم العبد انہ اوّاب۔	کتنا اچھا بندہ ہے کہ ہر حال میں رجوع ہوتا ہے۔

غرضکہ طاعت کے ساتھ کبائر سے رجوع کا نام توبہ ہے۔ اور محبت میں صغائر سے رجوع کا نام انابت ہے اور از خود خدا کی طرف رجوع کا نام اوّابت ہے۔ یہ ان کے درمیان فرق ہے جو فواحش سے اوامر کی طرف رجوع کرے اور وہ جو محبت میں حجت اور فاسد اندیشہ سے رجوع کرے اور جو اپنی خودی سے حق کی طرف رجوع کرے۔

توبہ کی اصل حق تعالیٰ کا آگاہ اور خبردار کرنا اور خوابِ غفلت سے دل کو بیدار کرنا اور اپنے حال کی غیبت کو دیکھنا ہے۔ جب بندہ اپنے برے افعال میں غور و فکر کرتا ہے اور اس سے نجات کی کوشش کرتا ہے تو حق تعالیٰ اس پر توبہ کے اسباب آسان فرما دیتا ہے اور

اسے اس کی معصیت کی برائی سے نکال کر اپنی طاعت کی شیرینی میں پہنچا دیتا ہے۔

اہلِ سنت و جماعت اور مشائخ طریقت کے نزدیک جائز ہے کہ بندہ کسی ایک گناہ سے توتوبہ کرے لیکن وہ کسی دوسرے گناہ میں مبتلا ہو جائے۔ اس کے باوجود حق تعالیٰ اس گناہ سے توبہ کے بدلے اسے ثواب عطا فرمائے گا اور ممکن ہے کہ اس کی توبہ کی برکت سے وہ دوسرے گناہ کے ارتکاب سے بھی باز آجائے۔ مثلاً کوئی شرابی و بدکار بدکاری سے تو توبہ کرلے مگر شراب خوری پر مصر رہے تو اس کی توبہ دوسرے گناہ کے ارتکاب کے باوجود درست ہوگی۔ لیکن معتزلہ کا وہ گروہ جسے "بہشمی" کہتے ہیں اس کا قول ہے کہ توبہ اس وقت تک صحیح نہیں ہوسکتی جب تک کہ بندہ تمام گناہوں سے توبہ نہ کرے۔ یہ نظریہ محال ہے اس لئے کہ تمام معاصی جو بندہ کرے اسے ان سب کی وجہ سے عذاب ہوتا ہے لیکن جب بندہ معاصی کی کسی ایک قسم کو چھوڑ دیتا ہے تو وہ اس قسم کے معاصی کے عذاب سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ لامحالہ وہ اس سے تائب ہوا۔ اسی طرح اگر کوئی بندہ بعض فرائض بجالاتا ہے اور بعض کو چھوڑ دیتا ہے تو وہ جتنا کرے گا لامحالہ اس کا اسے ثواب ملے گا۔ اور جتنا نہیں کرے گا اس کی اسے سزا ملے گی اور اگر کسی کے پاس معصیت کا آلہ ہی نہیں ہے اور نہ اس کے اسباب موجود ہیں۔ پھر وہ توبہ کرتا ہے تو وہ تائب ہی کہلائے گا۔ اس لئے کہ توبہ کا ایک رکن ندامت ہے اور اسے اس توبہ کے ذریعہ گزشتہ پر ندامت حاصل ہے۔ فی الحال گناہ کی اس جنس سے کنارہ کشی کرلی ہے اور ارادہ رکھتا ہے کہ اگر وہ آلہ موجود ہو جائے اور سبب بھی مہیا ہو جائے تو بھی میں ہرگز اس گناہ کا ارتکاب نہ کروں گا۔

توبہ کے بارے میں مشائخ کے ارشادات

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ اور ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ "التوبة ان لا تنسی ذنبک" توبہ یہ ہے کہ کیے ہوئے گناہوں کو نہ بھولو اور اس کی ندامت میں ہمیشہ غرق رہو اگرچہ کتنے ہی زیادہ اعمال صالحہ ہو جائیں۔ ان پر غرور نہ کرو اس لئے کہ برُے فعل پر شرمندگی، اعمال صالحہ پر مقدم ہے۔ ایسا شخص کبھی گھمنڈ نہ کرے اور نہ گناہ کو فراموش کرے۔

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ اور مشائخ کی ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ "التوبة ان تنسی ذنبک" کہ توبہ یہ ہے کہ کیے ہوئے گناہ کو بھول جاؤ کیونکہ توبہ کرنے والا اہلِ محبت سے ہوتا ہے۔ اور محبت والا مشاہدے میں ہوتا ہے اور مشاہدہ میں گناہ کی یاد ظلم ہے۔ کیونکہ وہ کچھ عرصہ تو شقاوت میں رہا پھر کچھ عرصہ حالتِ وفا میں جفا کی یاد میں تڑپا۔ حالانکہ وفا میں

جفا کی یاد، وفا میں حجاب ہوتا ہے اور نافرمانی سے رجوع کرنا مجاہدہ ہے اور مشاہدے سے وابستہ ہوتا ہے۔

اس بیان کی تفصیل مذہب سہیلیاں میں دیکھنی چاہئے جو کہ تائب کو بخود قائم کہتے ہیں اور اس کے گناہ کے فراموش کرنے کو غفلت سمجھتے ہیں اور جو تائب کو حق کے ساتھ قائم کہتے اور اس کے گناہ کی یاد میں شرک بتاتے ہیں۔

غرضکہ تائب اگر اپنی صفت میں باقی رہے تو اس کے گناہ کی عقدہ کشائی نہیں ہو سکتی اور اگر وہ صفت میں فانی ہے تو اس کے لئے اس کی یاد درست نہیں ہوتی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بحالت بقائے صفت کہا "تبت الیک" میں نے تیری طرف رجوع کیا۔ اور رسول اللہ ﷺ نے بحالتِ فنائے صفت کہا "لا احصی ثناء علیک" میں تیری ثنا کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

خلاصہ یہ کہ مقام قربت میں وحشت کی یاد وحشت ہوتی ہے۔ تائب کے لئے زیبا یہی ہے کہ وہ اپنی خودی کو بھی یاد نہ کرے۔ چہ جائیکہ وہ اپنے گناہوں کو یاد رکھے۔ درحقیقت اپنے گناہ کی یاد بھی اس مقام میں گناہ ہے۔ کیونکہ یہ محل اعراض ہے۔ جب گناہ محل اعراض ہے تو اس کی یاد بھی محل اعراض ہی ہوگی۔ جیسے جرم کی یاد جرم ہے۔ اس طرح اس کا بھول جانا بھی جرم ہے کیونکہ ذکر ونسیان دونوں کا تعلق توبہ سے ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے بکثرت کتابیں پڑھیں ہیں کسی نے مجھے اتنا فائدہ نہ دیا جتنا اس شعر نے دیا ہے

اذا قلت ما اذنبت قالت مجیبۃ

حیاتك ذنب لا یقاس بہ ذنب

جب میں نے کہا میں نے کیا گناہ کیا ہے تو جواب دینے والے نے کہا۔

تیری زندگی ہی گناہ ہے اس کی موجودگی میں کسی اور گناہ کا قیاس کرنے کی ضرورت ہی کیا؟

جب کہ دوست کی بارگاہ میں دوست کا وجود ہی گناہ ہے تو اس کے وصف کی کیا قدر و قیمت ہوگی؟

غرضکہ توبہ تائیدِ ربانی ہے اور معاصی، فعل جسمانی ہے۔ جب دل میں ندامت پیدا ہو جائے تو جسم میں کوئی سامان نہیں رہتا جو دل کی ندامت کو دور کر سکے، اور جب اس کی ندامت ابتدائے فعل میں توبہ کو مانع نہیں تو جب فعل کی انتہا ہو جائے تو اس کے وہ کیسے مانع ہوگی۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

فتاب علیه انه هو التواب الرحیم۔	بندے نے اپنے افعال پر توبہ کی تو اللہ تعالٰے نے اس کی توبہ قبول فرمائی وہی توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔

قرآن کریم میں اس کے نظائر و شواہد بکثرت موجود ہیں اُن کے بیان کرنے کی حاجت نہیں۔

توبہ کس سے کس کی طرف توبہ کی تین قسمیں ہیں ایک خطا سے راہ ثواب کی طرف؟ دوسرے درستگی سے مزید درستگی کی طرف؟ تیسرے اپنی خودی سے حق تعالٰی کی طرف؟ خطا سے راہ صواب پر گامزن ہونے کے بارے میں اللہ تعالٰی فرماتا ہے:۔

والذین اذا فعلوا فاحشة اوظلموا انفسهم ذکروا اللّٰه فاستغفروا لذنوبهم الآیة	وہ لوگ جنھوں نے برے کام کئے اور اپنی جانوں پر ظلم کیا تو انھوں نے خدا کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی مغفرت مانگی۔

اور وہ جو درستگی سے مزید درستگی کی طرف رجوع ہے اس کی مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسی ہے کہ انھوں نے کہا ”تبت الیك“ میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور وہ جو اپنی خودی سے حق تعالٰی کی طرف رجوع ہے اس کی مثال حضور نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ:۔

وانه لیغان علی قلبی انی کنت لاستغفر اللّٰه فی کل یوم سبعین مرةً الحدیث۔	جب میرے دل پر ہلکا سا ابر آ جاتا ہے تو اس وقت روزانہ ستّر مرتبہ خدا سے استغفار کرتا ہوں۔

ارتکاب خطا و معصیت غایت درجہ قبیح فعل ہے اور خطا و معصیت سے راہِ صواب کی طرف رجوع دتوبہ عمدہ اور پسندیدہ عمل ہے۔ یہ عام لوگوں کی توبہ ہے اور اس کا عمل ظاہر ہے اور راہِ صواب پر گامزن رہتے ہوئے اس کی موجودہ حالت پر توقف، باعث حجاب ہوتا ہے۔ موجودہ راہِ صواب سے آگے کی راہِ صواب کی طرف رجوع کرنا اہل ہمت کے نزدیک غایت درجہ عمل محمود ہے۔ یہ خاص بندوں کی توبہ ہے اور یہ محال ہے کہ خواص معصیت سے توبہ نہ کریں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں اس دنیا کے اندر جب دیدارِ الٰہی کی آرزو پیدا ہوئی تو انھوں نے اس سے توبہ کی۔ اس لئے کہ دیدار کی خواہش اپنے اختیار سے تھی اور دوستی میں اختیار آفت ہوتی ہے اور اپنے اختیار کی آفت کو ترک کرنا لوگوں کے لئے ترک رویت اور درجہء محبت میں اپنی خودی سے حق کی طرف رجوع کرنے کی صورت میں نمودار ہوئی۔ جیسا کہ مقامِ الٰہی پر وقوف آفت ہے اس سے توبہ کر کے اس سے بلند تر مقام پر فائز ہوتے ہیں اسی طرح مقام اور

احوال کی دید سے بھی توبہ کی جاتی ہے۔ چنانچہ حضور اکرم ﷺ کے مقامات ہر آن ترقی پر رہے۔ جب کسی عالی مقام پر پہنچتے تو اس سے نیچے مقام کے وقوف پر استغفار کیا کرتے تھے اور اس مقام کی دید سے توبہ بجالاتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بار بار ارتکاب گناہ کا مسئلہ

واضح رہنا چاہیئے کہ جب بندہ عہد کرے کہ آئندہ گناہ نہیں کرے گا تو اس کی توبہ کے لئے تائید ربانی شرط نہیں ہے۔ اگر تائب پر پھر ایسا وقت آ جائے کہ عہد کے باوجود گناہ سرزد ہو تو دوبارہ توبہ کرنا اس کی درستگی کے حکم میں ہوگا۔ طریقت کے مبتدیوں اور تائبوں سے ایسا ہوا ہے کہ توبہ کرلی پھر فساد لاحق ہوا اور معصیت کا ارتکاب ہو گیا۔ پھر جب خبردار ہوئے تو اس سے دوبارہ توبہ کی ہے۔ یہاں تک کہ ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ستر بار توبہ کی اور ہر توبہ کے بعد برابر معصیت کا صدور ہوتا رہا۔ اکہترویں مرتبہ توبہ کے بعد استقامت میسر آئی۔

حضرت ابوعمر نے حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ سے بیان کیا کہ میں نے ابتداء میں حضرت ابوعثمان حیری رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس میں توبہ کی اور اس پر کچھ عرصہ قائم رہا پھر میرے دل میں معصیت کی چاہت پیدا ہوئی اور میں نے ارتکاب کر لیا۔ اور اس بزرگ کی صحبت سے روگرداں ہو گیا۔ جب بھی میں انھیں دور سے دیکھتا تو میں شرمندہ ہو کر ادھر ادھر ہو جاتا کہ ان کی نظر مجھ پر نہ پڑے۔ اتفاق سے میرا ان کا آمنا سامنا ہو گیا۔ انھوں نے فرمایا اے فرزند! تم اپنے دشمنوں کے ساتھ نہ رہا کرو کیونکہ ابھی تم معصوم ہو۔ اس لئے کہ دشمن تمہارے عیب کو دیکھتا ہے اور جب تم انھیں عیب دار نظر آتے ہو تو وہ خوش ہوتے ہیں اور جب تم گناہ سے معصوم ہوتے ہو تو انھیں رنج پہنچتا ہے۔ اگر تمہاری خواہش یہی ہے کہ معصیت میں مبتلا رہو تو ہمارے پاس آیا کرو تا کہ ہم تمہاری معصیت و بلا کو دور کر دیا کریں اور تمہارے دشمنوں کو خوش ہونے کا موقعہ نہ دیں۔ حضرت ابوعمر بیان کرتے ہیں کہ اس کے بعد میرا دل گناہ سے سیر ہو گیا اور صحیح توبہ نصیب ہو گئی۔

میں نے سنا ہے کہ ایک شخص نے گناہوں سے توبہ کی۔ اس کے بعد پھر اس سے گناہ سرزد ہو گیا جس سے وہ بہت شرمسار ہوا۔ ایک دن اس نے اپنے دل میں کہا کہ اگر اب میں دوبارہ توبہ کر کے راہِ صواب اختیار کر لوں تو میرا حال کیا ہوگا؟ ہاتف نے آواز دی:۔

”اطعتنا فشکرناك ثم ترکتنا فامھلناك فان عدت الینا قبلناك“ تو نے ہماری اطاعت کی ہم نے اسے قبول کیا پھر تو نے بیوفائی کی اور ہمیں چھوڑ دیا تو ہم نے تجھے مہلت دی

اب تو اگر توبہ کر کے ہماری طرف آئے تو ہم پھر تجھے قبول کر لیں گے۔

توبہ میں اقوال مشائخ

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

توبة العوام من الذنوب و توبة الخواص من الغفلت	عوام کی توبہ گناہوں سے اور خواص کی توبہ غفلت سے ہے۔

کیونکہ عوام سے صرف ظاہرِ حال میں پوچھا جائے گا اور خواص سے معاملہ کی تحقیق کی جائے گی عوام کے لئے غفلت نعمت اور خواص کے لئے حجاب ہے۔

لیس للعبد فی التوبة شیئ لان التوبة الیه لامنه۔	بندے کو توبہ میں کوئی دخل نہیں ہے اس لئے کہ توبہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہے نہ کہ بندے کی جانب سے۔

اس قول سے لازم آتا ہے کہ توبہ بندے کا عمل نہیں ہے بلکہ حق تعالیٰ کی عطا و بخشش ہے یہی جنیدی مذہب ہے۔

حضرت ابوالحسن بوشنجہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "التوبة اذا ذکرت الذنب ثم لا تجد حلاوة عند ذکره فهو التوبة" توبہ یہ ہے کہ جب تم گناہ کو یاد کرو تو اس کی یاد میں تمہیں لذت و سرور نہ معلوم ہو تو ایسی توبہ صحیح ہے اس لئے کہ گناہ کی یاد، یا تو حسرت سے ہوگی یا ارادہ و خواہش سے۔ اگر کوئی حسرت و ندامت سے اپنی معصیت یاد کرتا ہے تو وہ تائب ہے اور اگر ارادہ و خواہش سے اسے یاد کرتا ہے تو وہ گنہگار ہے۔ کیونکہ ارتکاب معصیت میں اتنی آفت نہیں جتنی اس کے ارادہ و خواہش میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ارتکاب گناہ کچھ لمحہ کا ہوتا ہے لیکن اس کا ارادہ و خواہش مستقل اور دائمی ہے۔ جس کا جسم ایک لمحہ کے لئے گناہ میں رہے وہ ویسا نہیں ہے بمقابلہ اس کے جس کا دل دن رات اس کی صحبت میں رہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

التوبة توبتان توبة الانابت و توبة الاستحیاء، فتوبة الانابت ان یتوب العبد خوفا من عقوبته و توبة الاستحیاء ان یتوب حیاء من کرمه۔	توبہ دو طرح کی ہوتی ہے ایک توبہ انابت دوسری توبہء استحیاء۔ توبہ، انابت یہ ہے کہ بندہ عذاب الٰہی کے خوف سے توبہ کرے۔ اور توبہ استحیاء یہ ہے کہ بندہ حق تعالیٰ کے فضل و کرم سے حیا کر کے توبہ کرے۔

لہٰذا خوف الٰہی والی توبہ، جلالِ الٰہی کے کشف سے ہے اور حیا والی توبہ جمالِ الٰہی کے

نظارہ سے ہے۔ یعنی ایک جلالِ الٰہی میں اس کے خوف کی آگ سے جلتا ہے اور دوسرا جمالِ الٰہی میں حیاء وشرم کے نور سے روشن ہوتا ہے۔ ان دونوں میں سے ایک بحالتِ سکر دوسرا بحالتِ صحو ہے۔ اہلِ حیاء اصحاب سکر اور اہلِ خوف اصحابِ صحو سے تعلق رکھتے ہیں۔

پانچواں کشف حجاب
نماز کے بیان میں

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

واقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ	اے مسلمانو! نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔

حضرت اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:۔

الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم	نماز کی حفاظت کرو اور ان چیزوں کی جن کے تم مالک ہو۔

نماز کے معنی باعتبار لغت، ذکر و انقیاد کے ہیں اور فقہاء کے عرف و اصطلاح میں، مقررہ احکام کے تحت مخصوص عبادت ہے۔ جو بفرمانِ الٰہی نمازِ پنجگانہ ہے جنھیں پانچ وقتوں میں ادا کیا جاتا ہے۔ نماز کی فرضیت کے لئے اس کے وقت کا پہلے داخل ہونا شرط ہے۔ نماز کے شرائط میں سے ایک شرط طہارت ہے۔ جو ظاہری طور پر ناپاکی سے اور باطنی طور پر شہوت سے پاک ہونا ہے۔ دوسری شرط لباس کی پاکی ہے ظاہر طور پر نجاست سے اور باطن طور پر اس طرح کہ وہ حلال کمائی سے ہو۔ تیسری شرط جگہ کا پاک ہونا ہے ظاہر طور پر حوادث و آفت سے اور باطنی طور پر فساد و معصیت سے۔ چوتھی شرط استقبال قبلہ ہے ظاہر طور پر خانہ کعبہ کی سمت اور باطنی طور پر عرشِ معلیٰ اور اس کا باطن مشاہدۂ حق ہے۔ پانچویں شرط قیام ہے ظاہری طور پر کھڑے ہونے کی قدرت اور باطنی طور پر قربتِ الٰہی کے باغ میں قیام ہے۔ چھٹی شرط دخول وقت ہے جو ظاہری طور پر شرعی احکام کے مطابق اور باطنی طور پر حقیقت کے درجہ میں ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ اور داخلی شرائط میں سے ایک شرط خلوص نیت کے ساتھ بارگاہِ حق کی طرف متوجہ ہونا ہے اور قیام ہیبت وفنا میں تکبیر کہنا، محل وصل میں کھڑا ہونا، ترتیل وعظمت کے ساتھ قراءت کرنا، خشوع کے ساتھ رکوع کرنا، تذلل و عاجزی کے ساتھ سجدے کرنا، دلجمعی کے ساتھ تشہد پڑھنا، اور فنائے صفت کے ساتھ سلام پھیرنا۔

حدیث پاک میں وارد ہوا کہ:۔

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلي و في جوفه ازيزٌ كا زير المرجل۔	جب نبی کریم ﷺ نماز پڑھتے تو آپ کے بطن میں ایسا جوش اٹھتا جیسے دیگ میں جوش آتا ہے۔

امیر المومنین سیدنا علی مرتضی کرم اللہ وجہہٗ جب نماز کا ارادہ فرماتے تو ان کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا اور فرماتے کہ اس امانت کے ادا کرنے کا وقت آ گیا جس کا بار، زمین و آسمان اٹھانے سے عاجز رہے تھے۔

ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ حضرت حاتم اصم سے میں نے پوچھا آپ نماز کس طرح ادا کرتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا کہ جب اس کا وقت آتا ہے تو ایک ظاہری وضو کرتا ہوں دوسرا باطنی وضو۔ ظاہری وضو پانی سے اور باطنی وضو توبہ سے۔ پھر جب مسجد میں داخل ہوتا ہوں تو مسجد حرام کے روبرو دونوں ابرو کے درمیاں مقام ابراہیم دیکھتا ہوں۔ اور اپنی داہنی جانب جنت کو اور بائیں جانب دوزخ کو دیکھتا ہوں اور خیال کرتا ہوں کہ میرے قدم پل صراط پر ہیں اور ملک الموت میرے پیچھے کھڑا ہے۔ اس حال میں کمالِ عظمت کے ساتھ تکبیر، حرمت کے ساتھ قیام، ہیبت کے ساتھ قراءت، تواضع کے ساتھ رکوع، تضرع کے ساتھ سجدہ، حلم و وقار کے ساتھ جلسہ اور شکر و اطمینان کے ساتھ سلام پھیرتا ہوں۔

طریقت کی نماز

واضح رہنا چاہئے کہ شریعت کے مطابق نماز ایسی عبادت ہے جس کی ابتداء و انتہا میں مریدین راہِ حق پاتے ہیں اور ان کے مقامات کا کشف ہوتا ہے۔ چنانچہ مریدوں کے لئے طہارت، توبہ کا قائمقام، پیروی کا تعلق، قبلہ شناسی کا قائمقام، مجاہدۂ نفس پر قیام، قیام کا قائمقام، ذکرِ الٰہی کی مداومت، قراءت قرآن کا قائم مقام، تواضع، رکوع کا قائمقام، معرفت نفس، سجود کا قائمقام، مقام امن، تشہد کا قائمقام، دنیا سے علیحدگی، سلام کا قائمقام، اور نماز سے باہر آنا مقامات کی قید سے خلاصی کا قائم مقام ہے۔

حضور اکرم ﷺ جب اکل و شرب سے فارغ ہوتے تو کمالِ حیرت کے مقام میں شوق کے طالب ہوتے اور یکسو ہو کر خاص مشرب سے انہماک فرماتے۔ اس وقت آپ فرماتے "ارحنا یا بلال بالصلوٰۃ" اے بلال! نماز کی اذان دے کر ہمیں خوش کرو۔

اس بارے میں مشائخِ طریقت کے بکثرت ارشادات ہیں اور ہر ایک کا خاص مقام اور درجہ ہے۔ چنانچہ ایک جماعت کہتی ہے کہ نماز حضورِ الٰہی کا ذریعہ ہے اور ایک جماعت کہتی ہے کہ نماز غیبت نفس کا ذریعہ ہے۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ جو غائب رہتا ہے وہ نماز میں حاضر ہوتا

ہے۔ایک جماعت کہتی ہے کہ جو حاضر ہوتا ہے وہ نماز میں غائب ہو جاتا ہے۔جس طرح کہ اس جہان میں بحالتِ مشاہدہ محو ہوتا ہے۔ جو گروہ دیدار الٰہی میں رہتا ہے وہ غائب ہو کر حاضر رہتا ہے۔اور جو گروہ حاضر ہوتے ہیں غائب ہو جاتے ہیں۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نماز خدا کا حکم ہے وہ ذریعۂ حضور یا ذریعۂ غیبت نہیں ہے۔ کیونکہ حکم الٰہی کسی چیز کا ذریعہ نہیں ہوتا اس لئے کہ حضور کی علّت، عین حضور اور غیبت کی علّت بھی غیبت ہے اور حکم الٰہی کو کسی چیز کے ساتھ سببی تعلق نہیں ہے۔وجہ یہ ہے کہ نماز اگر حضور کی علّت ہوتی تو چاہئے تھا کہ نماز کے سوا حاضر نہ ہوتا۔اور اگر غیبت کی علّت ہوتی تو غائب، نماز کے ترک سے حاضر ہوتا۔حالانکہ غیبت وحضور کے لئے نماز کی ادائیگی یا اس کا ترک، وسیلہ اور سبب نہیں ہے۔نماز فی نفسہ ایک غلبہ ہے جو غیبت یا حضور پر موقوف نہیں ہے۔ لٰہذا صاحبانِ مجاہدہ اور اہلِ استقامت، بکثرت نمازیں پڑھتے اور اس کا حکم دیتے ہیں۔ چنانچہ بعض بزرگوں نے اپنے مریدوں کو دن ورات میں چار سو رکعات تک کا حکم دیا ہے تاکہ اُن کا جسم عبادت کا عادی بن جائے اور اہلِ استقامت بھی قبولیت حضور کے شکرانہ میں بکثرت نمازیں پڑھتے ہیں۔

باقی رہے صاحبانِ احوال، تو ان کی دو قسمیں ہیں کچھ وہ ہیں جن کی نمازیں کمالِ مشرب میں جمع کے قائم مقام ہیں۔اور اس سے وہ منزلِ جمع پاتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جن کی نمازیں انقطاعِ مشرب میں تفرقہ کے قائم مقام ہیں اور وہ اس سے منزلِ تفرقہ حاصل کرتے ہیں جو حضرات نماز میں منزلِ جمع پاتے ہیں وہ فرائض وسنن کے علاوہ ہمہ وقت نماز میں مشغول رہتے ہیں اور اس کی کثرت کرتے ہیں۔اور جو صاحبانِ تفرقہ ہیں وہ فرائض وسنن کے سوا دیگر نوافل میں کم مشغول رہتے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:۔

جعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ	نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک رکھی گئی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ میری تمام راحتیں نماز میں ہیں۔اسی لئے اہلِ استقامت کا مشرب نمازیں ہیں اس کی صورت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب معراج میں لے جایا گیا اور مقامِ قرب سے سرفراز کیا گیا کہ آپ کا نفس، دل کے درجہ میں، اور دل، روح کے درجہ میں، اور روح، سر کے مقام میں اور سر، مقامات میں فانی، اور مقامات کو محو کر کے نشانوں میں بے نشان، اور مجاہدے سے مشاہدہ

میں غائب کر کے معائنہ سے معائنہ میں اس طرح فائز ہوئے کہ آپ کی بشری صفات ختم ہو گئیں اور نفسانی مادہ فنا ہو کر طبعی قوت بھی باقی نہ رہی اور شواہد ربانی آپ کے اختیار میں رونما ہوئے اور اپنی خودی سے نکل کر معانی کی پنہائیوں میں پہنچے اور دائمی مشاہدے میں مستغرق ہو گئے۔ اور اسرارِ شوق سے بے اختیاری کو اختیار کر کے اللہ تعالیٰ سے مناجات کی کہ اے میرے رب! مجھے بلاؤں کی جگہ واپس نہ کر اور طبع و ہوا کی قید میں دوبارہ نہ ڈال۔ فرمانِ الٰہی ہوا اے محبوب، ہمارا حکم ایسا ہی ہے کہ ہم تمہیں دنیا میں واپس بھیجیں تاکہ تمہارے ذریعہ شریعت کا قیام ہو اور جو کچھ ہم نے تمہیں یہاں عطا فرمایا ہے وہاں بھی مرحمت فرمائیں گے۔ چنانچہ جب آپ دنیا میں تشریف لائے تو جب بھی آپ کا دل اس مقام معلیٰ کا مشتاق ہوتا تو فرماتے "ارحنا یا بلال بالصلوٰۃ" اے بلال نماز کی اذان دے کر ہمیں آرام پہنچاؤ۔ لہٰذا آپ کی ہر نماز معراج و قربت ہوتی اور حق تعالیٰ کی مہربانیوں کو نماز میں دیکھتے، آپ کی روح تو نماز میں ہوتی مگر آپ کا دل نیاز میں آپ کا باطن راز میں اور آپ کا جسم گداز میں ہوتا۔ یہاں تک کہ آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک نماز بن گئی۔ آپ کا جسم ملک دنیا میں ہوتا اور آپ کی روح ملکوت میں۔ آپ کا جسم انسانی ہوتا اور آپ کی جان، انس و محبت کے مقام میں۔ صلے اللہ علیہ والہ وسلم۔

حضرت سہیل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

علامة الصدق ان یکون له تابع من الحق اذا دخل وقت الصلوٰۃ بعثه علیها وینبهه ان کان نائما۔	محب صادق کی پہچان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر ایک فرستادہ مقرر ہوتا ہے کہ جب نماز کا وقت آئے تو وہ بندے کو اس کی ادائیگی پر ابھارے اگر بندہ سوتا ہو تو اسے بیدار کر دے۔

یہ کیفیت حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ میں موجود تھی کیونکہ وہ اپنے عہد کے شیخ تھے جب نماز کا وقت آتا وہ صحت مند ہو جاتے اور جب نماز ادا کر چکتے تو پھر وہی سکر کی حالت طاری ہو جاتی۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ:۔

یحتاج المصلی الی اربعة اشیاء فناء النفس وذهاب الطبع وصفاء السرو کمال المشاهدة۔	نماز پڑھنے والا چار چیزوں کا محتاج ہوتا ہے۔ نفس کی فناء، طبع کا خاتمہ، باطن کی صفائی اور مشاہدہ کا کمال۔

کیونکہ مصلی کے لئے فنائے نفس کے بغیر چارہ نہیں وہ بجز جمع کے ہمت نہیں کرتا اور جب ہمت مجتمع ہو جاتی ہے تو نفس کا اختیار جاتا رہتا ہے کیونکہ اس کا وجود تفرقہ سے ہے۔ جب بیانِ جمع کے تحت نہیں اور طبع کا خاتمہ اثباتِ جلالِ الٰہی کے بغیر نہیں ہوتا۔ کیونکہ جلالِ حق، غیر کو زائل کر دیتا ہے۔ باطن کی صفائی محبت کے تحت ممکن نہیں اور کمالِ مشاہدہ، باطن کی صفائی کے بغیر متصور نہیں۔

حضرت حسین بن منصور حلاج رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے اوپر چار سو رکعات فرض کر رکھی تھیں۔ کسی نے پوچھا اس قدر درجہ کمال رکھتے ہوئے اتنی مشقت کس لئے ہے؟ انھوں نے فرمایا یہ تمام رنج و راحت تمہاری حالت کا پتہ دیتا ہے حق تعالیٰ کے کچھ دوست ایسے ہیں جن کی صفات فنا ہو چکی ہیں ان پر نہ رنج اثر کرتا ہے اور نہ راحت؟ کاہلی کو رسیدگی کا نام نہ دو اور نہ حرص کا نام طلب رکھو۔

ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ کی اقتداء میں نماز پڑھ رہا تھا۔ جب انھوں نے تحریمہ کے وقت اللہ اکبر کہا تو بے ہوش ہو کر گر پڑے گویا کہ جسم میں حس و حرکت ہی نہیں رہی۔

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ جب بوڑھے ہو گئے تو اس بڑھاپے میں جوانی کے کسی ورد کو نہ چھوڑا۔ لوگوں نے عرض کیا اے شیخ اب آپ بوڑھے ہو گئے کمزور ہو گئے ہیں ان میں سے کچھ نوافل چھوڑ دیجئے۔ انھوں نے فرمایا یہی تو وہ چیزیں ہیں جن کو ابتداء میں کر کے اس مرتبہ کو پایا ہے۔ اب یہ ناممکن ہے کہ انتہا پر پہنچ کر ان سے دستبردار ہو جاؤں۔

مشہور ہے کہ فرشتے ہمیشہ عبادت میں رہتے ہیں۔ ان کا مشرب طاعت اور ان کی غذا عبادت ہے اس لئے کہ وہ روحانی ہیں اور ان میں نفس نہیں ہے۔ بندے کے لئے طاعت سے روکنے والی چیز صرف نفس ہے۔ جتنا بھی بندہ نفس کو مغلوب کرے گا اتنا ہی عبادت کی راہ آسان ہو جائے گی اور جب نفس فنا ہو جائے گا تو بندہ کی بھی غذا و مشرب عبادت بن جائے گی۔ جس طرح کہ فرشتوں کے لئے ہے بشرطیکہ فنائے نفس درست ہو۔

حضرت عبداللہ بن مبارک علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں کہ مجھے وہ عورت خوب یاد ہے جسے میں نے بچپن میں دیکھا جو بہت عبادت گذار تھی بحالت نماز بچھو نے اس عورت کے چالیس مرتبہ ڈنک مارا مگر اس کی حالت میں ذرہ برابر تغیر نہ ہوا۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئی تو میں نے کہا اے اماں! اس بچھو کو تم نے کیوں نہیں ہٹایا؟ اس نے کہا اے فرزند! تو ابھی بچہ ہے۔ یہ کیسے جائز تھا۔ میں اپنے رب کے کام میں مشغول تھی۔ اپنا کام کیسے کرتی؟

حضرت ابوالخیر قطع رحمتہ اللہ علیہ کے پاؤں میں آکلہ تھا۔ طبیبوں نے مشورہ دیا کہ یہ پاؤں کٹوا دینا چاہیے۔ مگر وہ راضی نہ ہوئے۔ آپ کے مریدوں نے طبیبوں سے کہا نماز کی حالت میں ان کا پاؤں کاٹ دیا جائے، کیونکہ اس وقت انھیں اپنی خبر نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جب نماز سے فارغ ہو کر دیکھا تو پاؤں کو کٹا ہوا پایا۔

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ جب آپ رات کو نماز پڑھتے تو قر[illegible]ت آہستہ کرتے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بلند آواز سے قر[illegible]ت کرتے تھے نبی کریم ﷺ نے دریافت فرمایا کہ اے ابوبکر تم آہستہ کیوں پڑھتے ہو؟ عرض کیا "یسمع من انا جی" جس سے مناجات کرتا ہوں وہ سنتا ہے۔ خواہ آہستہ کروں یا بلند۔ پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا کہ تم کیوں بلند آواز سے پڑھتے ہو؟ عرض کیا "اوقظ الوسنان واطرد الشیطان" "میں سوتے ہوؤں کو جگاتا ہوں اور شیطان کو بھگاتا ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا اے ابوبکر تم کچھ بلند آواز سے پڑھو اور اے عمر! تم کچھ آہستہ آواز سے اپنی اپنی عادت کے برخلاف پڑھو۔ اسی بنا پر بعض مشائخ فرائض کو ظاہر کر کے پڑھتے اور نوافل کو چھپا کر۔ اس میں ان کی مصلحت یہ ہوتی ہے کہ ریا و نمود سے پاک رہیں۔ کیونکہ جب کوئی ریاکاری کرتا ہے اور لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے تو وہ ریاکار بن جاتا ہے۔ مشائخ فرماتے ہیں کہ ہم اگرچہ اپنے معاملات کو نہیں دیکھتے مگر لوگ تو دیکھتے ہیں۔ یہ بھی تو ریاکاری ہے۔ لیکن مشائخ کی ایک جماعت فرائض اور نوافل سب کو ظاہر کر کے پڑھتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ریا باطل ہے اور طاعت حق ہے اور یہ محال ہے کہ باطل کی خاطر حق کو چھپایا جائے۔ لہٰذا ریا کو دل سے نکال دینا چاہیے اور جس طرح جی چاہے عبادت کرنی چاہیے۔

مشائخ طریقت نے نماز کے حقوق و آداب کی محافظت فرمائی ہے اور مریدوں کو اس فرض کی ادائی کا حکم دیا ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں نے چالیس سال سیاحت کی ہے لیکن میری کوئی نماز جماعت سے خالی نہیں ہے۔ اور ہر جمعہ میں نے کسی نہ کسی شہر ہی میں گزارا ہے۔

نماز کے احکام میری حد و شمار سے باہر ہیں۔ اس لئے نماز کی محبت کے مقامات کے ساتھ ہی محبت کے احکام پر بھی روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

سولہواں باب

محبت کا بیان

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

یا ایھا الذین اٰمنوا من یرتد منکم عن دینہ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم ویحبونہ" الآیہ	اے ایمان والو! تم میں سے جو بھی حق تعالےٰ کے دین سے پھر جائے تو اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو لے آئے گا جو خدا کو محبوب رکھیں گے اور خدا ان کو محبوب رکھے گا۔

نیز فرمایا

ومن الناس من یتخذ من دون اللہ اندادا یحبونھم کحب اللہ والذین امنوا اشد حبا لِلّٰہ۔ الآیہ	کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو شریک گردانتے اور خدا کی محبت کے مانند ان سے محبت کرتے ہیں لیکن جو ایمان والے ہیں ان کی محبت اللہ تعالیٰ سے بہت ہے۔

حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:۔

من اھان لی ولیا فقد بارزنی بالمحاربۃ۔ الحدیث

جس نے میرے ولی کی اہانت کی بلاشبہ اس نے مجھ سے جنگ کرنے کی جسارت کی اور میں کسی چیز میں تردد نہیں کرتا جیسا کہ بندے کی جان قبض کرنے میں تردد کرتا ہوں بندہ موت کو مکروہ جانتا ہے اور میں اس کی بدی کو مکروہ جانتا ہوں حالانکہ موت اس کے لئے لابد ہے اور ادائے فرض سے بڑھ کر کوئی چیز پیاری نہیں جو میرے بندے کو مجھ سے قریب کرے۔ بندہ ہمیشہ ادائے نوافل کے ذریعہ میری نزدیکی چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اسے محبوب بنالیتا ہوں۔ جب وہ میرا محبوب ہو جاتا ہے تو میں اس کے کان، آنکھ، ہاتھ پاؤں اور زبان بن جاتا ہوں۔

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کے دیدار کو محبوب رکھتا ہے وہ بھی اس کی ملاقات کو محبوب رکھتا ہے اور جو اللہ کے دیدار کو مکروہ سمجھتا ہے اللہ اس کے ملنے کو مکروہ رکھتا ہے۔

نیز فرمایا جب خدا کسی بندے کو محبوب بنالیتا ہے تو جبریل امین سے فرماتا ہے اے

جبریل میں نے فلاں بندے کو محبوب بنالیا ہے تم بھی اس سے محبت کرو۔ چنانچہ جبریل بھی اس کو محبوب سمجھنے لگتے ہیں اس کے بعد جبریل آسمان والوں سے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں بندے کو محبوب بنالیا ہے۔ اے آسمان والو تم بھی اسے محبوب سمجھو۔ پھر وہ زمین والوں سے فرماتے ہیں کہ زمین والے بھی اسے محبوب سمجھنے لگتے ہیں۔ واضح رہنا چاہئے کہ خدا کی محبت بندے کے لئے اور بندے کی محبت خدا کے لئے ضروری ہے کتاب وسنت اور اجماع امت اس پر شاہد وناطق ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے دوستوں کو محبوب رکھتا ہے اور محبوبانِ خدا اسے دوست رکھتے ہیں۔

اھلِ لغت کہتے ہیں کہ محبت حبہ سے ماخوذ ہے اور حبہ کے معنی تخم کے ہیں جو زمین پر گرتا ہے۔ لہٰذا حب کا نام حُب رکھا گیا۔ چنانچہ اصلِ حیات اسی میں ہے۔ جس طرح اشجار ونباتات میں ہے حب یعنی تخم ہے جس طرح میدان میں بیج کو بکھیرا جاتا ہے اور مٹی میں چھپایا جاتا ہے پھر اس پر پانی برستا ہے آبیاری کی جاتی ہے۔ سورج چمکتا ہے گرم وسرد موسم گزرتا ہے۔ لیکن زمانہ کے تغیرات اسے نہیں بدلتے جب وقت آتا ہے تو وہ تخم اُگتا ہے۔ پھل وپھول دیتا ہے اسی طرح جب محبت کا بیج دل میں جگہ پکڑتا ہے تو اسے حضور وغیبت، بلا وابتلاء، مشقت، راحت ولذت اور فراق ووصال کوئی چیز نہیں بدل سکتی۔ اسی معنی میں کسی کا شعر ہے

یا من سقام جنونه لسقام عاشقه طبیب،

جارت المؤده فاستویٰ عندی حضورك والمغیب

اے اس کی دیوانگی کا مرض اس کے عاشق کی بیماری کے لئے طبیب ہے

محبت کی برقراری میں میرے نزدیک تیرا حضور اور غیبت برابر ہے

نیز اہلِ لغت یہ بھی کہتے ہیں کہ محبت، حب سے مشتق ہے اور حَب وہ دانہ ہے جس میں پانی بکثرت ہو اور اوپر سے وہ ایسا محفوظ ہو کہ چشموں کا پانی اس میں داخل نہ ہو سکے۔ یہی حال محبت کا ہے کہ جب وہ طالب کے دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے تو اس کا دل اس سے پر ہو جاتا ہے پھر اس دل میں محبوب کے کلام کے سوا کوئی جگہ نہیں رہتی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب خلعت خلت سے سرفراز فرمایا تو وہ صرف کلام حق کے ہو کر رہ گئے۔ یہ جہان اور جہان والے سب ان کا حجاب بن گئے۔ اور وہ حق تعالیٰ کی محبت میں حجابات کے دشمن ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے حال وقال کی ہمیں خبر دیتے ہوئے فرمایا ہے:۔

فانہم عدولی الارب العالمین	یہ سب میرے دشمن ہیں بجز رب العالمین کے

حضرت شبلی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ:۔

سمیت المحبۃ لانہا تمحو من القلب ماسوی المحبوب	محبت اسی لئے نام رکھا گیا ہے کہ وہ دل سے محبوب کے ماسوئی کو مٹا دیا ہے۔

ایک معنی یہ بھی بیان کئے گئے ہیں کہ حُب ان چار لکڑیوں کا نام ہے جو باہم جڑی ہوئی ہوں۔ جس پر آفتابہ رکھا جاتا ہے یعنی تپائی وغیرہ۔ لہٰذا حُب اسی لئے کہتے ہیں کہ محبت کرنے والا، محبوب کی عزت وذلت، رنج وراحت بلاؤ مشقت اور جفا ووفا کو برداشت کرتا ہے۔ اور یہ باتیں اس پر گراں نہیں گزرتیں۔ اس کا وہی کام ہوتا ہے جو مذکورہ تپائی وغیرہ کا ہوتا ہے۔ اسی کی مانند وہ بھی بوجھ اٹھاتا ہے لہذا محبؔ کی خلقت میں ہی محبوب کے بوجھ کو اٹھانا ہے۔ اسی معنی میں یہ شعر ہے

ان شئت جودی وان شئت فامتنعی
کلاھما منك منسوب الی الکرم

اگر تو چاہے تو مجھ پر احسان کرے اور اگر تو چاہے تو مجھے منع کر دے۔
دونوں باتیں تیرے کرم سے منسوب ہیں۔

ایک معنی یہ بھی بیان کئے گئے ہیں کہ محبت، حبوب سے ماخوذ ہے جو حبہ کی جمع ہے اور حبہ وہ دل ہے جو لطائف کا نام اور ان کے قیام کی جگہ ہے۔ اسی لئے محبت کا نام حب رکھا گیا یہ تسمیہ حال باسم محل ہے اور اہلِ عرب کا رواج ہے کہ چیز کا نام اس کے مقام کے موافق رکھ دیتے ہیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ حباب سے ماخوذ ہے جس کے معنی پانی کے جوش کے ہیں۔ اور شدید بارش میں پانی کے بلبلے جو اٹھتے ہیں۔ اسی لئے محبت نام رکھا گیا ہے:۔

لان غیثان القلب عند الاشتیاق الٰی لقاء المحبوب۔ دوست کا دل دوست کے دیدار کے اشتیاق میں ہمیشہ مضطرب رہتا ہے۔ جس طرح اجسام رُوح کی مشتاق ہیں یا جسم کا قیام روح کے ساتھ ہے اسی طرح دوستی کا قیام محبت کے ساتھ ہے اور محبت کا قیام محبوب کے وصال اور اس کی رویت میں ہے۔ اسی معنی میں یہ شعر ہے

اذا تمنّٰی الناس روحا و راحۃ،
تمنیت ان القاك یا عزیز حالیا

جس وقت لوگوں نے خوشی وراحت کی تمنا کی۔

تو اے عزیز میں نے یہ خواہش کی کہ میں تجھے ہر کام سے
فارغ کردوں یعنی تیرا سارا بوجھ میں خود اٹھالوں۔

یہ بھی کہتے ہیں کہ حب ایسا نام ہے جو محبت کی صفائی کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ اسی لئے اہلِ عرب، انسان کی آنکھ کی سفیدی کی صفائی کو "حبة الانسان" کہتے ہیں۔ جس طرح دل کے نکتہ کی صفائی کو حبۃ القلب کہتے ہیں۔ دل کا نکتہ محبت کی جگہ اور آنکھ کی سفیدی دیدار کا مقام ہے۔ اسی معنی میں یہ مقولہ ہے کہ دل اور آنکھ دوستی میں مقارن و متصل ہیں۔ اور اسی معنی میں یہ شعر ہے۔

القلب یحسد عینی لذت النظر
والعین یحسد قلبی لذت الفکر
دل اس پر رشک کرتا ہے کہ آنکھ کو لذت دیدار ملی۔
اور آنکھ اس پر رشک کرتی ہے کہ دل کو لذت فکر ملی۔

استعمالِ محبت میں علماء کے خیالات واضح رہنا چاہئے کہ استعمالِ محبت میں علماء کے تین خیال ہیں ایک یہ کہ محبوب سے ایسی ارادت ہو کہ نفس کو قطعی چین حاصل نہ ہو۔ اور نہ دل کو تمنا و خواہش اور میلان وانسیت ہو۔ ان معانی کا تعلق ذاتِ قدیم اللہ تبارک وتعالیٰ پر جائز نہیں ہے یہ تمام تعلقات صرف مخلوق ہی کے لئے ہیں اور وہی ایک دوسرے کے ہم جنس ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان معانی سے مستغنی اور برتر ہے۔

دوسرا خیال بمعنیِ احسان ہے۔ یہ اس بندے کے ساتھ خاص ہے جسے اللہ تعالےٰ برگزیدہ کرکے ولایت کے کمال پر فائز کردے اور اسے گوناگوں الطاف واکرام سے نوازے۔

تیسری صورت بندے پر خوبی کی تعریف کے معنی میں ہے۔ متکلمین کی ایک جماعت کہتی ہے کہ قرآن وحدیث میں حق تعالیٰ کی جس محبت کی خبر ہمیں دی گئی ہے وہ تمام سماعی صفات سے تعلق رکھتی ہے۔ مثلاً دید، استوی کی کیفیت وغیرہ۔ اگر کتاب وسنت ان پر ناطق نہ ہوتے تو ان کا وجود، ازروئے عقل حق تعالیٰ کے لئے محال ہوتا۔ لہٰذا ہم اسی کی شان کے لائق محبت کا اثبات کرتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں نیز اس میں عقل کے ذریعہ تصرف کرنے سے توقف کرتے ہیں۔ متکلمین کی اس وضاحت سے مراد یہ ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے لئے اس لفظ کا اطلاق ازروئے عقل جائز نہیں جانتے محبت کے معنی میں اقوال علماء بیان کرنے کے بعد اس کی حقیقت کو بیان کرنا شروع کرتا ہوں۔

محبت کی حقیقت واضح رہنا چاہئے کہ بندے کے لئے حق تعالیٰ کی محبت کا مطلب، اس کی طرف سے بھلائی کا ارادہ ہے وہ بندے پر رحم فرماتا ہے اور ارادے کے ناموں میں سے ایک نام محبت بھی ہے جیسے رضا، ناراضگی، رحمت اور مہربانی وغیرہ ہیں۔ ان اسماء صفات کو بھی حق تعالےٰ کے ارادہ کے سوا پر محمول نہ کرنا چاہئے۔ یہ حق تعالیٰ کی ایک قدیم صفت ہے کہ اس نے اپنے افعال کو ان اوصاف کے ساتھ یاد فرمایا ہے۔ لہٰذا حکمِ مبالغہ اور اظہارِ فعل میں بعض، بعض سے اخص ہے۔

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی محبت بندوں کے حق میں یہ ہے کہ اس پر نعمت کی ارزانی فرمائے اور دنیا و آخرت میں اجر و ثواب عطا فرما کر مقام سزا سے اسے محفوظ رکھے۔ اور اسے ارتکاب معاصی سے بچا کر و قیع احوال اور مقامات علیا سے سرفراز فرمائے۔ اس کے باطن کو اغیار کے التفات سے پاک وصاف کر کے ازلی عنایات کا مستحق بنائے۔ یہاں تک کہ بندہ ہر ایک سے کنارہ کش ہو کر خالص رضائے الٰہی کو ملحوظ رکھنے لگے۔ حق تعالےٰ جب بندے کو ان معانی میں مخصوص فرمالیتا ہے تو اس کے ارادۂ تخصیص کا نام محبت رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ مذہب حضرت حارث محاسبی، حضرت جنید بغدادی اور دیگر مشائخ عظام کا ہے اور فریقین کے اکثر فقہاء اور متکلمینِ اہلِ سنت کا مذہب بھی یہی ہے۔ لیکن وہ حضرات جو یہ کہتے ہیں کہ حق تعالےٰ کی محبت کے معنی، ثنائے جمیل ہے۔ جو بندے پر لازم ہے۔ اس کی ثنا اس کا کلام ہے اس کا کلام غیر مخلوق ہے اور غیر مخلوق کو مخلوق کے ساتھ کیسے ملایا جاسکتا ہے۔

وہ حضرات جو یہ کہتے ہیں کہ محبت کے معنی احسان کے ہیں اور حق تعالیٰ کا احسان اس کا فعل ہے۔ معنی کے لحاظ سے یہ اقوال قریب قریب ہیں اور سب کا حکم یکساں ہے۔

لیکن بندے کی محبت، اللہ تعالیٰ کے لئے۔ تو یہ ایک ایسی صفت ہے جو فرمان بردار مومن کے دل میں ظاہر ہوتی ہے۔ جس کے معنی تعظیم و تکریم بھی ہیں یہاں تک کہ وہ محبوب کی رضا کو طلب کرتا اور اس کی رویت کی طلب میں بے خبر ہو کر اس کی قربت کی آرزو میں بے چین ہو جاتا ہے اور اسے اس کے بغیر چین و قرار حاصل ہوتا ہی نہیں۔ اس کی عادت اس کے ذکر کے ساتھ ہو جاتی ہے اور وہ غیر کی یاد اور غیر کے ذکر سے نفرت کرنے لگتا ہے کیونکہ غیر کے ساتھ راحت حرام ہے اور محبّ سے سکون و قرار جاتا رہتا ہے وہ تمام طبعی رغبتوں سے جدا ہو کر اپنی خواہشات سے کنارہ کش ہو جاتا ہے وہ غلبۂ محبت کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے اور خدا کے حکم کے آگے سر جھکا دیتا ہے اور اسے کمالِ اوصاف کے ساتھ پہچاننے لگتا ہے۔

یہ جائز نہیں کہ مخلوق کے ساتھ خالق کی محبت، لوگوں کی باہمی محبت کی جنس سے ہوتا کہ لوگوں کے مانند محبوب کی محبت کا ادراک اور احاطہ کر سکیں۔ یہ صفت تو جسموں کی ہے اور اللہ تعالیٰ جسم و جسمانیت سے پاک ہے لہٰذا محبوبانِ خدا، اس کی قربت کے مارے ہوئے ہوتے ہیں نہ کہ اس کی کیفیت کے طلب گار۔ اس لئے کہ طالب، فی نفسہ محبت میں قائم ہوتے ہیں اور قربت کے مارے ہوئے تو محبوب کے ساتھ قائم ہوتے ہیں۔ جس قدر وہ محبوب ہوتے ہیں اتنے ہی محبت کی رزمگاہ میں وہ ہلاک و مغلوب ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ محدث قدیم کے ساتھ اس وقت ہوتا ہے جب قدیم، محدث پر غلبہ فرمائے۔ جو محبت کی حقیقت کو پہچانتا ہے اسے کسی قسم کا ابہام اور شبہ نہیں ہوتا۔

محبت کی قسمیں

محبت کی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ جنس کی محبت دوسرے ہم جنس کے ساتھ ہو ایسی محبت میلانِ طبع اور نفس پرستی کہلاتی ہے ایسا طالب، محبوب کی ذات کا عاشق اور اس پر فریفتہ ہوتا ہے۔

دوسری قسم یہ کہ ایک جنس کی محبت کسی غیر جنس کے ساتھ ہو۔ ایسی محبت اپنے محبوب کی کسی صفت پر سکون و قرار حاصل کرنا ہوتا ہے تاکہ وہ اس خوبی سے راحت پائے۔ اور انس حاصل کرے۔ مثلاً محبوب کا کلام سننا یا اس کے دیدار کا خواہاں ہونا وغیرہ وغیرہ۔

حق تعالیٰ سے محبت رکھنے والے حضرات دو طرح کے ہیں۔ ایک تو وہ جنھوں نے اپنے اوپر حق تعالیٰ کا انعام و احسان دیکھا اور اس کے دیکھنے کی وجہ سے منعم و محسن کی محبت کے متقاضی ہوئے۔ دوسرے وہ جو تمام احسانات و انعام کو غلبہء محبت میں مقامِ حجاب تصور کرتے ہیں اور نعمتوں پر نظر کرنے کی بجائے ان کا طریق، نعمت دینے والے کی طرف ہوتا ہے۔ یہ مقام پہلے کے مقابلہ میں بہت ارفع ہے۔ واللہ اعلم۔

محبت میں مشائخ کا طریق

محبت کا مفہوم و معنی، تمام لوگوں کے درمیان معروف اور تمام زبانوں میں مشہور و مستعمل ہے۔ اور کوئی صاحبِ عقل و فہم اس کی کیفیت کو اپنے اوپر چھپا نہیں سکتا۔ طریقت کے مشائخ میں سے حضرت سمنون المحب رحمتہ اللہ علیہ تو محبت میں خاص مذہب و مشرب رکھتے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ محبت تو راہِ خدا کی اساس و بنیاد ہے اسی پر تو تمام احوال و مقامات اور منازل کی بنا ہے اور ہر منزل و محل میں خواہ طالب کہیں گامزن ہو اس کا اس سے زوال ممکن ہے لیکن حق تعالیٰ کی محبت کے مقام میں اس کا زوال ممکن نہیں۔ جب تک وہ اس راہ میں

موجود ہے کسی حال میں اس سے زوال جائز نہیں''۔ اس مسئلہ میں تمام مشائخ ان کے مذہب کی موافقت کرتے ہیں لیکن چونکہ یہ نام عام تھا اور انھوں نے چاہا کہ عام لوگوں سے ان معانی کو مخفی رکھا جائے اس لئے انھوں نے اس کے معنی کے وجود کے تحقق میں یہ نام بدل دیا۔ چنانچہ کسی نے صفائے محبت کا نام صفوت رکھا ہے اور محبّ کو صوفی کہنے لگے اور کسی نے محبّ کو ترک اختیار، اور محبوب کے اثباتِ اختیار کا نام، فقر رکھا اور محبّ کو فقیر کہنے لگے۔ کیونکہ محبت کا ادنیٰ درجہ، موافقت ہے اور محبوب کی موافقت، اس کی مخالفت کی ضد ہوتی ہے۔ شروع کتاب میں فقر و صفوت کے معنی کی وضاحت کی جا چکی ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ:۔

الحب عند الزهاد اظهر من الاجتهاد۔	زاہدوں کے نزدیک محبت، اجتہاد سے زیادہ ظاہر ہے۔

محبت کے سلسلہ میں یہ مقولے عام زبان زد ہیں۔

"عند التائبین اوجد من انین وحنین"۔	توبہ کرنے والوں کے نزدیک نالہ وفغاں سے زیادہ ظاہر ہے۔
"و عند الاتراك اشهر من الفتراك"۔	ترکوں کے نزدیک، شکار بند سے زیادہ مشہور ہے۔
"و سبی الحب عند الهنود اظهر من سبی المحمود و رحم و لهب"۔	ہندوؤں کے نزدک محبوب و محبّ کا قصہ غزنوی کی قید یا اس کی مہربانی یا اس کی سختی سے زیادہ ظاہر ہے۔
"قصة الحب والحبیب عند الروم اشهر من الصلیب"۔	رومیوں کے نزدیک محبوب و محبّ کا قصہ، صلیب سے زیادہ مشہور ہے۔
"قصة الحب فی العرب ادب فی کل حیی منه طرب او ویل و هرب و حزن"۔	عرب کے ہر قبیلہ کا ادب، محبت کا قصہ ہے جو خوشی، رنج، افسوس، جنگ اور غم سے زیادہ پیارا ہے۔

ان مقولوں کے بیان کرنے کا مقصد، یہ بتانا ہے کہ انسانوں میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جسے حالتِ غیبت میں، محبت سے واسطہ نہ پڑا ہو۔ اور اُن کے دل محبت سے خالی رہے ہوں۔ خواہ وہ خوشی میں سرشار ہوں یا شراب میں بدمست؟ یا اس کے غلبہ میں مخمور انسان کا دل جوش اور بے

قراری سے مرکب ہے اور عقل کا دریا محبت کی شراب ہے جو دل کے لئے اسی طرح ضروری ہے جس طرح جسم کے لئے خوراک۔ جو دل محبت سے خالی ہو وہ دل برباد و ویران ہے۔ تکلف میں محبت دور کرنے یا اس کے حاصل کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ محبت کے لطائف جو دل پر وارد ہوتے ہیں نفس کو اس کی کچھ خبر نہیں ہوتی۔

حضرت عمرو بن عثمان مکی رحمتہ اللہ علیہ "کتاب محبت" میں فرماتے ہیں کہ اللہ نے قلوب کو ان کے اجسام سے سات ہزار سال قبل پیدا فرمایا اور انھیں اپنے قرب خاص میں رکھا۔ اس کے بعد محبت کے درجہ میں رکھا۔ پھر ان کے باطن کو ان کے اجسام سے سات ہزار سال قبل پیدا کیا اور انھیں وصل کے درجہ میں رکھا اور روزانہ تین سو ساٹھ مرتبہ ظہور جمال سے باطن کو تجلی بخشی اور تین سو ساٹھ مرتبہ نظرِ کرامت ڈالی پھر محبت کا کلمہ سنایا اور تین سو ساٹھ مرتبہ دلوں پر انس و محبت کے لطائف ظاہر کئے یہاں تک کہ انھوں نے ساری کائنات پر نظر ڈالی تو کسی مخلوق کو اپنے سے زیادہ صاحبِ کرامت نہ پایا۔ اس بنا پر ان میں فخر و غرور پیدا ہوا اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان سب کا امتحان لیا اور باطن کو جسم میں مقید کر کے روح کو دل میں محبوس کیا اور دل کو جسم میں رکھا پھر عقل کو ان میں شامل کیا اور انبیاء علیہم السلام کو بھیج کر انھیں حکم دیا۔ اس کے بعد جو اپنے مقام کا متلاشی ہوا حق تعالےٰ نے اسے نماز کا حکم دیا تا کہ جسم تو نماز میں ہو اور دل محبتِ الٰہی میں اور جان قربت کا مقام حاصل کرے اور باطن وصالِ حق سے سکون و قرار پائے۔

غرضکہ یہ سب محبت کی تعبیرات ہیں نہ کہ عینِ محبت، اس لئے کہ محبت حال ہے اور حال کو کسی صورت الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اگر سارا جہان مل کر بھی چاہے کہ محبت کو حاصل کرے تو حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر سب مل کر چاہیں کہ اسے اپنے سے دور کر دیں تو بھی ممکن نہیں۔ کیونکہ یہ عطیہ اور موہبۂ ربی سے متعلق ہے۔ نہ کہ کسب و اختیار سے؟ اسی طرح اگر سارا جہان یہ چاہے کہ محبت اس میں آ جائے تو یہ بھی ممکن نہیں ہے اور اگر وہ سب مل کر یہ چاہیں کہ اسے اپنے سے محدود کر دیں تو وہ یہ بھی نہیں کر سکتے کیونکہ یہ خدا کا امر ہے اور آدمی لاہی یعنی کھلنڈرا ہے، لاہی کو الٰہی کا ادراک نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم۔

استعمالِ عشق پر مشائخ کے اقوال

لفظ عشق کے استعمال کے سلسلہ میں مشائخ کے بکثرت اقوال ہیں چنانچہ ایک جماعت کا یہ نظریہ ہے کہ بندہ کو حق تعالیٰ کا عشق ہو سکتا ہے لیکن حق تعالےٰ کو کسی سے عشق ہو یہ سمجھنا جائز نہیں ہے۔ یہ جماعت یہ بھی کہتی ہے کہ عشق ایسی صفت ہے

جو اپنے محبوب سے روکا گیا ہو۔ چونکہ بندہ کو حق تعالیٰ سے روکا گیا ہے اور حق تعالیٰ بندہ سے رُکا ہوا نہیں ہے اس لئے بندہ پر تو عشق کا استعمال جائز ہے لیکن حق تعالیٰ کے لئے اس کا استعمال جائز نہیں ہے۔

ایک جماعت کا نظریہ ہے کہ بندہ کا حق تعالیٰ پر عاشق ہونا بھی جائز نہیں ہے اس لئے کہ حد سے بڑھ جانے کا نام عشق ہے اور حق تعالیٰ محدود نہیں ہے۔

صوفیائے متاخرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا عشق دونوں جہان میں درست نہیں ہوسکتا البتہ ادراک ذات کا عشق ممکن ہے مگر حق تعالیٰ کی ذات مدرک نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی کسی صفت کے ساتھ ہی عشق و محبت درست ہوسکتا ہے اس کی ذات کے ساتھ درست نہیں ہوسکتا ہے۔

نیز صوفیاء فرماتے ہیں کہ عشق، دیدار کے بغیر حاصل نہیں ہوتا البتہ محض سماعت کے ذریعہ محبت جائز ہوسکتی ہے۔ چونکہ عشق کا تعلق نظر سے ہے اور یہ حق تعالیٰ پر ممکن نہیں کیونکہ دنیا میں کسی نے اس کو نہیں دیکھا۔ جب حق تعالیٰ سے یہ بات ظاہر ہوئی تو ہر ایک اس کا دعویٰ کرنے لگتا کیونکہ خطاب میں سب برابر ہیں۔ چونکہ ذاتِ حق غیر مدرک و غیر محسوس ہے تو اس کے ساتھ عشق کرنا کیسے درست ہوسکتا ہے البتہ حق تعالیٰ نے اپنی صفات و افعال کے ساتھ جب اپنے اولیاء پر احسان و کرم فرمایا تو بایں وجہ صفات کے ساتھ محبت کرنا درست ہوجاتا ہے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت میں ان کے صدمہ فراق سے وارفتہ ہوگئے تھے۔ جب انھوں نے ان کی قمیض مبارک پائی تو ان کی چشم مبارک میں نور آ گیا اور جب زلیخا کو عشق یوسفی نے مارا تو جب تک انھیں ان کا وصال نصیب نہ ہوا آنکھیں روشن نہ ہوئیں حالانکہ یہ عجیب معاملہ ہے کہ ایک یعنی زلیخا خواہش نفسانی کی پرورش کرتی ہے اور دوسرا یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام ہر خواہش کو فنا کردیتے ہیں۔

صوفیاء کی ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ چونکہ عشق کی کوئی ضد نہیں ہے اور حق تعالیٰ کی بھی کوئی ضد نہیں ہے لہٰذا اسے زیبا ہے کہ اس پر یہ جائز ہو۔ اسی سلسلہ میں بکثرت لطائف ہیں اور دقائق ہیں۔ بخوف طوالت انھیں چھوڑتا ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تحقیق محبت میں مشائخ کے رموز

محبت کی تحقیق میں مشائخ طریقت نے بکثرت رموز و اشارات بیان کئے ہیں بطور تبرک چند بیان کرتا ہوں۔ سب کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

حضرت استاذ ابوالقاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

المحبۃ محو المحب بصفاتہ و اثبات المحبوب بذاتہ	محبت یہ ہے کہ وہ اپنی تمام صفتوں کو محبوب کی طلب اور اس کی ذات کے اثبات میں فنا کر دے۔

مطلب یہ ہے کہ محبوب باقی ہو اور محبت فانی اور محبوب کی بقا کے لئے محبت کی غیرت کو اس حد تک نفی کرے کہ محبت ہی کا تصرف رہ جائے اور محبّ کے اوصاف کی فنا، ذاتِ محبوب کے اثبات کے سوا نہ رہے۔ چونکہ یہ جائز ہی نہیں ہے کہ محبّ اپنے صفات کے ساتھ قائم رہے۔ اگر وہ اپنی صفات میں قائم رہے گا تو جمالِ محبوب سے محروم رہے گا۔ جب کہ محبّ یہ جانتا ہے کہ اس کی ذات، جمالِ محبوب سے وابستہ ہے تو وہ بدیہی طور پر اپنی صفات کی برقراری کی نفی کرے گا۔ کیونکہ اسے معلوم ہے کہ جب تک اپنی صفات قائم ہیں وہ محبوب سے محجوب رہے گا لہذا وہ دوست و محبوب کی محبت میں اپنا دشمن رہے گا۔

مشہور ہے کہ حضرت حسین بن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ جب دار پر چڑھائے گئے تو ان کا آخری کلام یہ تھا کہ "حب الواحد افراد الواحد لہ" محبّ کے لئے یہ کتنا خوشی کا مقام ہے کہ اپنی ہستی کو راہِ محبت میں فنا کر دے۔ اور نفس کا اختیار محبوب کے پانے میں صرف کر کے خود کو فنا کر دے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

المحبۃ استقلال الکثیر من نفسک واستکثار القلیل من حبیبک"	محبت یہ ہے کہ اپنے بہت کو تھوڑا جانے اور محبوب کے تھوڑے کو بہت جانے

بندے کے لئے یہ معاملہ حق ہے اسلئے کہ دنیا میں جس قدر نعمتیں اسے دی گئی ہیں حق تعالیٰ نے ان کو تھوڑا فرمایا ہے چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے:۔

قل متاع الدنیا قلیل۔	اے محبوب تم کہہ دو یہ دنیاوی نعمتیں تو تھوڑی ہیں۔

لیکن قلیل زندگی، قلیل جگہ اور قلیل سامان کے ساتھ ان کے قلیل ذکر الٰہی کو بہت فرمایا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:۔

والذاکرین اللہ کثیرا والذاکرات۔	مرد و عورت خدا کا بہت ذکر کرنے والے ہیں۔

حضرت بایزیدؒ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ لوگ اس حقیقت کو جان لیں کہ حقیقی محبوب

اللہ تعالےٰ ہی ہے۔ یہ صفت غیر کے لئے موزوں نہیں ہے۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے جتنا بھی بندہ کو پہنچے وہ تھوڑا نہیں ہوسکتا اور بندے کی طرف سے جتنا بھی اس کی طرف جائے وہ تھوڑا ہی ہے۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

المحبۃ معانقۃ الطاعات ومباینۃ المخالفات۔	محبت یہ ہے کہ محبوب کی طاعتوں میں ہی ہم آغوش رہے اور اس کی مخالفتوں سے ہمیشہ بچتا رہے۔

کیونکہ دل میں جس قدر محبت زیادہ ہوگی۔ محبت کا حکم محبّ کے لئے اتنا ہی زیادہ آسان ہوگا۔ یہ ملحدوں کے اس گروہ کا رد ہے جو یہ کہتا ہے کہ بندہ محبت میں اس کمال تک پہنچ جاتا ہے کہ اس سے طاعتیں اٹھ جاتی ہیں۔ حالانکہ یہ خالص زندیقی اور بے دینی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ عقل کی درستگی کی حالت میں بندے سے احکام مکلفہ ساقط ہوجائیں۔ وجہ یہ ہے کہ امت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی شریعت ہرگز منسوخ نہ ہوگی۔ اور عقل کی درستگی کی حالت میں جب کسی ایک سے بھی طاعت کے اُٹھ جانے کو مانا جائے گا تو سب سے اُٹھ جانا بھی جائز و ممکن بن جائے گا۔ یہ بات خالص بے دینی کی ہے۔ البتہ مغلوب الحال یا پاگل دیوانے کا حکم مختلف ہے۔ اور اس کا عذر جداگانہ ہے۔ البتہ یہ بات جائز ہے کہ محبت الٰہی میں بندہ اس کمال تک پہنچ جائے کہ اسے طاعت کی بجا آوری میں تکلف و مشقت معلوم نہ ہو؟ اس لئے کہ حکم کی کلفت، حکم والے سے محبت رکھنے کی مقدار کے مطابق معلوم ہوتی ہے اس سے قبل جتنی زیادہ محبت ہوگی اتنی ہی اس کے احکام کی بجا آوری آسان ہوگی۔ یہ معنی حضور اکرم ﷺ کے مبارک حال میں ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ”لعمرك“ اے محبوب، آپ کی زندگی کی قسم، آپ نے شبانہ روز اس کثرت سے عبادت کی کہ تمام مشاغل سے دست کش ہوگئے اور آپ کے قدم ناز ورم کر آئے اس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

طٰہٰ ما انزلنا علیك القرآن لتشقی۔	اے محبوب ہم نے یہ قرآن اس لئے نہیں اتارا کہ آپ مشقت میں پڑجائیں۔

یہ صورت بھی ممکن ہے کہ طاعت کی بجا آوری میں بندے سے اس کی رویت اٹھالی جائے اور بندہ اپنے عمل کی کیفیت نہ دیکھ سکے۔ چنانچہ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ ”بسا اوقات میرے دل پر ایک ابر سا چھا جاتا ہے تو میں اس وقت روزانہ ستر بار اپنے رب سے استغفار کرتا

ہوں"۔اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ حضور اپنے اعمال کو خود ملاحظہ نہ فرماتے اور نہ ان پر حیرت وتعجب کا اظہار کرتے بلکہ امر حق کی تعظیم کی طرف ہی متوجہ ہو کر عرض کرتے ہیں کہ اے رب العالمین میرے اعمال تیرے شایانِ شان پورے نہ ہو سکے۔

حضرت سمنون محب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

ذھب المحبون للّٰہ بشرف الدنیا والاٰخرہ لان النبی صلے اللّٰہ علیہ وسلم قال المرء مع من احب۔	محبوبانِ خدا تو دنیا و آخرت کی شرافت کے ساتھ واصل بحق ہیں۔ کیونکہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ آدمی اس کے ساتھ رہے گا جس سے اسے زیادہ محبت ہے۔

چونکہ وہ حق تعالےٰ کے ساتھ ہیں۔اس لئے ان پر خطا کا صدور محال ہے۔لہٰذا ان کی دنیاوی شرافت یہ ہے کہ حق تعالیٰ ان کے ساتھ ہے۔اور اُخروی شرافت یہ ہے کہ وہ حق تعالےٰ کے ساتھ ہیں۔

حضرت یحییٰ بن معاذ رازی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

حقیقۃ المحبۃ لا ینقص بالجفاء ولا یزید بالبر والعطاء۔	حقیقی محبت، نہ ظلم سے کم ہوتی ہے اور نہ نیکی و عطاء سے بڑھتی ہے۔

اس لئے کہ یہ دونوں محبت میں سبب ہیں اور اسباب، ظاہر وجود کے حال میں فناء ہوتے ہیں اور محبؑ، محبوب کی بلا میں خوش ہوتا ہے۔ چونکہ راہِ وفاء میں ظلم و وفاء دونوں برابر ہیں اور جب محبت پیدا ہو جاتی ہے تو وفاء، جفا کی مانند، اور جفاء، وفا کی مانند بن جاتی ہے۔

حضرت شبلی علیہ الرحمتہ کو دیوانگی کے الزام میں شفا خانہ میں داخل کر کے محبوس کر کے کچھ لوگ بغرض ملاقات ان کے پاس گئے آپ نے ان سے پوچھا تم کون ہو؟ لوگوں نے کہا۔ ہم آپ سے محبت کرنے والے ہیں۔ یہ سن کر آپ نے پتھر مارنے کے لئے اٹھایا۔ لوگ سب بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس وقت آپ نے فرمایا اگر تم مجھ سے سچی محبت کرنے والے ہوتے تو مار کے ڈر سے نہ بھاگتے۔ اس لیے کہ محبین، محبوب کی بلا سے بھاگا نہیں کرتے۔

اس معنی میں بکثرت اقوال مشائخ ہیں فی الحال میں ان ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

چھٹا کشفِ حجاب

زکوٰۃ کے بیان میں

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

''اقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ'' نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔

اس حکم پر مشتمل بکثرت آیات و احادیث وارد ہیں۔ اور ایمان کے فرائض و احکام میں سے ایک زکوٰۃ کا وجوب ہے۔ جس پر زکوٰۃ فرض ہو جائے اس پر اعراض حرام ہے۔ البتہ تکمیل نصاب پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے مثلاً جس کے پاس دو سو درہم ہوں تو یہ کامل نصاب ہے۔ اس پر مالکانہ حیثیت سے پانچ درہم زکوٰۃ واجب ہے۔ اور بیس۲۰ دینار بھی ایک پورا نصاب اور کامل نعمت ہے اس پر نصف دینار زکوٰۃ واجب ہے اور پانچ اونٹ بھی پوری نعمت ہے اس پر ایک بکری واجب ہے دیگر اموال کی زکوٰۃ کا بھی یہی حال و قال ہے۔

جس طرح مال کی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اسی طرح مرتبہ کی زکوٰۃ بھی واجب ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ بھی ایک پوری نعمت ہوتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ:۔

ان اللّٰہ تعالیٰ فرض علیکم زکوٰۃ	اللہ تعالیٰ نے تمہارے مرتبہ کی زکوٰۃ بھی
جاھکم کما فرض علیکم زکوٰۃ مالکم۔	اسی طرح فرض کی ہے جیسا کہ تمہارے مال پر فرض کی۔

نیز ارشاد ہے:۔

ان لکل شیئ زکوٰۃ و زکوٰۃ الدار بیت الضیافۃ۔	یقیناً ہر چیز کے لئے زکوٰۃ ہے اور گھر کی زکوٰۃ مہمان کو ٹھہرانا اور اس کی مہمان نوازی کرنا ہے۔

زکوٰۃ کی حقیقت زکوٰۃ کی حقیقت، شکرانِ نعمت ہے جو اسی جنس کی نعمت کے ساتھ ادا کی جائے۔ چونکہ تندرستی ایک بڑی نعمت ہے لہٰذا ہر عضو کی زکوٰۃ بھی واجب ہے اور اس کی ادائیگی یہ ہے کہ اپنے تمام اعضاء کو عبادت میں مشغول رکھا جائے۔ اور کسی کھیل کود میں نہ لگایا جائے۔ تاکہ نعمت کی زکوٰۃ کا حق ادا ہو۔

اسی طرح باطنی نعمت کی بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے چونکہ باطنی نعمت بے حد حساب ہے۔ اس لئے اس کی حقیقت کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں ہر شخص کے لئے اپنے اندازہ کے مطابق اس کی زکوٰۃ واجب ہے اور وہ ظاہری و باطنی نعمتوں کا عرفان ہے۔ جب بندہ جان لے کہ حق تعالیٰ کی نعمتیں اس پر بے اندازہ ہیں تو وہ اس کا شکر بھی بے اندازہ بجالائے۔ اس لئے کہ بے اندازہ نعمتوں کی زکوٰۃ کے لئے، بے اندازہ شکر درکار ہے۔

اہل طریقت کے نزدیک زکوٰۃ کی تمام قسموں میں سب سے زیادہ غیر محمود زکوٰۃ دنیاوی نعمت کی زکوٰۃ ہے۔ کیونکہ اس میں بخل کا وجود ہے۔ حالانکہ انسان کے لئے بخل مذموم صفت ہے۔ کیا یہ بخل کا کمال نہیں ہے کہ دوسو درہم کوئی شخص سال بھر تک قبضہ میں رکھے اور ایک سال کے بعد اس میں سے پانچ درہم زکوٰۃ نکالے۔ حالانکہ کریم وسخی کا طریق مال خرچ کرنا ہے۔ نہ کہ مال کو جمع رکھنا۔ جب سخاوت کی عادت ہوگی تو زکوٰۃ کہاں سے واجب ہوگی۔؟

ایک ظاہری عالم نے بغرض تجربہ حضرت شبلی علیہ الرحمتہ سے دریافت کیا کہ کتنی مقدار پر زکوٰۃ کا وجوب ہے۔ آپ نے فرمایا جب بخیل کے پاس دوسو درہم مال موجود ہو تو تمہارے طریقہ میں پانچ درہم اور ہر بیس دینار پر نصف دینار زکوٰۃ واجب ہے۔ لیکن ہمارے طریق میں کسی چیز کو اپنی ملکیت میں نہ رکھنا واجب ہے تاکہ زکوٰۃ کی مشغولیت سے بے نیاز رہے۔ اس عالم نے پوچھا اس مسئلہ میں آپ کا امام اور رہنما کون ہے؟ آپ نے فرمایا حضرت صدیق اکبر رضی

اللہ عنہ ہیں کہ انھوں نے جو موجود تھا سب دے دیا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا" ما خلفت لعیالك "تم نے اپنے گھر والوں کے لئے کیا چھوڑا؟ عرض کیا" اللّٰہ و رسولہٗ"

امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے اپنے ایک قصیدہ میں فرمایا ہے

فما وجبت علیّ زکوٰۃ مال،

وهل تجب الزکوٰۃ علی الجواد

مجھ پر کبھی زکوٰۃ واجب نہ ہوئی۔

کیا سخیوں پر بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

لہٰذا سخیوں کا مال خرچ ہوتا رہتا ہے وہ مال میں کنجوسی نہیں کرتے اور نہ مال کی بدولت کسی سے جھگڑا کرتے ہیں کیونکہ ان کی ملکیت میں کچھ رہتا ہی نہیں۔ اگر کوئی شخص اپنی جہالت سے یہ کہے کہ جب میرے پاس مال ہی نہیں تو زکوٰۃ کے مسائل جاننے کی کیا حاجت؟ اس کا یہ کہنا صحیح نہیں اس لئے کہ تحصیل علم، فرضِ عین ہے اور علم سے لاتعلقی کا اظہار، کفر ہے۔ موجودہ زمانہ کے فتنوں میں سے ایک فتنہ یہ بھی ہے کہ مدعیان صلاح وفقر، جہالت میں رہتے ہوئے علم کو چھوڑ جاتے ہیں۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ایک دن صوفیوں کی ایک جماعت کو پڑھا رہا تھا چونکہ وہ لوگ مبتدی تھے ان کو مفہوم سمجھا رہا تھا ایک جاہل درمیان میں دخل انداز ہوا۔ میں اس وقت اونٹ کی زکوٰۃ کے مسائل بیان کر رہا تھا اور بنت لبون، بنت مخاض اور حقہ کے احکام سمجھا رہا تھا اس جاہل مرکب کے دل میں یہ بات تنگی کا موجب بنی اور اٹھ کھڑا ہوا اور مجھ سے کہنے لگا میرے پاس اونٹ نہیں ہیں۔ بنت لبون کا علم میرے کس کام آئے گا؟ میں نے اس سے کہا اے شخص! جس طرح ہمیں زکوٰۃ دینے کے لئے علم کی حاجت ہے۔ اسی طرح ہمیں زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھی علم کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی تجھے بنت لبون دے اور تو اسے لے لے تو اس وقت بھی یہی کہے گا کہ مجھے بنت لبون کے علم کی ضرورت نہیں۔ اگر کسی کے پاس مال نہ ہو اور مال کے حصول کی کوئی صورت نہ ہو تو کیا اس سے علم کی فضیلت جاتی رہے گی۔

فنعوذ باللّٰہ من الجهل

زکوٰۃ لینے میں طریقت کے مسائل

مشائخ طریقت میں کچھ حضرات تو وہ ہیں جو زکوٰۃ کے لینے کو گوارہ کرتے ہیں۔ اور کچھ

حضرات وہ ہیں جو زکوٰۃ لینے کو ناپسند کرتے ہیں۔ جن حضرات کا فقر اختیاری ہوتا ہے وہ مالِ زکوٰۃ نہیں لیتے وہ کہتے ہیں کہ ہم مال جمع نہیں کرتے کہ ہمیں زکوٰۃ دینی پڑے گی اور دنیاداروں سے لینا بھی گوارہ نہیں کرتے کہ اس میں ان کا ہاتھ اونچا رہتا ہے اور ہمارا ہاتھ نیچا۔ جن حضرات کا فقر اختیاری نہ ہو بلکہ اضطراری ہو وہ زکوٰۃ لے لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ انھیں مال زکوٰۃ کی ضرورت ہے۔ بلکہ اس بنا پر کہ وہ چاہتے ہیں کہ اپنے مسلمان بھائی کی گردن سے فریضہ اتر جائے اور جب ان کی نیت یہ ہو تو اس میں انہیں کا ہاتھ اونچا ہے نہ کہ تونگر کا؟ اگر دینے والے کا ہاتھ اونچا رہے اور لینے والے کا نیچا۔ تو اس سے خدا کے ارشاد گرامی ''یاخذ الصدقات'' وہ زکوٰۃ لیتے ہیں کا بطلان لازم آتا ہے اور یہ بھی کہ زکوٰۃ دینے والا زکوٰۃ لینے والے سے افضل ہے اور یہ خالص گمراہی ہے۔ اونچا ہاتھ وہی ہے جو کسی چیز کو وجوب کے طور پر مسلمان بھائی سے لے تا کہ اس کی گردن سے اس کا بوجھ اتر جائے۔ یہ درویش لوگ دنیاوی آدمی نہیں ہیں بلکہ عقبائی ہیں۔ اگر یہ عقبائی درویش دنیاداروں سے نہ لیں تو ان کے ذمہ فریضہ واجب رہ جائے گا اور جس کی بنا پر قیامت میں وہ ماخوذ ہوں گے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے عقبائی درویشوں کو بہت کم ضروریات کے ذریعہ امتحان میں ڈالا تا کہ دنیاداروں کی گردنوں سے فرض کا بوجھ اتاریں۔ لامحالہ اونچا ہاتھ فقراء کا ہی ہاتھ ہے، جو شریعت کے حق کے موافق اپنا حق لیتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حق اس پر واجب تھا۔ اگر لینے والوں کا ہاتھ نیچا ہوتا جیسا کہ حشوی لوگ کہتے ہیں تو انبیاء کا ہاتھ نیچا ہوتا کیونکہ انھوں نے اللہ تعالےٰ کا حق لوگوں سے وصول کیا ہے اور لازماً اخراجات میں ان کو صرف فرماتے رہے ہیں اس لئے ان کا کہنا غلط ہے کہ لینے والا ہاتھ نیچا ہے اور دینے والا ہاتھ اونچا۔ تصوف میں دونوں قاعدے قوی ہیں۔ وباللہ التوفیق۔

جودوسخا کا بیان

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔

السخی قریب من الجنة وبعید من النار والبخیل قریب من النار و بعید من الجنة۔	سخی جنت سے قریب اور دوزخ سے دور ہے اور بخیل دوزخ سے قریب اور جنت سے دور ہے۔

اہلِ علم کے نزدیک جودوسخا کے ایک ہی معنی صفات بشریہ میں ہیں۔حق تعالیٰ کو جواد تو کہہ سکتے ہیں مگر سخی نہیں کہہ سکتے۔کیونکہ حق تعالیٰ کے تمام اسماء وصفات توقیفی ہیں۔حق تعالیٰ نے اپنے آپ کو جواد تو فرمایا لیکن سخی نہیں کہلوایا ہے اور نہ کسی حدیث میں خدا کی صفت سخی وارد ہے اجماعِ امت اور اتفاقِ اہلِ سنت کے نزدیک بھی یہ جائز نہیں ہے کہ باعتبار عقل ولغت، اللہ تعالیٰ کو کسی نام سے پکارا جائے جب تک کہ کتاب وسنت اس پر ناطق نہ ہو۔مثلاً خدا کے اسماء حسنٰی میں عالم ہے باجماع امت اسے عالم تو کہہ سکتے ہیں لیکن عاقل وفقیہہ نہیں کہہ سکتے۔اگرچہ عالم، عاقل اور فقیہ کے معنی ایک ہی ہیں۔اسی طرح بربنائے توقیف خدا کو جواد تو کہہ سکتے ہیں لیکن عدمِ توقیف کی بنا پر سخی کا استعمال اس کے لئے درست نہیں۔

بعض اہلِ علم نے جودوسخا کے درمیان معنی میں کچھ فرق کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ سخی وہ ہوتا ہے جو بخشش وعطا میں امتیاز برتے یعنی وہ کسی غرض وسبب کو ملحوظ رکھے۔یہ جود کا ابتدائی درجہ ہے۔لیکن جود کا کامل مرتبہ یہ ہے کہ وہ کسی قسم کا امتیاز نہ برتے۔اور اس کا فعل بے سبب و بے غرض ہو۔یہ دونوں حالتیں دو نبیوں کی ہیں ایک حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی دوسری سیدنا حبیب اللہ ﷺ کی۔حدیث میں وارد ہے کہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام اس وقت تک کھانا تناول نہ فرماتے تھے جب تک کہ کوئی مہمان موجود نہ ہوتا۔ایک مرتبہ تین دن گزر گئے کوئی مہمان نہ آیا۔اتفاق سے ایک کافر کا گزر آپ کے دروازے کے آگے سے ہوا۔آپ نے اس سے پوچھا تو کون ہے؟ اس نے کہا میں کافر ہوں۔آپ نے فرمایا تو میری مہمانی اور عزت افزائی کے لائق نہیں ہے۔اسی وقت حق تعالےٰ نے وحی نازل فرمائی کہ اے خلیل، جسے میں نے ستر سال تک پالا تم نے اسے ایک

روٹی تک نہ دی۔

اللہ کے حبیب ﷺ کا حال یہ ہے کہ جب حاتم طائی کا بیٹا آپ کی بارگاہ میں آیا تو آپ نے اپنی چادر مبارک اس کے نیچے بچھائی اور فرمایا "اذا اتاکم کریم قوم فاکرموہ" جب کسی قوم کا عزت والا تمہارے پاس آئے تو تم اس کی عزت کرو۔ مقام غور ہے کہ ایک نبی نے امتیاز برتا اور سخاوت سے ہاتھ کھینچا اور ایک نبی نے امتیاز برتا اور اپنی شانِ نبوت کے اظہار میں کافر کے لئے چادر مبارک بچھائی۔ اول حضرت ابراہیم کی سخاوت کا حال تھا اور دوسرا ہمارے آقا ﷺ کے جود کا ذکر پاک۔

اس معنی میں سب سے عمدہ مذہب یہ ہے کہ دل میں جو سب سے پہلے خیال آئے اس کی پیروی جود ہے۔ اور جب اس پر دوسرا خیال غالب آ جائے تو وہ بخل کی علامت ہے۔ محققین نے اول خیال کو بہت بلند جانا ہے۔ کیونکہ پہلا خیال حق تعالیٰ کی جانب سے ہے۔

مجھے پتہ چلا ہے کہ نیشاپور میں ایک سوداگر تھا جو ہمیشہ ابو سعید کی صحبت میں رہا کرتا تھا۔ ایک روز سوداگر سے کسی درویش نے کچھ مانگا۔ اس سوداگر نے دل میں کہا کہ میرے پاس ایک دینار ہے اور ایک ٹکڑا سونے کا ہے؟ دل کا پہلا خیال یہ کہتا ہے کہ اسے دینار دے دیا جائے اور دوسرا خیال یہ کہتا ہے کہ اسے سونے کا ٹکڑا دے دیا جائے اس سوداگر نے سونے کا ٹکڑا دے دیا جب حضرت ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے اس کا ذکر آیا تو اس نے دریافت کیا کہ کیا حق تعالےٰ سے بحث کرنا جائز ہے؟ حضرت شیخ نے فرمایا تم نے (خود تو اللہ سے) بحث کی ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے تو حکم دیا کہ دینار دو مگر تم نے سونے کا ٹکڑا دے دیا یہ بھی مجھے معلوم ہوا ہے کہ حضرت شیخ ابو عبداللہ رودباری رحمۃ اللہ علیہ ایک مرید کے گھر تشریف لائے۔ مرید گھر میں موجود نہ تھا۔ انھوں نے فرمایا اس کے گھر کا سامان بازار میں فروخت کردو۔ جب مرید گھر آیا تو وہ اس سے بہت خوش ہوا۔ اور شیخ کی خوشنودی کی خاطر کچھ نہ کہا۔ جب اس کی بیوی آئی اور گھر کا یہ حال دیکھا تو اس نے اندر جا کر اپنے کپڑے اتار دیئے اور کہنے لگی کہ یہ بھی تو گھر کے سامان میں سے ہے اس کا بھی وہی حکم ہے۔ مرد نے اس پر تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ سراسر تکلف واختیار ہے، جو تو نے کیا ہے۔ عورت نے کہا شیخ نے جو کچھ کیا وہ اُن کا جود تھا اب ہمیں اپنے نفس کی ملکیت میں تصرف کرنا چاہئے تا کہ ہمارا جود بھی ظاہر ہو مرد نے کہا ٹھیک ہے جب کہ ہم نے خود کو شیخ کے حوالہ کر دیا ہے تو ہم پر بھی ان کا اختیار اسی طرح ہے جیسا کہ ہمارا، ہمارے اوپر تھا۔ یہی ہمارا عین جود ہے۔

انسان کی صفت میں جود کا وجود تکلف ومجاز ہے۔ لہٰذا مرید کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ

ہمیشہ اپنے نفس کی طاقت کو اللہ تعالیٰ کی متابعت میں صرف کرے یہی مذہب حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ کا ہے وہ فرماتے ہیں کہ "الصوفی دمه هدرو ملکه مباح" صوفی وہ ہے جس کا خون معاف، اور اس کی ملکیت مباح ہو۔

میں نے حضرت شیخ ابو مسلم فارسی رحمتہ اللہ علیہ سے سنا ہے انھوں نے فرمایا کہ ایک مرتبہ میں کچھ لوگوں کے ساتھ سفر حجاز میں تھا۔ حلوان کے نواح میں کردوں نے ہمارے سب کپڑے چھین لیئے۔ ہم نے بھی ان سے کوئی مزاحمت نہ کی۔ ہم نے اسی میں ان کی خوشی سمجھی۔ لیکن ایک شخص ہم میں ایسا تھا جو بے قراری کا اظہار کر رہا تھا۔ ایک کردی نے تلوار سونت کر اسے مار ڈالنا چاہا ہم سب نے اس کی سفارش کی۔ اس کردی نے کہا یہ جائز نہیں ہے کہ ہم اس جھوٹے کو زندہ چھوڑیں یقیناً ہمیں اسے مار ہی ڈالنا چاہیئے۔ ہم نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ یہ صوفی نہیں ہے یہ اولیاء کی صحبت میں خیانت کرتا ہے۔ ایسے شخص کو نا پید کر دینا ہی بہتر ہے۔ ہم نے پوچھا یہ الزام کس بنا پر رکھتے ہو؟ اس کُردی نے کہا اس لئے کہ صوفیوں کا سب سے کمتر درجہ جود ہے۔ یہ شخص چند پھٹے پُرانے کپڑوں پر بے صبری کا اظہار کرتا ہے یہ کیسے صوفی ہو سکتا ہے؟ جو اپنے رفقاء سے اس طرح جھگڑا کرتا ہے۔ حالانکہ ہم برسوں سے یہ کام کر رہے ہیں تمہارا راستہ روک رہے ہیں اور تمہارے تعلقات کو منقطع کر رہے مگر تم کبھی رنجیدہ خاطر نہیں ہوتے۔

اہل علم بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہما ایک قبیلہ کی چراگاہ سے گزرے وہاں ایک حبشی غلام کو بکریوں کی رکھوالی کرتے دیکھا۔ اسی اثنا میں ایک کتا آیا اور اس غلام کے آگے بیٹھ گیا۔ اس نے ایک روٹی نکال کر کتے کے آگے ڈال دی اس کے بعد دوسری پھر تیسری۔ حضرت عبداللہ نے یہ حال دیکھ کر پوچھا اے غلام تیرا کھانا روزانہ کتنا ہوتا ہے اس نے کہا اتنا ہی جتنا آپ نے دیکھا۔ فرمایا وہ سب کیوں کھلا دیا یہ سن کر اس نے کہا اس لئے کہ یہ جگہ کتوں کی تو ہے نہیں، معلوم ہوتا ہے یہ کہیں دور سے امید لے کر آتا ہے میں نے اچھا نہ جانا کہ اس کی محنت کو ضائع کر دوں۔ حضرت عبداللہ کو یہ بات اس کی بہت اچھی معلوم ہوئی۔ انھوں نے اس غلام کو اور اس کی تمام بکریوں کو مع چراگاہ کے خرید لیا۔ اور غلام کو آزاد کر کے فرمایا یہ سب بکریاں اور یہ چراگاہ تمہیں بخش دیں۔ غلام نے ان کے لئے دعا کی اور بکریوں کو خیرات کر کے چراگاہ وقف کر دی اور خود وہاں سے چلا گیا۔

ایک شخص حضرت امام حسن مجتبیٰ بن حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما کے دروازے پر آیا اور اس نے عرض کیا اے فرزندِ رسول، مجھ پر چار سو درہم قرض ہیں حضرت امام حسنؓ نے حکم دیا کہ

اسے چار ہزار درہم دے دیئے جائیں اور خود روتے ہوئے اندر تشریف لے گئے تو لوگوں نے پوچھا اے فرزندِ رسول ﷺ! رونے کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے فرمایا اس لئے روتا ہوں کہ میں نے اس شخص کے حال کی جستجو میں کوتاہی کی ہے یہاں تک کہ میں نے اسے سوال کی ذلت میں ڈال دیا۔

حضرت ابو سہل صلعو کی رحمتہ اللہ علیہ کبھی خیرات کسی درویش کے ہاتھ پر نہ رکھتے اور جو چیز دینی ہوتی اسے کسی کے ہاتھ میں نہ دیتے بلکہ زمین پر رکھ دیتے تاکہ وہ اسے اٹھالے۔ لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا اس طرح دینے میں وہ خطرہ نہیں رہتا جو کسی مسلمان کے ہاتھ میں دینے سے ہوتا ہے مطلب یہ کہ میرا ہاتھ اونچا ہو اور اس مہمان کا ہاتھ نیچا۔

حضور اکرم ﷺ کا ایک واقعہ ہے کہ بادشاہِ حبش نے آپ کی خدمت میں ڈونا فے کستوری کے تحفہ میں بھیجے۔ آپ نے انہیں ایک بار ہی پانی میں گھول دیا اور اپنے اور اپنے صحابہ کے اوپر مل دیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آیا۔ آپ نے اسے دو پہاڑ کے درمیان کی وادی جو بکریوں سے پُر تھی عطا فرمادی۔ جب وہ اپنی قوم میں گیا تو اس نے کہا اے لوگو! جاؤ تم سب مسلمان ہو جاؤ کیونکہ محمد رسول اللہ ﷺ اتنا زیادہ عطا فرماتے ہیں کہ آپ اپنی درویشی سے بھی نہیں ڈرتے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں اسّی ہزار درہم لائے گئے آپ نے ان سب کو ایک چادر پر پھیلا دیا اور جب تک ان سب کو تقسیم نہ فرما دیا اپنی جگہ سے نہ اُٹھے۔ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ میں دیکھ رہا تھا آپ کے شکم اطہر پر بھوک کی وجہ سے پتھر بندھا ہوا تھا۔

میں نے متاخرین کے ایک درویش کو دیکھا ہے کہ ایک بادشاہ نے اس کے پاس تین ہزار درہم کے برابر خالص سونے کے پترے بھیجے وہ ان پتروں کو لے کر حمام میں گیا وہاں ان سب کو تقسیم کر کے چلا آیا۔ اس سے قبل نوری مذہب کے سلسلہ میں ایثار کے ضمن میں اس قسم کی بکثرت باتیں گزر چکی ہیں۔ واللہ اعلم

ساتواں کشف حجاب
روزے کے بیان میں

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

یا ایھا الذین آمنوا کتب علیکم الصیام الآیہ	اے ایمان والو تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جبریل علیہ السلام نے مجھے خبر دی ہے کہ حق تعالے فرماتا ہے"

"الصوم لی وانا اجزی بہ"	روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔ یا میں ہی اس کی جزا ہوں گا۔

اس لئے کہ روزہ باطنی عبادت ہے جس کا ظاہر سے کوئی تعلق نہیں اور کسی دوسرے کو یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ یہ روزہ دار ہے۔ اس بنا پر اس کی جزا بھی بے حد وحساب ہے۔
علماء فرماتے ہیں کہ دخول جنت تو رحمت کے طفیل میں ہوگا۔ اور وہاں درجات عبادت کے صدقہ میں اور ہمیشہ رہنا روزے دار کے لئے ہوگا۔ کیونکہ حق تعالیٰ فرماتا ہے میں ہی اس کی جزا دوں گا۔

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

"الصوم نصف الطریقۃ"	روزہ آدھی طریقت ہے۔

بکثرت مشائخ کو دیکھا ہے کہ وہ ہمیشہ روزہ رکھتے تھے اور بعض مشائخ کو دیکھا کہ وہ صرف ماہِ رمضان المبارک کے روزے رکھتے تھے۔ ان کا یہ عمل اس لئے تھا کہ رمضان کے روزے سے ثواب حاصل ہو اور ماسوئی دنوں میں روزہ نہ رکھ کر ریا کاری سے محفوظ رہیں۔ میں نے ایسے مشائخ کو بھی دیکھا ہے کہ جن کو روزہ دار ہوتے ہوئے بھی کوئی نہ جانتا تھا کہ وہ روزے سے ہیں۔ اگر کوئی کھانا سامنے لے آتا تو کھا بھی لیتے (اور نفل روزہ افطار کر لیتے تا کہ روزہ دار ہونا معلوم نہ ہو) یہ طریق سنت کے زیادہ موافق ہے۔ کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ جب ایک دن ان کے یہاں تشریف لائے تو دونوں نے عرض کیا:۔

انا خبزنا لك حيسا قال عليه السلام اما انی کنت ارید الصوم ولکن قربنیه سا صوم یوم مکانه۔

یا رسول اللہ ﷺ ہم نے آپ کے لئے گوشت پکایا ہے؟ حضور نے فرمایا میں نے تو آج روزے کا ارادہ کیا تھا لیکن لاؤ میں اس کے بدلے کل روزہ رکھ لوں گا۔

میں نے احادیث میں دیکھا ہے کہ حضور اکرم ﷺ ایام بیض یعنی چاند کی تیرہ چودہ اور پندرہ تاریخوں میں اور محرم کے دس دنوں میں روزے رکھا کرتے اور ماہِ رمضان اور شعبان میں بھی روزے رکھتے تھے حدیث میں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ آپ داؤدی روزے رکھا کرتے اور اسے خیر الصیام فرمایا کرتے تھے۔ داؤدی روزہ یہ ہے کہ ایک دن روزہ رکھے اور دوسرے دن افطار کرے۔

ایک مرتبہ شیخ احمد بخاری رحمتہ اللہ علیہ کے پاس میں گیا تو ایک طباق حلوے کا ان کے پاس رکھا ہوا تھا اور وہ اس سے تناول کر رہے تھے مجھے اشارہ کر کے فرمایا کھاؤ۔ میں نے بچپن کی عادت کے مطابق کہہ دیا کہ میں روزے سے ہوں فرمایا کیوں روزہ رکھتے ہو؟ میں نے کہا فلاں بزرگ کی موافقت میں روزہ رکھتا ہوں۔ انھوں نے فرمایا کہ یہ بات درست نہیں ہے کہ کسی مخلوق کی کوئی مخلوق متابعت کرے۔ میں نے ارادہ کیا کہ روزہ افطار کرلوں۔ انھوں نے فرمایا جب تم نے فلاں بزرگ کی متابعت ترک کرنے کا ارادہ کیا ہے تو اب میری بھی موافقت نہ کرو۔ کیونکہ میں بھی ایک مخلوق ہوں۔

روزے کی حقیقت روزے کی حقیقت رکنا ہے۔ اور پوری طریقت اسی میں پنہاں ہے۔ روزے میں ادنیٰ درجہ، بھوکے رہنا ہے کیونکہ "الجوع طعام الله فی الارض" بھوکا رہنا زمین پر خدا کا طعام ہے بھوکے رہنے کو شریعت اور عقل دونوں پسند کرتے ہیں۔

ہر مسلمان، عاقل، بالغ، تندرست و مقیم پر صرف ایک ماہ رمضان کے روزے فرض ہیں جو رمضان کا چاند دیکھنے سے شوال کا چاند دیکھنے تک ہیں۔ ہر روزے کے لئے نیت درست اور ادائیگی میں صدق و اخلاص ہونا چاہیے۔

رکے رہنے کی شرائط بہت ہیں۔ مثلاً معدے کو کھانے پینے سے روکے رکھا اور آنکھ کو شہوانی نظر، کان کو غیبت سننے، زبان کو بیہودہ اور فتنہ انگیز باتیں کرنے اور جسم کو دنیاوی اور مخالفتِ حکمِ الٰہی سے روکے رکھنا روزہ ہے جب بندہ ان تمام شرائط کی پیروی کرے گا تب وہ حقیقتہً روزے دار ہوگا۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب روزہ رکھے تو اپنے کان، آنکھ، زبان، ہاتھ اور جسم کے ہر عضو کا روزہ رکھے بہت سے روزے دار ایسے ہیں جن کا روزہ کچھ فائدہ مند نہیں ہوتا۔ بجز اس کے کہ وہ بھوکے اور پیاسے رہتے ہیں۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا تو عرض کیا یارسول اللہ ﷺ مجھے کوئی نصیحت فرمایئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا "احبس حواسک" اپنے حواس کو قابو میں رکھو۔ یہ مکمل مجاہدہ ہے۔ اس لئے کہ تمام علوم کا حصول انہی پانچ دروازوں سے ہوتا ہے۔ دیکھنے[1] سے، سونگھنے[2] سے، چکھنے[3] سے، سننے سے چھونے[5] سے۔ یہ پانچوں حواس علم وعقل کے سپہ سالار ہیں۔ اول چار کے لئے تو ایک مخصوص جگہ ہے۔ لیکن پانچواں بدن کے تمام حصوں میں پھیلا ہوا ہے۔ آنکھ جو دیکھنے کی جگہ ہے وہ رنگ و بشرہ کو دیکھتی ہے اور کان جو سننے کی جگہ ہے وہ خبر اور آوازوں کو سنتا ہے اور زبان، ذائقہ اور چکھنے کا مقام ہے وہ مزہ اور بے مزہ کو پہچانتی ہے۔ ناک سونگھنے کا مقام ہے جو خوشبو و بدبو کا ادراک کرتی ہے اور لمس یعنی چھونے کے لئے کوئی مقام خاص نہیں ہے بلکہ تمام جسم میں اس کا ادراک پھیلا ہوا ہے۔ انسان کے تمام اعضا میں نرمی و گرمی، سختی و سردی کا احساس ہوتا ہے۔ کوئی علم ایسا نہیں ہے جسے انسان معلوم کرنا چاہے مگر وہ انھیں پانچ دروازوں سے ہی حاصل کرتا ہے۔ بجز بدیہی باتوں اور حق تعالیٰ کے الہام کے۔ کیونکہ نہ ان میں آفت جائز ہے اور نہ ان کے لئے پانچوں حواسوں کی ضرورت ہے۔ ان پانچوں حواس کے لئے صفائی اور کدورت دونوں صفتیں ہیں۔ جس طرح علم و عقل اور روح کے لئے قدرت اور دخل ہے اسی طرح نفس و ہوا کی لئے بھی ہے۔ کیونکہ یہ طاعت و معصیت اور سعادت و شقاوت کے درمیان سبب آلۂ مشترک ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ کی ولایت و اختیار سمع و بصر میں یہ ہے کہ وہ سچی بات سنے اور دیکھے۔ اسی طرح نفس و ہوا کی ولایت و اختیار یہ ہے کہ وہ جھوٹی بات سننے اور شہوانی نظر سے دیکھنے کی خواستگار رہے اور ذائقۂ شامہ میں ولایتِ حق یہ ہے کہ وہ حکمِ الٰہی کی موافقت اور سنتِ مصطفوی ﷺ کی متابعت میں کارفرما ہو۔ اسی طرح نفس، فرمانِ حق کی مخالفت اور شریعت سے منافرت کا طلب گار رہے۔ اس لئے روزے دار کو

لازم ہے کہ اپنے حواسوں کو قابو میں رکھے تاکہ مخالفت کے مقابلہ میں موافقت کا ظہور ہو اور وہ صحیح معنی میں روزے دار ہو۔ ورنہ کھانے پینے کا روزہ تو بچے بھی رکھ لیتے ہیں اور بوڑھی عورتیں بھی رکھتی ہیں حالانکہ روزہ کا حقیقی مقصد نفسانی خواہش اور دنیاوی کھیل کود سے بچنا ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ فرماتا ہے "وما جعلنا هم جسدًا لا یاکلون الطعام" کیا ہم نے پیغمبروں کے جسموں کو ایسا نہیں بنایا کہ وہ کھانا نہ کھائیں۔ اور فرمایا "افحسبتم انما خلقنکم عبثا" کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں بیکار پیدا کیا۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے ہر طبیعت کو کھانے کا حاجت مند بنایا اور ہر مخلوق کے لئے اس کی خاطر حیلہ بہانا پیدا فرمایا۔ لہٰذا رکنا تو کھیل کود اور حرام چیزوں سے چاہئے نہ کہ حلال چیزوں کے کھانے سے۔ مجھے حیرت تو اس شخص پر ہوتی ہے جو کہتا ہے کہ میں نفلی روزہ رکھتا ہوں حالانکہ وہ فرائض کی ادائیگی سے غافل ہے۔ چونکہ معصیت نہ کرنا فرض ہے۔ اور نفلی روزہ، رسول اللہ ﷺ کی سنت کے ساتھ متصل اور ملحق ہے فنعوذ باللہ من قسوة القلب۔ لہٰذا جو شخص معصیت سے بچتا ہے وہ ہر حال میں روزے دار ہے۔

اربابِ علم بیان کرتے ہیں کہ حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ جس روز پیدا ہوئے تو وہ روزے سے تھے۔ اور جس دن دنیا سے رحلت فرمائی اس دن بھی روزے دار تھے۔ کسی نے پوچھا یہ کس طرح؟ بیان کیا کہ ان کی پیدائش کا وقت صبح صادق تھا اور شام تک انھوں نے دودھ نہ پیا اور جب وہ دنیا سے رخصت ہوئے تو وہ روزے کی حالت میں تھے۔ یہ بات حضرت ابوطلحہ مالکی رحمتہ اللہ علیہ نے بیان فرمائی۔

صومِ وصال کا مسئلہ صومِ وصال یعنی مسلسل اور پے در پے روزے رکھنے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے ممانعت مروی ہے۔ کیونکہ آپ نے جب صوم وصال رکھا تو صحابہ کرام نے بھی آپ کی موافقت میں روزے رکھنے شروع کر دیئے۔ حضور ﷺ نے ان سے فرمایا تم صوم وصال نہ رکھو کیونکہ انی لست کاحدکم انی ابیت عند ربکم یطعمنی و یسقینی" میں تم میں سے کسی کی مانند نہیں ہوں کیونکہ میں تمہارے رب کے حضور رات گزارتا ہوں وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔

اربابِ مجاہدہ فرماتے ہیں کہ آپ کی یہ ممانعت، شفقت و مہربانی کے لئے ہے نہ کہ نہی و ممانعت یا حرام بتانے کے لئے۔ ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ صومِ وصال سنت قولی کے خلاف ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وصال بذات خود نا ممکن و محال ہے اس لئے کہ دن گزر جائے تو رات میں روزہ نہیں ہوتا اور رات کو روزے سے ملائے تو بھی وصال نہیں ہوتا۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ کی بابت منقول ہے کہ وہ ہر پندرہ دن کے بعد ایک مرتبہ کھانا کھاتے اور جب ماہِ رمضان آتا تو عید الفطر تک کچھ نہ کھاتے اس کے باوجود روزانہ رات میں چار سو رکعات نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ یہ حال، انسان کی امکانی طاقت سے باہر ہے۔ بجز مشرب الٰہی کے ایسا ہو نہیں سکتا ہے اسی کی تائید سے ممکن ہے اور وہی تائید الٰہی اس کی غذا بن جاتی ہے۔ کسی کے لئے دنیا و نعمت غذا ہوتی ہے اور کسی کے لئے تائید الٰہی غذا۔

حضرت شیخ ابونصر سراج رحمتہ اللہ علیہ جن کو "طاؤس الفقرا" اور "صاحبِ لمع" کہا جاتا ہے جب ماہِ رمضان آیا تو بغداد پہنچے اور مسجدِ شونیزیہ میں اقامت فرمائی تو ان کو علیحدہ حجرہ دے دیا گیا اور درویشوں کی امامت ان کے سپرد کر دی گئی۔ چنانچہ عید تک انھوں نے ان کی امامت فرمائی اور تراویح میں پانچ ختم قرآن کئے۔ ہر رات خادم ایک روٹی ان کے حجرے میں آکر انھیں دے جاتا جب عید کا دن آیا اور وہ نماز پڑھ کر چلے گئے تو خادم نے حجرے میں نظر ڈالی، وہ تیسوں روٹیاں یونہی اپنی جگہ پر موجود تھیں۔

حضرت علی بن بکار رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت حفص مصیصی کو میں نے دیکھا کہ وہ ماہِ رمضان میں پندرھویں دن کے علاوہ کچھ نہ کھاتے تھے۔

حضرت ابراہیم ادہم رحمتہ اللہ علیہ کی بابت مروی ہے کہ وہ ماہ رمضان میں اول سے آخر تک کچھ نہ کھاتے تھے۔ حالانکہ شدید گرمی کا زمانہ تھا اور روزانہ گندم کی مزدوری کو جایا کرتے تھے۔ جتنی مزدوری ملتی تھی وہ سب درویشوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے اور رات بھر عبادت کرتے تھے نمازیں پڑھتے یہاں تک کہ دن نکل آتا تھا وہ لوگوں کے ساتھ ان کی نظروں کے سامنے رہتے تھے لوگ دیکھا کرتے تھے کہ وہ کچھ نہ کھاتے ہیں اور نہ پیتے ہیں رات کو سوتے بھی نہیں۔

حضرت شیخ عبداللہ خفیف رحمتہ اللہ علیہ کی بابت منقول ہے کہ جب وہ دنیا سے رخصت ہوئے تو انھوں نے مسلسل چالیس چلّے کاٹے تھے۔

میں نے جنگل میں ایک بوڑھے کو دیکھا جو ہمیشہ ہر سال دو چلّے کاٹتا تھا اور جب حضرت ابو محمد غزنوی رحمتہ اللہ علیہ دنیا سے رخصت ہوئے تو میں ان کے پاس موجود تھا انھوں نے اسی ۸۰ دن تک کچھ نہیں کھایا اور کوئی نماز بغیر جماعت کے نہیں پڑھی تھی۔ متاخرین کے ایک درویش نے اسی ۸۰ دن رات کچھ نہ کھایا اور نہ کوئی نماز بغیر جماعت کے پڑھی۔

مرو کی ایک بستی میں دو بزرگ تھے ایک کا نام مسعود اور دوسرے کا نام شیخ بوعلی سیاہ

تھا۔لوگ بیان کرتے ہیں کہ شیخ مسعود نے بزرگ کے پاس کہلا بھیجا کہ یہ دعوے کب تک رہیں گے آؤ ہم چالیس دن ایک جگہ بیٹھیں اور کچھ نہ کھائیں۔انھوں نے جواب میں کہلوایا آؤ ہم روزانہ تین مرتبہ کھائیں اور چالیس دن تک ایک وضو سے رہیں۔

یہ مسئلہ اپنی جگہ دشوار ہے۔جاہل لوگ اس سے تعلق رکھ کر کہتے ہیں کہ صوم وصال جائز ہے اور اطبا اس کا سرے سے انکار کرتے ہیں۔اب میں اس کی مکمل وضاحت کرتا ہوں تاکہ یہ شبہات رفع ہوجائیں اور اس کی حقیقت واضح ہوجائے۔

صوم وصال کی وضاحت صوم وصال رکھنا بغیر اس کے کہ کسی فرمانِ الٰہی میں خلل واقع ہو کرامت ہے اور کرامت کا محل خاص ہوتا ہے نہ کہ عام۔پھر جس کا حکم عام نہ ہو وہ معاملہ ہر جگہ درست نہیں ہوتا۔کیونکہ اگر کرامت کا اظہار عام ہوتا تو ایمان جبری ہوتا اور عارفوں کے لئے معرفت میں ثواب نہ ہوتا۔رسول اللہ ﷺ چونکہ صاحب معجزہ تھے تو آپ سے صوم وصال (بطور معجزہ) ظاہر ہوا اور اہل کرامت کے لئے، کرامت کے اظہار کی ممانعت ہے اور یہ کہ کرامت میں اخفا شرط ہے جس طرح معجزے کے لئے اظہار شرط ہے۔یہ فرق معجزہ اور کرامت کے درمیان واضح ہے۔لہٰذا ہدایت یافتہ کے لئے اتنی ہی وضاحت کافی ہے۔

چلہ کشی کی اصل مشائخ طریقت کی چلہ کشی کی اصل، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حال سے متعلق ہے۔کیونکہ انھوں نے بوقت مکالمہ پہلے چلہ کشی کی اور یہ صحیح ہے کہ مشائخ جب چاہتے ہیں کہ باطن میں رب العزت سے ہم کلام ہوں اور وہ چالیس روز بھوکے رہتے ہیں اور جب تیس دن گزر جاتے ہیں تو مسواک کرتے ہیں اس کے بعد دس روز مزید گزارتے ہیں۔بلاشک وشبہ اللہ تعالیٰ ان کے باطن کے ساتھ ہم کلام ہوتا ہے اس لئے انبیاء علیہم السلام کے لئے جو کچھ ظاہر طور پر جائز ہوتا ہے وہ سب اولیاء پر باطنی طور پر جائز ہوتا ہے۔لہٰذا حق تعالیٰ کے کلام کی سماعت، جب تک طبیعت اپنے حال پر ہے جائز نہیں ہوتی۔اس لئے چاروں طبائع کو چالیس دن تک کھانا پینا ترک کر کے مغلوب کرتے ہیں تاکہ لطائفِ روح اور محبت کی صفائی کے لئے کامل ولایت حاصل ہوجائے۔اسی موافقت میں بھوکے رہنے اور اس کی حقیقت کے بیان کرنے میں کچھ وضاحت پیش کرتا ہوں۔وباللہ التوفیق۔

فاقہ کشی اور اس کے متعلقات کا بیان

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:۔

ولنبلونکم بشئ من الخوف والجوع و نقص من الاموال و الانفس والثمرات الآیہ	ضرور بالضرور ہم تمہیں کچھ خوف اور بھوک اور مال و جان اور پھلوں کی کمی سے آزمائیں گے۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ:۔

بطن جائع احب الی اللہ تعالیٰ من سبعین عابد عاقل۔	اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھوکے کا شکم، ستر عاقل عابدوں سے زیادہ محبوب ہے

واضح رہنا چاہئے کہ بھوکا رہنا، تمام امتوں اور ملتوں کے نزدیک قابل تعریف ہے اور بزرگی کی علامت۔ کیونکہ ظاہری لحاظ سے بھوکے کا دل زیادہ تیز اور اس کی طبیعت زیادہ پاکیزہ اور تندرست ہوتی ہے خاص کر وہ شخص جو زیادہ پانی تک نہ پئے اور مجاہدے کے ذریعہ تزکیہء نفس کرے۔ ''لان الجوع للنفس خضوع وللقلب خشوع '' اس لئے کہ بھوکے کا جسم متواضع اور دل خشوع والا ہوتا ہے۔ کیونکہ بھوک نفسانی قوت کو فنا کر دیتی ہے۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ:۔

اجیعوا بطونکم واظمئوا البادکم واعروا اجسادکم لعل قلوبکم تری اللہ عیانا فی الدنیا۔	تم اپنے شکموں کو بھوکا، اپنے جگروں کو پیاسا اور اپنے جسموں کو غیر آراستہ رکھو تاکہ تمہارے دل، اللہ تعالیٰ کو دنیا میں ظاہر طور پر دیکھ سکیں۔

اگرچہ بھوک جسم کے لئے بلا ہے مگر دل کے لئے جلا ہے۔ اور اپنے جسموں کو غیر آراستہ رکھنا باطن کے لئے بقا ہے۔ جب باطن، بقا سے ہمکنار ہو کر جسم مصفا ہو جائے اور دل پر نور ہو تو کیا نقصان؟ شکم سیر ہو کر کھانے میں کوئی توقیر ہے۔ اگر اس میں توقیر ہوتی تو جانور شکم سیر ہو کر نہ کھاتے۔ معلوم ہوا کہ شکم سیر ہو کر کھانا جانوروں کا کھانا ہے اور بھوکا رہنا جانوں کا علاج اور یہ کہ بھوک میں باطن کی تعمیر اور شکم سیری میں پیٹ کی تعمیر ہے۔ جو شخص باطن کی تعمیر میں کوشاں رہتا ہے وہ حق تعالیٰ کے لئے خاص ہوتا ہے اور علائق دنیا سے یکسو ہو جاتا ہے۔ بھلا وہ شخص، اس شخص کے کیسے برابر ہو سکتا

ہے جس کی زندگی بدن کی تعمیر اور جسم وخواہش کی خدمت میں گزرتی ہو۔ ایک کے لئے ساری دنیا کھانے کے لئے چاہئے اور دوسرے کے لئے کھانا عبادت کے لئے۔ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔

كان المتقدمون ياكلون ليعيشوا وانتم تعيشون لتاكلوا۔	متقدمین کھاتے تھے تا کہ زندہ رہیں اور تم زندہ رہتے ہوتا کہ خوب کھاؤ۔
الجوع طعام الصديقين ومسلك المريدين و قيد الشياطين۔	بھوکا رہنا صدیقوں کی غذا، مریدوں کا مسلک اور شیاطین کی قید ہے۔

اللہ تعالیٰ کی قضاؤ قدر کے تحت حضرت آدم علیہ السلام کا جنت سے دنیا میں تشریف لانا اور قرب الٰہی سے ان کا دور ہونا ایک لقمہ ہی کی وجہ سے تھا۔

فاقہ کشی کی حقیقت جو شخص بھوک سے بے قرار ہو در حقیقت وہ بھوکا نہیں ہے اس لیے کہ کھانے والے کی طلب غذا کے ساتھ ہے۔ لہٰذا جس کا درجہ بھوک ہے۔ وہ غذا کے نہ پانے کی وجہ سے ہے نہ کہ غذا کو چھوڑنے کی وجہ سے اور جو شخص کھانا موجود ہوتے ہوئے نہ کھائے اور بھوک کی تکلیف اٹھائے در حقیقت وہی بھوکا ہے اور شیطان کی قید اور نفسانی خواہش کی بندش بھوکے رہنے ہی میں ہے۔

حضرت کتانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

من حكم المريد ان يكون فيه ثلثة اشياء نومه غلبة وكلامة ضرورة واكله فاقة۔	مرید کی شرط یہ ہے کہ اس میں تین چیزیں موجود ہوں۔ ایک یہ کہ اس کا سونا، غلبہ کے بغیر نہ ہو دوسرے یہ کہ اس کا کلام، ضرورت کے بغیر نہ ہو۔ تیسرے یہ کہ اس کا کھانا فاقہ کے بغیر نہ ہو۔

بعض مشائخ کے نزدیک کم از کم فاقہ دو دن اور دو راتوں کا ہونا چاہئے۔ اور بعض کے نزدیک تین شبانہ روز اور بعض کے نزدیک ایک ہفتہ، اور بعض کی نزدیک ایک چلہ کا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ محققین کے نزدیک سچی بھوک ہر چالیس شبانہ روز کے بعد ایک مرتبہ ہوتی ہے اور یہ زندگی کے لئے ضروری ہے۔ اس دوران جو بے چینی و بے قراری ظاہر ہوتی ہے وہ طبیعت کی شرارت اور اس کا گھمنڈ ہے اللہ تعالےٰ اس سے محفوظ رکھے کیونکہ اہل معرفت کی رگیں، سراسر اسرار الٰہی ہوتی ہیں اور ان کے قلوب حق تعالیٰ کی نظر کرم کی طرف ہوتے ہیں۔ ان کے سینوں میں دلوں کے

دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور عقل و ہوا، بارگاہِ الٰہی میں پژمردہ ہو چکی ہوتی ہیں۔ روح عقل کی مدد کرتی ہے اور نفس ہوا کی۔ جن کی طبیعتیں کثرت غذا سے پرورش پاتی ہیں ان کا نفس قوی ہوتا ہے اور خواہش بڑھتی ہے اور اعضا میں اس کا غلبہ زیادہ پھیلتا ہے اور اس پھیلاؤ سے ہر رگ میں قسم قسم کے حجابات نمودار ہوتے ہیں۔

جب غذا کا طلبگار، نفس سے ہاتھ کھینچتا ہے تو نفس بہت کمزور ہو جاتا ہے اور عقل زیادہ قوی ہو جاتی ہے اور رگوں سے نفسانی قوتیں مضمحل ہو جاتی ہیں اور اس کے اسرار و براہین زیادہ ظاہر ہونے لگتے ہیں اور جب نفس اپنی حرکتوں سے بے بس ہوتا ہے تو اس کے وجود سے نفسانی خواہش فنا ہو جاتی ہے۔ باطل ارادے، اظہارِ حق میں گم ہو جاتے ہیں تو اس وقت مرید کی ہر مراد پوری ہو جاتی ہے۔

حضرت ابوالعباس قصاب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میری طاعت و معصیت[2] دو شکلوں میں منقسم ہے جب میں کھاتا ہوں تو معاصی کا خمیر اپنے میں پاتا ہوں اور جب اس سے ہاتھ کھینچ لیتا ہوں تو تمام طاعتوں کی بنیاد اپنے اندر دیکھتا ہوں۔ بھوکے رہنے کا ثمرہ مشاہدہ ہے جس کا قائد و رہنما مجاہدہ ہے۔ لہٰذا مشاہدے کے ساتھ سیری، مجاہدے کے ساتھ بھوکے رہنے سے کہیں بہتر ہے۔ کیونکہ مشاہدہ جوانمردوں کی رزم گاہ ہے اور مجاہدہ بچوں کا کھیل۔ "فالشبع بمشاهدة الحق خير من الجوع بشاهد الخلق" مشاہدہ حق کے ساتھ سیری، لوگوں کے مشاہدہ کے ساتھ بھوکے رہنے سے بہتر ہے۔ اس بحث میں طویل گفتگو ہے طوالت کے خوف سے اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

آٹھواں کشفِ حجاب

حج کے بیان میں

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وللہ علی الناس حج البیت من	اور اللہ کے لئے لوگوں پر بیت اللہ کا حج
استطاع الیه سبیلا	فرض ہے جو وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھیں۔

فرائض اسلام میں سے ایک مستقل فرض، بیت اللہ کا حج ہے جو بندے پر عقل و بلوغ اور اسلام کے بعد صحت قدرت کی حالت میں فرض ہوتا ہے۔ حج کے ارکان، میقات سے احرام

باندھنا، عرفات میں ٹھہرنا، اور خانہ کعبہ کی زیارت وطواف وغیرہ اس پر سب کا اجماع ہے۔ صفاو مروہ کی سعی کے رکن ہونے میں اختلاف ہے اور بغیر احرام کے حرم کے حدود میں داخل نہ ہونا چاہئے۔ حرم کو اس لئے حرم کہا جاتا ہے کہ یہ مقام ابراہیم علیہ السلام ہے اور امن وحرمت کی جگہ ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ۲ دو مقام ہیں۔ ایک مقام آپ کے جسم اقدس کا اور دوسرا مقام آپ کے قلب انور کا۔ جسم کا مقام مکہ مکرمہ ہے اور دل کا مقام، خلّت ہے۔ لہٰذا جو شخص آپ کے جسم کے مقام کی زیارت کا ارادہ کرے اس پر لازم ہے کہ وہ تمام لذتوں اور شہوتوں سے منہ موڑ لے اور وہ محرم ہو یعنی ان چیزوں کو اپنے اوپر حرام کئے ہوئے ہو جن کو شریعت نے بیان کیا ہے۔ جسم پر کفن پہنے، حلال شکار سے ہاتھ کھینچے۔ حواس کے تمام دروازوں کو بند کرے۔ اس کے بعد عرفات میں حاضر ہو۔ وہاں سے مزدلفہ، مشعر الحرام جائے پھر وہاں سے سنگریزے چنے پھر مکہ مکرمہ پہنچ کر طواف کرے اس کے بعد منیٰ آکر تین روز قیام کرکے جمرات پر سنگریزے پھینکے۔ وہاں سر منڈائے اور قربانی دے کر جیسے چاہے کپڑے پہنے۔

جب بندہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل کے مقام، خلّت ودوستی کا ارادہ کرے اس پر لازم ہے کہ وہ تمام لذتوں اور رغبتوں سے منہ موڑ کر تمام راحتوں کو چھوڑ دے۔ اغیار کے ذکر سے کنارہ کش ہو جائے۔ کیونکہ دنیا کی طرف التفات کرنا خطرناک ہے پھر معرفت کے عرفات میں ٹھہرے اور وہاں سے محبت کے مزدلفہ میں آئے وہاں سے حق سبحانہ کے حرم کے طواف کے لئے سر کو بھیجے اور حرص وخواہش اور دل کے فاسد ارادوں سنگریزوں کو اس امن وسلامتی کی منیٰ میں پھینکے اور نفس کو مجاہدے کے مقام اور اس کی تسخیر گاہ میں قربان کرے تاکہ مقام خلت حاصل ہو۔ لہٰذا مکہ مکرمہ میں داخل ہونا گویا دشمن اور اس کی تلوار کی زد سے جائے امن وامان میں آجانا ہے اور اس مقامِ خلت میں داخل ہونا گویا بارگاہِ حق سے اور اس کے متعلقات سے مامون ومحفوظ رہنا ہے۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ:۔

حج کرنے والے خدا کے قاصد ہیں۔ وہ جو مانگتے ہیں اللہ تعالیٰ انھیں عطا فرماتا ہے اور جو دعا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اسے قبول فرماتا ہے۔	الحاج وفد اللہ یعطیھم ماسألوا ویستجیب لھم مادعوا۔

لیکن جو مقام خلت کا طالب ہوتا ہے۔ وہ صرف پناہ چاہتا ہے نہ کچھ مانگتا ہے نہ کوئی دعا

رتا ہے بلکہ حالتِ تسلیم و رضا پر قائم رہتا ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ:۔

جب خدا نے ان سے فرمایا کہ سر جھکاؤ تو عرض کیا میں نے رب العالمین کے حضور سر تسلیم خم کر دیا۔	واذ قال لہٗ ربہ اسلم قال اسلمت لرب العالمین۔

جب حضرت ابراہیمؑ مقامِ خلت پر فائز ہوئے تو انھوں نے تمام تعلقات سے منہ موڑ کر دل کو غیر سے خالی کر دیا۔ اس وقت اللہ تعالےٰ نے چاہا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جلوے کی بر سرِ عام نمائش کر دے اس کے لئے حق تعالیٰ نے نمرود کو مقرر کیا اس نے چاہا کہ ان کے اور ان کے گھر والوں کے درمیان تفریق کرا دے۔ چنانچہ نمرود نے آگ جلوائی، ابلیس نے آ کر منجنیق بنا کر دی اور اس میں گائے کی کھال کو چلہ میں سیا گیا اور اس چلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بٹھایا گیا اس وقت جبریل علیہ السلام آئے اور منجنیق کا چلہ پکڑ کر عرض کرنے لگے "ھل لك الى من حاجة" کیا آپ کو مجھ سے کوئی حاجت ہے؟ حضرت خلیل اللہ نے فرمایا "اما اليك فلا" حاجت تو ہے مگر تم سے نہیں۔ جبریل علیہ السلام نے عرض کیا پھر اللہ تعالےٰ ہی سے عرض کیجئے؟ فرمایا "حسبی من سوالی علمه بحالی" "اللہ تعالیٰ میری عرض سے بے نیاز ہے وہ میرے حال کو جانتا ہے۔ حضرت خلیل اللہ کے فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ میرے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ جان لے کہ مجھے اسی کی راہ میں آگ میں ڈالا جا رہا ہے۔ میرے حال پر اس کا علم، میرے عرض و سوال کا محتاج نہیں ہے۔

حضرت محمد بن الفضل رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں اس شخص پر تعجب کرتا ہوں جو دنیا میں اس کے گھر کو تلاش کرتا ہے وہ اپنے دل کے اندر اس کے مشاہدے کی خواہش کیوں نہیں کرتا۔ گھر کی طلب میں ممکن ہے کہ وہ گھر کو پا جائے اور ممکن ہے کہ وہ گھر کو نہ پا سکے۔ حالانکہ مشاہدے کی طلب تو ہر حال میں رہنی چاہیے۔ اگر اس پتھر کی عمارت کی زیارت، جس پر سال میں ایک مرتبہ نظر پڑتی ہے فرض کر دی گئی ہے تو وہ دل جس پر شبانہ روز تین سو ساٹھ مرتبہ نظر پڑتی ہے اس کی زیارت تو بدرجہء اولیٰ کرنی چاہیے۔ بایں ہمہ محققین کے نزدیک مکہ کے راستے میں ہر قدم پر نیکی ہے اور جب وہ حرم میں داخل ہو جاتا ہے تو وہ ہر قدم کے عوض ایک خلعت پاتا ہے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جسے عبادت کا اجر و ثواب دوسرے دن ملے تو اس سے کہہ دو کہ آج عبادت نہ کرے۔ حالانکہ عبادت و مجاہدے کے ہر سانس پر توفی الحال ثواب ملتا ہے۔ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ پہلے حج میں میں نے خانہء کعبہ کے سوا کچھ نہیں دیکھا اور دوسری مرتبہ میں نے خانہء کعبہ کے ساتھ اس کے مالک کو بھی دیکھا لیکن تیسری مرتبہ میں

صرف خانہء کعبہ کے مالک ہی کو دیکھ سکا۔اور خانہء کعبہ نظر نہیں آیا۔

غرضکہ جو حرم میں داخل ہو جاتا ہے وہ تعظیم کا مشاہدہ کرتا ہے اور جسے سارا جہان قربت کی میعاد، اور محبت کی خلوت گاہ نظر نہ آئے وہ ابھی محبت و دوستی کی منزل سے بہت دور ہے۔ چونکہ جب بندہ مشاہدہ میں ہوتا ہے تو اس کے لئے سارا جہان حرم ہو جاتا ہے اور جب بندہ محجوب ہو تو اس کے لئے حرم بھی جہان میں تاریک تر جگہ معلوم ہوتی ہے:۔

''اظلم الاشیاء دار الحبیب بلا حبیب۔''	سب سے تاریک گھر وہ ہے جو گھر محبوب سے خالی ہو۔

لہٰذا مقام خلت میں مشاہدے کی قیمت، اپنے وجود کی فنا سے متعلق ہے اس لئے کہ اللہ تعالےٰ نے کعبہ کی دید کو اس کا سبب بنایا ہے نہ کہ اس کی قیمت۔ بایں ہمہ مسبب کو ہر سبب کے ساتھ تعلق رکھنا چاہئے کیونکہ کسی کو پتہ نہیں کہ عنایت الٰہی کس مقام سے اس کی طرف توجہ فرمائے کہاں سے اس کا ظہور ہو اور طالب کی مراد، کس جگہ سے نمودار ہو۔ لہٰذا جوانمردوں کی مراد، قطع بیابان اور صحرا نوردی سے ہی ہے۔ نہ کہ عین حرم۔ کیونکہ دوست کے لیے تو محبوب کا گھر یعنی حرم کا دیکھنا حرام ہے۔ بلکہ مجاہدے کا مطلب یہی ہے کہ اس کے ہر شوق میں بے قراری اور بے چینی ہمیشہ قائم رہے

ایک شخص حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس آیا۔ آپ نے اس سے پوچھا کہاں سے آئے ہو؟ اس نے کہا کہ حج کر کے آیا ہوں۔ آپ نے فرمایا حج کر لیا؟ اس نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا جب تم اپنے مکان سے چلے، وطن سے کوچ کیا اس وقت کیا تم نے گناہوں سے بھی کوچ کر لیا تھا؟ اس نے کہا نہیں، فرمایا پھر تم نے کوچ ہی نہ کیا اس کے بعد فرمایا جب تم گھر سے چلے اور ہر منزل میں رات کو قیام کیا تو تم نے راہ حق کا قیام بھی طے کیا؟ اس نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا تم نے کوئی منزل طے نہیں کی۔ پھر فرمایا جب تم نے میقات سے احرام باندھا تو کیا تم بشری صفات سے جدا ہو گئے تھے؟ اس نے کہا نہیں۔ فرمایا تو تم محرم بھی نہ ہوئے۔ پھر فرمایا جب تم نے عرفات میں وقوف کیا تھا تو کیا مجاہدے کے کشف میں بھی وقوف کیا تھا؟ اس نے کہا نہیں...... فرمایا تمہیں عرفات کا وقوف بھی میسر نہ آیا۔ پھر فرمایا جب تم مزدلفہ میں اترے تھے اور تمہاری مُراد بر آئی تھی تو کیا تم نے تمام نفسانی خواہشوں کو چھوڑ دیا تھا؟ اس نے کہا نہیں۔ فرمایا بس تو مزدلفہ کا نزول بھی حاصل نہ ہوا۔ پھر فرمایا جب تم نے خانہء کعبہ کا طواف کیا تھا تو کیا تم نے

اپنے سر کی آنکھوں سے مقامِ تنزیہہ میں حق تعالیٰ کے جمال کے لطائف کو بھی دیکھا تھا۔؟اس نے کہا نہیں۔فرمایا بس تو طواف بھی حاصل نہیں ہوا۔پھر فرمایا جب تم نے صفا و مروہ کے درمیان سعی کی تھی تو صفا کے مقام اور مروہ کے درجہ کا ادراک کیا تھا؟اس نے کہا نہیں۔فرمایا ابھی سعی بھی نصیب نہ ہوئی پھر فرمایا جب منیٰ میں آئے تھے تو کیا تمہاری ہستیاں تم سے جدا ہوگئی تھیں۔؟اس نے کہا نہیں۔فرمایا ابھی تم منیٰ بھی نہیں پہنچے۔پھر فرمایا جب قربان گاہ میں تم نے قربانی کی تھی اس وقت نفسانی خواہشوں کی بھی تم نے قربانی کی تھی۔؟اس نے کہا نہیں۔فرمایا بس تو قربانی بھی نہیں ہوئی۔پھر فرمایا جب تم نے جمرات پر سنگریزے پھینکے تھے اس وقت تمہارے ساتھ جو نفسانی تمنائیں تھیں کیا ان سب کو بھی پھینک دیا تھا اس نے کہا نہیں۔فرمایا تم نے سنگریزے بھی نہیں پھینکے اور حج بھی نہیں کیا۔جاؤ ان صفات کے ساتھ پھر حج کرو۔تاکہ مقامِ ابراہیم علیہ السلام تک رسائی ہو۔

میں نے سنا ہے کہ ایک بزرگ خانہ کعبہ کے سامنے بیٹھے ہوئے رو رہے تھے اور یہ اشعار ورد زبان تھے

واصبحت یوم النحر والعیر ترحل
وکان حدی الحادی ینادی و معجل

قربانی کے دن میں نے صبح کی جب کہ سفید اونٹ کوچ کر رہے تھے
اور حدی خوانوں کے ساتھ حدی بھی جو بلا رہے تھے اور جلدی کر رہے تھے

وانا سائل عن سلمٰی فھل من مخبر
بان لہ علمیاً بھا این تنزل

اور میں سلمٰی کے متعلق دریافت کر رہا تھا کہ کیا کوئی خبر دینے والا ہے
جسے معلوم ہو کہ کہاں پر اترنا ہے۔

لقد افسدت حجی و نسکی و عمرتی
وفی البین لی شغل عن الحج مشغل

یقیناً میرا حج اور میری قربانی اور عمرہ برباد ہوگئے۔
چونکہ میرے لئے جدائی میں رکاوٹ ہے جو حج سے مجھے روکے ہوئے ہے

سارجع من عام لحجۃ قابلٍ،
فان الذی قد کان لا یتقبل

آئندہ سال دوبارہ حج کے لئے آوں گا کیوں کہ اس کی
حقیقت تو یہ ہے کہ یہ نامقبول ہوا......

حضرت فضیل بن عیاض رحمتہ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے موقف میں ایک جوان کو سر جھکائے کھڑا دیکھا۔ تمام لوگ تو دعائیں مانگ رہے ہیں مگر وہ خاموش کھڑا تھا۔ میں نے ا سے کہا اے نوجوان تم دعا کیوں نہیں مانگتے اور اظہارِ مسرت کیوں نہیں کرتے؟ اس نے کہا وحشت ہو رہی ہے کہ جو وقت میں رکھتا تھا وہ مجھ سے ضائع ہو گیا ہے اب میرا منہ دعا مانگنے کے قابل نہیں رہا۔ میں نے اس سے کہا کہ تمہیں دعا مانگنی چاہئے تھی ممکن ہے کہ حق تعالےٰ ان لوگوں کے مجمع کے طفیل تمہیں تمہاری مراد عطا فرما دے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ اس نوجوان نے ارادہ کیا کہ ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگے مگر اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ گر پڑا اور اس کی روح پرواز کر گئی۔

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک جوان کو منیٰ میں بیٹھے دیکھا۔ سب لوگ تو اپنی اپنی قربانیوں میں مشغول تھے مگر میں اس فکر میں تھا کہ وہ کون ہے اور کیا کرتا ہے؟ یہاں تک کہ اس نے کہا کہ اے خدا، تمام لوگ تو جانوروں کی قربانی دے رہے ہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ اپنے نفس کی قربانی تیرے حضور پیش کروں تو اسے قبول کر، یہ کہہ کر نوجوان نے انگشتِ شہادت کا اشارہ اپنے حلقوم پر کیا اور وہ گر پڑا۔ جب میں نے قریب جا کر دیکھا تو وہ فوت ہو چکا تھا۔

واضح رہنا چاہئے کہ حج کی ۲ قسمیں ہیں۔ ایک غیبت میں دوسرے حضور میں! چنانچہ

مکہ کا حج غیبت میں ہے اور ایسا ہی ہے جیسا کہ اپنے گھر میں غیبت میں تھا۔ اس لئے کہ ایک غیبت دوسری غیبت سے بہتر نہیں ہوتی اور جو اپنے گھر میں حضور میں ہو وہ ویسا ہی ہے جیسا کہ مکہ میں حاضر ہے۔ اس لئے کہ کوئی حضور دوسرے حضور سے بہتر نہیں اور حج، کشفِ مجاہدہ کے لئے ایک مجاہدہ ہے اور مجاہدہ، مشاہدے کی علت نہیں ہوتا بلکہ اس کا سبب ہوتا ہے۔ معانی کی حقیقت میں، سبب کچھ زیادہ موثر نہیں ہوتا۔ لہٰذا حج کا مقصود، خانہ کعبہ کا دیدار نہیں ہے بلکہ کشف کا مقصود مشاہدہ ہے۔ اب میں مشاہدہ کا عنوان قائم کر کے اس کے معانی کو بیان کرتا ہوں تا کہ حصولِ مقصد میں آسان ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

انیسواں باب

مشاہدہ کا بیان

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ:۔

”اجیعوا بطونکم، دعوا الحرص واعروا اجسادکم واقصرو الامل واظمأو اکبادکم دعوا الدنیا لعلکم ترون اللہ بقلوبکم“	اپنے شکموں کو بھوکا رکھو، لالچ کو چھوڑ دو جسموں کی زیبائش نہ کرو، خواہش کو کم کرو دل وجگر کو پیاسا رکھو، دنیا سے کنارہ کشی کرو تا کہ تمہارے دل اللہ کا مشاہدہ کرسکیں۔

نیز حدیث جبریل میں ان کے سوال کے جواب میں فرمایا:۔

ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک۔	تم خدا کی اس طرح عبادت کرو کہ گویا تم اس کا مشاہدہ کر رہے ہو اگر ایسا نہ کرسکو تو یوں سمجھو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ:

”یا داؤد اتدری مامعرفتی قال لا قال ھی حیات القلب فی مشاھدتی“

اے داؤد تم جانتے ہو کہ میری معرفت کیا ہے؟ عرض کیا نہیں۔ فرمایا وہ دل کی زندگی ہے جو میرے مشاہدے سے پیدا ہوتی ہے۔

مشائخ طریقت کے نزدیک، عبادت سے مراد، چشم قلب سے مشاہدہ کرنا ہے گویا وہ بے کیف وکم، خلوت وجلوت میں چشم دل سے حق تعالےٰ کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

حضرت ابوالعباس بن عطار حمتہ اللہ علیہ آیہ کریمہ کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ:۔

ان الذین قالوا ربنا اللہ بالمجاھدۃ ثم استقاموا علی بساط المشاھدۃ	جنھوں نے مجاہدے میں کہا ہمارا رب اللہ ہے تو وہ مشاہدے کے فرش پر استقامت رکھتے ہیں۔

مشاہدے کی حقیقت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک صحت یقین دوسرے ایسا غلبہء محبت جس سے ایسا درجہ حاصل ہو جائے کہ مکمل طور پر دوست کی ہر بات میں وہی نظر آئے اور اس کے سوا کچھ نظر نہ آئے۔

حضرت محمد بن واسع رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

ما رأیت شیئًا قط الا ورأیت اللّٰه فیه ای بصحة الیقین۔	میں کسی چیز کو نہیں دیکھتا سوائے اس کے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ صحتِ یقین کے ساتھ ہوتا ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ:۔

ما رأیت اللّٰه شیئًا و رأیت اللّٰه فیه۔	میں نے خدا کے سوا کچھ نہ دیکھا ہر شئی میں پہلے خدا کا جلوہ ہی نظر آتا ہے۔

یہ حالت اس مشاہدے کی ہے جن کو مخلوق میں خدا کا جلوہ نظر آتا ہے۔

حضرت شبلی علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں کہ:۔

ما رأیت اللّٰه شیئًا قط الا اللّٰه یعنی بغلبات المحبة و غلیان المشاهدة۔	کوئی چیز اللہ کے سوا مجھے نظر آتی ہی نہیں یعنی یہ حالت غلبۂ محبت اور مشاہدے کے جوش کی وجہ سے ہے۔

معلوم ہوا کہ کوئی فعل کو دیکھتا ہے اور اس فعل کی دید میں بچشم سر، فاعل کو دیکھتا ہے اور کوئی بچشم سر فعل کی رویت میں، فاعل کی محبت میں ایسا فنا ہوتا ہے کہ اسے تمام اشیاء حتیٰ کہ اپنے وجود میں بھی فاعل ہی نظر آتا ہے۔ لہٰذا یہ پہلا طریقہ استدلالی ہے اور دوسرا طریقہ جذباتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک استدلال کرتا ہے تاکہ اثبات و دلائل سے حق اس پر عیاں ہو جائے اور دوسرا جذب و شوق میں مغلوب اور وارفتہ ہوتا ہے اور اسے دلائل و حقائق حجاب نظر آتے ہیں۔

لان من عرف شیئًا لا یطمئن غیره ومن احب شیئًا لا یطالع غیره فیترك المنازعة مع اللّٰه والا عتراض علیه فی احکامه و افعاله۔	اس لئے کہ جو کچھ معرفت رکھتا ہے وہ غیر سے چین نہیں پاتا اور جو محبت رکھتا ہے وہ غیر کو نہیں دیکھتا لہٰذا وہ فعل پر جھگڑتا نہیں کہ وہ جھگڑالو بنے اور نہ اس کے فعل و حکم پر اعتراض کرتا ہے کہ وہ متصرف بنے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول علیہ السلام کے ذریعہ ان کے معراج کی خبر ہمیں دی اور فرمایا

ما زاغ البصر وما طغٰی من شدة شوقه الی اللّٰه تعالٰی	یعنی اللہ تعالیٰ کے دیدار کے شوق کی شدت میں آنکھ کو کسی چیز کی طرف نہ پھیرا۔

تاکہ جو لائق ہو دل کے یقین کی ساتھ دیکھیں۔ جب بھی محبّ اپنی آنکھ کو موجودات کے دیکھنے

سے بند کرتا ہے وہ یقیناً اپنے دل میں موجودات کے خالق کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

لقد رای من آیات ربہ الکبریٰ۔

بلاشبہ انھوں نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

رب العزت تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے:۔

قل للمومنین یغضوا من ابصارھم ای ابصار العیون من الشھوات وابصار القلوب من المخلوقات۔

اے محبوب! تم مسلمانوں سے فرمادو کہ وہ اپنی آنکھیں بند رکھیں...... یعنی سر کی آنکھوں کو شہوات سے اور دل کی آنکھوں کو مخلوقات کی طرف دیکھنے سے

جو شخص چشمِ سر کو مجاہدے کے اندر شہوت سے بند رکھتا ہے یقیناً وہ باطنی آنکھ سے حق تعالیٰ کا مشاہدہ کرتا ہے۔

فمن اکثر اخلص مجاھدۃ کان اصدق مشاھدۃ۔

جو کثرت اخلاص کے ساتھ مجاہدہ کرتا ہے وہ مشاہدے میں سب سے زیادہ صادق ہوتا ہے۔

اسی بنا پر باطنی مشاہدہ ظاہری مجاہدہ کے ساتھ وابستہ ہے۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

من غض بصرہ عن اللہ طرفۃ عین لا یھتد طول عمرہ

جو شخص ایک لمحہ کے لئے بھی حق تعالےٰ کی طرف سے آنکھیں بند رکھتا ہے تمام عمر وہ ہدایت نہیں پاتا۔

اس لئے کہ غیر کی طرف التفات، غیرحق سے تعلق رکھنا ہے اور جو غیر کے ساتھ ہوتا ہے وہ ہلاکت میں پڑ جاتا ہے۔ بایں وجہ اہل مشاہدہ کی وہی عمر قابلِ شمار ہوتی ہے جو مشاہدے میں صرف ہو اور جتنی عمر غیوبت میں گزری وہ اسے شمار نہیں کرسکتا۔ درحقیقت یہ ان کی موت کا زمانہ ہے۔ چنانچہ حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ سے جب لوگوں نے عمر دریافت کی تو فرمایا چار سال۔ لوگوں نے پوچھا یہ کس طرح؟ فرمایا گذشتہ ستر سال کی عمر، حجاب وغیبت میں گزری ہے اور میں نے اس میں مشاہدہ نہیں کیا۔ صرف یہ چار سال ہیں جس میں مشاہدہ کیا ہے۔ زمانہ حجاب کی عمر قابلِ شمار نہیں ہے۔

حضرت شبلی علیہ الرحمتہ اپنی دعا میں کہا کرتے کہ

اے خدا جنت و دوزخ کو اپنے غیب کے خزانوں میں پوشیدہ رکھ اور ان کی یاد لوگوں کے دلوں سے فراموش کر دے تا کہ ہم بغیر کسی واسطہ کے خالص تیری عبادت کرسکیں۔	"اللهم اخبأ الجنة والنار فی جنایا غیبک حتی نعبدک بغیر واسطة۔

جب طبیعت کو حصول جنت کا لالچ ہوگا تو یقینی طور پر ہر عقلمند اسی کے حصول کے لئے عبادت کرے گا اور جس دل میں محبت کا حصہ نہ ہو وہ غافل ہے یقیناً وہ مشاہدے سے حجاب میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے شب معراج کے سلسلہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو خبر دی کہ میں نے خدا کو نہیں دیکھا اور حضرت ابن عباس روایت کرتے ہیں کہ آپ نے مجھے بتایا کہ میں نے خدا کو دیکھا۔ لوگ اس اختلاف میں پڑے ہوئے ہیں لیکن جس نے غور کیا وہ اس اختلاف سے نکل گیا۔ چنانچہ جس سے یہ فرمایا کہ میں نے دیکھا۔ اس نے چشم باطن سے دیکھنا مراد لیا اور جس سے یہ فرمایا کہ میں نے نہیں دیکھا اس سے چشم سر سے دیکھنا مراد لیا۔ کیونکہ ان دونوں میں ایک صاحب باطن ہے اور دوسرا اہلِ ظاہر۔ ہر ایک سے اس کے حالات کے بموجب کلام فرمایا۔ لہٰذا جب باطنی آنکھ سے دیکھا تو اگر سر کی آنکھ کا واسطہ نہ ہو تو کیا مضا نقہ۔؟

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر حق تعالیٰ مجھ سے فرمائے کہ مجھے دیکھ، تو میں عرض کروں گا کہ میں نہیں دیکھتا کیونکہ آنکھ، محبت میں غیر اور بیگانہ ہے۔ اور غیریت کی غیرت مجھے دیدار سے باز رکھتی ہے۔ کہ میں دنیا میں اسے آنکھ کے واسطہ سے دیکھوں۔ اور آخرت میں واسطہ کا کیا کروں گا خدا ہی ہدایت فرمانے والا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

وانی لاحسد ناظری علیک

فاغض طرف اذا نظرت الیک

یقیناً میں تیری طرف نظر اٹھانے میں حسد کرتا ہوں۔

اور جب تیری طرف دیکھتا ہوں تو آنکھوں کو بند رکھتا ہوں

کیونکہ محبوب کو آنکھ سے چھپاتے ہیں۔ اس لئے کہ آنکھ بیگانہ اور غیر ہے۔ لوگوں نے حضرت شیخ سے دریافت کیا کہ کیا آپ چاہتے ہیں کہ خدا کا دیدار ہو؟ فرمایا نہیں۔ پوچھا کیوں؟ فرمایا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چاہا تو انہیں دیدار نہ ہوا اور حضور اکرم ﷺ نے نہ چاہا تو دیدار ہوا؟ لہٰذا ہمارا چاہنا دیدارِ خداوندی میں ہمارے لئے بہت بڑا حجاب ہے کیونکہ ارادہ کا وجود،

محبت کے اندر مخالفت ہوتی ہے اور مخالفت حجاب ہے اور جب دنیا میں ارادہ فنا ہوجاتا ہے تب مشاہدہ حاصل ہوتا ہے اور جب مشاہدہ ثابت و برقرار ہوجائے تو دنیا آخرت کی مانند اور آخرت دنیا کی مانند ہوجاتی ہے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

ان لِلّٰہ عباد لو حجبوا عن اللّٰہ فی الدنیا والاٰخرہ لارتدوا۔	اللہ تعالےٰ کے کچھ بندے ایسے ہیں کہ اگر دنیا وآخرت میں وہ اللہ تعالیٰ سے ایک لمحہ کی لئے محجوب ہوجائیں تو وہ مرتد ہوجائیں

مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کو دائمی مشاہدہ میں پرورش فرماتا اور اپنی محبت کی حیات میں ان کو زندہ رکھتا ہے۔ لامحالہ جب صاحب مشاہدہ محجوب ہوجائے تو وہ مردودِ بارگاہِ الٰہی ہوجاتا ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں مصر کے بازار میں جا رہا تھا میں نے دیکھا کہ ایک جوان کو بچے پتھر مار رہے ہیں میں نے بچوں سے پوچھا تم اس سے کیا چاہتے ہو بچوں نے کہا یہ دیوانہ ہے۔ میں نے پوچھا تم نے اس کے جنون کی کیا علامت دیکھی ہے؟ بچوں نے کہا۔ یہ کہتا ہے کہ میں خدا کو دیکھتا ہوں۔ اس کے بعد میں جوان کی طرف متوجہ ہوا اس سے پوچھا کہ اے جوان کیا تم یہ کہتے ہو کہ یا یہ بچے تم پر الزام رکھتے ہیں؟ جوان نے کہا یہ الزام نہیں رکھ رہے بلکہ میں یہی کہتا ہوں۔ کیونکہ اگر ایک لمحہ کے لئے حق کو نہ دیکھوں اور محجوب رہوں تو میں اس کی برداشت نہیں رکھ سکتا۔

البتہ اس مقام میں بعض لوگوں کو اربابِ مشاہدہ کے بارے میں غلطی لاحق ہوئی ہے وہ یہ گمان رکھتے ہیں کہ دلوں کی رویت اور ان کا مشاہدہ، دل میں کوئی صورت بناتی ہے جسے ذکر یا فکر کی حالت میں وہم برقرار و قائم رکھتا ہے۔ حالانکہ یہ تشبیہ محض اور کھلی گمراہی ہے۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ کے لئے کوئی اندازہ نہیں ہے جس کا اندازہ دل کے وہم کو ہوسکے اور ہر عقل اس کی کیفیت سے باخبر ہوسکے۔ جو چیز موہوم ہوتی ہے وہ بھی وہم کے قبیل سے ہے اور جو چیز عقل میں سما سکے وہ بھی عقل کی جنس سے تعلق رکھتی ہے حق تعالیٰ کے لئے کسی جنس کے لئے ہم جنسی نہیں ہے۔ لطافت و کثافت دونوں جنس کے قبیل سے ہیں جو محل میں ایک دوسرے کی ضد اور ایک دوسرے کی جنس ہیں۔ لہٰذا توحید کے تحقق میں اور قدیم کے پہلو میں ضد جنس ہے۔ کیونکہ تمام اضداد محدث و مخلوق

ہیں اور تمام حوادث یک جنس ہیں۔ تعالی اللّٰہ عن ذالك عما یصفه الملاحدة علوا کبیرا۔

دنیا میں مشاہدہ، آخرت میں دیدار کے مانند ہے اور جب تمام اہلِ علم کا اجماع اور اتفاق ہے کہ آخرت میں دیدار جائز ہے تو لامحالہ دنیا میں بھی مشاہدہ جائز ہے لہٰذا جو عقبیٰ میں مشاہدہ کی خبر دے اور جو دنیا میں مشاہدے کی خبر دے ان دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے اور جو ان دونوں معنی کی خبر دیتا ہے وہ اجازت سے خبر دیتا ہے نہ کہ محض دعویٰ سے۔ یعنی وہ یہ کہتا ہے کہ دیدار و مشاہدہ دونوں جائز ہیں لیکن وہ یہ نہیں کہتا کہ مجھے دیدار ہوا ہے یا اب یہ حاصل نہیں ہے اس لئے کہ مشاہدہ باطن کی صفت ہے اور خبر دینا زبان کی تعبیر ہے اور جب زبان، باطن کی خبر دے تو یہ عبادت ہوتی ہے مشاہدہ نہیں ہوتا۔ بلکہ دعوی ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جس چیز کی حقیقت عقلوں میں نہ سما سکے اسے زبان کیسے تعبیر کر سکتی ہے۔ بجز مجازی معنی کے۔

لان المشاهدة قصر اللسان بحضور الجنان۔	مشاہدہ، زبان کی عاجزی کے ساتھ قلوب کا حضور ہے۔

اس کے معنی کی تعبیر میں زبان کو خاموش رکھنا بلند درجہ رکھتا ہے۔ کیونکہ خاموشی مشاہدے کی علامت ہے اور گویائی شہادت کی نشانی ہے اور کسی چیز کی شہادت دینے اور کسی چیز کے مشاہدہ کرنے میں بہت بڑا فرق ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے اس درجہ قرب اور مقام اعلیٰ پر فائز ہو کر جسے حق تعالےٰ نے آپ کے لئے مخصوص فرمایا تھا کہا!۔

”لا احصی ثناء علیك“	میں تیری ثنا کو محدود نہیں کر سکتا۔

کیونکہ آپ مشاہدے میں تھے اور محبت و دوستی کے درجہ میں مشاہدہ کمال یگانگت رکھتا ہے۔ اور یگانگی کی تعبیر کرنا بے گانگی اور غیریت ہوتی ہے۔ اس وقت آپ نے کہا:۔

انت کما اثنیت علٰی نفسك	تو وہی ہے جیسا کہ تو نے خود اپنی ثنا فرمائی ہے۔

اس جگہ تیرا فرمایا ہوا میرا ہی عرض کرنا ہے۔ یعنی تیری ثنا کرنا میری ثنا ہے۔ میں اپنی زبان کو اس لائق نہیں سمجھتا۔ کہ وہ میری حالت کو بھی بیان کرے اور میں بیان کو بھی اس کا مستحق نہیں سمجھتا کہ وہ میرا حال ظاہر کرے اسی معنی میں کسی کہنے والے نے کہا ہے

تمنیت من اهوی فلما رأیتة

بهت فلم املك لسانا ولا طرفا

جسے میں دوست رکھتا تھا میں نے اس کی تمنا کی۔ پھر جب میں نے اسے دیکھا تو حیرت زدہ ہو کر رہ گیا اور اپنی زبان اور اپنے کسی عضو کا مالک نہ رہا

بیسواں باب

نواں کشفِ حجاب

صحبت اور اس کے آداب و احکام کے بیان میں

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

یا ایھا الذین اٰمنوا قوا انفسکم واھلیکم نارًا ای ادبوا ھم۔	اے ایمان والو اپنی جانوں اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ یعنی ان کی درستگی کرو۔

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

حسن الادب من الایمان۔	حسنِ ادب ایمان کا حصہ ہے۔

نیز فرمایا:

ادبنی ربی فاحسن تادیبی	میرے رب نے مجھے ادب سکھایا اور بہت اچھا ادب مجھے سکھایا۔

دین و دنیا کے تمام امور کی شائستگی، آداب سے وابستہ ہے اور ہر قسم کے لوگوں کے مقامات کے لئے ہر مقام کے آداب جداگانہ ہیں۔ تمام انسان، خواہ وہ کافر ہوں یا مسلمان، ملحد ہوں یا موحد، سنی ہو یا مبتدع سب کا اس پر اتفاق ہے کہ معاملات میں حسنِ ادب عمدہ چیز ہے اور جہان میں کوئی رسم و رواج، استعمالِ ادب کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتی۔ لوگوں میں ادب ہی مروت کی حفاظت ہے اور دین میں سنت کی حفاظت اور دنیا میں عزت و احترام کی حفاظت بھی اسی ادب سے متعلق ہے کیونکہ یہ تینوں ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ جس میں مروت نہ ہو گی وہ سنت کا متبع نہ ہو گا اور جس میں سنت کی حفاظت نہ ہو گی اس میں عزت و احترام کی رعایت بھی نہ ہو گی۔

معاملات یعنی طریقت کے سلوک میں حفظِ ادب، مطلوب کی تعظیم سے حاصل ہوتی ہے۔ یعنی دلوں میں حق تعالیٰ اور اس کے مغائرت کی عظمت و عزت ہر طریقت میں یہ تعظیم، تقوی

سے حاصل ہوتی ہے اور جو تعظیم کی بے حرمتی کرتا ہے اور مشاہدۂ حق کو پائمال کرتا ہے طریق تصوف میں اس کا کوئی مقام نہیں ہے۔ سکر و غلبہ یا کسی اور حال میں ہونا طالب کو ادب کی حفاظت سے منع نہیں کرتا اس لئے کہ ادب ان کی عادت ہے اور عادت، طبیعت کی مانند ہوتی ہے۔ ہر جاندار سے کسی حالت میں طبائع کی جدائیگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جب تک کہ اس کی زندگی برقرار ہے اس کا افتراق اس سے محال ہے۔ لہٰذا جب تک انسان کا تشخص برقرار ہے ہر حال میں ادب کی پیروی لازم ہے۔ خواہ تکلف سے ہو یا بے تکلف! جب ان کا حل صحت مندی میں ہوتا ہے تو وہ بہ تکلف آداب کی رعایت برتتے ہیں اور جب ان کا حال سکر و مدہوشی میں ہوتا ہے اس وقت حق تعالیٰ انہیں ادب پر قائم رکھتا ہے غرض کہ کسی حالت میں بھی دل، ادب سے روگرداں نہیں ہوتا۔

لان المودة عند الادب وحسن الادب صفة الاحباب۔	کیونکہ محبت، بہترین ادب ہے۔ اور حسنِ ادب محبت کرنے والوں کی صفت ہے۔

اللہ تعالیٰ جس پر جتنی کرامت فرماتا ہے وہ اس کی دلیل ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ دین کے ادب کی حفاظت کرتا ہے۔ بخلاف ملحدوں کے اس گروہ کے خدا ان پر لعنت کرے جو یہ کہتے ہیں کہ بندہ محبت میں جب غالب ہو جاتا ہے تو حکمِ متابعت اس سے ساقط ہو جاتا ہے یہ خالص بے دینی ہے

ادب کی قسمیں

ادب کی تین قسمیں ہیں ایک، اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کی توحید میں اس طرح پر کہ جلوت و خلوت کی ہر حالت میں خود کو اس کی بے حرمتی سے بچائے اور وہ سلوک برتے جو بادشاہوں کے حضور کیا جاتا ہے۔ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ ایک مرتبہ رسول خدا ﷺ چہار زانو تشریف فرما تھے کہ جبریل علیہ السلام نے حاضر ہو کر پیام پہنچایا:

"یا محمد اجلس جلسة العبد"	نشانِ بندگی کے ساتھ جلوس فرمائیں۔

آپ اللہ کے مقرب بندے ہیں اس کی بارگاہ میں اس کی شان کے لائق جلوس فرمائیں۔

مشائخ بیان کرتے ہیں کہ حضرت حارث محاسبی رحمتہ اللہ علیہ نے چالیس سال تک دن رات کے کسی حصہ میں دیوار سے ٹیک لگا کر کمر سیدھی نہیں کی۔ اور دو زانو کے سوا کسی اور حالت میں نہ بیٹھے۔ لوگوں نے عرض کیا آپ اتنی تکلیف و مشقت کیوں برداشت کرتے ہیں؟ فرمایا مجھے شرم آتی ہے کہ میں حق تعالیٰ کے مشاہدے میں اس طرح نہ بیٹھوں جس طرح بندہ بیٹھتا ہے۔

حضور سیدنا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے خراسان کے ایک شہر بلند نامی میں ایک شخص کو دیکھا جو بہت مشہور تھا اور لوگ اسے بلند ادیب کہتے تھے وہ بڑا صاحبِ فضیلت تھا

اس نے بیس سال قدموں پر کھڑے گزار دیئے سوائے نماز میں تشہد کے کبھی نہ بیٹھا۔ میں نے اس سے اس کی وجہ دریافت کی تو اس نے کہا ابھی مجھے وہ درجہ حاصل نہیں ہوا ہے کہ میں مشاہدہ حق میں بیٹھ سکوں۔

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ سے کسی نے دریافت کیا "بما وجدت ما وجدت" "آپ نے جو کچھ پایا ہے وہ کس چیز کی بدولت پایا" "قال بحسن الصحبة مع اللہ" "فرمایا اللہ تعالٰی کے ساتھ حسنِ صحبت کی وجہ سے۔" چنانچہ میں نے حق تعالٰی کے ساتھ اتنا ہی جلوت میں ادب اور حسنِ صحبت کو ملحوظ رکھا ہے جتنا خلوت میں۔ اہلِ جہان کو چاہئے کہ اپنے معبود کے مشاہدہ میں ادب کی حفاظت کا سلیقہ زلیخا سے سیکھیں۔ جس وقت اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ خلوت وتنہائی کی اور حضرت یوسف علیہ السلام سے اپنی خواہش کی تکمیل کی درخواست کی تو اس نے پہلے اپنے بت کے چہرے کو کسی چیز سے ڈھانپ دیا تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس سے پوچھا یہ کیا کر رہی ہو؟ اس نے کہا اپنے معبود کے چہرے کو چھپا رہی ہوں تاکہ وہ بے حرمتی میں مجھے آپ کے ساتھ نہ دیکھے۔ کیونکہ یہ شرائطِ ادب کے خلاف ہے اور جب حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام باہم ملے اور انہیں جمال یوسفی سے ہم آغوش کیا تو زلیخا کو جوان کر کے دینِ حق کی راہ دکھائی تب حضرت یوسف علیہ السلام کی زوجیت میں دیا۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کی طرف قصد فرمایا تو زلیخا آپ سے بھاگی۔ فرمایا اے زلیخا کیا میں تیرا دلربا نہیں ہوں؟ غالباً میری محبت تمہارے دل سے جاتی رہی ہے؟ زلیخا نے عرض کیا خدا کی قسم! یہ بات نہیں محبت اپنی جگہ برقرار ہے بلکہ زیادہ ہے لیکن میں نے ہمیشہ اپنے معبود کی بارگاہ کے ادب کو ملحوظ رکھا ہے اس دن جب کہ ہمارے تمہارے درمیان خلوت ہوئی تھی اس وقت میرا معبود ایک بت تھا جو قطعاً دیکھ نہیں سکتا تھا مگر اس کے باوجود اس کی بے نور دو آنکھیں تھیں اس پر میں نے پردہ ڈال دیا تھا تاکہ بے ادبی کی تہمت مجھ سے اُٹھ جائے اب میرا معبود ایسا ہے جو دانا اور بینا ہے جس کے لئے دیکھنے کا نہ حلقہ ہے اور نہ کوئی آلہ؟ مگر میں جس حال میں بھی ہوں وہ مجھے دیکھتا ہے اس لئے میں نہیں چاہتی کہ اس کی بارگاہ میں ترک ادب کا الزام مجھ پر عائد ہو۔

حضور اکرم ﷺ کو شبِ معراج میں لے جایا گیا تو آپ نے حفظ ادب میں کونین کی طرف نظر نہیں اُٹھائی یہاں تک کہ اللہ تعالٰی نے فرمایا۔

"مازاغ البصر وما طغٰی۔"	نہ آنکھ جھپکی اور نہ بے راہ ہوئی۔

یعنی دنیا کی طرف نظر کرنے میں نہ آنکھ بھٹکی اور نہ آخرت کے دیکھنے میں آنکھ بے راہ ہوئی۔

ادب کی دوسری قسم معاملات میں اپنے ساتھ ہے۔ وہ اس طرح کہ ہر حال میں اپنے ساتھ مروت کو ملحوظ رکھے۔ یہاں تک کہ لوگوں کی صحبت ہو یا حق تعالیٰ کی بارگاہ کی حاضری خواہ جلوت ہو یا خلوت کسی حال میں بے ادبی کا ارتکاب نہ کرے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ سچ کے سوا کلام نہ کرے جو بات اپنے دل کو جھوٹی معلوم ہو اسے زبان پر لانا کیسے درست ہو سکتا ہے کیونکہ اس میں بے مروتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کم کھائے تاکہ طہارت گاہ میں زیادہ نہ جانا پڑے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ کسی کی شرمگاہ کو نہ دیکھے حتیٰ کہ اپنی شرم گاہ بھی مجبوری کے سوا نہ دیکھے۔ کیونکہ امیر المومنین حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ کے بارے میں منقول ہے کہ انھوں نے کبھی اپنے پوشیدہ حصہ جسم کو نہیں دیکھا کسی نے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا میں شرم کرتا ہوں کہ اس حصہ جسم کو دیکھوں جس کی جنس پر نظر ڈالنا حرام ہے۔

ادب کی تیسری قسم، لوگوں کے ساتھ صحبت کرنے میں ادب کا لحاظ رکھنا ہے صحبت کے آداب میں بہترین ادب یہ ہے کہ سفر وحضر میں حسنِ معاملہ اور سنّت کی حفاظت کرے۔

آداب کی یہ تینوں قسمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتیں اب میں حتی المقدور ترتیب وار آداب کو بیان کرتا ہوں تاکہ بآسانی سمجھ میں آسکے۔

آدابِ صحبت

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

ان الذین آمنوا وعملوا الصلحت سیجعل لھم الرحمن ودًا، ای بحسن رعایتھم الاخوان ''جو ایمان لائے اور عمل صالح کیے اللہ ان کو محبوب بنا کر دوست بنالے گا۔ یعنی انھوں نے اپنے دلوں کی حفاظت کی اور اپنے بھائیوں کے حقوق کو ادا کیا اور اپنے مقابلہ میں ان کی بزرگی و شرافت کو دیکھا۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ:۔

ثلٰث لك ودًا خیك لتسلم علیه ان لقیته و توسع له فی المجلس وتدعوه باحب اسمائه۔

حسن رعایت اور حفظ مراتب کے سلسلہ میں مسلمان بھائیوں کی محبت کو تین چیزیں پاکیزہ بناتی ہیں ایک یہ کہ جب کسی سے ملاقات کرو تو اسے سلام کرو دوسرے یہ کہ اپنی مجلسوں میں اس کے لئے جگہ بناؤ تیسرے یہ کہ اسے اچھے القاب کے ساتھ یاد کرو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:۔

انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم۔	تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں لہٰذا اپنے بھائیوں سے صلح و آشتی رکھو۔

مطلب یہ کہ باہم لطف و مہربانی سے پیش آؤ کسی کی دل شکنی نہ کرو۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ:۔

اکثروامن الاخوان فان ربکم حی کریم یستحی ان یعذب عبدہ بین	اپنے بھائی اور زیادہ بناؤ۔ اور ان کے حقوق میں حسن سلوک کرکے بھائی بناؤ کیونکہ
اخوتہ یوم القیمۃ۔	تمہارا رب حی و کریم ہے وہ حیا فرماتا ہے کہ روز قیامت باہمی آداب و معاملات کی وجہ سے اپنے بندے پر اس کے بھائیوں کے درمیان عذاب فرمائے۔

لہٰذا یہی مناسب ہے کہ اپنے بھائی کے ساتھ صحبت لوجہ اللہ کی جائے نہ کہ نفسانی خواہش یا کسی غرض و مفاد کی خاطر، تاکہ وہ بندہ حفظ ادب کی وجہ سے ممنون و متشکر رہو۔

حضرت مالک بن دینار نے اپنے داماد حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا:۔

یا مغیرہ کل اخ وصاحب لم تفدمتہ فی دینك خیرا فانبذ عن	اے مغیرہ جس بھائی یا ساتھی کی رفاقت تمہیں دینی فائدہ نہ پہنچائے تم اس جہان
صحبتہ حتی تسلم۔	میں اس کی صحبت سے بچو تاکہ تم محفوظ رہو۔

اس نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری صحبت یا تو اپنے سے بڑے اور اچھے کے ساتھ ہو گی یا اپنے سے کمتر کے ساتھ۔ اگر اپنے سے بڑے اور اچھے کی رفاقت اختیار کرو گے تو اس سے تمہیں دینی دینوی فائدہ پہنچے گا اور اگر اپنے سے کمتر کے ساتھ بیٹھو گے تو تم سے اس کو دین کا فائدہ پہنچے گا کیونکہ اگر وہ تم سے کچھ حاصل کرے گا تو وہ دینی فائدہ پہنچانا ہوگا اور جو تم اپنے بڑے سے حاصل کرو گے وہ بھی دینی فائدہ حاصل کرنا ہوگا۔

سید عالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ:۔

ان من تمام التقوی تعلم من لا یعلم۔	کمال پرہیزگاری یہ ہے کہ تو بے علم کو علم سکھائے۔

حضرت یحییٰ بن معاذ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:-

بئس الصدیق تحتاج ان تقول له اذکرنی فی دعائك و بئس الصدیق تحتاج ان تعیش معهٔ بالمدارات وبئس الصدیق صدیق یلجیك الی الاعتذار فی زلة کانت منك۔

یعنی وہ دوست بہت بُرا ہے جس کو دعا کرنے کی وصیت کرنی پڑے کیونکہ ایک لمحہ کی صحبت کا حق یہ ہے کہ اسے ہمیشہ دعائے خیر میں یاد رکھا جائے اور وہ دوست بہت بُرا ہے جس کی صحبت، خاطر تواضع کی محتاج ہو کیونکہ صحبت کا سرمایہ ہی یہ ہے کہ ہمیشہ باہمی خوشی و مسرت میں گزرے۔ اور وہ دوست بہت بُرا ہے جس سے گناہ کی معافی مانگنے کی ضرورت پیش آئے اس لئے کہ عذر خواہی بیگانگی کی علامت ہے اور صحبت میں غیریت اور بیگانگی ظلم ہے۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ

المرء علی دین خلیله فلینظر احدکم من یخالل۔

آدمی اپنے دوست کے دین اور اس کے طور و طریق پر ہوتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ وہ دیکھے کہ کس سے دوستی رکھتا ہے۔؟

اگر اس کی صحبت نیکوں کے ساتھ ہے اگرچہ وہ خود نیک نہ ہو تو وہ صحبت نیک ہے۔ اس لئے کہ نیک کی صحبت اسے نیک بنا دے گی اور اگر اس کی صحبت بروں کے ساتھ ہے اگرچہ وہ نیک ہے تو یہ بُرا ہے کیونکہ وہ اس کی بُرائیوں پر راضی ہے اور جو برائیوں پر راضی ہو اگرچہ وہ نیک ہو بہر حال بُرا ہے۔

ایک شخص دورانِ طواف خانہ کعبہ میں دعا مانگ رہا تھا کہ ”اللھم اصلح اخوانی فقیل له لم تدع لك فی هذا المقام“۔ اے خدا میرے بھائیوں کی اصلاح فرما۔ لوگوں نے پوچھا اس مقام میں تم اپنے لئے دعا کیوں نہیں مانگتے بھائیوں کے لئے کیوں دعا کرتے ہو؟ اس نے جواب دیا ان لی اخوانا ارجع الیهم فان صلحوا صلحت معهم وان فسدوا فسدت معهم ۔ میں چونکہ انہیں بھائیوں کی طرف واپس جاؤں گا اگر وہ درست ہوئے تو میں بھی ان کے ساتھ درست رہوں گا اور اگر وہ خراب ہوئے تو میں بھی ان کے ساتھ

خراب ہو جاؤں گا۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ اپنی درستگی مصلحین کی درستگی پر موقوف ہے۔لہذا میں اپنے بھائیوں کے لئے دعا کرتا ہوں تاکہ میرا مقصود ان سے حاصل ہو جائے۔

اس ارشاد و نصیحت کی بنیاد یہ ہے کہ نفس کی عادت ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں سے راحت پاتا ہے اور جس قسم کے لوگوں کی صحبت اختیار کی جائے گی وہ انھیں کی خصلت و عادت اختیار کر لیتا ہے اس لئے کہ تمام معاملات، ارادۂ حق اور ارادۂ باطل سے مرکب ہیں۔ وہ جس ارادے کے معاملات کے ساتھ صحبت رکھے گا اس پر اسی کا غلبہ ہوگا۔ کیونکہ اپنی ارادت، دوسرے کے ارادوں پر مبنی ہے اور طبع و عادت پر ان کی صحبت کا بڑا اثر اور غلبہ ہے۔ یہاں تک کہ باز آدمی کی صحبت میں سدھ جاتا ہے، طوطی آدمی کے سکھانے سے بولنے لگتی ہے، گھوڑا اپنی بہیمانہ خصلت ترک کر کے مطیع بن جاتا ہے یہ مثالیں بتاتی ہیں کہ صحبت کا کتنا اثر و غلبہ ہوتا ہے اور کس طرح وہ عادتوں کو بدل دیتی ہے۔ یہی حال تمام صحبتوں کا ہے۔اسی بنا پر تمام مشائخ سب سے پہلے صحبت کے حقوق کے خواہاں رہتے ہیں اور اپنے مریدوں کو بھی اس کی ترغیب دیتے ہیں۔حتیٰ کہ ان کے نزدیک صحبت کے آداب، اور ان کی مراعات فرض کا درجہ رکھتی ہیں۔گزشتہ مشائخ کی کثیر جماعت نے صحبت کے آداب میں مفصل کتابیں تحریر فرمائی ہیں چنانچہ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ نے ایک کتاب موسومہ "تصحیح الارادۃ" اور حضرت احمد بن خضرویہ بلخی علیہ الرحمتہ نے "الرعایۃ بحقوق اللہ" اور حضرت محمد بن علی ترمذی رحمہ اللہ نے "بیان آداب المریدین" لکھی ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت ابوالقاسم الحکیم، حضرت ابوبکر وراق، حضرت سہل بن عبداللہ تستری حضرت ابوعبدالرحمٰن سلمیٰ اور حضرت استاذ ابوالقاسم قشیری رحمہم اللہ نے بھی اس موضوع پر بھرپور کتابیں لکھی ہیں۔ یہ تمام مشائخ اپنے فن کے امام گزرے ہیں اب تمام طالبانِ طریقت کے لئے اقسامِ آداب میں معاملاتِ مشائخ پر مشتمل چند عنوانات پیش کرتا ہوں بیدہ التوفیق۔

صحبت کے حقوق واضح رہنا چاہئے کہ مریدوں کے لئے سب سے اہم ترین چیز صحبت ہے کیونکہ صحبت کے حق کی رعایت کرنا اہم فرض ہے چونکہ مریدوں کے لئے انفرادی اور علیحدگی کی زندگی گزارنا موجب ہلاکت ہے۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ:۔

الشیطان مع الواحد، وھو من الاثنین ابعد	اکیلے آدمی کے ساتھ شیطان ہوتا ہے اور جب دو ایک ساتھ ہوں گے تو دور رہے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

ما یکون من نجوی ثلثۃ الا ھو رابعھم۔	تم میں جو تین آدمی راز کی باتیں کرتے ہیں ان میں چوتھا حق تعالیٰ ہوتا ہے۔

لہٰذا مرید کے لئے اکیلے رہنے سے بڑھ کر کوئی آفت نہیں ہے۔

صحبت شیخ سے انحراف کا وبال

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے مریدوں میں سے ایک کو یہ خیال گزرا کہ میں درجہءکمال کو پہنچ گیا ہوں اب میرے لئے اکیلا رہنا صحبت سے بہتر ہے۔ چنانچہ وہ گوشہ نشین ہو گیا۔ اور مشائخ کی صحبت چھوڑ دی۔ ایک رات اس نے دیکھا کہ کچھ لوگ ایک اونٹ لے کر آئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ رات تمہیں جنت میں گزارنی چاہئے۔ یہ لوگ اسے اونٹ پر سوار کر کے لے گئے یہاں تک کہ ایسی جگہ لے گئے جو اچھی طرح نظر آتی ہے۔ وہاں حسین و خوبصورت چہروں میں نفیس طعام اور پانی کے چشمے رواں تھے۔ اسے صبح تک وہاں رکھا۔ حالانکہ یہ سب مرید کی خواب کی حالت تھی۔ جب صبح بیدار ہوا تو اپنے حجرے میں اپنے آپ کو پایا۔ یہ سلسلہ اسی طرح روزانہ جاری رہا یہاں تک کہ بشری غرور و رعونت نے غلبہ پایا اور اس کے دل میں جوانی کے گھمنڈ نے اپنا اثر جمایا اور اس کی زبان پر دعویٰ جاری ہو گیا۔ اور کہنے لگا میری حالت اس کمال تک پہنچ گئی ہے اور میری راتیں اس طرح بسر ہوتی ہیں۔ لوگوں نے اس کی خبر حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کو پہنچائی آپ اٹھے اور اس کے حجرے میں تشریف لے گئے اسے اس حال میں پایا کہ اس کے سر میں خواہشیں بھری ہوئی تھیں اور تکبر سے اکڑا ہوا تھا۔ آپ نے اس سے حال دریافت کیا اس نے سارا حال بیان کر دیا حضرت جنید نے فرمایا یاد رکھ جب تو آج رات وہاں پہنچے تو تین مرتبہ "لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم" پڑھنا۔ چنانچہ جب رات آئی اور اسے حسب سابق لے جایا گیا چونکہ وہ اپنے دل میں حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کا انکاری تھا کامل اعتقاد جاتا رہا تھا کچھ عرصہ بعد محض تجربہ کے طور پر اس نے تین مرتبہ لاحول پڑھا تو اسے لے جانے والے تمام لوگ چیخ مار کر بھاگ گئے۔ اور خود کو اس نے نجاست اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پڑا پایا۔ چاروں طرف مردار ہڈیاں پڑی ہوئی ہیں اس وقت اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ دل سے توبہ کی اور ہمیشہ صحبت میں رہنے لگا۔ مرید کے لئے اکیلے رہنے سے بڑھ کر کوئی آفت نہیں۔

صحبت کی شرائط

مشائخ طریقت کی صحبت کی شرط یہ ہے کہ ہر ایک کو ان کے درجہ کے مطابق پہچانے، بوڑھوں کا ادب کرے، ہم جنسوں کے ساتھ عمدہ سلوک سے پیش آئے اور بچوں کے

ساتھ شفقت و محبت کا برتاؤ کرے۔ بوڑھوں کو باپ دادا کی طرح سمجھے۔ہم جنسوں کو بھائیوں کی مانند اور بچوں کو اولاد کی مانند جانے۔ کینہ، حسد اور عداوت و دشمنی سے اجتناب کرے اور کسی کی نصیحت میں کوتاہی نہ کرے۔ صحبت میں کسی کی کوتاہی نہ کرے اور نہ ایک دوسرے کی قول و فعل میں کوتاہی کرے اس لئے کہ لوجہ اللہ صحبت کرنے والے پر لازم ہے کہ رفیق کے کسی قول و فعل پر کبیدہ اور آزردہ خاطر نہ ہو اور اسے اپنے سے اسی بنا پر جدا نہ کرے۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے شیخ المشائخ حضرت ابوالقاسم گرگانی رحمتہ اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ صحبت کی شرط کیا ہے؟ انھوں نے فرمایا یہ ہے کہ صحبت میں اپنی خوشی نہ چاہے کیونکہ صحبت کی سب سے بڑی آفت یہی ہے کہ ہر ایک سے اپنی خوشی کا خواہاں ہوتا ہے۔ایسے شخص کے لئے صحبت کے مقابلہ میں اکیلا رہنا بہتر ہے اور جب وہ اپنی خوشی کو ترک کر دے تو پھر وہ اپنے مصاحب کی خوشیوں کا لحاظ رکھے۔تب وہ صحبت میں کامیابی حاصل کر سکے گا۔

ایک درویش بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں کوفہ سے مکہ مکرمہ کے ارادے سے چلا۔

راستہ میں حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی میں نے ان سے صحبت میں رہنے کی اجازت مانگی انھوں نے فرمایا صحبت میں ایک امیر ہوتا ہے اور دوسرا فرمانبردار، تم کیا منظور کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا آپ امیر بنیں اور میں فرمانبردار، انھوں نے فرمایا اگر فرمانبردار بننا پسند کرتے ہو تو میرے کسی حکم سے باہر نہ ہونا میں نے کہا یہی ہوگا؟ جب ہم منزل پر پہنچے تو انھوں نے فرمایا بیٹھ جاؤ۔میں بیٹھ گیا۔انھوں نے کنویں سے پانی کھینچا جو بہت سرد تھا پھر لکڑیاں جمع کر کے ایک نشیبی جگہ پر آگ جلائی اور مجھے گرم کیا میں جس کام کا ارادہ کرتا وہ فرماتے بیٹھ جاؤ فرمانبرداری کی شرط کو ملحوظ رکھو۔جب رات ہوئی تو شدید بارش نے گھیر لیا۔انھوں نے اپنی گدڑی اتار کر کندھے پر ڈال لی اور رات بھر میرے سر پر سایہ کئے کھڑے رہے۔میں ندامت سے پانی پانی ہوا جا رہا تھا مگر شرط کے مطابق کچھ کر نہیں سکتا تھا۔جب صبح ہوئی تو میں نے کہا اے شیخ! آج میں امیر بنوں گا۔انھوں نے فرمایا ٹھیک ہے۔جب ہم منزل پر پہنچے تو انھوں نے پھر وہی خدمت اختیار کی۔میں نے کہا اب آپ میرے حکم سے باہر نہ ہوجئے فرمایا فرمان سے وہ شخص باہر

ہوتا ہے جو اپنے امیر سے اپنی خدمت کرائے۔ وہ مکہ مکرمہ تک اسی طرح میرے ہم سفر رہے۔ جب ہم مکہ مکرمہ پہنچے تو میں شرم کے مارے بھاگ کھڑا ہوا یہاں تک کہ انھوں نے مجھے منیٰ میں دیکھ کر فرمایا! اے فرزند! تم پر لازم ہے کہ درویشوں کے ساتھ ایسی صحبت کرنا جیسی کہ میں نے تمہارے ساتھ کی ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی دس سال خدمت کی ہے۔ خدا کی قسم، آپ نے کبھی بھی مجھ سے اف تک نہ فرمایا اور نہ میرے کسی کام پر یہ فرمایا کہ یہ کیوں کیا؟ اور نہ کسی کام کے نہ کرنے پر یہ فرمایا یہ کیوں نہیں کیا؟

ہر درویش یا تو مقیم ہوگا یا مسافر۔ مشائخ طریقت کا مشرب یہ ہے کہ مسافر درویش کو چاہئے کہ وہ مقیموں کی خدمت کو اپنے حق میں افضل جانے۔ اس لئے مسافر اپنی تقدیر پر رواں دواں ہے اور مقیم حق تعالےٰ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ کیونکہ مسافروں میں طلب کی علامت ہے اور مقیموں میں پانے کا اشارہ ہے۔ لہٰذا جس نے پایا وہ بیٹھ گیا۔ وہ اس سے افضل ہے جو ابھی مسافرت اور طلب میں ہے۔ اسی طرح مقیموں پر فرض ہے کہ وہ مسافروں کو اپنے سے افضل جانئیں۔ اس لئے کہ مقیم صاحبِ علائق ہیں اور مسافر علائق سے جدا اور اکیلے۔ وہ راہ طلب کے مسافر ہیں اور مقیم دنیا میں حالتِ وقوف میں ہیں۔ اسی طرح بزرگ حضرات کو چاہئے کہ جوانوں کو اپنے پر فوقیت دیں کیونکہ جوان دنیا میں نو وارد ہیں اور ان کے گناہ بہت کم ہیں اور جوانوں پر یہ لازم ہے کہ وہ بزرگوں کو اپنے پر فضیلت دیں کیونکہ وہ عبادت میں ان سے پہلے ہیں اور خدمتِ الٰہی میں مقدم۔ جب یہ سب ایک دوسرے کا اس طرح لحاظ و پاس کریں گے تو یہ سب نجات پا جائیں گے ورنہ ہلاک ہو جائیں گے۔

آداب کی حقیقت آداب کی حقیقت خصائل جمیلہ کا جمع کرنا ہے۔ ادیب کو ادیب اسی لئے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اس پر وارد ہوتا ہے وہ سب نیک ہوتا ہے:۔

فالذی اجتمع فیه خصال الخیر فهو ادیب۔	جس میں نیک خصلتیں زیادہ ہوں وہ ادیب ہے۔

حالانکہ عرف و عادت میں ادیب وہ شخص کہلاتا ہے جو علمِ لغت اور صرف ونحو کے قواعد کا ماہر ہو۔

ادب کے معنی تصوف کے علم میں ادب کے معنی یہ ہیں کہ "الوقوف مع المستحسنات و معناه ان تفعل لله فی الادب سرا وعلانیة واذا کنت

کذالک کنت ادیبا وان کنت اعجمیا وان لم تکن کذالک تکون علیٰ ضدہٖ“

ادب کے معنی نیک اعمال پر قائم رہنے کے ہیں مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ظاہر و باطن میں با ادب معاملات رکھے۔ جب تم ایسے بن جاؤ گے تو ادیب کہلاؤ گے۔ چاہے تم گونگے ہو؟ اور اگر تم نہ بنے تو اس کے برخلاف ہو گے۔

طریقت کے معاملات میں الفاظ و عبارت کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی اور ہر حال میں عاقل سے عالم افضل و بزرگ ہوتا ہے۔

کسی نے کسی بزرگ سے پوچھا کہ ادب کی کیا شرط ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ اس کا جواب اس گفتگو میں موجود ہے جسے میں نے سنا ہے۔ ادب یہ ہے کہ جو بات کہو وہ قول، صادق ہو، جو معاملہ کرو وہ برحق ہو۔ قول صادق اگرچہ سخت و درشت ہو مگر ملیح ہوتا ہے اور برحق معاملہ اگرچہ دشوار ہو مگر نیک ہوتا ہے۔ لہٰذا جب بات کرو تو تمہاری بات میں صداقت ہو اور جب خاموش رہو تو تمہاری خاموشی میں بھی حق و صداقت کار فرما ہو۔

حضرت شیخ ابو نصر سراج صاحب لمعہ رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں آداب کا فرق بیان فرمایا ہے۔ ”ادب میں لوگوں کے تین طبقے ہیں۔ ایک دنیادار جو فصاحت و بلاغت، حفظ علوم اور بادشاہوں کے نام اور عرب کے اشعار کو ادب کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ دوسرا طبقہ اہلِ دین کا ہے جنھوں نے ریاضتِ نفس، تادیب اعضاء، حفظ حدودِ الٰہی اور ترک شہوات کا نام ”ادب“ رکھا ہے۔ اور تیسرا طبقہ اہلِ خصوصیت کا ہے جو دلوں کی طہارت، باطن کا تزکیہ، اسرار کی مراعات، عہد و پیمان کا ایفاء، وقت کی حفاظت، پراگندہ خیالات اور موہوم خطرات کی طرف قلت توجہ، مقام طلب، اوقات حضور، اور مقاماتِ قرب میں حسنِ ادب کو ملحوظ رکھنے کو ادب کہتے ہیں۔“ یہ تعریف جامع ہے اور اس کی تفصیل جگہ بہ جگہ موجود ہے۔ وباللہ التوفیق۔

اقامت کے آداب

جب کوئی درویش سفر کے سوا اقامت اختیار کرے تو اس کے ادب کی شرط یہ ہے کہ جب کوئی مسافر اس کے پاس پہنچے تو وہ خوشی و احترام کے ساتھ پیش آئے اور عزت و تعظیم سے اس کا خیر مقدم کرے۔ گویا وہ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معزز مہمانوں کا ایک مہمان ہے اور اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے مہمان کے ساتھ کرتے تھے۔ گھر میں جو کچھ موجود ہوتا مہمان کے روبرو لا کر رکھ دیتے تھے۔

چنانچہ حق تعالےٰ فرماتا ہے:۔

وہ ایک فربہ بچھڑا تیار کر کے لائے۔	"فجاء بعجل سمين"

اور مہمان سے اتنا بھی دریافت نہ فرمایا کہ کہاں سے آ رہے ہو اور کہاں جا رہے ہو۔ اور کیا نام ہے؟ مہمان کے ساتھ ان کا یہ ادب اور سلوک تھا انھوں نے مہمان کا آنا بھی حق تعالےٰ کی طرف سے جانا اور مہمان کی روانگی بھی حق تعالےٰ ہی کی طرف سمجھی اور اس کا نام بھی بندۂ حق خیال کیا۔

اس کے بعد درویشِ مقیم یہ دیکھے کہ مہمان خلوت کو پسند کرتا ہے یا صحبت کو۔ اگر وہ خلوت کو پسند کرتا ہے تو اس کے لئے تنہائی کر دے اور اگر وہ صحبت کو پسند کرتا ہے تو انس ومحبت کے ساتھ بے تکلف پیش آئے اور جب رات کو بستر پر آرام کرنے لیٹے تو اس کے ہاتھ پاؤں دبائے اگر وہ ایسا نہ کرنے دے اور کہے کہ اس کی عادت نہیں ہے تو اس پر ضد اور اصرار نہ کرے تا کہ وہ دل گیر نہ ہو صبح کے وقت حمام کے لئے کہے تا کہ غسل کر کے صاف وستھرا ہو جائے اور ضروریاتِ صفائی کا خیال رکھے۔ کسی دوسرے کو اس کی خدمت کرنے کا موقعہ نہ دے مقیم کے لئے لازم ہے کہ حسنِ عقیدت کے ساتھ اس کی خدمت کرے اور اسے خوب صاف وستھرا بنانے کی کوشش کرے۔ یہاں تک کہ اس کی کمر ملے۔ ہاتھ پاؤں کی مالش کرے۔ مہمان نوازی کے یہ آداب ہیں۔ اگر مقیم اتنی استطاعت رکھتا ہو کہ اسے نیا کپڑا پہنچا سکے تو اس میں کوتاہی نہ کرے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو تکلف نہ برتے بلکہ اسی کے لباس کو دھو کر صاف ستھرا کر دے۔ تا کہ جب وہ حمام سے باہر آئے تو اسی لباس کو پہن لے۔ حمام سے فارغ ہونے کے بعد اگر تین دن سے زیادہ نہ گزرے ہوں تو اس شہر کے بزرگ، امام، یا بزرگوں کی جماعت سے ملنے کا اشتیاق دلائے اور اس سے کہے کہ آؤ ہم ان کی زیارت کو چلیں۔ اگر وہ آمادہ ہو تو ہمراہ جائے اور اگر وہ کہے کہ میرا دل نہیں چاہتا تو اصرار نہ کرے۔ کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ طالبانِ حق کا دل اپنے اختیار میں نہیں ہوتا۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ سے لوگوں نے درخواست کی کہ آپ اپنے سفر کے عجائب وغرائب میں سے کوئی بات بیان فرمائیں تو انھوں نے فرمایا سب سے عجیب بات یہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے مجھ سے ساتھ رہنے کی خواہش ظاہر کی مگر میں نے اسے قبول نہ کیا اور میرے دل نے نہ چاہا کہ حق تعالیٰ کے سوا میرا دل کسی اور کی قدرومنزلت کرے اور میں اس کے ادب واحترام کی رعایت میں مشغول ہوں۔

مقیم کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ مسافر سے پہلے سلام کرے یہی احکام ان دنیاداروں کے لئے بھی ہیں، جو بیمار پرسی، عیادت یا تعزیت وغیرہ کے لئے جایا کرتے ہیں اور جس مقیم کو

مسافروں سے یہ طمع ہو کہ ان کو وہ اپنی گدائی کا آلہ بنائے اور اپنے گھر سے دوسرے کے گھر لے جائے اس کے لئے یہی سزاوار اور بہتر ہے کہ وہ مہمانوں کی خدمت نہ کرے۔ کیونکہ وہ انھیں ذلیل کرتا ہے اور اُن کے دل کو رنج پہنچاتا ہے۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے اپنے سفروں میں یہی بات میرے لئے سب سے بڑھ کر تکلیف دہ ثابت ہوئی کہ جاہل خدّام اور بے تکلف قسم کے مقیم لوگ کبھی کبھی ایک گھر سے اٹھا کر دوسرے گھر لے جاتے تھے۔ کبھی کسی امیر کے گھر کبھی کسی دہقانی کے گھر۔ حالانکہ میں دل میں اس سے متنفر ہوتا اور انھیں سخت وسُست کہتا تھا لیکن ظاہر داری میں درگزر اور مسامحت سے کام لیتا تھا اور یہ مقیم لوگ جو سلوک میرے ساتھ کرتے اور بے ڈھنگے طور پر میری نذر کرتے تھے اس پر میں دل میں یہ عہد کر لیتا کہ مقیم ہونے کے بعد مسافروں سے کبھی یہ سلوک نہیں کروں گا۔ بے ادبوں کی صحبت کا فائدہ اس سے بڑھ کر اور نہیں ہو سکتا کہ جو بات تمہیں اچھی معلوم نہ ہو تو تم اپنے معاملات میں ہمیشہ ان سے اجتناب کرو۔

پھر اگر کوئی مسافر درویش خوش ہو اور کچھ دن رہنا چاہے اور دنیا طلبی کا اظہار کرے تو مقیم کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ ہمیشہ اس کی ضرورت کے لئے اسے مقدم رکھے اور اگر یہ مسافر لالچی اور بے ہمت ہے تو مقیم کو نہ چاہئے کہ بے ہمتی کا مظاہرہ کرے اور ناممکن ضرورتوں میں اس کا پیرو ہو۔ کیونکہ جن لوگوں نے دنیا کو چھوڑ رکھا ہے۔ ان کا طریقہ یہ نہیں ہوتا کہ جب ضرورت ہوئی تو بازار آ گئے اور لگے ضرورت جتانے یا امراء کے دروازے پر پہنچ گئے اور لگے ان سے مدد مانگنے۔ دنیا سے کنارہ کشوں کا ان کی صحبت سے کیا علاقہ؟

مشائخ طریقت بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ اپنے مریدوں کو ریاضت و مجاہدے کی تعلیم دے رہے تھے کہ ایک مسافر آ گیا آپ اس کی خاطر مدارات میں مشغول ہو گئے اور کھانا لا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ مسافر نے کہا اس کے سوا فلاں چیز کی بھی مجھے ضرورت ہے۔ انھوں نے فرمایا تجھے بازار جانا چاہئے تھا تو تو بازاری شخص معلوم ہوتا ہے۔ مساجد و خانقاہ میں رہنے والا شخص معلوم نہیں ہوتا۔

ایک مرتبہ میں نے دمشق سے دو درویشوں کے ساتھ حضرت ابن العلاء رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت کا قصد کیا۔ وہ مکہ مکرمہ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ ہم نے آپس میں طے کیا کہ ہر ایک اپنی آپ بیتی کا کوئی اہم واقعہ یاد کرے تاکہ وہ بزرگ ہمارے باطن کی ہمیں خبر دیں اور

ہمارے اس واقعہ کی مشکلات کو حال کریں۔ چنانچہ میں نے دل میں خیال جمایا کہ میں حضرت حسین بن منصور حلاج رحمتہ اللہ علیہ کے اشعار کو حل کراؤں گا۔؟ دوسرے درویش نے یہ خیال جمایا کہ میں اپنے مرض عظیم طحال کی لئے ان سے دعا کراؤں گا اور تیسرے نے یہ خیال جمایا کہ میں "صابونی حلوے" کی درخواست کروں گا۔ سوچتے ہوئے جب ہم سب ان کے پاس پہنچے تو انھوں نے حضرت حسین بن منصور حلاج کے اشعار کے حل پہلے ہی لکھوا رکھے تھے وہ میرے سامنے رکھ دیئے اور اس درویش کے پیٹ پر دست مبارک پھیرا اور اس کی تلی جاتی رہی اور تیسرے درویش سے فرمایا چونکہ تم "صابونی حلوے" کی خواہش رکھتے ہو جو کہ عوام کی غذا ہے حالانکہ تم اولیاء کے لباس میں ملبوس ہو اور اولیاء کا لباس عوامی مطالبے اور خواہش کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ لہٰذا تم دونوں میں سے ایک رُخ اختیار کرلو۔

غرضیکہ مقیم کو ایسے مسافر کی مدارات لازم نہیں جو حق تعالیٰ کے حقوق کی رعایت نہ کرے اور اپنی نفسانی لذتوں کو نہ چھوڑے۔ جب تک کوئی شخص اپنی لذت پر قائم ہے محال ہے کہ کوئی دوسرا شخص اس کی لذتوں کو پورا کرنے میں اس کی موافقت کرے۔ جب وہ اپنی لذتوں کو چھوڑ دے گا تب وہ اس لائق ہوگا کہ دوسرا اس کی لذت کو برقرار رکھے تاکہ دونوں اپنے اپنے حال میں راہ پر قائم رہیں اور راہزن نہ بنیں۔

احادیث میں مشہور واقعہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت سلمان فارسی اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہما کے درمیان مواخات قائم فرمائی تھی۔ یہ دونوں اصحابِ صفہ کے سرکردہ افراد میں سے تھے اور باطنی اسرار کے ائمہ ورؤسا میں سے تھے۔ ایک دن حضرت سلمان فارسیؓ حضرت ابوذرؓ کے گھر والوں کی مزاج پرسی کے لئے آئے تو گھر والوں نے حضرت سلمانؓ سے شکایت کی کہ یہ تمہارے بھائی ابوذرؓ، نہ دن میں کچھ کھاتے ہیں اور نہ رات میں سوتے ہیں۔ حضرت سلمانؓ نے فرمایا کچھ کھانے کے لئے لاؤ۔ جب لایا گیا تو حضرت ابوذر سے کہا اے بھائی تمہیں زیبا یہ ہے کہ تم موافقت کرو اور میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔ کیونکہ تمہارا یہ روزہ فرض تو ہے نہیں۔ حضرت ابوذرؓ نے ان کے کہنے پر ان کے ساتھ کھانا کھایا۔ جب رات ہوئی تو کہا اے بھائی سونے میں بھی تم کو میرا ساتھ دینا چاہیئے "ان لجسدك عليك حق وان لزوجك عليك حق وان لربك عليك حق " کیونکہ تمہارے اوپر اپنے جسم کا بھی حق

ہے تمہاری بیوی کا بھی حق ہے اور تمہارے رب کا بھی حق ہے۔ دوسرے دن حضرت ابوذرؓ بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا میں بھی تم سے وہی کہتا ہوں جو کل سلمان نے تم سے کہا تھا کہ ”ان لجسدك عليك حق الخ“

حضرت ابوذرؓ نے جب اپنی لذتوں کو چھوڑنے پر اقامت فرمائی تو حضرت سلمان نے انھیں ان کی لذتوں پر قائم کیا اور انھوں نے ان کی خاطر اپنے حق سے درگزر کیا۔ اسی اصل و قاعدے پر جو کچھ تم کرو گے صحیح و مستحکم ہوگا۔

مجھ پر ایک زمانہ ایسا گزرا ہے کہ میں ملک عراق میں دنیاوی مال کو جمع کرنے اور ان کو خرچ کرنے میں خوب اسراف کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے مجھ پر قرض کا بار بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ جسے جو ضرورت پیش آتی میرے پاس آجاتا اور میں اس کی ضرورتیں پوری کرنے میں تکلیفیں اٹھاتا تھا۔ اس زمانہ کے ایک بزرگ نے مجھے لکھا کہ اے فرزند! خیال رکھنا کہ تمہارا دل خدا سے غافل نہ ہو جائے۔ اپنے دل کو فارغ رکھنا۔ تم مشاغل میں پھنس گئے ہو۔ لہٰذا اگر کوئی دل اپنے سے زیادہ عزیز پاؤ تو جائز ہے کہ اس دل کی فراغت میں اپنے آپ کو مشغول کر لو ورنہ اس کام اور اس شغل سے دستکش ہو جاؤ۔ کیونکہ بندگان خدا کی کفالت خدا کے ذمہ ہے۔ اسی لمحہ میرے دل میں اس سے فراغت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

یہ مسافروں کے بارے میں مقیموں کے احکام تھے جو اختصاراً بیان کر دیے ہیں۔

مسافرت کے آداب

جب کوئی درویش اقامت چھوڑ کر سامان سفر اختیار کرے تو اس کے ادب کے احکام یہ ہیں کہ اس کا سفر خدا کے لئے ہو نہ کہ نفسانی پیروی میں، جس طرح ظاہر میں سفر اختیار کیا ہے اسی طرح باطن میں بھی اپنی نفسانی خواہش کو ترک کر دے۔ ہمیشہ باوضو رہے اور اپنے اوراد و وظائف کو ترک نہ کرے۔ زیبا یہی ہے کہ اس کا سفر یا تو ادائے حج کے لئے ہو یا جہاد بالکفار کے لئے، یا کسی جگہ کی زیارت یا کہیں دینی فوائد کے حصول یا طلب علم یا کسی بزرگ یا شیخ کی ملاقات یا کسی شیخ کے مزار کی زیارت کے لئے ہو۔ ان کے سوا اگر کسی اور مقصد سے سفر ہوگا تو وہ سفر میں شمار نہ ہوگا۔

سامان سفر

سفر کی حالت میں گدڑی، جانماز، لوٹا، جوتیاں اور عصا ضرور رکھنا چاہئے تاکہ گدڑی سے ستر پوشی کرے، مصلے پر نماز پڑھے، لوٹے سے طہارت و وضو کرے اور عصا سے مضر چیزوں کو دفع کرے۔ عصا کے فوائد اور بھی ہیں۔ اور وضو کے بعد جوتیاں پہن کر جائے نماز

تک آسکے۔ ان کے سوا سنت کی حفاظت کی خاطر دیگر چیزیں بھی سفر میں ساتھ رکھ سکتا ہے مثلاً کنگھا، ناخن تراش، سرمہ دانی وغیرہ، اور اگر ان کے سوا ایسا سامان بھی ساتھ رکھے جو زیب و زینت اور آرائش سے متعلق ہو تو وہ سوچے کہ کس مقام میں ہے اگر وہ منزلِ ارادت میں ہے تو اس کے لئے ان کے سوا سامان، قید، راہ کی بندش اور موجبِ حجاب ہوں گی اور اپنے نفس کی رعونت کے اظہار کا موجب بنے گی اور اگر وہ مقامِ تمکین واستقامت میں ہے تو اس کے لئے یہ سامان ہی نہیں بلکہ ہر چیز درست ہوگی۔

میں نے شیخ ابو مسلم فارس بن غالب فارسی رحمتہ اللہ علیہ سے سنا ہے کہ میں ایک دن حضرت شیخ ابو سعید ابوالخیر فضل اللہ بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت کو حاضر ہوا تو انہیں چار بالشت کے تختہ پر سویا ہوا پایا اور ان کا پاؤں ایک دوسرے پر رکھا ہوا تھا وہ اس وقت مصری چادر اوڑھے ہوئے تھے اور میں ایسا لباس پہنے ہوئے تھا جو میلا ہو کر چمڑے کی مانند سخت ہو گیا تھا۔ جسم تھکن سے چور چور اور محنت ومشقت اور مجاہدے سے پیلا پڑ گیا تھا۔ میرے دل میں ان سے ملاقات نہ کرنے کا جذبہ ابھرا اور دل میں خیال گزرا کہ ایک درویش یہ ہیں جو اس طمطراق کے ساتھ رہتے ہیں اور ایک میں درویش ہوں جو شکستہ حالی کے ساتھ بسر کر رہا ہوں یہ اتنے چین وراحت میں ہیں اور میں اس محنت ومشقت میں ہوں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ وہ بزرگ میری باطنی کیفیت سے باخبر ہوگئے اور میری نخوت کو انھوں نے ملاحظہ فرما لیا۔ مجھ سے فرمایا اے ابو مسلم! تم نے کونسی کتاب میں پڑھا ہے کہ اپنے کو دیکھنے والا درویش ہوتا ہے؟ جب میں نے ہر شئے میں جلوۂ الٰہی کا مشاہدہ کر لیا تو اسی نے مجھے تخت پر بٹھا دیا ہے اور جب کہ تم خود اپنے آپ کو دیکھنے ہی میں ابھی تک پڑے ہوئے ہو تو اس نے تمہیں محنت ومشقت میں ڈال رکھا ہے۔ میرے مقدر میں مشاہدہ ہے اور تمہارے مقدر میں مجاہدہ۔ یہ دونوں مقام راستہ کے مقامات سے ہیں۔ اللہ رب العزت اس سے پاک ومنزہ ہے۔ درویش وہی ہے جس کا مقام فنا ہو جائے اور وہ احوال سے گزر جائے شیخ ابو مسلم فرماتے ہیں کہ یہ سن کر میرے ہوش اُڑ گئے اور سارا جہان مجھ پر تاریک ہو گیا۔ جب اپنے آپ میں آیا تو ان سے معذرت خواہی کی اور اُنھوں نے مجھے معاف فرما دیا۔ اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ اے شیخ! مجھے واپسی کی اجازت عطا فرمائیے چونکہ آپ کے دیدار کی تابِ مقاومت نہیں رکھتا۔ انھوں نے فرمایا ''صدقت یا ابامسلم'' ابو مسلم! تم نے ٹھیک کہا۔ اس کے بعد انھوں نے میری حالت کی تمثیل میں یہ شعر پڑھا

آنچہ گوشم نتوانست شنیدن بخبر
ہمہ چشم بعیاں یکسرہ دید آں بھصر

جو خبر میرے کان سن نہ سکے اسے میری آنکھ نے سر بسر ظاہر دیکھ لیا۔

ہر مسافر پر لازم ہے کہ وہ ہمیشہ سنت کی حفاظت کرے اور جب وہ کسی مقیم کے یہاں پہنچے تو احترام کے ساتھ اس کے پاس جائے۔ اسے سلام کرے پھر بایاں قدم جوتی سے نکالے کیونکہ حضور اکرم ﷺ ایسا ہی کرتے تھے اور جب جوتی میں پاؤں ڈالے تو پہلے داہنا پاؤں ڈالے اس کے بعد دوسرا جب پاؤں دھوئے تو پہلے دایاں پھر بایاں، اور دو رکعت تحیۃ الوضو کے پڑھے اس کے بعد درویشوں کے حقوق کی رعایت کی طرف متوجہ ہو۔

ایسا نہ چاہیئے کہ مقیم کی کسی حالت پر اعتراض کرے یا کسی کے ساتھ زیادتی کرے خواہ معاملات سے متعلق ہو یا گفتگو سے اپنے سفر کی سختیوں کو بیان نہ کرے، نہ اپنے علم کو جتائے اور لوگوں کے سامنے حکایات و روایات بیان نہ کرے کیونکہ یہ باتیں اظہار رعونت کی موجب ہیں اور لازم ہے کہ جاہلوں کی باتوں کو برداشت کرے اور لوجہ اللہ ان کی زیادتیوں پر صبر کرے کیونکہ اس میں بڑی برکتیں ہیں اگر کوئی مقیم یا ان کا خادم اسے کوئی حکم دے یا اُسے کسی کو سلام کرنے یا کہیں کی زیارت کرنے کو کہا جائے تو جہاں تک ممکن ہو انکار نہ کرے۔ بایں ہمہ دنیاداری کی مروت نہ ہو۔

برادران طریقت کے افعال کی ہر ممکن تاویل و عذر کرے اور دل میں اپنی کسی حاجت کا رنج نہ آنے دے اور نہ مقیموں کو بادشاہوں کے دروازے پر لے جائے۔ مسافر و مقیم ہر حاجت اور اپنی تمام حالتوں میں رضائے الٰہی کا خواہاں رہے اور ایک دوسرے کے ساتھ حسنِ عقیدت رکھے۔ سب کو برابر جانے اور پیٹھ پیچھے کسی کی غیبت نہ کرے کیونکہ طالبانِ حق کے لئے فضول باتیں کرنا بُرا ہے اور بُری بات کہنا تو بڑی بد نصیبی ہے۔ محققین فعل کی شکل میں فاعل کو دیکھتے ہیں۔ جب وہ مخلوق کو بُرا کہے گا تو اس سے خالق کی بُرائی لازم آئے گی۔ اگرچہ کوئی بندہ عیب دار، محجوب اور بے مشاہدہ ہی کیوں نہ ہو۔ فعل پر جھگڑنا فاعل پر جھگڑنا ہوتا ہے۔ اگر انسانی آنکھ لوگوں پر پڑے تو وہ سب سے دور رہے اور جانے کہ ساری مخلوق مقہور و مجبور اور مغلوب و عاجز ہے کوئی شخص مشیتِ الٰہی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا اور جو کچھ وہ کرتا ہے وہ سب خدا کا ہی پیدا کردہ ہے۔ کسی مخلوق کو اس کی ملکیت میں تصرف کرنے کا حق نہیں ہے۔ کسی ذات پر خدا کے سوا کسی مخلوق کو مطلق تغیر و تبدل کی قدرت نہیں ہے۔ وباللہ التوفیق۔

آدابِ غذا

واضح رہنا چاہیئے کہ انسان کو غذا کے بغیر گزارہ نہیں کیونکہ بدن کا تقوم

کھانے پینے کے بغیر ناممکن ہے۔ لیکن غذا کے استعمال کی شرط یہ ہے کہ اس میں مبالغہ نہ کرے اور نہ رات دن کھانے پینے کی فکر میں مشغول رہے۔

حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

مَن کان ھمتہ مایدخل فی جوفہ کان قیمتہ مایخرج منہ۔	جو پیٹ میں داخل کرنے کی ہی فکر میں رہتا ہے اس کی قدر و قیمت وہ ہوتی ہے جو اس سے خارج ہوتا ہے۔

اسی لئے سالکانِ راہِ حق کے لئے بسیار خوری سے بڑھ کر کوئی چیز نقصان رساں نہیں۔ تفصیل بھوک کے باب میں گزر چکی ہے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا آپ بھوکے رہنے کی اتنی زیادہ تعریف کیوں فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا اس لئے کہ اگر فرعون بھوکا رہتا تو ہرگز "انا ربکم الاعلیٰ" (میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں) نہ کہتا۔ اگر قارون بھوکا رہتا تو باغی نہ ہوتا اور لومڑی چونکہ بھوکی رہتی ہے اس لئے ہر ایک اس کی تعریف کرتا ہے جب پیٹ بھر جاتا ہے تو نفاق پیدا ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کافروں کی حالت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ:۔

ذرھم یاکلوا ویتمتعوا ویلھھم الامل فسوف یعلمون۔	انھیں چھوڑ دو جو کھاتے اور عیش کرتے ہیں وہ اپنی خواہشوں میں مگن ہیں۔ عنقریب وہ اپنا انجام جان لیں گے۔

نیز فرماتا ہے:۔

والذین کفروا یتمتعون یاکلون کما تاکل الانعام والنار مثویً لھم۔	کافر لوگ عیش کرتے اور کھانے پینے میں ایسے ہی ہیں جیسے جانور کھاتے ہیں۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔

حضرت سہیل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک پیٹ بھر کر حلال غذا کھانے کے مقابلہ میں شراب سے پیٹ کو پُر کرنا زیادہ بہتر ہے۔ لوگوں نے پوچھا یہ کیسے؟ انھوں نے فرمایا اس لئے کہ شراب سے بھرا پیٹ، عقل کی طاقت سلب کر لیتا ہے شہوت کی آگ بجھا دیتا ہے اور وہ بے ہوش ہو کر اس کی زبان و ہاتھ سے لوگ محفوظ ہو جاتے ہیں لیکن پیٹ حلال غذا سے پُر ہو جاتا ہے تو بیہودہ تمنائیں، شہوت اور نفس اپنے مقدر کے حصول میں سر اٹھاتے ہیں مشائخ طریقت نے ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ:۔

اکلھم کاکل المرضیٰ ونومھم کنوم الغرقی وکلامھم ککلام الثکلی۔

ان کا کھانا بیماروں کی طرح ان کی نیند گہری نیند والوں کے مانند ان کی گفتگو بچوں کی چیخ و پکار کے مانند ہوتی ہے۔

غذا کے شرط آداب میں سے یہ ہے کہ تنہا نہ کھائے اور جو کھائے دوسروں کو بھی اس میں شریک بنائے۔ کیونکہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ

شر الناس من اکل وحدہٗ و ضرب عبدہ ومنع وفدہ۔

سب سے زیادہ برا شخص وہ ہے جو اکیلا کھائے۔ غلام کو مارے اور خیرات سے رو کے رہے۔

جب دستر خوان پر بیٹھے تو خاموش نہ بیٹھے اور بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کرے اور کوئی چیز اس طرح نہ رکھے اور نہ اُٹھائے جسے لوگ ناپسند کریں، پہلا لقمہ نمکین غذا کا لے اور اپنے ساتھیوں کا لحاظ و پاس کرے۔ ایثار و انصاف سے کام لے۔

سہل بن عبداللہ سے کسی نے آیہء کریمہ ''ان اللہ یامر بالعدل و الاحسان '' (اللہ تعالیٰ عدل و انصاف کا حکم دیتا ہے) کی تفسیر معلوم کی تو انھوں نے بتایا انصاف تو یہ ہے کہ اپنے ساتھی کو کھانے میں شریک کرے اور احسان یہ ہے کہ ساتھی کے کھلانے کو خود پر افضل جانے۔

میرے شیخ و مرشد فرماتے ہیں کہ میں اس مدعی پر تعجب کرتا ہوں جو کہتا ہے کہ میں تارک دنیا ہوں اور حال یہ ہے کہ وہ کھانے کی فکر میں رہتا ہو۔

اس کے بعد لازم ہے کہ داہنے ہاتھ سے لقمہ لے اور اپنے لقمہ کے سوا کسی کی طرف نہ دیکھے۔ کھانے میں پانی کم پئے اور پانی اُس وقت پئے جب سچی پیاس لگے اور اتنا پئے جس سے جگر تر ہو جائے اور لقمہ بہت بڑا نہ لے اور اسے خوب چبائے۔ کھانے میں جلدی نہ کرے کیونکہ ان باتوں سے بدہضمی پیدا ہو جاتی ہے اور سنت کے خلاف بھی ہے اور جب کھانے سے فارغ ہو جائے تو حمد و شکر بجالائے اور ہاتھ دھوئے۔

اگر جماعت میں سے دو یا تین یا زیادہ افراد کو پوشیدہ طور پر کسی خاص چیز پر مدعو کریں

اور چھپا کر کھلانا چاہیں تو بعض مشائخ فرماتے ہیں کہ یہ حرام ہے اور مصاحبوں کی خیانت ہے۔

''اولئک مایاکلون فی بطونھم الا النار'' یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں اور بعض مشائخ فرماتے ہیں کہ جب سب اس پر متفق ہوں تو یہ جائز ہے اور بعض کہتے

ہیں کہ اگر صرف ایک ہو تو جائز ہے کیونکہ اس کے لئے انصاف شرط نہیں ہے کیونکہ انصاف کی شرط تو ایک سے زیادہ افراد کے درمیان ہے اور جب وہ اکیلا ہو تو اس سے صحبت کے یہ آداب ساقط ہو جاتے ہیں اور بندہ اس میں ماخوذ نہیں ہوتا۔ اس میں مذہب کی سب سے بڑی بنیادی بات یہ ہے کہ کسی درویش کی دعوت کو رد نہ کرے اور کسی دنیادار کی دعوت کو قبول نہ کرے اور نہ ان کے گھر جائے اور نہ ان سے کچھ مانگے۔ کیونکہ اہلِ طریقت کے نزدیک یہ مداہنت ہے، اس لئے کہ دنیا دار، درویش کی لئے غیر محرم ہے اور وہ اس کا ہم جنس نہیں ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ انسان نہ تو سامان کی کثرت کی بنا پر دنیادار بنتا ہے اور نہ سامان کی قلت کی بنا پر درویش؟ اور جو فقر کو تو نگر پر فوقیت نہیں دیتا وہ دنیادار نہیں ہے اگرچہ بادشاہ ہو اور جو فقر کا منکر ہے وہ دنیا دار ہے اگرچہ وہ مضطرب و بے قرار ہو؟ اور جب کسی دعوت میں شریک ہو تو کسی چیز کے کھانے یا نہ کھانے میں تکلف نہ برتے اور وقت کے مطابق روش اختیار کرے۔ جب صاحبِ دعوت محرم ہو تو اسے جائز ہے کہ بچا ہوا کھانا گھر والوں کے لئے اٹھالے اور اگر نامحرم ہے تو بچا ہوا کھانا گھر میں لے جانا جائز نہیں ہے۔ لیکن کسی حال میں پس خوردہ چھوڑنا بہتر نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت سہل فرماتے ہیں کہ ”الزلة ھی الذلة“ پس خوردہ بچانا ذلت و کمینگی ہے۔ وباللہ التوفیق واللہ اعلم بالصّواب

چلنے پھرنے کے آداب

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" وعباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض ھوناً الایہ "رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر تواضع وانکساری سے چلتے ہیں طالب حق پر لازم ہے کہ وہ رفتار میں ہمیشہ اس کا خیال رکھے کہ جو وہ قدم اُٹھاتا ہے وہ اپنی طاقت سے اُٹھاتا ہے یا خدا کی طاقت سے۔ اگر وہ یہ خیال کرے کہ اپنی طاقت سے ہے تو استغفار کرے۔ اور اگر اس پر یقین ہو کہ خدا کی دی ہوئی طاقت سے ہے تو اسے اس یقین پر مزید اضافہ کی کوشش کرنی چاہیے۔

حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ ایک دن انھوں نے کوئی دوا کھائی لوگوں نے عرض کیا کہ کچھ دیر صحن میں تشریف رکھیں تا کہ دوا کا اثر وفائدہ ظاہر ہو آپ نے فرمایا خدا سے حیا کرتا ہوں کہ قیامت کے دن وہ مجھ سے پوچھے گا تو نے اپنے نفس کی خاطر چند قدم کیوں اٹھائے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے" وتشھد ارجلھم بما کانوا یکسبون "ان کے قدم گواہی دیں گے کہ وہ دنیا میں کیا کرتے تھے؟

درویش کو لازم ہے کہ بیداری میں سر جھکائے مراقبہ میں رہے اور کسی طرف نظر نہ اٹھائے۔ اگر راستہ میں کوئی شخص اس کے برابر سے گزرے تو بجز اپنے کپڑے بچانے کے کہ اس کے پاؤں کے نیچے نہ آئے (کیونکہ وہ ان کپڑوں سے نماز پڑھتا ہے) خود کو بچانے کی کوشش نہ کرے لیکن اگر یہ پتہ چل جائے کہ وہ شخص کافر ہے یا وہ نجاست میں آلودہ ہے تو اپنے آپ کو اس سے بچانا ضروری ہے۔

اور جب جماعت کے ساتھ چلے تو آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرے۔ کیونکہ آگے بڑھ کر چلنا تکبر کی علامت ہے بہت پیچھے رہنے کی بھی کوشش نہ کرے کیونکہ اس میں تواضع کی زیادتی ہے۔ چونکہ زیادتی تواضع کو دیکھنا بھی عین تکبر ہے۔

کھڑاؤں اور جوتیوں کو جہاں تک ہو سکے ظاہری نجاست سے بچائے تا کہ اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے رات میں اس کے کپڑوں کو محفوظ رکھے۔

جب کسی جماعت یا کسی ایک درویش کے ساتھ جا رہا ہو تو راستہ میں کسی اور سے بات کرنے کے لئے اسے محوِ انتظار نہ چھوڑ دے۔ رفتار میں میانہ روی کو ملحوظ رکھے نہ زیادہ آہستہ چلے

اور نہ تیز دوڑ کر۔ آہستہ چلنا متکبروں کی علامت ہے۔ قدم پوار رکھے۔ غرضکہ ہر طالب حق کی رفتار ایسی ہو کہ اگر کوئی اس سے پوچھے کہ کہاں جارہے ہو تو وہ کامل دل جمعی کے ساتھ کہہ سکے کہ ''انی ذاھب الٰی ربی سیھدین '' میں خدا کی طرف جارہا ہوں اسی نے میری رہنمائی فرمائی ہے۔ اگراس کا چلنا ایسا نہ ہوتو یہ اس کے لئے موجب وبال ہوگا کیونکہ قدموں کی درستگی خطرات سے محفوظ رہنے کی نشانی ہے۔ جو اس درستگی کی فکر میں رہتا ہے حق تعالیٰ اس کے قدموں کو اُس کے اندیشہ کا پیرو کار بنا دیتا ہے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ یہ فرماتے ہیں کہ بغیر مراقبہ کے درویش کا چلنا، غفلت کی نشانی ہے۔ کیونکہ وہ جس مقام پر ہوتا ہے دُو قدم سے معلوم ہو جاتا ہے یعنی ایک اپنے نصیب پر قدم رکھتا ہے اور دوسرا فرمانِ الٰہی پر مطلب یہ ہے کہ وہ ایک مقام سے قدم اٹھاتا ہے اور دوسرے مقام پر قدم رکھتا ہے گویا طالب کی رفتار، مسافت کو طے کرنے کی علامت ہے اور قربِ حق، مسافت نہیں ہے۔ جب اس کا قرب مسافت نہیں تو طالب کو محلِ سکون میں قدموں کا ذریعہ قطع مسافت کے بغیر کیا چارہ؟ واللہ ولی التوفیق۔

بائیسواں باب

سفر و حضر میں سونے کے آداب

واضح رہنا چاہیئے کہ مشائخ طریقت کا اس معنی میں بہت اختلاف ہے۔ بایں ہمہ ہر گروہ کے نزدیک یہ بات مسلّم ہے کہ غلبہء نیند کے بغیر سونا نہ چاہیئے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ "النوم اخ الموت" "نیند موت کی بہن ہے۔ لہٰذا زندگانی حق تعالےٰ کی نعمت ہے اور موت بلا۔ لامحالہ بلا کے مقابلہ میں نعمت اچھی چیز ہے۔

حضرت شبلی علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں کہ:۔

اطلع الحق فقال علی من نام غفل ومن غفل حجب۔	اللہ تعالیٰ نے اپنی اطلاع میں مجھ سے فرمایا جو سویا وہ غافل ہوا اور جو غافل ہوا وہ محجوب رہا۔

ایک گروہ کے نزدیک جائز ہے کہ مرید بالقصد سوئے اور بجبر نیند کو لائے آرام کرے جب کہ وہ احکامِ الٰہی کو پورا کر چکا ہو۔ اس لئے کہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ:۔

رفع القلم عن ثلاث عن النائم حتی ینتبہ وعن الصبی حتی یحتلم وعن المجنون حتی یفیق۔	تین شخصوں سے حکمِ الٰہی اٹھا لیا گیا ہے ایک سونے والے سے جب تک کہ وہ نہ جاگے۔ دوسرے بچے سے جب تک کہ وہ بالغ نہ ہو، تیسرے دیوانے سے جب تک اسے افاقہ نہ ہو۔

مطلب یہ کہ بندہ جب تک سوتا رہتا ہے بیدار ہونے تک قلم تقدیر اُٹھا رہتا ہے۔ اور مخلوق اس کی بُرائی سے محفوظ رہتی ہے اور اس کے اختیارات معطل اور اس کا نفس معزول رہتا ہے اور کراماً کاتبین اس کا نامہء اعمال نہیں لکھتے۔ اس کی زبان دعوں، جھوٹ اور غیبت سے رکی رہتی ہے۔ اور اس کا ارادہ عُجب وریا سے دور رہتا ہے۔ "لا یملك لنفسه ضرا ولا نفعا ولا موتا ولا حیاتا ولا نشورا" یعنی سونے والا اپنی جان کے نفع ونقصان، موت وحیات اور اٹھنے کا مالک نہیں رہتا۔ اسی بنا پر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ:۔

لا شیئ اشد علی ابلیس من نوم | شیطان پر گنہگار کے سونے سے بڑھ کر کوئی

العاصی فاذا نام العاصی یقول متی ینتبه و یقوم حتیٰ یعصی اللّٰہ۔	چیز سخت نہیں۔ جب گنہگار سوتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ کب یہ اُٹھے گا جو اُٹھ کر خدا کی نافرمانی کرے گا۔

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کو حضرت علی بن سہل اصفہانی سے اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ حضرت علی بن سہل نے حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہما کو ایک لطیف معنیٰ کا خط لکھا۔ آپ نے اسے سُن کر اختلاف فرمایا۔ حضرت علی بن سہل نے اس خط میں اپنا مقصد اس طرح ظاہر فرمایا تھا کہ ''نیند چونکہ غفلت و آرام کا موجب ہے لہٰذا اس سے بچنا ضروری ہے کیونکہ محب کو دن رات میں کبھی نیند و آرام کا ہوش نہیں ہوتا۔ اگر وہ سو جائے تو اپنے مقصود سے محروم رہ جاتا ہے۔ اس کی زندگانی غافل بن جاتی ہے اور حق تعالےٰ کے مشاہدے سے محروم رہ جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ ''یا داؤد کذب من ادعی محبتی فاذا جنہ اللیل نام عنی'' اے داؤد! وہ شخص میری محبت کے دعوے میں جھوٹا ہے جس پر رات کا اندھیرا چھا جائے اور وہ مجھ سے غافل ہو کر سو جائے اور میری محبت کو چھوڑ دے۔'' حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ نے اس خط کے جواب میں تحریر فرمایا کہ واضح رہنا چاہئے کہ ہماری بیداری، راہِ حق میں ہمارا معاملہ ہے اور ہماری نیند حق تعالےٰ کا ہم پر فعل ہے۔ لہٰذا ہماری بے اختیاری کی حالت میں جو کچھ ہم پر گزرتا ہے وہ سب ہم پر حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ ہماری طرف سے ہمارا اختیار حق تعالیٰ کے تحتِ تصرف میں ہے۔'' والنوم موھبۃ من اللّٰہ تعالیٰ علی المحبین '' لہٰذا محبوبانِ خدا پر نیند کا غلبہ، حق تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔'' اس مسئلہ کا تعلق صحو و سکر سے ہے اُس جگہ یہ بات وضاحت سے کی جا چکی ہے۔ لیکن یہ بات حیرت کی ہے کہ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ جو کہ صاحبِ صحو مردِ خدا تھے اس جگہ انھوں نے سکر کی تقویت فرمائی۔ ممکن ہے کہ آپ اس وقت مغلوب الحال ہوں اور اسی حالت میں آپ نے یہ تحریر فرمایا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کا مسلک اس کے برخلاف ہو کیونکہ نیند بنفسہ خود صحو ہے اور بیداری عین سکر۔ اس لئے کہ نیند آدمی کی صفت ہے اور جب تک آدمی اپنی صفتوں کے سایہ میں رہتا ہے تو وہ صحو کے ساتھ منسوب ہوتا ہے اور نہ سونا حق تعالیٰ کی صفت ہے۔ جب آدمی صفتِ حق کے سایہ میں ہوتا ہے تو وہ سکر کے ساتھ منسوب ہوتا ہے اور مغلوب الحال ہوتا ہے۔

میں نے مشائخ کی ایک جماعت دیکھی ہے جو نیند کو بیداری پر فضیلت دیتی ہے اور وہ حضرت جنید کے مسلک کی موافقت کرتی ہے کیونکہ بکثرت اولیاء، بزرگانِ دین اور انبیاء عظیم علیہم

السلام پر ہمیشہ نیند کا ظہور ہوتا تھا اور ہمارے حضور اکرم ﷺ نے اللہ کا یہ ارشاد بیان فرمایا ہے کہ "اللہ تعالیٰ اس بندے پر اظہار خوشنودی فرماتا ہے جو بحالت سجدہ سو جاتا ہے۔ اور اپنے فرشتوں سے فرماتا ہے میرے بندے کی طرف دیکھو اس کی روح مجھ سے ہمراز ہے اور اس کا بدن عبادت کے فرش پر ہے۔

حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ

"من نام علی الطھارت یوذن لروحه ان یطوف بالعرش ویسجد اللّٰہ تعالیٰ" جو شخص باوضو سوئے اللہ تعالیٰ اس کی روح کو اجازت فرماتا ہے کہ وہ عرش کا طواف کرے اور وہاں اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرے۔

میں نے ایک حکایت میں دیکھا ہے کہ حضرت شاہ شجاع کرمانی رحمتہ اللہ علیہ چالیس سال بیدار رہے۔ پھر جب ایک رات سوئے تو خواب میں انھیں حق تعالٰے کا دیدار ہوا۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ اسی امید میں سوتے رہے۔ اسی معنی میں قیس عامری کا یہ شعر ہے

وانی لاستنعس وما لی نعیسة	لعل خیالا منك یلقی خیالا

میں بالقصد سوتا ہوں حالانکہ مجھے نیند نہیں آتی۔ شاید کہ خواب میں تیرے خیال سے ملاقات ہو جائے۔

مشائخ کی ایک جماعت کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ بیداری کو خواب پر فضیلت دیتے ہیں اور حضرت علی بن سہل کی موافقت کرتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ انبیاء و مرسلین علیہم السلام کو وحی اور اولیاء کرام کو کرامتیں بیداری ہی میں ہوتی ہیں۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ:۔

"لوکان فی النوم خیر الکان فی الجنة نوم"	اگر نیند افضل ہوتی تو یقیناً جنت میں بھی سونا ہوتا۔

مطلب یہ کہ اگر نیند میں کوئی خوبی ہوتی تو جنت میں جو مقام قربت ہے وہاں نیند ضرور آتی۔ چونکہ جنت میں نہ حجاب ہے نہ نیند اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نیند میں حجاب ہے۔

ارباب لطائف فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جب نیند آئی تھی تو ان کے بائیں پہلو سے حوا کو پیدا فرمایا تھا اور ان کی تمام بلاؤں کا سرچشمہ یہی حوا تھیں، نیز فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے فرمایا "یا بنی انی اریٰ فی المنام انی اذبحك" اے میرے فرزند میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تمہیں ذبح

کر رہا ہوں تو حضرت اسمٰعیل نے عرض کیا اے والد ماجد" ھٰذا جزاء من نام عن حبیبه" یہ اپنے حبیب سے سو جانے کا بدلہ ہے۔" لو لم تنم لما امرت بذبح الولد" اگر آپ نہ سوتے تو آپ کو فرزند کے ذبح کرنے کا حکم نہ دیا جاتا۔ لہٰذا آپ کی نیند آپ کو بے اولاد اور مجھے بے جان بناتی ہے۔ اس کے سوا بوقت ذبح میری تکلیف تو ایک لحہ کے لئے ہوگی مگر بے اولاد ہونے کی تکلیف آپ کے لئے دائمی ہوگی۔

حضرت شبلی علیہ الرحمتہ کا واقعہ ہے کہ وہ ہر رات نمک کے پانی سے تر کر کے سلائی سامنے رکھ لیتے تھے جب نیند کا غلبہ ہوتا تو آنکھ میں وہ سلائی پھیر لیا کرتے تھے۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ جب وہ فرائض کی ادائیگی سے فارغ ہوتے تو سو جاتے تھے۔ میں نے شیخ احمد سمرقندی کو بخارا میں دیکھا کہ وہ ایک سال تک رات بھر نہیں سوئے۔ دن میں کچھ دیر کے لئے سو جاتے تھے اس میں بھی اس سے رجوع ان کا مقصد تھا اس لئے کہ جسے زندگی کے مقابلہ میں موت زیادہ عزیز ہو تو ظاہر ہے کہ اسے بیداری کے مقابلہ میں نیند پیاری ہوگی اور جسے موت کے مقابلہ میں زندہ رہنا زیادہ عزیز ہو اس کے لئے زیبا ہے کہ وہ نیند کے مقابلہ میں بیداری کو زیادہ عزیز رکھے۔ لہٰذا جو تکلف سے بیدار رہے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں بلکہ قدر و قیمت تو اس کی ہے جو اسے بیدار رکھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو برگزیدہ فرما کر بلند تر مقامات پر فائز فرمایا۔ آپ نے نہ نیند میں تکلف فرمایا اور نہ بیداری میں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا" قم اللیل الا قلیلا نصفه" رات کو کم قیام فرمائیے بلکہ آدھی رات تک۔

اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے جو نیند میں تکلف برتے اور بیداری کی مشقت اٹھائے۔ اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کو برگزیدہ فرمایا اور انھیں مقام اعلیٰ پر پہنچایا ان کی گردن سے کفر کا لباس اُتارا وہ نہ نیند کا تکلف کرتے تھے نہ بیداری کا۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے ان پر ایسی نیند طاری فرمائی کہ ان کے اختیار کے بغیر اللہ تعالیٰ ان کی پرورش فرماتا رہا جیسا کہ ارشاد ہے:۔

وتحسبهم ایقاظاً وهم رقود ونقلبهم ذات الیمین و ذات الشمال"	تم گمان کرتے ہو کہ وہ جاگ رہے ہیں حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو دائیں اور بائیں پہلو بدلتا ہے۔ (اور وہ
	خواب و بیداری دونوں حالتوں میں بے اختیار ہیں۔)

جب بندہ اس درجہ پر فائز ہو جائے کہ اس کا اختیار جاتا رہے اور اپنے کھانے پینے سے دست کش ہو جائے اور اس کی تمام ہمتیں غیر سے جُدا ہو جائیں پھر اگر وہ سوئے یا جاگے ہر حال میں عزیز ہوتا ہے۔ لہٰذا مرید کے لئے نیند کی شرط یہ ہے کہ اپنی پہلی نیند کو اپنی عمر کی آخری نیند جانے۔ گناہوں سے بچے اور دشمنوں کو راضی کرے۔ طہارت کے ساتھ رہے داہنے پہلو پر قبلہ رو ہو کر سوئے۔ دنیاوی کام ٹھیک رکھے۔ نعمتِ اسلام کا شکر بجالائے اور عہد کرے کہ اگر بیدار ہوا تو پھر گناہوں میں مبتلا نہ ہوگا۔ جو شخص اپنی بیداری میں کاموں کو درست رکھتا ہے اس کے لئے نیند ہو یا موت دونوں میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔

ایک بزرگ ایک ایسے امام کے پاس جایا کرتے تھے جو مرتبہ و عزتِ نفس کی رعونت میں مبتلا تھا وہ بزرگ اس سے کہتے تھے اے فلاں شخص تجھے مرجانا چاہئے اس کلمہ سے اس امام کا دل رنجیدہ ہوا کرتا تھا اور کہا کرتا یہ درویش ہمیشہ مجھ سے یہی کہتا رہتا ہے۔ کل میں اس کے کہنے سے پہلے یہ کلمہ اس سے کہوں گا۔ چنانچہ جب پھر وہ بزرگ اس کے پاس آئے تو اس امام نے کہا، تمہیں مرجانا چاہئے۔ اس بزرگ نے مصلے کو بچھایا سر کو زمین پر رکھا اور کہا میں مرتا ہوں اور اسی وقت اس بزرگ کی روح پرواز کر گئی۔ اس واقعہ میں امام کو یہ تنبیہ تھی کہ وہ جان لے کہ یہ بزرگ جو مرجانے کو کہا کرتے تھے خود بھی مرنے سے نہیں ڈرتے۔

میرے شیخ رحمتہ اللہ علیہ اپنے مریدوں کو اس کی ہدایت فرمایا کرتے تھے کہ نیند کے غلبہ کے وقت سونا چاہئے اور جب بیدار ہو جائے تو دوبارہ سونا مریدوں کے لئے حرام ہے۔ چونکہ بندے کو نیند غفلت لاتی ہے۔ اس معنی میں بحث طویل ہے اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ واللہ اعلم بالصّواب۔

سکوت وکلام کے آداب

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" ومن احسن قولا ممن دعا الی اللہ وعمل صالحا" سب سے بہتر کلام یہ ہے کہ جو بندہ اللہ کو پکارے اور نیک کام کرے۔ نیز فرمایا" قول معروف" نیک بات کہو۔ اور فرمایا" قولوا آمنا" کہو کہ ہم ایمان لائے۔!

واضح رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو اچھی بات کہنے کا حکم دیا ہے مثلاً حق تعالیٰ کی معبودیت کا اقرار، اس کی حمد وثنا اور مخلوق خدا کو دعوت وتبلیغ وغیرہ گویائی حق تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے لئے بڑی نعمت ہے۔ آدمی اس صفت کے ذریعہ دیگر مخلوق سے ممتاز ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔" ولقد کرمنا بنی آدم" بنی آدم کو ہم نے مکرم بنایا۔ مفسرین کا ایک قول یہ ہے کہ اس کے معنی گویائی عطا فرمانے کے ہیں۔ اگرچہ گویائی خدا کی ظاہر نعمت ہے۔ لیکن اس کی آفت بھی بہت بڑی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے" اخوف ما اخاف علی امتی اللسان" میری امت پر سب سے زیادہ خوفناک چیز زبان ہے مجھے اسی کا خوف ہے۔ گفتار، شراب کی مانند ہے جس سے عقل مخمور ہو جاتی ہے۔ آدمی جب شرابِ کلام میں پڑ جاتا ہے تو اس سے نکلنا دشوار ہو جاتا ہے اپنے آپ کو اس سے بچا نہیں سکتا۔ چونکہ اہلِ طریقت کو معلوم ہے کہ گفتار آفت ہے اس لئے وہ انتہائی ضرورت کے بغیر بات نہیں کرتے گویا وہ ابتدا اور انتہا میں گفتگو پر قابو رکھتے ہیں اگر ساری گفتگو حق کے لئے ہو تو بات کرتے ہیں ورنہ خاموش رہتے ہیں۔ ان کا پختہ اعتقاد ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھیدوں کو جانتا ہے اور ان لوگوں کو بہت برا جانتے ہیں جو حق تعالیٰ کو ایسا نہیں جانتے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے" ام یحسبون انا لا نسمع سرھم ونجوٰھم بلٰی ورسلنا لدیھم یکتبون" کیا یہ کافر لوگ گمان رکھتے ہیں کہ ہم ان کے بھیدوں کو اور خفیہ باتوں کو نہیں سنتے۔ ہاں ہمارے فرشتے بھی ان کے پاس سب کچھ لکھ رہے ہیں۔ میں عالم الغیب ہوں۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ" من سکت نجی" جو خاموش رہا اس نے نجات

پائی لہٰذا خاموشی میں بہت فوائد ہیں اور اس میں بہت فتوحات ہیں اور بولنے میں بکثرت آفت۔

مشائخ طریقت کی ایک جماعت بولنے پر سکوت کو افضل سمجھتی ہے اور ایک جماعت خاموشی پر بولنے کو ترجیح دیتی ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ الفاظ وعبارات سراسر دعاوی ہیں۔ جس وقت معانی کا اثبات ہو جاتا ہے تو الفاظ وعبارات والے دعاوی جاتے رہتے ہیں۔ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ انسان اختیاری حالت میں سقوط کلام میں معذور ہو جاتا ہے۔ یعنی بحالتِ بقا خوف کی وجہ سے۔ باوجود بولنے پر قادر ہونے کے وہ بول نہیں سکتا۔ اس کا نہ بولنا، معرفتِ حقیقت میں کوئی حرج پیدا نہیں کرتا۔ اور کسی وقت بندہ بے معنی محض خالی دعووں میں معذور نہیں ہوتا اس کا حکم منافقوں کی مانند ہو جاتا ہے۔ لہٰذا بے معنی دعویٰ نفاق ہے اور بے دعویٰ معنی اخلاص پر مبنی ہے۔ کیونکہ جس بندے کے لئے راستہ کھل جاتا ہے وہ گفتار سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس معنی کی وہ خبر دے گا اس کے الفاظ عبارت سب غیر ہوں گے اور حق تعالیٰ بے نیاز ہے کہ احوال کی تعبیر و تفسیر کسی غیر کے ذریعہ کرائے۔ اس کا غیر اس لائق نہیں کہ اس کی طرف التفات کیا جائے۔ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ اپنی تائید میں فرماتے ہیں کہ "من عرف اللّٰہ کلَّ لسانہ" جس نے حق تعالیٰ کو دل سے پہچان لیا اس کی زبان، بیان سے عاجز ہوگئی کیونکہ اظہار بیان میں حجاب دکھائی دیتا ہے۔

حضرت شبلی علیہ الرحمتہ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس میں کھڑے ہو کر نعرہ مارا کہ "یا مرادی" اور حق تعالیٰ کی طرف اشارہ کیا حضرت جنیدؒ نے فرمایا اے ابوبکر اگر تمہاری مراد حق ہے تو یہ اشارہ کیوں ہے کیونکہ وہ اس سے بے نیاز ہے اور اگر تمہاری مراد حق نہیں ہے تو تم نے خلاف کیوں کیا۔ حق تعالیٰ تمہارے قول کے بموجب علیم ہے۔ حضرت شبلی علیہ الرحمتہ نے اپنے کلام پر توبہ واستغفار کیا۔

وہ جماعت جو بولنے کو خاموشی پر ترجیح دیتی ہے ان کا کہنا ہے کہ حق تعالیٰ نے ہمیں اپنے احوال کے بیان کا حکم دیا ہے۔ کیونکہ دعویٰ معنی کے ساتھ قائم ہے مثلاً اگر کوئی حق تعالیٰ کی معرفت، عقل وخرد سے ہزار برس تک رکھے اور کوئی امر مانع بھی نہ ہو تو جب تک اپنی معرفت کا اقرار زبان سے نہ کرے اس کا حکم کافروں جیسا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو حمد وثنا اور شکر خدا بجالانے کا حکم دیتا ہے اس نے اپنے حبیب علیہ ﷺ کو حکم دیا "واما بنعمة ربك فحدث" اپنے

رب کی نعمتوں کو اچھی طرح بیان کرو۔ حمد وثنا اور بیانِ نعمت بندے کا کلام ہوتا ہے لہٰذا اظہار ذکر کرنا حکمِ خدا کی تعظیم اور بجا آوری کے لئے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ ''ادعونی استجب لکم'' مجھ سے دعا مانگو میں قبول کروں گا۔ نیز فرمایا ''اجیب دعوۃ الداع اذا دعان'' میں دعا مانگنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے دعا مانگے۔ ان کے سوا بے شمار آیات اس کی دلیل ہیں۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ جس کو اپنے حال کے بیان کی قدرت نہ ہو وہ بے حال ہے اس لئے کہ گویائی کا وقت بھی تو ایک وقت وحال ہوتا ہے جیسا کہ شاعر کہتا ہے

لسان الحال افصح من لسانی	وصمتی عن سوالی ترجمانی

میری زبان سے زیادہ فصیح میرے حال کی زبان ہے۔
اور میرے سوال کی ترجمانی میری خاموشی کر رہی ہے۔

ایک مرتبہ حضرت ابوبکر شبلی علیہ الرحمتہ بغداد سے کرخ تشریف لے گئے انھوں نے ایک مدعی کو یہ کہتے سنا کہ ''السکوت خیر من الکلام'' خاموشی، بولنے سے بہتر ہے۔ اس پر حضرت شبلی نے فرمایا ''سکوتک خیر من کلامک و کلامی خیر من سکوتی'' تیرا خاموش رہنا تیرے بولنے سے بہتر ہے اور میرا بولنا میرے خاموش رہنے سے بہتر ہے ''لان کلامک لغو و سکوتک هزام و کلامی خیر من سکوتی لان سکوتی حلم و کلامی علم'' کیونکہ تیرا بولنا لغو ہے اور تیری خاموشی ٹھٹھا اور میرا بولنا خاموشی ہے اس لئے بہتر ہے کہ میری خاموشی میں حلم و بردباری اور کلام میں علم و دانائی ہے۔

قولِ فیصل حضور سیدنا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کلام دو طرح کا ہوتا ہے اسی طرح خاموشی بھی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک کلام حق اور ایک کلام باطل۔! اسی طرح ایک سکوت، مقصود و مشاہدہ کے حاصل ہونے کے بعد اور ایک غفلت وحجاب کی حالت میں۔ ہر شخص کو گفتار و سکوت کی حالت میں اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنا چاہیے کہ اگر اسی کا بولنا حق ہے تو اس کا بولنا اس کی خاموشی سے بہتر ہے اور اگر اس کا بولنا باطل ہے تو اس کی خاموشی اس کے بولنے سے بہتر ہے اور اگر حجاب و غفلت کی بنا پر ہو تو بھی بولنا خاموشی سے بہتر ہے ایک جہان اس کے معنی میں حیران و سرگرداں ہے۔

کچھ لوگ ایسے ہیں جنھوں نے اپنی ہوس میں معانی سے خالی الفاظ و عبارت کو اپنا رکھا ہے اور کہتے پھرتے ہیں کہ بولنا خاموشی سے افضل ہے۔

اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو گہرائی کے مقابلہ میں منارہ تک کو نہیں جانتے اور اپنی جہالت کی وجہ سے خاموش رہتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ خاموشی، بولنے سے بہتر ہے۔ یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کی مانند ہیں کسے گویا کہیں اور کسے خاموش؟

''من نطق اصاب او غلط ومن انطق عصم من الشطط'' جو بولتا ہے یا تو وہ صحیح ہوگا یا غلط اور جو بولا جاتا ہے اسے خطا و خلل سے بچایا جاتا ہے۔ چنانچہ ابلیس علیہ اللعنۃ نے کہا ''انا خیر منہ'' میں آدمؑ سے بہتر ہوں (معاذ اللہ) اور حضرت آدمؑ سے یہ کہلوایا گیا کہ ''ربنا ظلمنا انفسنا'' اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔

لہٰذا مشائخِ طریقت، اپنی گویائی میں اجازت یافتہ اور بے قرار ہیں اور اپنی خاموشی میں شرم زدہ اور مجبور ہیں۔ ''من کان سکوتہ حیاءً کان کلامہ حیوۃ'' جس کی خاموشی شرم سے ہو اس کا کلام دعویٰ کی زندگی ہے۔ ان کا کلام دیدار سے ہے اور جو کلام بغیر دیدار کے ہو وہ موجب ذلّت و رسوائی ہے۔ ایسے وقت نہ بولنا، بولنے سے افضل ہے تاکہ اپنے آپ میں رہیں اور جب غائب ہو جاتے ہیں تو لوگ ان کے قول کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ:۔

''من کان سکوتہ لہ ذھبا کان کلامہ لغیرہ مذھبا''	جس کے لئے خاموشی سونا ہو تو اس کا کلام دوسروں کے لئے مذہب ہوتا ہے۔

لہٰذا طالبِ حق پر لازم ہے کہ اگر اس کی فکر و غور بندگی میں ہو تو خاموش رہے تاکہ اس کی زبان جب بولے تو ربوبیت کے ساتھ بولے۔ اور اسی کی بات کہے اور اس کے الفاظ و عبارت مریدوں کے دلوں کو متاثر کر سکیں۔

بات کرنے کا ادب یہ ہے کہ بے حکم نہ بولے اور اتنا ہی جواب دے جو ضروری ہو خاموشی کا ادب یہ ہے کہ وہ جاہل نہ ہو اور نہ جہالت پر راضی ہو غفلت میں نہ رہے۔

مرید پر لازم ہے کہ مشائخ کے کلام میں دخل نہ دے اور نہ اس میں تصرف کرے اور سنسنی خیز باتیں نہ بیان کرے۔ اس زبان کو جس سے کلمہ شہادت پڑھا اور توحید کا اقرار کیا ہے اس کو غیبت اور جھوٹ سے پاک و صاف رکھے۔ مسلمان کو رنج نہ پہنچائے اور درویشوں کو صرف ان کے نام سے نہ پکارے اور جب تک کوئی ان سے معلوم نہ کرے خود کچھ نہ بولے۔ بات کرنے میں پہل نہ کرے اور اس درویش پر خاموشی لازم ہے جو باطل پر خاموش نہ رہ سکے۔ گفتگو کی شرط

یہ ہے کہ حق کے سوا دوسری بات نہ کرے۔ اس کی اصل وفرع اور لطائف بہت ہیں بخوفِ طوالت اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

چوبیسواں باب

سوال کے آداب

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے" لا یسألون الناس الحافا " لوگوں سے گڑگڑا کر سوال نہ کرو۔ اور جب کوئی سوال کرے تو منع نہ کرو۔

حضور اکرم ﷺ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا" واما السائل فلا تنھر " سائل کو نہ جھڑکو۔ جہاں تک ممکن ہو خدا کے سوا کسی سے سوال نہ کرو۔ اس لئے کہ غیر خدا کو سوال کا محل نہیں بنایا گیا ہے۔ سوال سے غیر خدا کی طرف التفات پایا جاتا ہے۔ جب بندہ خدا سے روگرداں ہوتا ہے تو اس کا قوی اندیشہ ہوتا ہے کہ اسے محلِ اعراض میں نہ چھوڑ دیا جائے۔

کسی دنیا دار نے حضرت رابعہ عدویہ رحمتہ اللہ علیہا سے کہا اے رابعہ مجھ سے مانگو میں تمہیں دوں گا۔ انھوں نے جواب دیا اے شخص، جب کہ میں دنیا کے پیدا کرنے والے سے حیا کرتی ہوں کہ دنیا اس سے مانگوں، تو کیا اپنے جیسے سے مانگنے میں مجھے شرم نہ آئے گی۔؟

منقول ہے کہ ابومسلم کے زمانہ میں کسی صاحب دعوت نے ایک درویش کو بے گناہ چوری کے الزام میں پکڑوا دیا۔ چار راتیں اسے قید خانہ میں رہنا پڑا۔ ایک رات ابومسلم نے حضور اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ آپ نے فرمایا اے ابومسلم! مجھے خدا نے تمہارے پاس بھیجا ہے کہ اس کے دوست کو بے جرم قید خانہ میں ڈلوا دیا ہے۔ جاؤ اسے آزاد کرو۔ ابومسلم خواب سے بیدار ہوئے اور ننگے سر اور ننگے پاؤں قید خانہ دوڑتے ہوئے گئے حکم دیا کہ قید خانہ کا دروازہ کھول دیا جائے اور اس درویش کو باہر لے کر آئے۔ اس سے معافی مانگی اور کہا کوئی حاجت ہو تو بیان کرو۔ درویش نے کہا اے امیر، جس خدا کی شان یہ ہو کہ وہ آدھی رات کے وقت ابومسلم کو بستر سے جگا کر بھیجے اور بلا سے نجات دلائے کیا اس کے بندے کے لئے زیبا ہے کہ وہ دوسروں سے سوال کرے۔؟ ابومسلم رونے لگے اور درویش کے سامنے سے ہٹ گئے۔

ایک جماعت کے نزدیک درویش کا سوال کرنا جائز ہے کیونکہ حق تعالےٰ کا ارشاد ہے

کہ لوگوں سے گڑگڑا کر سوال نہ کرو اس میں اشارہ ہے کہ سوال تو کرو مگر گڑگڑاؤ نہیں حضور اکرم ﷺ نے خود صحابہ کی ضروریات پوری کرنے کے لئے صاحب ہمت کو ترجیح دی ہے اور ہمیں بھی ارشاد فرمایا ہے کہ

''اطلبوا الحوائج عند حسان الوجوہ''	اپنی ضرورتوں کے لئے خوب صورت چہرہ والوں سے سوال کیا کرو۔

مشائخ طریقت فرماتے ہیں کہ تین باتوں کے لئے سوال جائز ہے کہ ایک یہ کہ دل کی فراغت کے لئے سوال ضروری ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ ہم دو روٹیوں کی قیمت بھی نہیں رکھتے اور دن رات اس کا انتظار کرتے ہیں اور ہماری اضطراری و بے قراری کی حالت میں اللہ تعالےٰ سے اس کے سوا کوئی حاجت نہیں ہوتی اس لئے کہ کھانے کے انتظار کی مشغولیت سے بڑھ کر اور کوئی مشغولیت نہیں ہوتی۔ اسی بنا پر جب حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے مرید شقیق کی بابت دریافت کیا جب کہ وہ مرید زیارت کے لئے آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ شقیق کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں سے کنارہ کش ہو گئے ہیں اور توکل اختیار کر لیا ہے۔ حضرت بایزیدؒ نے فرمایا جب تم جاؤ تو شقیق سے کہنا کہ دیکھو دو روٹی کی خاطر خدا کو نہ آزمانا۔؟ جب بھوکے ہو تو کسی ہم جنس سے دو روٹی مانگ لینا اور توکل کے نام کو ایک طرف رکھ دینا تاکہ تمہارے ولایت کا محل اپنے معاملہ کی بدبختی سے زمین پر نہ آ جائے۔ اور تباہ و برباد نہ ہو جائے۔!

سوال کی دوسری غرض یہ ہے کہ نفس کی ریاضت کے لئے سوال کیا جائے تاکہ نفس ذلیل و خوار ہو سکے اور رنجیدہ ہو کر اپنی قدر و قیمت پہچانے۔ کہ دوسروں کی نظر میں اس کی کیا منزلت ہے اور دوبارہ تکبر کر کے مصیبت میں نہ ڈالے۔!

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس جب حضرت ابوبکر شبلی رحمتہ اللہ علیہ آئے تو حضرت جنید نے فرمایا اے ابوبکر تمہارے دماغ میں ابھی تک یہ گھمنڈ ہے کہ میں خلیفہ کے خاص الخاص کا فرزند ہوں اور سامرہ کا امیر ہوں یہ تمہارے کام نہ آئے گا جب تک کہ تم بازار میں جا کر ہر ایک کے سامنے دستِ سوال نہ پھیلاؤ گے اس وقت تک اپنی قدر و قیمت نہ جان سکو گے چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا روزانہ بازار میں ان کی قدر و قیمت گھٹتی گئی یہاں تک کہ چھ سال میں اس حال کو پہنچ گئے کہ انھیں بازار میں کسی نے کچھ نہ دیا۔ اس وقت حضرت جنیدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا حال بیان کیا۔ آپ نے فرمایا اے ابوبکر اب تم اپنی قدر و قیمت کو پہچانو کہ لوگوں کی

نظر میں تمہاری کوئی قیمت نہیں ہے۔ لہٰذا تم ان لوگوں کو دل میں جگہ نہ دو اور ان کی کچھ منزلت نہ سمجھو۔ یہ معنی ریاضت کے لئے تھے نہ کہ کسب کے لئے۔ کسب کے طریق پر سوال کسی طرح حلال نہیں ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میرا ایک رفیق تھا، اللہ تعالےٰ نے اسے بلا لیا اور دنیاوی نعمت سے اخروی نعمتوں میں پہنچا دیا۔ میں نے اسے خواب میں دیکھا تو اس سے پوچھا کہ اللہ تعالےٰ نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟ اس نے کہا مجھے بخش دیا ہے۔ میں نے پوچھا کس بنا پر؟ اس نے کہا اللہ تعالےٰ نے مجھے اٹھا کر فرمایا اے میرے بندے، تو نے بخیلوں اور کمینوں کی بڑی اذیتیں برداشت کیں ہیں۔ تو نے ان کے آگے ہاتھ پھیلایا پھر صبر سے کام لیا۔ اس لئے تجھے بخشتا ہوں......!

سوال کی تیسری غرض یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کی حرمت میں لوگوں سے سوال کرے اور تمام دنیاوی اموال کو خدا ہی کا جانے اور ساری مخلوق کو اس کا وکیل سمجھے اور جو اپنے نصیب کی ہوا سے خدا کے وکیلوں سے حاصل کرے۔ سوال تو لوگوں سے ہو لیکن نظر حق تعالیٰ کی طرف۔ جب بندہ خود کو ایسا بنا لیتا ہے۔ تو حرمت الٰہی میں وکیل سے جو مانگتا ہے وہ طاعت میں حق تعالیٰ سے زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ایسوں کا غیر سے سوال کرنا حق تعالیٰ سے اپنے حضور توجہ کی نشانی ہے نہ یہ غیبت ہے اور نہ حق تعالیٰ سے روگردانی۔!

حضرت عیسیٰ بن معاذ رحمتہ اللہ علیہ کی ایک لڑکی تھی۔ ایک دن لڑکی نے اپنی ماں سے کہا مجھے فلاں چیز کھلایئے۔ اس کی والدہ نے کہا۔ خدا سے مانگو۔ لڑکی نے کہا مجھے شرم آتی ہے کہ میں اپنی نفسانی خواہش کے لئے خدا سے سوال کروں۔ تم جو کچھ دو گی وہ بھی اسی کی جانب سے ہو گا اور وہ میری تقدیر کا حصہ ہو گا۔

سوال کے آداب یہ ہیں کہ اگر سوال پورا ہو جائے تو اس سے زیادہ کی خواہش نہ کرنی چاہئے۔ لوگوں کو حق تعالےٰ کے درمیان نہ رکھے حق تعالیٰ ہی کی طرف نظر رکھے۔ عورتوں اور بازار والوں سے سوال نہ کرے۔ اپنا راز اسی سے کہے جس پر اعتماد ہو کہ اس کا مال حلال ہے کسی پر ظاہر نہ کرے۔ جہاں تک ہو سکے اپنے نصیب پر سوال نہ کرے وہ تو اسے پہنچنا ہی ہے۔ سوال کرتے وقت گھر کی آرائش کو ملحوظ نہ رکھے اور نہ اسے اپنی ملکیت جانے بلکہ ضرورتِ وقت کا تقاضہ سمجھے۔ کل کی فکر آج نہ کرے تاکہ دائمی ہلاکت میں نہ پڑے۔ حق تعالیٰ کو اپنی گدائی کا ذریعہ نہ

بنائے اور نہ ایسی پارسائی جتائے کہ پارسائی کی وجہ سے لوگ زیادہ دیں۔؟

ایک صاحب مرتبہ بزرگ کو میں نے دیکھا کہ وہ بیابان سے فاقہ زدہ اور سفر کی صعوبتیں اٹھائے ہوئے بازارِ کوفہ میں پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چڑیا تھی اور آواز لگاتا تھا کہ مجھے اس چڑیا کی خاطر کچھ دے دو؟ لوگوں نے کہا اے شخص یہ کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا یہ محال ہے کہ میں یہ کہوں کہ مجھے خدا کی راہ پر کچھ دے دو۔ دنیا کے لئے ادنیٰ چیز ہی کا وسیلہ لایا جا سکتا ہے۔ چونکہ دنیا قلیل ہے......

طوالت کی وجہ سے اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ واللہ اعلم

پچیسواں باب

نکاح اور مجرّد رہنے کے آداب

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے" ھن لباس لکم وانتم لباس لھن " بیویاں تمہارے لباس ہیں اور تم بیویوں کے لباس ہو۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"تنا کحوا تکثروا فانی اباھی بکم الامم یوم القیٰمۃ ولو بالسقط"	مسلمانو، نکاح کرو اور اولاد کی کثرت کرو کیونکہ روزِ قیامت تمہارے ذریعہ اپنی امت کی کثرت پر فخر کروں گا۔ اگرچہ حمل کا سقوط ہی کیوں نہ ہو۔

نیز فرمایا:۔

"ان اعظم النساء برکۃ اقلھن مؤنتہ واحسنھن وجوھا واحصنھن فروجا"	سب سے بڑی برکت والی بیوی وہ ہے جس کا بوجھ کم ہو اور وہ حسین چہرے والی اور عصمت کی حفاظت کرنے والی ہو۔

احادیث صحیحہ میں وارد ہے کہ تمام مرد و عورت پر ہر حال میں نکاح ہے۔ ہر مرد و عورت پر فرض ہے کہ حرام سے بچے اور سنت یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے عیال کے حقوق کو پورا کرے۔

مشائخ کی ایک جماعت فرماتی ہے کہ شہوت کو دور کرنے اور دل کی فراغت حاصل کرنے کے لئے نکاح کرنا چاہئے اور ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ نسل کو قائم رکھنے کے لئے نکاح کرنا ضروری ہے تاکہ اولاد ہو۔ اگر اولاد باپ کے سامنے فوت ہو جائے تو وہ قیامت کے دن اس کی شفاعت کرے گی اور اگر اولاد کے سامنے باپ مر جائے تو اولاد اس کی مغفرت کے لئے دعا کرے گی۔

حدیث میں وارد ہوا ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ام کلثوم دختر سیدہ فاطمۃ الزہراء بنت رسول اللہ ﷺ کا پیام نکاح ان کے والد ماجد حضرت علی مرتضی کرم اللہ وجہہٗ کو دیا اور ان سے درخواست کی، حضرت علی مرتضی نے فرمایا وہ تو بہت کم عمر ہیں اور آپ بہت بزرگ ہیں۔ میری نیت تو یہ تھی کہ اسے اپنے چچازاد بھائی حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما کو دوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہلوایا اے ابوالحسن! بڑی عمر کی عورتیں تو جہان میں بہت ہیں میری مراد، ام کلثوم سے دفع شہوت نہیں ہے بلکہ اثباتِ نسل ہے کیونکہ حضور اکرم ﷺ سے میں نے سنا ہے کہ "کل نسب و حسب ینقطع بالموت الا نسبی وحسبی" مرنے کے بعد ہر حسب ونسب منقطع ہو جاتا ہے مگر میرا حسب ونسب باقی رہتا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ ہر سبب ونسب منقطع ہو جاتا ہے مگر میرا سبب ونسب باقی رہتا ہے۔ اس وقت سبب تو مجھے حاصل ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ نسب بھی حاصل ہو جائے۔ تاکہ دونوں میں حضور اکرم ﷺ کی متابعت میں مضبوط ہو جاؤں۔ اس کے بعد حضرت علی مرتضیٰؓ نے اپنی صاحبزادی سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو حضرت عمر فاروقؓ کے نکاح میں دے دیا اور ان سے حضرت زید ابن عمرؓ تولد ہوئے......!

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ:۔

تنکح النساء علٰی اربعۃ علی المال' والحسب والحسن والدین فعلیکم بذات الدین فانہ مااستفاد امرء بعد الاسلام خیر من زوجۃ مومنۃ موافقۃ یسربھا اذا نظر الیھا"	چار وجہوں کی بنا پر عورتوں سے نکاح کیا جاتا ہے مال، حسب، حسن اور دین کے لئے۔ لیکن تم پر لازم ہے کہ دین والی عورتوں کو پسند کرو کیونکہ مسلمان ہونے کے بعد سب سے بہتر فائدہ جو حاصل ہو سکتا ہے وہ مومنہ اور موافقت کرنے والی بیوی ہے جس سے تمہارا دل خوش ہو جب تم اسے دیکھو۔

مردِ مومن ایسی ہی بیوی سے انس و راحت پاتا ہے اس کی صحبت سے دین کو تقویت حاصل ہوتی ہے اور دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ سب سے بڑی وحشت تنہائی کی ہے اور سب سے بڑی راحت صحبت۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ تنہائی کا ساتھی شیطان ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب مرد یا عورت اکیلے رہتے ہوں تو ان کے ساتھ شیطان ہوتا ہے جو ان کے دل میں شہوات کو ابھارتا ہے اور امن و حرمت کے اعتبار سے کوئی صحبت نکاح کرنے سے بہتر نہیں ہے۔ اگر یک جہتی اور موافقت ہے تو اس میں ذرا بھی سختی و مشغولیت نہیں رہتی اور جب عورت میں یک جہتی نہ ہو اور غیر جنس سے ہو تو درویش کو چاہئے کہ پہلے اپنے دل میں غور کرے اور تنہائی کی آفتوں اور نکاح کے درمیان سوچے کہ ان دونوں میں سے کونسی آفت کو آسانی سے دور کر سکتا ہے پھر اس کے مطابق عمل کرے۔ کیونکہ مجرد و تنہا رہنے میں دو۲ آفتیں ہیں ایک تو سنت کا ترک ہے دوسرے شہوت کی پرورش اور حرام میں مبتلا ہونے کا خطرہ بھی ہے۔ اسی طرح غیر جنس سے نکاح کرنے میں دو۲ آفتیں ہیں ایک غیر خدا کے ساتھ دل کی مشغولیت دوسرے نفسانی لذت کے لئے تن کو مشغول کرنا۔ اس مسئلہ کی اصل، عزلت و صحبت یعنی خلوت و جلوت کے مسئلہ کی طرف راجع ہے۔ جو شخص خلق کی صحبت چاہتا ہے اس کے لئے نکاح کرنا ضروری ہے اور جو خلوت و گوشہ نشینی کا خواہاں ہے اسے مجرد رہنا مناسب ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے

"سیروا سبق المفردون" چلو، کہ مجرد لوگ تم پر سبقت لے گئے۔

حضرت حسین بن ابی الحسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

"نجا المخففون وهلك المثقلون"۔	ہلکے لوگ نجات پا گئے اور بوجھ والے ہلاک ہو گئے۔

حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ایک بزرگ سے ملنے ایک بستی میں گیا جب میں ان کے گھر پہنچا تو ان کا گھر نہایت پاکیزہ دیکھا جس طرح اولیاء کا عبادت خانہ ہوتا ہے۔ اور اس مکان میں دو۲ محرابیں تھیں، ایک محراب کے گوشہ میں وہ بزرگ تشریف فرما تھے اور دوسری محراب میں ایک بوڑھی عورت پاکیزہ اور روشن چہرے والی بیٹھی ہوئی تھی اور یہ دونوں کثرتِ عبادت میں بوڑھے ہو چکے تھے۔ میرے آنے پر انھوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا تین۳ دن ان کے یہاں رہا جب میں نے واپسی کا ارادہ کیا تو میں نے اس بزرگ سے

پوچھا یہ پاک دامن عورت آپ کی کون ہے؟ انھوں نے فرمایا۔ یہ ایک رشتہ سے تو میری چچازاد بہن ہے اور دوسرے رشتہ سے یہ میری بیوی۔ میں نے کہا ان تین دنوں میں میں نے تو آپ دونوں میں غیریت اور بیگانگی دیکھی ہے؟ انھوں نے کہا ٹھیک ہے۔ پینسٹھ سال گزر گئے ہیں اسی طرح رہتے ہوئے۔ میں نے عرض کیا اس کی وجہ بیان فرمایئے؟ انھوں نے جواب دیا بات یہ ہے کہ ہم بچپن میں ایک دوسرے پر عاشق ہوگئے تھے۔ اس کے والد نے اسے مجھے دینا منظور نہ کیا کیونکہ ہماری باہمی محبت اسے معلوم ہوگئی تھی۔ ایک عرصہ تک محبت کی آگ میں ہم دونوں جلتے رہے۔ یہاں تک کہ اس کا والد وفات پا گیا۔ میرے والد اس کے چچا تھے انھوں نے میرے ساتھ اس کا نکاح کردیا جب پہلی رات ہم دونوں یکجا ہوئے تو اس نے مجھ سے کہا جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کیسی نعمت سے سرفراز کیا ہے کہ ہم دونوں ایک ہوگئے اس نے ہمارے دلوں کو ناخوش گوار ابتلا و آفت سے نجات دی۔ میں نے کہا ٹھیک کہتی ہو۔ اس نے کہا پھر ہمیں آج کی رات اپنے آپ کو نفسانی خواہش سے باز رکھنا چاہیئے چہ جائے کہ ہم اپنی مراد کو پائمال کریں اور اس نعمت کے شکریہ میں ہم دونوں کو خدا کی عبادت کرنی چاہیئے۔ میں نے کہا تم ٹھیک کہتی ہو۔ دوسری رات بھی یہی کہا تیسری رات میں نے کہا گزشتہ ۲ دو راتیں تو میں نے تمہارے شکر میں گزاری ہیں آج رات تم میرے شکر میں عبادت کرو۔ اس طرح ہم پینسٹھ ۶۵ سال گذار چکے ہیں، اور ہم نے ایک دوسرے کو چھونا تو درکنار کبھی نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ساری عمر نعماتِ الٰہی کے شکرانے میں گزار دی۔

معاشرت کے آداب

جب درویش نکاح کے ذریعہ صحبت کا قصد کرے تو لازم ہے کہ بیوی کو حلال رزق مہیا کرے۔ اور اس کے مہر کو حلال کمائی سے ادا کرے تا کہ حق تعالےٰ کے حقوق اور بیوی کے حقوق جو خدا نے فرض کئے ہیں اس کے ذمہ باقی نہ رہیں۔ لذتِ نفس کی خاطر اس سے مشغول نہ ہو۔ جب فرائض ادا کر چکے تب اس سے ہم بستر ہو اور اپنی مراد اس سے پوری کرے اور حق تعالےٰ سے دعا مانگے کہ اے خدا جہان کی آبادی کے لئے تو نے آدم کی سرشت میں شہوت پیدا کی اور تو نے چاہا کہ یہ باہم صحبت کریں۔ اے خدا مجھے اس کی صحبت سے دو چیزیں عطا فرما۔ ایک تو حرصِ حرام کو حلال سے بدل دے دوسرے مجھے فرزندِ صالح عطا فرما جو راضی برضا اور ولی ہو ایسا فرزند عطا نہ فرما جو میرے دل کو تجھ سے غافل کردے۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ ان کے یہاں ایک فرزند پیدا ہوا وہ بچپن میں اپنی ماں سے کھانے کے لئے جو مانگتا اس کی ماں کہتی خدا سے مانگ؟ وہ بچہ محراب

میں چلا جاتا سجدہ کرتا اس کی ماں چھپا کر اس کی خواہشیں پوری کر دیتی۔ بچے کو معلوم تک نہ ہوتا کہ یہ ماں نے دیا ہے یہاں تک کہ یہ اس کی عادت بن گئی ایک دن بچہ مدرسہ سے آیا تو اس کی ماں گھر میں موجود نہ تھی۔ عادت کے مطابق سر سجدہ میں رکھ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے جو اس کی خواہش تھی پوری کر دی۔ ماں جب آئی تو اس نے پوچھا اے بیٹے یہ چیز کہاں سے آئی؟ اس نے کہا وہیں سے جہاں سے روزانہ آتی ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام، حضرت مریم سلام اللہ علیہا کے پاس اگر گرمی میں تشریف لاتے تو سردی کے میوے اور اگر سردی میں تشریف لاتے تو گرمی کے میوے ان کے پاس موجود ہوتے اور حیرت سے دریافت کرتے کہ ''انّٰی لک ھٰذا قالت ھو من عند اللّٰہ'' یہ کہاں سے آئے وہ کہتیں یہ میرے رب نے بھیجے ہیں۔

درویش کے لئے ضروری ہے کہ سنت کی اتباع کے وقت دل کو دنیا اور شغلِ حرام سے دور رکھے کیونکہ درویش کی ہلاکت اس کے دل کی خرابی میں ہے جس طرح کہ تونگر کی خرابی گھر اور خاندان کی خرابی میں مضمر ہے۔ مالدار کی خرابی کا تو بدل ممکن ہے لیکن درویش کی خرابی کا کوئی بدل ممکن نہیں

اس زمانہ میں ایسی بیوی کا ملنا ناممکن ہے جو حاجت سے زیادہ اور فضول و محال چیزوں کی طلب کے بغیر اچھی رفیقۂ حیات ثابت ہو۔ اسی بنا پر مشائخ کی ایک جماعت مجرد رہنے کو پسند کرتی ہے ان کا عمل اس حدیث پر ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ''خیر الناس فی اٰخر الزمان خفیف الحاذ'' آخر زمانہ میں وہ لوگ سب سے بہتر ہیں جو خفیف الحاذ ہوں۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ خفیف الحاذ کیا ہے؟ فرمایا ''الذی لا اھل لہ ولا ولد لہ'' وہ لوگ ہیں جن کی نہ بیوی ہو نہ بچے؟ نیز فرمایا ''سیروا سبق المفردون'' چلو، کہ مجرد لوگ تم پر سبقت لے گئے۔

مشائخ طریقت کا اس پر اجماع ہے کہ جن کے دل آفت سے خالی ہوں اور ان کی طبیعت شہوت و معاصی کے ارتکاب کے ارادے سے پاک ہو۔ ان کا مجرد رہنا افضل و بہتر ہے اور عام لوگوں نے ارتکاب معاصی کے لئے حضور اکرم ﷺ کی اس حدیث کو (معاذ اللہ) سند بنا لیا ہے کہ ''حبب الیّ من دنیا کم ثلث الطیب والنساء و جعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ'' تمہاری دنیا کی تین چیزیں مجھ پسند و مرغوب ہیں ایک تو خوشبو، دوسری بیویاں، تیسری نماز کہ اس میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک رکھی گئی ہے۔

مشائخ طریقت فرماتے ہیں کہ جسے عورت محبوب ہو اسے نکاح کرنا افضل ہے لیکن ہم کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ "لی حرفتان الفقر والجهاد" میرے دو کسب ہیں ایک فقر دوسرا جہاد۔ لہٰذا اس حرفت وکسب سے کیوں ہاتھ اُٹھایا جائے؟ اگر عورت محبوب ہے تو یہ اس کی حرفت ہے۔ اپنی اس حرص کو، کہ عورت تمہیں زیادہ محبوب ہے، اس کی نسبت حضور اکرم ﷺ کی طرف کیوں منسوب کرتے ہو؟ یہ محال و باطل ہے کہ جو شخص پچاس سال تک اپنی حرص کا پیرو رہے اور وہ یہ گمان رکھے کہ یہ سنت کی پیروی ہے۔ وہ سخت غلطی میں مبتلا ہے۔ غرضکہ سب سے پہلا فتنہ جو حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں مقدر کیا گیا اس کی اصل یہی عورت ہے اور دنیا میں سب سے پہلا جو فتنہ ظاہر ہوا اس کا سبب بھی یہی عورت ہے۔ یعنی ہابیل وقابیل کا فتنہ اور آج تک بلکہ جب تک بھی اللہ تعالیٰ چاہے کسی کو عذاب دے ان کا سبب بھی عورت ہی ہے۔ گویا تمام دینی اور دنیاوی فتنوں کی جڑ یہی عورتیں ہیں۔ جیسا کہ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ "ما ترکت بعدی فتنة اضر علی الرّجال من النساء" مردوں کے لئے سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والا فتنہ عورت سے بڑھ کر میں نے نہیں دیکھا۔ عورتوں کا فتنہ جب ظاہر میں اس قدر ہے تو باطن میں کتنا ہوگا؟

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ گیارہ سال نکاح کی آفت سے خدا نے محفوظ رکھنے کے بعد میری تقدیر نے مجھے اس فتنہ میں مبتلا کر دیا اور بے دیکھے میرا ظاہر و باطن، ایک پری صفت کا اسیر بن گیا۔ ایک سال اس میں ایسا غرق رہا کہ قریب تھا کہ میرا دین تباہ ہو جائے یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے اپنے کمالِ لطف وکرم سے عصمت کو میرے ناتواں دل کے استقبال کے لئے بھیجا اور اپنی رحمت سے مجھے نجات عطا فرمائی۔ والحمد لله علی جزیل نعمائه۔

الحاصل طریقت کی بنیاد، مجرّد رہنے پر ہے نکاح کی بعد حال دگرگوں ہو جاتا ہے۔ شہوت کے لشکر سے بڑھ کر کوئی لشکر غارت گر نہیں ہے۔ مگر شہوت کی آگ کو کوشش کر کے بجھانا چاہیئے۔ اس لئے کہ جو آفت بھی انسان میں ابھرتی ہے اس کے ازالہ کا ذریعہ بھی انسان میں موجود ہونا چاہیئے۔ کوئی اور اس آفت کو دور نہیں کر سکتا۔

شہوت کا دور ہونا دو چیزوں سے ہوتا ہے ایک یہ کہ تکلف کے تحت اسے دور کیا جائے۔

دوسرا یہ کہ ریاضت ومجاہدے کے کسب سے۔ لیکن جو تحتِ تکلّف ہے وہ انسان کی طاقت ہے کہ وہ بھوکا رہے اور جو کسب ومجاہدے سے باہر ہے تو وہ یا تو بے چین کرنے والا خوف ہے یا سچی محبت، جو

آہستہ آہستہ پیدا ہو کر محبت کے جسم کے تمام اجزاء میں سرائت کر جاتی اور غالب ہو جاتی ہے اور تمام حواس کو اس کے وصف سے نکال دیتی ہے اور بندے کو مکمل جدا کر کے اس سے بے ہودگی کو فنا کر دیتی ہے۔

حضرت احمد حماد سرخسی، جو ماوراء النہر میں میرے رفیق تھے اور برگزیدہ بندے تھے ان سے لوگوں نے پوچھا کیا آپ کو نکاح کی ضرورت پیش آئی؟ فرمایا نہیں۔ پوچھا کیوں؟ فرمایا اسلئے کہ میں اپنے احوال میں یا تو اپنے سے غائب ہوتا ہوں یا اپنے سے حاضر، جب غائب ہوتا ہوں تو مجھے دونوں جہان کی کوئی چیز یاد نہیں رہتی اور جب حاضر ہوتا ہوں تو میں اپنے نفس پر ایسا قابو رکھتا ہوں کہ جب ایک روٹی ملے تو وہ سمجھتا ہے کہ ہزار حوریں مل گئیں۔ دل کی مشغولیت بہت بڑا کام ہے جس طرح چاہو اسے رکھو۔

مشائخ طریقت کا ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ ہم مجرد رہنے اور نکاح کرنے میں بھی اپنے اختیار کو دخیل نہیں ہونے دیتے۔ یہاں تک کہ پردۂ غیب سے تقدیر کا جو حکم بھی ظاہر ہو سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ اگر ہماری تقدیر مجرّد رہنے میں ہے تو ہم پارسائی کی کوشش کرتے ہیں اور اگر نکاح کرنے میں ہے تو ہم سنت کی پیروی کرتے ہیں۔ دل کو فارغ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر حق تعالیٰ کی حفاظت شامل حال ہے تو بندہ کا مجرّد رہنا حضرت یوسف علیہ السلام کی مانند ہوگا کہ انھوں نے زلیخا کے ورغلانے پر باوجود طاقت وقوّت رکھنے کے اس سے منہ پھیر لیا۔ اس وقت بھی اپنے نفس کے عیوب دیکھنے اور نفسانی خواہش پر غلبہ پانے میں مصروف ہو گئے اور جب نکاح کرنا تقدیر میں ہوتا ہے تو وہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے نکاح کرنے کی مانند ہو جاتا ہے۔ چونکہ حضرت خلیل علیہ السلام کو حق تعالےٰ پر کامل بھروسہ اور اعتماد تھا بیوی کی مشغولیت بھی انھیں مشغول نہ کر سکی۔ یہاں تک کہ حضرت سارہ نے جب رشک کا اظہار کیا اور غیرت پیدا ہوئی تو حضرت ابراہیمؑ نے حضرت ہاجرہ کو بے آب وگیاہ بیابان میں چھوڑ کر خدا کے حوالہ کر دیا اور خود ان سے رُخ پھیر لیا تاکہ حق تعالیٰ اپنی صفات میں جس طرح چاہے ان کی پرورش فرمائے۔ بندے کی ہلاکت نہ نکاح کرنے میں ہے اور نہ مجرّد رہنے میں۔ کیونکہ اس کی ہلاکت تو اپنے اختیار کو قائم و برقرار رکھنے اور نفس کی پیروی کرنے میں ہے!

آل واولاد کے آداب اہل وعیال کی موجودگی میں شرط ادب یہ ہے کہ اس کے کسی درد و دکھ سے غافل نہ رہے اور نہ اپنا حال ضائع اور اوقات پراگندہ ہونے دے۔ اپنے اہل وعیال کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرے اور انھیں حلال رزق مہیا کرے اور نفقہ کی ادائیگی میں ظالموں اور جابر

بادشاہوں کی رعایت نہ کرے یہاں تک کہ اگر فرزند سے بھی ایسا ارتکاب ہو تو اس کا بھی لحاظ نہ کرے۔

حضرت احمد بن حرب نیشاپوری رحمتہ اللہ علیہ ایک دن نیشاپور کے امراء ورؤساء کے ساتھ جو انھیں سلام کرنے آئے تھے تشریف فرما تھے ان کا ایک بیٹا شراب پیئے ہوئے گانے والیوں کے ساتھ جھومتا ہوا گزر گیا۔ جس نے بھی اسے دیکھا اس کا حال متغیر ہو گیا۔ حضرت احمد نے جب لوگوں کو دیکھا تو فرمایا تمہارا حال کیوں متغیر ہے۔ انھوں نے کہا یہ جوان اس بے باکی کے ساتھ آپ کے سامنے سے گزرا ہے جس سے پریشان ہو گئے اس نے آپ کا بھی لحاظ نہیں کیا؟ آپ نے فرمایا وہ معذور ہے اس لئے کہ ایک رات ہم نے اپنے اور اپنی بیوی کے لئے ہمسایہ سے کوئی چیز لی تھی اور ہم دونوں نے اسے کھایا تھا اسی رات ہمبستری میں اس جوان کا استقرار ہوا تھا۔ پھر ہم پر نیند کا غلبہ ہوا اور سو گئے اس رات ہمارے اوراد وظائف بھی نہ ہو سکے۔ ہم نے صبح اس کھانے کی بابت تفتیش کی تو ہمسایہ نے بتایا جو چیز بھیجی تھی وہ ایک شادی کا کھانا تھا۔

مجرد رہنے کے آداب

مجرد رہنے یعنی غیر شادی شدہ رہنے کے آداب میں شرط یہ ہے کہ آنکھوں کو ناشائستہ باتوں سے محفوظ رکھے اور نہ دیکھنے کے لائق چیزوں کو نہ دیکھے اور ناجائز آوازوں کو نہ سنے اور نامناسب باتوں کو نہ سوچے۔ شہوت کی آگ کو فاقہ اور بھوک سے بجھائے دل کو دنیا اور حوادث کی مشغولیت سے محفوظ رکھے اور نفسانی خواہش کا نام علم والہام نہ رکھے اور شیطان کے فریبوں کی تاویل نہ کرے تا کہ طریقت کی راہ میں مقبول ہو۔ صحبت اور اس کے معاملات کے آداب یہ تھے جن کو اختصار کے ساتھ بیان کر دیا واللہ اعلم۔

دسواں کشف حجاب

مشائخ کے کلام اور ان کے الفاظ و معانی کے حقائق کے بیان میں

واضح رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں نیک بخت بنائے کہ ہر علم و ہنر اور ہر اہل معاملہ کے لئے اپنے اسرار کے اظہار و بیان میں خاص اشارے و کلمات ہوتے ہیں اور جنھیں ان کے سوا کوئی دوسرا سمجھ نہیں سکتا۔ الفاظ و عبارات کی اصطلاح وضع کرنے سے ان کی دو چیزیں مراد ہوتی ہیں ایک یہ کہ بخوبی سمجھا جائے اور مشکلات کو آسان بنایا جائے تا کہ فہم مرید کے قریب ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ ان اسرار کو ان لوگوں سے چھپایا جائے جو صاحبِ علم نہیں ہیں اس کے دلائل و شواہد واضح ہیں مثلاً اہل لغت کی خاص اصطلاحیں اور مخصوص الفاظ اور عبارات ہیں جن کو انھوں نے وضع کیا ہے جیسے فعل ماضی، حال مستقبل، صحیح و معتل وغیرہ اور اہلِ نحو کے بھی مخصوص الفاظ و عبارات ہیں۔ جن کو انھوں نے وضع کیا ہے جیسے رفع و ضمہ (پیش) فتح و نصب (زبر) خفض و کسرہ (زیر) جزم، جر، متصرف، غیر متصرف وغیرہ۔ اہل عروض کے بھی اپنے وضع کردہ مخصوص الفاظ ہیں جیسے بحور، دوائر، سبب، وتد اور فاصلہ وغیرہ اہل حساب و ہندسہ کے بھی مخصوص الفاظ ہیں جیسے ذو، زوج، ضرب، قسمت، کعب، جذر، اضافت تضعیف، تنصیف، جمع اور تفرقہ وغیرہ۔ فقہا کے بھی مخصوص وضع کردہ اصطلاحیں ہیں جیسے علّت، معلول، قیاس، اجتہاد، رفع اور الزام وغیرہ محدثین کی بھی مخصوص کردہ اصطلاحیں ہیں مثلاً مسند، مرسل، احاد، متواتر، جرح و تعدیل وغیرہ متکلمین کی بھی اپنی وضع کردہ مخصوص اصطلاحیں ہیں جیسے جوہر، کل، جزو، جسم، حدث، جبر، حیز اور ہیولیٰ وغیرہ۔

اسی طرح اہل طریقت کے بھی اپنے وضع کردہ الفاظ و عبارات ہیں جن سے اپنا مطلب و مقصود ظاہر کرتے ہیں تا کہ وہ علم تصوف میں ان کا استعمال کریں اور جسے چاہیں اپنے مقصود کی راہ دکھائیں اور جس سے چاہیں اسے چھپائیں۔ لہٰذا ان میں سے بعض الفاظ و کلمات کی تشریح بیان کرتا ہوں اور ان میں جو فرق و امتیاز ہے اس کی وضاحت کرتا ہوں تا کہ سمجھنے میں آسانی ہو۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

حال، وقت اوران کا فرق

اہل طریقت مصطلحات میں سے ایک حال اور ایک وقت ہے ان کے بیان کے ساتھ ان کا فرق بھی ظاہر کیا جائے گا۔ وقت اہلِ طریقت کے درمیان بہت مشہور لفظ ہے اور اس میں ان کی طویل بحثیں ہیں چونکہ میرا مقصود تحقیق واثبات ہے نہ کہ طوالت اس لئے اختصار پر اکتفا کرتا ہوں۔

وقت اسے کہتے ہیں کہ بندہ اس کے سبب اپنے ماضی و مستقبل سے فارغ ہو جائے۔ بندے کے دل پر حق تعالیٰ کی طرف سے جو واردات طاری ہوتے ہیں ان کے اسرار کو دل میں اس طرح محفوظ رکھے جس طرح کشف ومجاہدہ میں ہوتا ہے۔ اس وقت اس کے دل میں نہ تو پہلے کی کوئی یاد رہے اور نہ آیندہ کی فکر۔ اس حالت میں کسی مخلوق کی اس پر دسترس نہیں رہتی۔ اور نہ اس کی کوئی یاد باقی رہتی ہے کہ ماضی میں اس پر کیا گزرا۔ اور مستقبل میں کیا ہوگا۔؟

صاحبانِ ابوسعید خرازی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اپنے عزیز وقت کو عزیز ترین چیزوں کے سوا کسی سے مشغول نہ کرو اور بندے کی عزیز ترین چیز ماضی و مستقبل کے درمیان وقت اور حال ہے۔ اسی میں مشغول رہنا چاہیے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:۔

اللہ تعالیٰ کے حضور میں میرا ایک وقت ایسا ہوتا ہے کہ اس وقت میرے دل میں اٹھارہ ہزار عالم میں سے کسی کا بھی گزر ممکن نہیں۔	”لی مع اللّٰہ وقت لا یسعنی فیہ ملك مقرب ولا نبی مرسل“۔

اور نہ میری آنکھ میں کسی کی قدر ومنزلت ہوتی ہے۔ اسی بنا پر شب معراج، جب کہ زمین وآسمان کے ملک کی زیب وزینت آپ کو پیش کی گئی تو آپ نے کسی کی طرف التفات نہ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ”ما زاغ البصر وما طغٰی“ نہ آنکھ جھکی اور نہ ادھر اُدھر ہوئی۔ اسی لئے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم عزیز تھے اور عزیز کو بجز عزیز کے کسی سے شغل نہیں ہوتا۔

موحد کے دو وقت ہوتے ہیں ایک گم ہونے کا دوسرا پانے کا۔ ایک وصال کا دوسرا فراق کا۔

دونوں حالتوں میں اس کا وقت مغلوب ہوتا ہے۔ کیونکہ وصل میں اس کا وصل حق تعالیٰ سے ہے اور فراق میں اس کا فراق بھی حق تعالیٰ ہی سے ہے۔ بندے کا اختیار اور اس کا کسب دونوں وقت قائم نہیں رہتا۔ جس کے ساتھ بندے کی صفت کی جاسکے۔ چونکہ بندے کا اختیار اس کے

حالات سے جدا کر دیا جاتا ہے اس لئے وہ جو کچھ کرتا وقت کی زیبائش کے لئے ہوتا ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بیابان میں ایک درویش کو دیکھا جو کیکر کے درخت کے نیچے سخت و دشوار جگہ پر بیٹھا ہوا تھا میں نے اس سے کہا اے بھائی کس چیز نے تمہیں یہاں بٹھایا ہے۔ یہ جگہ بڑی سخت و دشوار ہے اور یہاں تم بیٹھے ہو؟ اس نے کہا میرا ایک وقت اس جگہ ضائع ہوا ہے۔ میں اس کے غم میں اس جگہ بیٹھا ہوا ہوں۔ میں نے پوچھا کتنے عرصہ سے یہاں بیٹھے ہوئے ہو اس نے کہا بارہ[۱۲] سال گزر چکے ہیں۔ اب میں اپنے شیخ سے استدعا کرتا ہوں میرے کام میں میری مدد فرمائیں تاکہ اپنے وقت اپنی مراد کو حاصل کر سکوں۔ حضرت جنید فرماتے ہیں کہ میں وہاں سے چل دیا۔ حج کیا اور اس کے لئے دعا کی جو خدا نے قبول فرمائی اور وہ اپنی مراد کو پہنچ گیا۔ جب واپس آیا تو اس درویش کو اس جگہ بیٹھا پایا میں نے اس سے کہا اے جوانمرد! اب جب کہ تم نے اپنا وقت پالیا تو اب یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ اس نے کہا اے میرے شیخ! یہ وہ جگہ ہے جہاں مجھے وحشت و پریشانی لاحق ہوئی تھی اور میرا سرمایا گم ہوا تھا اور اب بھی یہی وہ جگہ ہے جہاں سے میرا گم شدہ سرمایہ مجھے دوبارہ ملا ہے۔ میں نے اس جگہ کو پکڑ لیا ہے، مجھے اس جگہ سے محبت ہوگئی ہے۔ کیا اب میرے لئے جائز ہوگا کہ میں اس جگہ کو چھوڑ دوں اور کسی اور جگہ چلا جاؤں۔ میری تمنا ہے کہ مر کر میری مٹی بھی اسی جگہ مل جائے اور قیامت کے دن جب اٹھایا جاؤں تو میں اس جگہ سے اٹھوں۔ یہ میرے انس و محبت کی جگہ ہے۔

فکل امرء یولی الجمیل مجیب ہر انسان اچھے دوست کو قبول کرتا ہے	فکل مکان ینبت العز اطیب اور عزت والی جگہ کو وہ پسند کرتا ہے

جو چیز آدمی کے کسب و اختیار میں نہیں ہوتی کہ اسے بتکلف حاصل کرے وہ بازار میں فروخت نہیں ہوتی کہ اسے جان کے عوض حاصل کر سکے اور اس کے حاصل کرنے یا دور کرنے کی اس میں قدرت بھی نہ ہو تو اس کی یہ دونوں صورتیں رعایت میں برابر ہوتی ہیں اور اس کے تحقق میں بندہ کا اختیار باطل ہوتا ہے۔

مشائخ طریقت بیان کرتے ہیں کہ "الوقت سیف قاطع" وقت کاٹنے والی تلوار ہے۔ چونکہ تلوار کا کام کاٹنا ہے۔ اسی طرح وقت کا کام کاٹنا ہے اور وقت، ماضی و مستقبل کی جڑوں کو کاٹتا ہے اور اس کے غموں کو مٹاتا ہے۔ لہٰذا وقت کی صحبت خطرناک ہے یا تو وہ ہلاک کر دے گا یا مالک بنادے گا۔ اگر کوئی شخص ہزار برس تک تلوار کی خدمت کرے اور اپنے کاندھوں پر لٹکائے

پھرے لیکن جب اس کے کاٹنے کا وقت آئے گا تو تلوار نہ اپنے خدمت گار مالکوں کو دیکھے گی نہ غیر کو۔ دونوں کو یکساں کاٹ دے گی۔ کیونکہ اس کا کام ہی قہر وغلبہ ہے۔ اس کے مالک کے اسے پسند کرنے کی وجہ سے اس کا قہر وغلبہ جاتا نہ رہے گا۔

حال حال، وقت پر ایک آنے والی چیز ہے جو وقت کو مزین کرتی ہے۔ جس طرح روح سے جسم مزین ہوتا ہے لامحالہ وقت، حال کا محتاج ہے کیونکہ وقت کی پاکیزگی حال سے ہوتی ہے اور اس کا قیام بھی اسی سے ہوتا ہے۔ لہٰذا جب صاحب وقت صاحبِ حال ہوتا ہے تو اس سے تغیر جاتا رہتا ہے اور وہ اپنے احوال میں مستحکم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بغیر حال کے وقت کا زوال ممکن نہیں۔ اور جب اس سے حال مل جاتا ہے اس کے تمام احوال وقت بن جاتے ہیں ان کے لئے وقت کا نزول تھا۔ چونکہ متمکن کے لئے غفلت جائز تھی۔ اور صاحبِ غفلت پر اب حال نازل ہے اور وقت چونکہ متمکن ہے۔ اس لئے صاحبِ وقت پر غفلت جائز تھی اور اب صاحبِ حال پر غفلت جائز نہیں ہے۔ واللہ اعلم

مشائخ طریقت فرماتے ہیں کہ "الحال سکوت اللسان فی فنون البیان" صاحبِ حال کی زبان اپنے حال کے بیان کرنے سے ساکت رہتی ہے اور اس کا معاملہ اس کے حال کے تحقق واثبات میں گویا ہوتا ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ "السوال عن الحال محال" حال کے بارے میں پوچھنا محال ہے اس لئے کہ حال کی تعبیر ناممکن ہے۔ حال ہوتا ہی وہ ہے جہاں حال فنا ہو جائے۔

استاد ابو علی قاری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دنیا و آخرت میں خوشی وغم وقت کا نصیبہ ہے اور حال ایسا نہیں ہوتا۔ کیونکہ حال ایسی کیفیت ہے جو حق تعالیٰ کی جانب سے بندے پر وارد ہوتی ہے اور جب اس کا ورود ہوتا ہے تو دل سے سب کچھ فنا ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا حال تھا وہ صاحبِ وقت تھے۔ ایک وقت میں تو بحالت فراق آنکھوں کی بینائی جاتی رہی دوسرے وقت میں بحالتِ وصال بینائی لوٹ آئی۔ کبھی گریہ وزاری سے ایسے ضعیف و ناتواں ہوئے کہ بال سے باریک ہو گئے اور کبھی وصال سے تندرست وتوانا بن گئے۔ کبھی خوفزدہ ہوئے اور کبھی مسرت وخوشی پائی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام صاحب حال تھے وہ نہ فراق سے مغموم ہوتے اور نہ وصال سے مسرور۔ چاند ستارے اور سورج ان کے حال کی مدد کرتے تھے۔

اور خود ہر چیز کے دیکھنے سے فارغ تھے۔ جو نظر آتا اس میں حق تعالیٰ کا جلوہ ہی نظر آتا تھا۔ فرماتے تھے "لا احب الآفلین" میں چھپنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

صاحبِ وقت کے لئے کبھی سارا جہان دوزخ ہو جاتا ہے جب کہ مشاہدہ میں غیبت ہو جاتی ہے اور دل سے حبیب کا روپوش ہو جانا موجب وحشت بن جاتا ہے اور کبھی اس کا دل خوشی و مسرت میں پھولا نہیں سماتا۔ اور سارا جہان مانند جہالت بن جاتا ہے۔ نعمتوں میں ہر آن وہ حق کا مشاہدہ کرتا ہے اور وہ نعمت اس کے لئے تحفہ اور بشارت بن جاتی ہے۔ پھر یہ کہ صاحبِ حال کے لئے حجاب ہو یا کشف ہو، نعمت ہو یا بلا سب یکساں ہوتا ہے کیونکہ وہ ہر مقام میں صاحب حال ہوتا ہے۔ لہٰذا حال مراد کی صفت ہے اور وقت مرید کا درجہ کوئی فی نفسہٖ وقت کی راحت میں ہوتا ہے اور کوئی حال کی مسرت میں خدا کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ دونوں منزلوں کے درمیان فرق وامتیاز ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

مقام و تمکین اور ان کا فرق

مقام طالب کا صدقِ نیت اور ریاضت و مجاہدے کے ساتھ حق تعالیٰ کے حقوق کو ادا کرنے پر قائم رہنے کا نام مقام ہے۔ ہر ارادۂ حق والے کا ایک مقام ہوتا ہے جو بوقت طلب، بارگاہِ حق سے ابتداء میں اس کے حصول کا موجب بنتا ہے۔ جب بھی طالب کسی مقام پر عبور کرے گا اور پچھلے مقام کو چھوڑے گا تو وہ لازمی کسی ایک مقام پر قائم ہوگا جو اس کے واردات کا مقام ہے، مرکب اور از قسم تخلوق ہے وہ سلوک اور معاملہ کی قسم سے نہیں ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں آیا ہے کہ "وما منا الا له مقام معلوم" ہم میں سے کوئی نہیں مگر یہ کہ اس کا کوئی مقام معین ہے۔ جیسے حضرت آدم علیہ السلام کا مقام توبہ تھا۔ اور حضرت نوح علیہ السلام کا مقام زہد تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام تسلیم و رضا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقام انابت تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا مقام حزن و ملال تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقام امید و رجا تھا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا مقام خوف وخشیت تھا اور ہمارے آقا سیدِ عالم ﷺ کا مقام ذکر تھا۔ ہر ایک کو ہر مقام میں خواہ کتنا ہی عبور ہو بہر طور اس کا رجوع اس کے اپنے اصل مقام کی ہی طرف ہوگا میں نے اس کا تذکرہ محاسبیوں کے مذہب میں بیان کر دیا ہے اور حال و مقام کا فرق بھی واضح کر چکا ہوں۔

راہ حق کی قسمیں واضح رہنا چاہیئے کہ راہِ حق کی تین قسمیں ہیں۔ ایک مقام دوسرا حال تیسرا تمکین۔ اللہ تعالیٰ نے تمام نبیوں کو اپنی راہ بتانے کے لئے بھیجا۔ تاکہ وہ مقامات کے احکامات

بیان فرمائیں۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار (کم وبیش) انبیاء علیہم السلام تشریف لائے اور وہ اتنے ہی مقامات کی تعلیم کے پیغامبر تھے۔ مگر ہمارے آقا سیدِ عالم ﷺ کی تشریف آوری سے ہر صاحب مقام کے لئے ایک حال ظاہر ہوا اور حال کو مقام سے ملا کر مخلوق سے اس کا کسب واختیار جدا کیا گیا۔ یہاں تک کہ مخلوق پر دین کو تمام کیا اور نعمت کو انتہا تک پہنچایا گیا۔ ارشاد حق ہے کہ "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی" "آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر کے اپنی تمام نعمتیں تم پر ختم کر دیں۔ اس کے بعد اہل تمکین کے لئے قرار کا ظہور رہا۔

درجہ تمکین

محققین کا درجہء کمال کے اعلیٰ منزل میں اقامت گزیں ہونے کا نام تمکین ہے۔ لہٰذا صاحبانِ مقامات کے لئے مقامات سے عبور ممکن ہے لیکن درجہء تمکین سے گزر جانا محال ہے۔ اس لئے کہ مقام مبتدیوں کا درجہ ہے۔ تمکین منتہیوں کی اقامت گاہ ہے۔ ابتدا سے انتہا کی طرف جانا تو ہے لیکن انتہا سے گزرنے کی کوئی صورت نہیں۔ کیونکہ مقامات منزلوں کی راہیں ہیں اور تمکین بارگاہِ قدس میں برقرار ہونا ہے۔ محبوبانِ خدا راستہ میں عاریۃً ہوتے ہیں اور منزل میں بے گانے۔ ان کا باطن بارگاہِ قدس میں ہوتا ہے اور بارگاہِ قدس میں سبب وآلہ، آفت ہوتا ہے اور وہ غیبت وعلت کے اوزار ہوتے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں شعراء اپنے ممدحین کی تعریف، معاملہ سے کرتے تھے اور جب تک کچھ عرصہ نہ گزر جاتا شعر نہیں کہتے تھے۔

چنانچہ جب کوئی شاعر ممدوح کے حضور پہنچ جاتا تھا تو تلوار سونت کر سواری کے پاؤں کاٹ ڈالتا اور تلوار کو توڑ دیتا تھا۔ اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا کہ مجھے سواری اس لئے درکار تھی کہ اس کے ذریعہ تیرے حضور تک پہنچنے کے لئے مسافت طے کروں اور تلوار رکھنا اس لئے ضروری تھا کہ حاسدوں کو تیرے حضور سے دور کر دوں اب چونکہ میں پہنچ گیا ہوں تو سامان سفر کی کیا حاجت؟ سواری کو اس لئے ہلاک کر دیا کیونکہ تیری پاس سے مجھے جانا ہی نہیں ہے اور تلوار اس لئے توڑ ڈالی کہ تیرے حضور سے جدا ہونے کا دل میں کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ پھر جب کچھ دن گزر جاتے تو شعر پڑھتا تھا

حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صفت بھی ایسی ہی بیان فرمائی کہ جب وہ منزلیں کر کے دشوار مقامات کو عبور کر کے محلِ تمکین پہنچے اور ان سے تمام اسبابِ تغیر جدا ہو گئے تو حق تعالٰے نے فرمایا "فاخلع نعلیك" "والق عصاك" "نعلین اتارو، اور اپنا عصا ڈال دو۔ کیونکہ یہ سامانِ سفر تھا۔ بارگاہِ قدس میں حضور کے بعد، سفر کا خطرہ ہی کیا؟ محبت کی ابتداء طلب ہے اور اس کی انتہا قرار اور سکون پانا۔

پانی جب نہر و دریا میں رہے جاری رہتا ہے جب سمندر میں پہنچ جاتا ہے تو ٹھہر جاتا ہے اور جب پانی ٹھہر جاتا ہے تو اس کا مزہ بدل جاتا ہے۔ کیونکہ جسے پانی کی ضرورت ہوتی ہے وہ سمندر کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ سمندر کی طرف وہی جاتا ہے جسے موتیوں کی تلاش ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ سانس کو روکتا ہے اور گہر کی طلب میں پاؤں جوڑ کر سر کے بل سمندر کی تہ میں غوطہ لگاتا ہے۔ اس کے بعد یا تو وہ بہترین قیمتی موتی لے کر آتا ہے یا غرقِ دریا ہو جاتا ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ "التمکین رفع التلوین" تغیر و تبدل ختم ہو جانے کا نام تمکین ہے۔ لفظ تلوین بھی حال و مقام کی مانند اہلِ طریقت کی اصطلاح میں ایک لفظ و عبارت ہے اور معنی میں ایک دوسرے کے قریب۔ لیکن اس جگہ تلوین کے معنی ایک حال سے دوسرے حال کی طرف بدلنے کے ہیں اس مقولہ کا مطلب یہ ہے کہ متمکن متردد نہیں ہوتا اور اپنا سارا سامان لے کر بارگاہِ قدس سے واصل ہو جاتا ہے۔ اس کے دل میں نہ غیر کا اندیشہ باقی رہتا ہے اور نہ اس پر کوئی معاملہ گزرتا ہے جس سے اس کے ظاہر کے بدل جانے کا امکان ہو اور نہ کوئی حال گزرتا ہے جس سے اس کا باطن متغیر ہو۔ چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مقام تلون میں تھے۔ طور پر جب جلوۂ حق نے تجلی فرمائی تو ان کے ہوش جاتے رہے حق تعالیٰ نے فرمایا "وخر موسٰی صعقا" موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر زمین پر آ رہے اور ہمارے آقا سید عالم ﷺ محل تمکین میں تھے جب مکہ مکرمہ سے قاب قوسین تک عین تجلّی میں رہے تب بھی آپ کا حال ایک رہا۔ اور کسی دوسرے حال کی طرف متغیر نہ ہوئے۔ یہ درجہ اعلیٰ تھا۔ واللہ اعلم

محل تمکین کی قسمیں محلِ تمکین کی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ اس کی نسبت اپنے شہود کے ساتھ ہو۔ جس کی نسبت اپنے شہود کے ساتھ ہے وہ باقی الصفت ہوتا ہے اور جس کی نسبت شہود حق کے ساتھ ہو وہ فانی الصفت ہوتا ہے۔ فانی الصفت کے لئے محو، صحو، محق، بحق، فنا و بقا اور وجود و عدم کا استعمال درست نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ ان اوصاف کے قیام کے لئے موصوف کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب موصوف شہود حق میں مستغرق ہوتا ہے تو اس سے وصف کا قیام ساقط ہو جاتا ہے اور بھی بکثرت لطائف ہیں۔ مختصراً اتنا ہی کافی ہے۔ وباللہ التوفیق۔

محاضرہ و مکاشفہ اور ان کا فرق

واضح رہنا چاہئے کہ لفظ محاضرہ کا استعمال، حضور قلب پر بیان لطائف میں ہوتا ہے اور لفظ مکاشفہ کا استعمال، حضور تحریر پر جو دل میں خطرہ عیاں ہو اس وقت ہوتا ہے۔ گویا آیات کے

شواہد کو محاضرہ اور مشاہدات کے شواہد کو مکاشفہ کہتے ہیں اور محاضرہ کی علامت، آیات کی دید میں ہمیشہ فکر مند رہنا ہے اور مکاشفہ کی علامت، عظمت کی تہ میں ہمیشہ حیرت زدہ رہنا ہے۔ جو افعال میں فکر مند ہو اور جو جلال میں حیرت زدہ ہو۔ ان میں فرق یہ ہے کہ ایک خلت کے ہم معنی ہوتا ہے اور دوسرا محبت کے قریب۔ چنانچہ حضرت خلیل علیہ السلام نے جب ملکوت سماوی پر نظر ڈالی تو اس کے وجود کی حقیقت میں تامل و تفکر کیا اور ان کا دل اس میں حاضر ہوا تو فعل کی دید میں فاعل کو دیکھا۔ یہاں تک کہ ان کے حضور نے فعل کو بھی فاعل کی دلیل بنا دیا اور کمال معرفت میں گویا ہوئے "انی وجهت وجهی للذی فطر السموات والارض حنیفاً الآیہ" یعنی میں اپنے چہرے کو اس ذات کی طرف یکسو ہو کر پھیرتا ہوں جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے۔

حضور اکرم ﷺ کو جب ملکوت سماوی کی سیر کرائی گئی تو آپ نے سارے عالم کو دیکھنے سے آنکھیں بند کر لیں۔ نہ فعل کو دیکھا اور نہ مخلوق کو۔ حتیٰ کہ اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھا صرف فاعل کے مکاشفہ میں رہے۔ اسی طرح کشف میں شوق پر شوق کا اضافہ ہوا اور بے قراری بڑھی، دیدار کی طلب ہوئی تو رُخ کی رویت نہ ہوئی۔ قرب کو چاہا تو قربت ممکن نہ ہوئی۔ وصل کا ارادہ کیا تو وصال کی صورت نہ بنی۔ قلب اطہر پر دوست کی تنزیہہ و تقدیس کا جتنا زیادہ ظہور ہوتا اتنا ہی شوق پر شوق بڑھتا جاتا، نہ اعراض کی ہی راہ تھی نہ اقبال و توجہ کا امکان یعنی نہ ہٹ سکتے تھے نہ سامنے ہو سکتے تھے متحیر ہو کر رہ گئے۔ کیونکہ جہاں خلّت تھی وہاں حیرت کفر معلوم ہوئی اور جہاں محبت تھی وہاں وصل شرک نظر آیا۔ حیرت ہی سرمایہ بن کے رہ گیا۔ اس لئے کہ مقام خلت میں حیرت زدہ ہونا اس کے وجود میں ہوتا ہے اور یہ شرک ہے اور مقام محبت میں حیرت زدہ ہونا کیفیت میں ہوتا ہے یہ توحید کا مقام ہے۔ اسی واسطے حضرت شبلی علیہ الرحمۃ کہا کرتے تھے کہ "یا دلیل المتحیرین زدنی تحیرا" اے متحیروں کے رہنما! میری حیرت کو اور زیادہ کر۔ کیونکہ مشاہدے میں حیرت کی زیادتی سے درجہ بلند ہوتا ہے۔

حضرت ابو سعید خراز رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابراہیم سعد علوی کے ساتھ دریا کے کنارے ایک خدا کے دوست کو دیکھا تو اس سے دریافت کیا کہ حق کی راہ کس چیز میں ہے؟ انھوں نے کہا حق کی دو راہیں ہیں ایک عوام کی دوسرے خواص کی انھوں نے پوچھا اس کی تشریح فرمایئے؟ کہا عوام کی راہ وہ ہے جس پر تم ہو کیونکہ کسی علّت کے ساتھ قبول کرتے ہو اور کسی علت کے سبب چھوڑتے ہو اور خواص کی راہ یہ ہے کہ نہ وہ معلل کو دیکھتے ہیں۔ نہ علت کو۔ و باللہ التوفیق۔

قبض وبسط اور ان کا فرق

واضح رہنا چاہیئے کہ قبض وبسط احوال کی دو حالتوں کا نام ہے جو بندے کی طاقت سے باہر ہے۔ وہ نہ اس کے آنے پر قادر ہے اور نہ اس کے جانے پر۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "واللّٰہ یقبض ویبسط" قبض وبسط میرے ہی قبضہ واختیار میں ہے۔

قبض اس حال کا نام ہے جو بحالتِ حجاب دل پر چھائے اور بسط اس کیفیت کا نام ہے جس کو دل پر چھائے ہوئے حجاب کا ارتفاع کہتے ہیں۔ یہ دونوں حق ہیں ان میں بندے کا اختیار نہیں ہے۔ عارفوں کے احوال میں قبض ایسا ہے جیسے کہ مریدوں کے احوال میں خوف اور اہل معرفت کے احوال میں بسط ایسا ہے جیسے مریدوں کے احوال میں رجا یعنی امید۔ یہ تعریف اس گروہ کے موافق ہے جو اس طرح معنی بیان کرتے ہیں۔

مشائخ طریقت کی ایک جماعت کہتی ہے کہ قبض کا مرتبہ، بسط کے مرتبہ سے زیادہ بلند ہے۔ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ قرآن کریم میں قبض کا ذکر، بسط سے پہلے آیا ہے۔ دوسرے یہ کہ قبض میں گداز اور قہر ہے اور بسط میں نوازش ومہربانی ہے۔ لامحالہ بشریت کے اوصاف کو فنا کرنا، اور نفس کو مغلوب کرنا، پرورش ومہربانی سے افضل ہے کیونکہ وہ بہت بڑا حجاب ہے۔

اور ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ بسط کا مرتبہ، قبض کے مرتبہ سے بلند تر ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم میں قبض کا پہلے ذکر آنا بسط کی فضیلت کی علامت ہے کیونکہ اہلِ عرب کی عادت ہے کہ اس چیز کو پہلے بیان کرتے ہیں جو فضیلت میں بعد ہو۔ جیسا کہ ارشاد ہے:۔

"فمنهم ظالم لنفسه ومنهم مقتصد ومنهم سابق بالخيرات باذن اللّٰه"	یعنی بعض بندے جانوں پر ظلم کرتے ہیں اور بعض بندے میانہ رو ہوتے ہیں اور بعض بندے حکمِ الٰہی سے نیکیوں میں سبقت لے جاتے ہیں۔

نیز فرمایا:۔

"ان اللّٰه يحب التوابين ويحب المتطهرين"	اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور خوب پاک وصاف رہنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔

اور فرمایا:۔

"يا مريم اقنتي لربك واسجدي واركعي مع الراكعين"	اے مریم اپنے رب کی فرمانبرداری کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ سجدہ ورکوع کرو۔

نیز مشائخ طریقت فرماتے ہیں کہ بسط میں سرور ہے اور قبض میں تکلیف اور عارفوں کا سرور، وصل معرفت کے بغیر نہیں ہوتا اور اپنی تکلیف، فصل کے بغیر دیکھے نہیں، لہٰذا وصل میں وقوف، فراق کے وقوف سے بہتر ہے۔

میرے شیخ و مرشد فرماتے ہیں کہ قبض و بسط دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں حق تعالےٰ کی طرف سے بندے کے شامل حال ہوتے ہیں۔ کیونکہ جب ان کے معانی دل پر اثر کرتے ہیں تو اس وقت بندے کا باطن یا تو مسرور ہوتا ہے اور نفس مغلوب یا پھر باطن مغلوب ہوتا ہے اور نفس مسرور۔ ایک سے دل کے قبض میں اس کے نفس کی کشادگی ہے اور دوسرے سے باطن کی کشادگی میں اس کے نفس کا قبض ہے۔ اس کے سوا جو بیان کرتا ہے وہ اپنے وقت کو ضائع کرتا ہے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "قبض القلوب فی بسط النفوس و بسط القلوب فی قبض النفوس" دلوں کا قبض، نفسوں کی کشادگی میں ہے اور دلوں کی کشادگی، نفسوں کے قبض میں ہے۔ لہٰذا قبض شدہ نفس خلل سے محفوظ ہے اور بسط شدہ باطن، زوال سے مضبوط ہے۔ اس لئے کہ محبت میں غیرت سے بری ہے اور قبض میں غیرت الٰہی کی علامت ہے محبّ کو محبّ کے ساتھ عتاب کرنا شرط ہے۔ اور بسط معاتبت کی علامت ہے آثار میں مروی ہے کہ حضرت یحییٰ قبض کو قبول کئے ہوئے تھے اور حضرت عیسیٰ بسط کو۔ جب ایک دوسرے سے ملاقات کرتے تو حضرت یحییٰ کہتے کہ اے عیسےٰ آپ قطعیت یعنی جدائیگی سے محفوظ ہیں اور حضرت عیسیٰ فرماتے کہ اے یحییٰ تم رحمت سے مایوس ہو، اس لئے کہ تمہارا رونا نہ تو ازلی حکم کو بدلتا ہے اور نہ میرا ہنسا قضائے الٰہی کو پلٹتا ہے۔ لہٰذا "لا قبض و لا بسط و لا طمس و لا انس و لا محو و لا صحو و لا لحق و لا محق و لا عجز و لا جھل الا من اللّٰہ تعالٰی۔" نہ قبض ہے نہ بسط۔ نہ رکنا ہے نہ محبت کرنا ہے، نہ مٹنا ہے نہ صحو نہ لحق ہے نہ محقق نہ عجز اور نہ جہل سب اللہ کی طرف سے ہے۔

اُنس و ہیبت اور ان کا فرق

واضح رہنا چاہئے اللہ تعالیٰ تمہیں سعید بنائے۔ ہیبت وانس، سالکانِ راہِ حق کے دو حال کا نام ہے۔ جب حق تعالیٰ بندے کے دل پر مشاہدہ جلال سے تجلی فرماتا ہے تو اس وقت اس کے دل پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ پھر جب مشاہدۂ جمال سے تجلی فرماتا ہے تو اس کے دل پر محبت و

انس کا غلبہ ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اہلِ محبت اس کے جلال سے حیرت زدہ اور اہل انس و محبت اس کے جمال سے خوشی میں مگن ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا جو دل جلال الٰہی کی محبت کی آگ میں جلتے ہیں اور وہ دل جو اس کے جمال کے نور کے مشاہدہ میں تاباں ہیں ان کے درمیان یہ فرق ہے۔

مشائخ کی ایک جماعت فرماتی ہے کہ ہیبت عارفوں کا درجہ ہے اور انس مریدوں کا مقام۔ اس لئے کہ بارگاہِ قدس کی تنزیہہ اور اس کے قدیم اوصاف میں جتنا کمال حاصل ہوگا۔ اتنا ہی اس کے دل پر ہیبت کا غلبہ ہوگا۔ اور انس سے اس کی طبیعت زیادہ دور ہوگی۔ کیونکہ انس ہم جنسوں سے ہوتا ہے اور حق تعالےٰ سے مجانست اور مشاکلت محال ہے لہٰذا وہاں انس کی کوئی صورت متصور نہیں ہو سکتی اسی طرح حق تعالیٰ کا مخلوق سے انس کرنا بھی محال ہے۔ اگر انس کی کوئی صورت ممکن ہے تو اس کے ذکر اور اس کی یاد کے ساتھ اُنس کرنا ممکن ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس کا ذکر غیر ہے اور وہ بندے کے صفات کے قبیل سے ہے۔ محبت میں غیروں کے ساتھ آرام پانا جھوٹ، ادعائے محض اور خالص گمان ہے اور ہیبت عظمت کے مشاہدے کی قبیل سے ہے اور عظمت، حق تعالیٰ کی صفت ہے۔ لہٰذا جس بندے کا کام اپنے فعل کے ساتھ ہو اور جس بندے کا کام اپنے افعال کو فنا کر کے بقائے حق کے ساتھ ہو اس کے اور اُس کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔

حضرت شبلی علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں کہ میں عرصہ تک اس گمان میں رہا کہ محبت میں خوش رہتا ہوں اور مشاہدۂ الٰہی سے انس پاتا ہوں۔ اب میں نے جانا کہ انس اپنی ہی ہم جنس سے ہو سکتا ہے۔

ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ ہیبت، فراق و عذاب کا ثمرہ ہے اور انس، رحمت و وصل کا نتیجہ ہے۔ اسی بنا پر دوستوں کے لئے لازم ہے کہ وہ ہیبت کے اقسام سے محفوظ رہیں اور انس و محبت کے قریب رہیں۔ یقیناً انس، محبت کا اقتضاء کرتی ہے جس طرح محبت کے لئے ہم جنسی محال ہے اسی طرح انس کے لئے بھی محال ہے۔

میرے شیخ و مرشد فرماتے ہیں کہ میں اس شخص پر تعجب کرتا ہوں جو یہ کہتا ہے کہ حق تعالیٰ کے لئے انس ممکن نہیں۔ باوجودیکہ یہ اس کا ارشاد ہے اس نے فرمایا ہے: "ان عبادی" یہ میرے بندے ہیں۔ "یا عبادی لا خوف علیکم الیوم ولا انتم تحزنون" اے میرے بندو آج نہ تم پر خوف ہے اور نہ تم غمگین ہو گے لامحالہ جب بندہ حق تعالےٰ کے اس فضل کو دیکھتا ہے تو وہ اس سے محبت کرتا ہے اور جب محبت کرتا ہے تو اُنس بھی حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ دوست سے ہیبت، غیریت کی علامت ہے اور انس یگانگت کی نشانی ہے۔ آدمی کی یہ خصلت ہے

کہ وہ نعمت عطا کرنے والے کے ساتھ اُنس رکھتا ہے اور حق تعالیٰ کی نعمتیں تو ہم پر بے شمار ہیں۔ اسی نے ہمیں اپنی معرفت سے نوازا ہے پھر ہم ہیبت کی بات کس طرح کر سکتے ہیں؟

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دونوں گروہ اپنی اپنی تعریف میں اختلاف کے باوجود راہ یاب اور درست ہیں۔ اس لئے کہ ہیبت کا غلبہ نفس اور اس کی خواہش کے ساتھ ہوتا ہے اور اس ہیبت کے ذریعہ اپنے اوصاف بشریت کو فنا کرنے، باطن میں انس کو غالب کرنے اور باطن میں معرفت کی پرورش کرنے میں مدد ملتی ہے اور حق تعالیٰ کی تجلّی جلال سے دوستوں کا نفس فنا ہو جاتا ہے اور تجلّیِ جمال سے ان کا باطن باقی رہتا ہے۔ لہٰذا جو اہلِ فنا ہیں وہ ہیبت کو مقدم کہتے ہیں اور جو ارباب بقا ہیں وہ انس کو فضیلت دیتے ہیں۔ اس سے قبل فنا و بقا کی تشریح کی جا چکی ہے۔

قہر و لطف اور ان کا فرق

قہر و لطف یہ دو لفظ ایسے ہیں جن سے مشائخ طریقت اپنے احوال کی تعبیر کرتے ہیں۔ قہر سے ان کی مراد یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی تائید سے اپنی مرادوں کو فنا کریں اور اس کی خواہشوں سے نفس کو محفوظ رکھیں بغیر اس کے کہ اس میں ان کا کوئی مطلب ہو اور لطف سے ان کی مراد یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی تائید سے باطن کو باقی رکھیں اور ہمیشہ مشاہدے میں مشغول رہیں اور درجہ استقامت میں حال انتہا تک برقرار رہے۔

ایک جماعت کہتی ہے کہ کرامت واعزاز یہ ہے کہ حق تعالیٰ سے مراد حاصل کرے۔ یہ اہل لطف ہیں اور ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ کرامت یہ ہے کہ حق تعالےٰ بندے کو اپنی مراد اور اس کی مراد دونوں سے بچائے رکھے اور اسے نامرادی کے ساتھ مغلوب کرے۔ مثلاً دریا میں جائے تو پیاس کی حالت میں دریا خشک ہو جائے۔ واللہ اعلم بالصواب

بغداد میں صاحبِ مرتبہ فقراء میں سے دو درویش تھے۔ ایک صاحب قہر و غلبہ تھے اور دوسرے صاحبِ لطف و کرم۔ ہمیشہ ان میں نوک جھونک رہا کرتی تھی۔ ہر ایک اپنے حال کو بہتر بتاتا تھا۔ ایک کہتا کہ حق تعالیٰ کا لطف و کرم بندے پر بہت بزرگ شئی ہے کیونکہ اس کا ارشاد ہے کہ "اللّٰہ لطیف بعبادہٖ" اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ حق تعالیٰ کا قہر و غلبہ بندہ پر بہت زیادہ مکمل شئی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتا ہے "وھو القاھر فوق عبادہٖ" اللہ

اپنے بندوں پر غالب ہے۔ ان دونوں درویشوں کی نوک جھونک نے بہت طول پکڑا۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آیا کہ صاحبِ لطف درویش نے مکہ مکرمہ کا قصد کیا وہ بیابان میں ٹھہر گیا اور مکہ مکرمہ نہ پہنچ سکا برسوں تک کسی کو اس کی خبر تک نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ ایک شخص مکہ مکرمہ سے بغداد آرہا تھا اس نے اس درویش کو دریا کے کنارے دیکھا۔ درویش نے اس سے کہا کہ اے بھائی! جب تم عراق پہنچو تو کرخ میں میرے فلاں رفیق سے کہنا کہ اگر تم چاہتے ہو تو اس مشقت کے باوجود جنگل میں بغداد کے محلہ کرخ کی مانند اس کے عجائبات کو دیکھنا چاہو تو آجاؤ۔ کیونکہ یہ جنگل میرے لئے حق تعالیٰ نے بغداد کی مانند بنا دیا ہے۔ جب یہ شخص کرخ پہنچا تو اس کے رفیق کو تلاش کر کے اس کا پیغام پہنچایا۔ اس کے جواب میں اس نے کہا۔ جب تم پھر جاؤ تو اس درویش سے کہنا کہ اس میں کوئی بزرگی نہیں ہے کہ مشقت کے ساتھ جنگل کو تمہارے لئے کرخ کی مانند بنا دیا گیا ہے۔ یہ اس لئے ہوا کہ تم درگاہِ الٰہی سے بھاگ نہ اٹھو بزرگی تو یہ ہے کہ بغداد کے محلہ کرخ کو اس کی نعمتوں اور اس کے عجائب کے باوجود مشقت کے ساتھ کسی کے لئے جنگل بنا دیا جائے اور وہ اس میں خوش وخرم رہے۔

حضرت شبلی علیہ الرحمتہ اپنی مناجات میں کہتے ہیں کہ اے خدا اگر تو آسمان کو میرے گلے کا طوق اور زمین کو میرے پاؤں کی زنجیر اور عالم کو میرے خون کا پیاسا بنا دے تب بھی میں تیری بارگاہ سے نہ ہٹوں گا۔

میرے مرشد رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک سال جنگل میں اولیاء کا اجتماع ہوا۔ میرے مرشد حضرت حصری رحمتہ اللہ علیہ مجھے اپنے ہمراہ وہاں لے گئے۔ میں نے وہاں ایک جماعت دیکھی جو تخت کے نیچے تھی اور ایک جماعت دیکھی جو تخت پر بیٹھی تھی۔ کوئی اُڑتا آرہا تھا اور کوئی کسی طریق سے۔ میرے مرشد نے کسی کی طرف التفات نہ کیا۔ یہاں تک کہ ایک جوان کو میں نے دیکھا جس کی جوتیاں پھٹی ہوئی تھیں اور عصا شکستہ تھا۔ پاؤں ننگے، بدن جھلسا ہوا، جسم کمزور ولاغر، جب وہ نمودار ہوا تو حضرت حصری رحمتہ اللہ علیہ دوڑ کر اس کے پاس پہنچے اور اسے بلند تر جگہ پر بٹھایا۔ فرماتے ہیں کہ میں یہ دیکھ کر حیرت میں پڑ گیا۔ اس کے بعد میں نے شیخ سے دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا یہ بندہ ایسا صاحب ولی ہے کہ ولایت کا تابع نہیں ہے بلکہ ولایت اس کے تابع ہے۔ وہ کرامتوں کی طرف توجہ نہیں کرتا۔

غرضکہ جو کچھ ہم از خود اختیار کریں وہ ہماری بلا ہوتی ہے۔ میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا کہ حق تعالیٰ مجھے اس منزل میں اس کی آفت سے محفوظ رکھے اور میرے نفس کی بُرائی سے

بچائے۔ اگر وہ قہر وغلبہ میں رکھے تو میں لطف ومہربانی کی تمنا نہیں کروں گا اور اگر لطف وکرامت میں رکھے تو میں قہر وغلبہ کا آرزومند نہ ہوں گا ہمیں اس کے اختیار کرنے میں کوئی اختیار نہیں ہے۔

نفی واثبات اور ان کا فرق

مشائخ طریقت نے تائید حق کے ساتھ صفتِ بشریت کی محو کو فنا واثبات کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ صفتِ بشریت کی فنا کو نفی اور غلبۂ حقیقت کے وجود کو اثبات کہا ہے۔ اس لئے کہ ''محو'' کل کے مٹ جانے کو کہتے ہیں اور کل کی نفی بجز صفات کے، ذات پر ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ جب تک بشریت باقی ہے اس وقت تک ذات سے کل کی نفی کی کوئی صورت ممکن ہی نہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ مذموم صفات کی نفی، خصائل محمودہ کے اثبات کے ساتھ کی جائے مطلب یہ کہ معنی کے اثبات کے لئے حق تعالیٰ سے معیت میں، دعوے کی نفی ہو۔ کیونکہ دعویٰ کرنا، نفس کے غرور کی قسم سے ہے جو انسان کی عام عادت ہے جب غلبۂ حقیقت میں، اوصاف مغلوب ومقہور ہو جاتے ہیں اس وقت کہا جاتا ہے کہ صفات بشریت کی نفی، حق کی بقا کے اثبات کے ساتھ ہوگئی۔ قبل ازیں فقر وصفوت اور فنا وبقا کے باب میں بہت کچھ کہا جاچکا ہے فی الحال اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مشائخ طریقت فرماتے ہیں کہ اس نفی سے مراد، حق تعالےٰ کے اختیار کے اثبات میں، بندے کے اختیار کی نفی ہے۔ اسی بنا پر ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ''اختیار الحق لعبدہٖ مع علمه لعبده خير من اختيار عبده لنفسه مع جهله بربه ''حق تعالیٰ کا اختیار اس کے بندے کے لئے اس کے اپنے علم سے بہتر ہے۔ اس سے جو بندے کو اپنے نفس کے لئے خدا سے غافل رہ کر اختیار پایا جائے۔ اس لئے کہ محبت میں محبّ کے اختیار کی نفی، محبوب کے اختیار کے اثبات سے وابستہ ہے یہ بات مسلّم ہے۔

ایک درویش دریا میں غرق ہو رہا تھا۔ کسی نے اس سے کہا اے بھائی! کیا تو چاہتا ہے کہ تجھے نکال لیا جائے؟ اس نے کہا نہیں۔ پھر اس نے پوچھا کیا چاہتا ہے کہ غرق ہو جائے؟ درویش نے کہا نہیں۔ اس نے کہا عجیب بات ہے کہ نہ تو ہلاکت چاہتا ہے نہ نجات؟ درویش نے کہا مجھے ایسی نجات کی حاجت نہیں جس میں میرا اختیار شامل ہو۔ میرا اختیار تو وہ ہے جو میرے رب کے اختیار میں ہے۔

مشائخ طریقت فرماتے ہیں کہ محبت میں کم سے کم درجہ اپنے اختیار کی نفی ہے کیونکہ حق تعالیٰ کا اختیار ازلی ہے اس کی نفی ممکن نہیں اور بندے کا اختیار عارضی ہے اس کی نفی جائز ہے۔ لازم ہے کہ عارضی اختیار کو پائمال کیا جائے تا کہ ازلی اختیار قائم و باقی رہے۔ جس طرح کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہِ طور پر مسرور ہوئے تو اپنے اختیار کو برقرار رکھتے ہوئے حق تعالیٰ کے دیدار کی تمنا کا اظہار کیا اور خدا سے عرض کیا "ربّ ارنی" "اے رب مجھے اپنا جلوہ دکھا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا "لن ترانی" "تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکو گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا اے خدا دیدار تو حق ہے اور میں اس کا مستحق بھی ہوں پھر کیوں منع فرمایا جا رہا ہے؟ ارشاد ہوا کہ دیدار حق ہے لیکن محبت میں اپنا اختیار باقی رکھنا باطل ہے۔ اس مسئلہ میں گفتگو تو بہت ہے مگر میرا مقصود چونکہ اختصار ہے۔ بتوفیق الٰہی اس کا مختصر تذکرہ جمع و تفرقہ۔ فنا و بقا اور غیبت و حضور میں بھی گزر چکا ہے یہاں اسی پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

مسامرہ و محادثہ اور ان کا فرق

مسامرہ اور محادثہ کے دونوں لفظ، کاملانِ طریقت کے احوال کی دو حالتیں ہیں۔ محادثہ کی حقیقت باطنی کیفیت سے متعلق ہے جہاں زبان کو خاموش رکھا جاتا ہے۔ اور مسامرہ کی حقیقت، باطنی واردات کے چھپانے پر ہمیشہ خوش رہنا ہے۔ ان کے تمام کے ظاہر معنی یہ ہیں کہ مسامرہ، ایک وقت ہے جب کہ بندہ رات میں حق تعالیٰ کے ساتھ ہو اور محادثہ وہ وقت ہے جو دن میں حق تعالیٰ کے ساتھ ہو۔ دن کے اس وقت میں بندہ حق تعالیٰ سے ظاہری و باطنی سوال و جواب کرتا ہے۔ اسی بنا پر رات کی مناجات کو مسامرہ اور دن کی دعاؤں کو محادثہ کہتے ہیں گویا دن کا حال کشف پر مبنی ہے اور رات کا حال خفا پر اور محبت میں مسامرہ، محادثہ سے کامل تر ہوتا ہے۔ مسامرہ کا تعلق حضور اکرم ﷺ کے حال سے وابستہ ہے۔ جب حق تعالیٰ نے چاہا کہ حضور ﷺ کو قربِ خاص سے نوازے تو جبریلؑ کو براق دے کر آپ کے پاس بھیجا تا کہ وہ مکہ سے قاب قوسین تک لے جائے اور حضور ﷺ حق تعالیٰ سے ہمراز ہوں۔ چنانچہ حضور ﷺ خدا سے ہم کلام ہوئے جب انتہا تک رسائی ہوئی تو آپ کی زبان مبارک ظہور جلال باری میں سُرخ ہوگئی اور آپ کا دل عظمت کی تہ میں متحیر ہو گیا اور آپ کا علم ادارک سے رہ گیا۔ زبان مبارک عبارت سے عاجز ہو گئی۔ اس وقت عرض کیا "لا احصی ثناء علیک" "تیری حمد و ثنا کرنے سے عاجز ہوں۔

محادثہ کا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حال سے ہے۔ جب چاہا کہ ان کا ایک وقت

حق تعالیٰ کے ساتھ ہو تو چالیس دن وعدہ انتظار کے بعد، دن میں کوہِ طور پر آئے۔ خدا کا کلام سُنا تو مسرور ہوئے۔ دیدار کی خواہش کی تو مراد سے رہ گئے اور ہوش سے جاتے رہے۔ جب ہوش آیا تو عرض کیا "تبت الیک" "تیری طرف رجوع ہوتا ہوں۔ تاکہ فرق ہو جائے کہ ایک وہ ہے جو آتا ہے اور ایک وہ ہے جو لے جایا جاتا ہے۔ "سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلاً" "پاک ہے وہ ذات جو راتوں رات بندے کو لے گیا۔ یہ وہ بندہ ہے جو لے جایا گیا ہے اور وہ وہ بندہ ہے جو خود آتا ہے۔ اس بندے کے متعلق ارشاد ہے "ولما جاء موسیٰ لمیقاتنا" "جب موسیٰ ہماری مقررہ جگہوں پر آئے۔ اس لئے رات دوستوں کی خلوت کا وقت ہے اور دن بندوں کی خدمت کرنے کا وقت۔ لامحالہ جب بندہ محدود حد سے تجاوز کر جاتا ہے تو اسے تنبیہ کی جاتی ہے۔ پھر دوست و محبوب کی کوئی حد نہیں ہوتی جس سے تجاوز ممکن ہو اور وہ مستحق ملامت بنے۔ محبوب جو بھی کچھ کرے محبّ کا پسندیدہ ہوتا ہے۔

عِلم الیقین، عین الیقین، حق الیقین اور ان کا فرق

واضح رہنا چاہئے کہ باعتبار اصول، یہ تینوں کلمے علم سے متعلق ہیں جو اپنے جاننے کے ساتھ ہیں۔ اور اپنے جاننے کے بیان کی صحت پر غیر یقینی علم، علم نہیں ہوتا اور جب علم حاصل ہو جاتا ہے تو اس سے غیب و خفا مرتفع ہو کر مشاہدہ عینی کی مانند بن جاتا ہے۔ اس لئے کہ کل روزِ قیامت جب ہر مسلمان دیدار باری تعالیٰ سے مشرف ہو گا تو وہ بھی اسی صفت پر دیکھے گا جس صفت میں آج جانتا ہے۔ اگر وہ دید اس کے خلاف ہوگی تو کل کی رویت یا تو صحیح نہ ہوگی یا اس کا علم درست نہ ہوگا۔ حالانکہ یہ دونوں صفتیں توحید کے منافی ہیں۔ اس لئے کہ مخلوق کو اس کا علم جو آج حاصل ہے وہ اسی کی طرف سے درست ہے کل اس کی رویت بھی اسی کی طرف سے درست ہوگی۔ لہٰذا علم الیقین عین الیقین کی مانند اور حق الیقین، علم الیقین کی مانند ہوگا۔ وہ حضرات جو عین الیقین کے بارے میں کہتے ہیں کہ رویت میں علم کا استغراق ہوتا ہے۔ یہ محال ہے۔ اس لئے کہ رویت حصول علم کے لئے ایک ذریعہ اور آلہ ہے جیسے کہ سننا ایک ذریعہ ہے۔ جب کہ علم کا استغراق سننے میں محال ہے تو رویت میں بھی محال ہے۔ لہٰذا اہلِ طریقت کے نزدیک عِلم الیقین

سے مراد، دنیاوی معاملات میں اوامر واحکام کا جاننا ہے اور عین الیقین سے مراد، جانکنی اور دنیا سے کوچ کرنے کے وقت کا علم ہے اور حق الیقین سے مراد، جنت میں رویت کا کشف اور اس کے احوال کے معائنہ کی کیفیت ہے۔ گویا علم الیقین علماء کا درجہ ہے کہ وہ احکام و اوامر پر استقامت رکھتے ہیں اور عین الیقین عارفوں کا مقام ہے کہ وہ موت کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں اور حق الیقین، محبوبانِ خدا کے فنا کا مقام ہے کہ وہ تمام موجودات سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ علم الیقین مجاہدے سے ہوتا ہے عین الیقین انس ومحبت سے اور حق الیقین مشاہدے سے اور یہ کہ ایک عام ہے دوسرا خاص تیسرا خاص الخاص۔ واللہ اعلم۔

عِلم و معرفت اور ان کا فرق

علماء اصول علم و معرفت کے درمیان فرق نہیں کرتے اور دونوں کو ایک ہی کہتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کو عارف کہنا جائز نہیں ہے۔ چونکہ اس کے تمام اسماء توقیفی ہیں۔ لیکن مشائخ طریقت ایسے علم کو جو معاملہ اور حال سے متعلق ہو اور اس کا عالم اپنے حال کو اس سے تعبیر کرے معرفت کہتے ہیں اور اس کے جاننے والے کو عارف اور جو علم ایسا ہو جس کے صرف معنی ہی ہوں اور وہ معاملہ سے خالی ہو اس کا نام علم رکھتے ہیں اور اس کے جاننے والے کو عالم کہتے ہیں لہٰذا وہ شخص جو کسی چیز کے معنی اور اس کی حقیقت کا عالم ہو اس کا نام عارف رکھا گیا ہے اور وہ شخص جو صرف عبارت جانتا ہو اور اس کی معنوی حقیقت سے ناآشنا ہو اس کا نام عالم رکھا گیا ہے۔ یہ طبقہ جب ان معنوں کو اپنے ہم زمانہ لوگوں پر بیان کرتا ہے تو ان کا استخفاف کرتا ہے ان کو دانشمند بناتا ہے اور عوام کو منکر ان کی مراد، ان کے حصولِ علم کی بنا پر ان کی مذمت کرنا نہیں ہوتی بلکہ ان کی مراد، معاملہ کو ترک کرنے کی برائی ظاہر ہوتی ہے۔

''لان العالم قائم بنفسه والعارف قائم بربه'' اس لئے کہ عالم اپنی ذات کے ساتھ قائم ہوتا ہے اور عارف اپنے رب کے ساتھ۔ ''معرفت سے حجاب کشف'' کے بیان میں بہت کچھ تشریح کی جا چکی ہے اس جگہ اتنا ہی کافی ہے۔

شریعت وحقیقت اور ان کا فرق

شریعت وحقیقت، مشائخ طریقت کے دو اصطلاحی کلمے ہیں۔ جن میں سے ایک ظاہر حال کی صحت کو واضح کرتا ہے اور دوسرا باطن کے حال کی اقامت کو بیان کرتا ہے ان کی تعریف میں

دو طبقے غلطی میں مبتلا ہیں۔ ایک علماء ظاہر ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ان میں فرق نہیں کرتے کیونکہ شریعت، خود حقیقت ہے اور حقیقت خود شریعت ہے۔ دوسرا طبقہ ملحدوں و بے دینوں کا ہے جو ہر ایک کا قیام ایک دوسرے کے بغیر جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب حال حقیقت بن جائے تو شریعت اٹھ جاتی ہے۔ یہ نظریہ مشبّہ، قرامطہ، مشبعہ اور موسان کا ہے۔ شریعت و حقیقت کے جدا ہونے پر دلیل یہ دیتے ہیں کہ محض تصدیق جو بغیر اقرار کے ہو اسے ایماندار نہیں بناتی۔ اور نہ صرف اقرار بغیر تصدیق کے اسے مومن بناتا ہے۔ قول و تصدیق کے درمیان فرق ظاہر ہے۔ لہٰذا حقیقت اسی معنی کی تعبیر ہے جس پر نسخ جائز نہیں ہے۔ حضرت آدم سے فنائے عالم تک اس کا حکم قائم و یکساں ہے۔ مثلاً معرفتِ حق، معاملہ میں خلوص نیت وغیرہ اور شریعت اس معنی کی تعبیر ہے جس پر نسخ و تبدیل جائز ہے مثلاً احکام و اوامر وغیرہ۔ شریعت بندہ کا فعل ہے اور حقیقت حق تعالیٰ کی حفاظت اور اس کی عصمت و تنزیہہ۔ معلوم ہوا کہ شریعت کا قیام، حقیقت کے وجود کے بغیر محال ہے اور حقیقت کا قیام، شریعت کی حفاظت کے بغیر بھی محال ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی مانند ہے جو روح کے ساتھ زندہ ہو۔ جب روح اس سے جدا ہو جاتی ہے تو وہ شخص مردہ ہو جاتا ہے اور روح جب تک رہتی ہے تو اس کی قدر و قیمت ایک دوسرے کے ساتھ رہنے تک ہے۔ اسی طرح شریعت بغیر حقیقت کے ریا ہے۔ اور حقیقت بغیر شریعت کے نفاق۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "والذین جاھدو افینا لنھدیھم سبلنا" جن لوگوں نے ہماری راہ میں کوشش کی یقیناً ہم نے ان کو اپنا راستہ دکھایا۔ مجاہدہ شریعت ہے اور ہدایت اس کی حقیقت۔ ایک بندہ کے ذمے ظاہری احکام کی حفاظت ہے دوسرے حق تعالیٰ کی حفاظت جو بندے کے باطنی احوال سے تعلق رکھتی ہے لہٰذا شریعت از قسم کسب ہے اور حقیقت از قسم عطائے ربانی ہے۔

"آخری نوع۔ دیگر مصلحاتِ مشائخ کے بیان میں"

اس آخری نوع میں ان کلمات کی تعریف ہے جو مشائخ طریقت کے کلام میں بطور اصطلاح و استعارہ مستعمل ہیں۔ جن کی تفصیل و شرح اور احکام زیادہ دشوار ہیں۔ اختصار کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں۔

الحق۔ اس سے مشائخ طریقت کی مراد رب العزّت کی ذات اقدس ہے اس لئے کہ اس کے اسماء میں سے حق بھی ایک نام ہے جیسا کہ "بان اللّٰہ ھو الحق" یقیناً اللہ وہی حق ہے۔

الحقیقۃ۔اس سے مراد، وصل الٰہی کے محل میں بندے کا قیام ہے اور محل تنزیہہ میں بندے کے باطن کا وقوف ہے۔

الخطرات۔اس سے مراد طریقت کے وہ احکامات ہیں جو دل پر گزرتے ہیں۔

الوطنات۔اس سے مراد، وہ معانی ہیں جو متوطن کے باطن میں وارد ہوں۔

الطمس۔عین کی ایسی نفی کہ اس کا اثر بھی نہ رہے۔

الرمس۔عین کی ایسی نفی کہ دل پر اس کا اثر رہے۔

العلائق۔ایسے اسباب ہیں جن سے طالب تعلق رکھنے کی وجہ سے مراد و مقصود سے رہ جائے۔

الوسائط۔ایسے اسباب جن سے طالب تعلق رکھ کر مقصود و مراد کو حاصل کرے۔

الزوائد۔دل میں انوار کی زیادتی۔

الفوائد۔اپنے ضروری اسرار کا ادراک کرنا۔

الملجا۔اپنی مراد کے حصول میں دل پر اعتماد کرنا۔

المنجا۔محلِ آفت سے دل کا نجات پا جانا۔

الکلیۃ۔پورے طور پر بشری اوصاف میں مستغرق ہونا۔

اللوائح۔اثبات مراد اور واردات کی نفی۔

اللوامع۔دل پر انوار کا ظہور، اس کے فوائد کے باقی رہنے کے ساتھ۔

الطوالع۔دل کا نورِ معرفت سے روشن ہونا۔

الطوارق۔شب بیداری میں عبادت و مناجات کے دوران دل پر خوشخبری یا فتنہ کی حالت کا طاری ہونا

السر۔محبت و دوستی کے معاملہ کو پوشیدہ رکھنا۔

النجویٰ۔راز و نیاز کے ذریعہ تکالیف و مصائب سے تحفظ حاصل کرنا تا کہ غیر کو خبر نہ ہو۔

الاشارۃ۔بغیر الفاظ استعمال کیے اپنا مطلب اشارۃً بیان کرنا۔

الایماء۔ظاہری اشارہ اور الفاظ کے بغیر، کسی دوسری کیفیت کے ذریعہ کچھ بتانا۔

الوارد۔معانی کا دلنشین ہونا۔

الانتباہ۔دل کا ہوشیار ہونا اور غفلت سے بیدار ہونا۔

الاشتباہ۔کسی چیز کا حق و باطل کے درمیان اس طرح مخلوط ہونا کہ حقیقت کا امتیاز نہ ہو سکے۔

القرار کسی تردد کے بغیر معاملہ کی حقیقت پر سکون دل اور قرار قلب کا حاصل ہونا۔

الانزعاج راہ راست پر ہونے کے باوجود حالات اضطراب میں ہونا۔
مذکورہ اصطلاحات کا مطلب نہایت مختصر بیان کیا گیا ہے۔

توحید کی وضاحت کے لئے اہل طریقت کی اصطلاحات

یہ اصطلاحات اظہار اعتقاد کے لئے بغیر استعارہ کے استعمال ہوتی ہیں۔

العالم۔ عالم کا مطلب خدا کے علاوہ تمام موجودات ومخلوقات جن کی تعداد اٹھارہ ہزار اور بعض روایات کے مطابق پچاس ہزار ہے۔ فلسفیوں کے نزدیک عالم کی دو قسمیں بنیادی ہیں ا۔عالم علوی یا عالم بالا۔۲۔عالم سفلی یا عالم دنیا۔ حقیقت شناس کہتے ہیں کہ عرش سے تحت الثریٰ یعنی تمام مخلوق ایک ہی عالم ہے دراصل ایک نوعیت کی مخلوق کے اجتماع کا نام عالم ہے جس طرح کہ اہل طریقت کے ہاں ایک عالم ارواح ہے اور دوسرا عالم نفوس، مگر ان دونوں کے ایک جگہ جمع ہونے کا نام عالم نہیں جیسا کہ فلاسفہ کہتے ہیں بلکہ عالم دنیا میں عالمِ ارواح الگ ہے اور عالم اجسام یا نفوس الگ۔

المحدث۔ جو عدم سے وجود میں آیا ہو۔

القدیم۔ جو تمام موجودات سے پہلے ہمیشہ سے تھا اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ خواہ دیگر موجودات رہیں یا نہ رہیں یہ صرف ذاتِ باری تعالیٰ ہے جس کے سوا کوئی ہستی قدیم نہیں۔

الازل۔ جو آغاز وابتداء سے ماوریٰ ہو۔

الابد۔ جو انجام وانتہا سے بے نیاز ہو۔

الذات۔ اصلیت، حقیقت، ہستی اور وجود کا نام ذات ہے۔

الصفت۔ کوئی خوبی جو بذات خود قائم نہ ہو مثلاً علم وحسن وغیرہ۔

الاسم۔ کسی چیز کی اصلیت یا کیفیت کا تعارفی کلمہ یا اشارہ۔

التسمیہ۔ ایسا تعارف جس میں عظمت کا پہلو پوشیدہ ہو یا نام رکھنا۔

النفی۔ کسی فانی چیز کا نہ ہونا واضح کرنا۔

الاثبات۔ ہو سکنے والی چیز کا وجود یا ہونا ثابت کرنا۔

الشیئان۔ ایسی دو چیزیں جن کا وجود ایک دوسرے کی موجودگی میں جائز ہو۔

الضدان۔ایسی دو چیزیں جن میں سے ایک کا وجود دوسرے کی موجودگی میں کسی ایک حالت پر جائز نہ ہو البتہ مختلف حالتوں میں دونوں کا وجود الگ الگ جائز ہو۔

الغیران۔دو چیزوں میں سے ایک کا وجود دوسری کی فنا کے لئے جائز ہونا۔

الجوھر۔کسی چیز کا مادہ یا اصل جو بذاتِ خود قائم ہو۔

العرض۔ایسی صفت یا کیفیت جو جوہر کے ساتھ قائم ہو۔

الجسم۔ایسا مرکب جو مختلف اجزاء سے تیار کیا گیا ہو۔

السؤال۔اصلیت یا حقیقت معلوم کرنا۔

الجواب۔مطلوبہ معلومات مہیا کرنا۔

الحُسن۔ایسی کیفیت جو متعلقہ چیز کے مناسب ہو اور امرِ حق کے موافق ہو۔

القبیح۔ایسی حالت جو متعلقہ چیز سے مناسبت نہ رکھتی ہو اور امرِ الٰہی کے مخالف ہو۔

السفہ۔حقیقی معاملہ کو چھوڑ دینا۔

الظلم۔کسی چیز کا مناسب استعمال نہ کرنا اور اسے موزوں مقام نہ دینا۔

العدل۔ہر معاملہ میں مناسب اور موزوں رویہ اختیار کرنا جس کے ذریعہ ہر چیز اپنا صحیح مقام حاصل کرے۔

الملک۔جس کے قول و فعل پر اعتراض نہ ہو سکے۔

یہ ایسی اصطلاحات ہیں جن سے حقیقت کے طلبگاروں کو واقف ہونا بڑا ضروری ہے۔

اصطلاحاتِ تصوّف کی چوتھی اور آخری قسم

یہ اصطلاحات اہلِ لغت کے ظاہری معانی سے مختلف صرف صوفیاء کے درمیان رائج ہیں جن کی وضاحت و تشریح ضروری ہے۔

الخاطر۔دل میں ایسے خیال یا وسوسہ کا آنا جو کسی دوسرے خیال یا وسوسہ کے آنے پر زائل ہو جائے اور اس خیال کو دل سے نکالنے پر قدرت حاصل ہو۔خیالات کی آمد کے وقت پہلے خیال کو خدا کی طرف سے سمجھ کر اہلِ معاملہ اپنا لیتے ہیں اور خیال اول کی پیروی کرتے ہیں۔

مثلاً حضرت خیر النساجؒ کے متعلق روایت ہے کہ ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ حضرت جنید بغدادیؒ ان کے دروازے پر موجود ہیں مگر اسے وہم و وسوسہ سمجھ کر دل سے نکالنا چاہا تو عدم

موجودگی کا خیال آیا، اسے دور کرنے کی کوشش کی تو تیسرا خیال پیدا ہوا کہ باہر ہی چل کر دیکھ لیں چنانچہ آپ باہر نکلے تو حضرت جنیدؒ دروازہ پر موجود تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ اے خیر! اگر آپ سنتِ مشائخ پر عمل کرتے ہوئے خیالِ اول کی پیروی کرتے تو مجھے اتنی دیر انتظار نہ کرنا پڑتا۔ اس واقعہ کے متعلق مشائخ نے یہ سوال پیدا کیا کہ اگر حضرت خیر النساجؒ کے دل میں آنے والا پہلا خیال ہی "خاطر" تھا تو حضرت جنیدؒ کس خیال میں دروازہ پر کھڑے ہوئے تھے؟ اس کا جواب بزرگوں نے خود دیا ہے کہ حضرت جنیدؒ چونکہ حضرت نساجؒ کے پیرو مرشد تھے لہٰذا انھیں اپنے مرید کو راہ طریقت میں "خاطر" کا مسئلہ بتانا تھا جو آپ نے بتا دیا۔

الواقع ۔ واقع سے مراد دل میں پیدا ہونے والی وہ کیفیت جو "خاطر" کے بالعکس ہو یعنی مستقل دل نشین ہو کر نا قابل زوال ہو اور نہ اسے دور کرنے پر قدرت حاصل ہو چنانچہ ایک محاورہ ہے کہ خطر علی قلبی و وقع فی قلبی یعنی میرے دل پر ایک "خیال" گذرا اور "واقعہ" یا بات میرے دل میں بیٹھ گئی۔ خیالات تو تمام دلوں میں آتے ہیں مگر واقعات صرف حق تعالیٰ کے نور سے معمور دلوں میں واقع ہوتے ہیں اسی وجہ سے راہ حق میں رکاوٹ پیدا ہونے کا نام قید ہے جسے کہا جاتا ہے کہ "ایک واقعہ ظاہر ہو گیا" یعنی مشکل پیدا ہو گئی۔ اہلِ لغت واقعہ ایسی مشکل کو کہتے ہیں جو مسائل حل کرنے کے سلسلہ میں پیش آتی ہے جب وہ مسئلہ حل ہو جائے یا اس کا مکمل جواب مل جائے تو کہا جاتا ہے کہ واقعہ حل ہو گیا یعنی مشکل ختم ہو گئی اہلِ تحقیق کہتے ہیں کہ حل نہ ہونے والا معاملہ واقعہ ہوتا ہے اور اگر حل ہو جائے تو وہ خیال (خاطر) ہوتا ہے واقعہ نہیں کیونکہ اہلِ تحقیق کسی عظیم معاملہ ہی میں رک سکتے ہیں چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتیں تو وہ اشاروں سے حل کر لیتے ہیں۔ خیال تو خود بخود بدلتے رہتے ہیں انھیں حل کرنے کی چنداں ضرورت ہی نہیں پڑتی ۔ الاختیار ۔ اپنے اختیار پر اختیار مولیٰ کو ترجیح دے کر راضی برضا ہونا اور خیر و شر میں جو خدا نے ان کے لئے پسند فرمایا اسے قبول کرنا۔ اور یہ راضی برضا ہونا یا اختیارِ مولیٰ کو پسند کرنا بھی تو حق تعالیٰ کے اختیار اور مرضی سے ہوتا ہے اس میں بھی ذاتی اختیار کی نفی ہو جاتی ہے۔ اگر اختیار الٰہی کی برتری قبول نہ کی جاتی تو بندہ اپنے اختیار کو چھوڑنا کب گوارا کر سکتا تھا۔ حضرت بایزیدؒ سے

پوچھا گیا کہ امین کون ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جسے ذاتی اختیار حاصل نہ ہو اور اختیارِ مالک کو اس نے قبول کرلیا ہو۔ حضرت جنیدؒ سے روایت ہے کہ آپ تے بخار میں دعا فرمائی کہ خدایا! مجھے صحت عطا فرما۔ ضمیر سے آواز آئی کہ ہمارے ملک میں اپنی تدابیر اختیار کرنے والا تو کون ہوتا ہے میں اپنے ملک کے نظام کو تجھ سے بہتر جانتا ہوں راضی برضا رہو اور اپنے آپ کو صاحب اختیار ظاہر نہ کرو واللہ اعلم

الامتحان ۔اس سے مراد اولیاء کرام کے دلوں کی آزمائش ہے یہ آزمائش بذریعہ خوف، غم، قبض اور ہیبت وغیرہ کی جاتی ہے امتحان کے متعلق حق تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا اولٰئک الذین امتحن اللّٰہ قلوبھم للتقویٰ ط لھم مغفرۃ و اجر عظیم یعنی یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ (عطا کرنے) کے لئے امتحان و آزمائش میں ڈالا، ایسے پرہیز گاروں کے لئے بخشش اور اجر عظیم ہے اور یہ درجہ بہت بلند ہے۔

البلاء۔ بیماریوں اور تکالیف کے ذریعہ اولیاء کے جسموں کی آزمائش جس میں دل بھی شریک ہوتے ہیں بلا کے ذریعہ جس قدر مصیبت اور پریشانی بڑھتی ہے اسی قدر قرب الٰہی میں اضافہ ہوتا ہے کیونکہ دکھ درد اولیاء کا لباس، بزرگوں کا مسکن اور انبیاء کی لازمی صفت ہے آپ کو یاد ہوگا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا نحن معاشر الانبیاء اشد الناس بلاءً (ہم گروہ انبیاء تمام لوگوں کی نسبت آزمائش میں زیادہ مبتلا ہوتے ہیں اور مزید یہ فرمایا کہ اشد الناس بلاءً الانبیاء ثم الاولیاء ثم الامثل فالامثل۔ سب سے زیادہ مصیبت میں انبیاء ہوتے ہیں پھر اولیاء پھر وہ لوگ جو زیادہ بزرگ ہوتے ہیں پھر جو ان کی طرح بزرگ ہوں مختصراً بلاء دراصل جسم اور دل کی بیک وقت آزمائش ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے بندہ مومن کے لئے ہوتی ہے اور امتحان صرف دل مومن کی آزمائش کا نام ہے۔ بلاء اور آزمائش مومن کے لئے ایک نعمت ہوتی ہے جس کا ظاہر تکلیف دہ اور اصل میٹھا پھل ہوتا ہے مگر کافر کے لئے وبال جسم و جان اور ذریعہ بدبختی ہے جس سے چھٹکارا ملنا مشکل ہے۔

التحلی۔ کسی اچھی قوم کے اقوال کو اپنانا جس سے اچھائی پیدا ہو تحلی کہلاتا ہے۔ جیسا کہ اقوال زرین جو مختلف قوموں کے دانا اور عقلمندوں نے بیان کئے ہیں صرف تحلی سے ایمان پیدا نہیں ہوتا جیسا کہ رہبر اعظم ﷺ نے فرمایا لیس الایمان بالتحلی والتمنی لکن ماوقر فی القلوب وصدقہ العمل یعنی ایمان کسی طرح اچھی قوم کے اقوال

قبول کرنے یا ان کی طرح بننے کی خواہش کا نام نہیں بلکہ جو کچھ دل میں بیٹھ جائے اور اس کی تصدیق عمل سے ہو جائے تو وہ حقیقت میں ایمان کہلاتا ہے۔ چنانچہ کسی گروہ کی بغیر عمل کے باتوں میں مشابہت کرنا تحلی ہے اور یہ طریقہ رسوا کن ہے کیونکہ اصل کام عمل ہے اور بے عملی کی وجہ سے اہلِ تحقیق کی نظر میں وہ پہلے ہی سے ذلیل ہوتے ہیں اور ان کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔

التجلی ۔ اولیاء کا دل کی آنکھ سے انوارِ الٰہی اور ذاتِ حق کا اس طرح مشاہدہ کرنے کے قابل ہونا کہ وہ چاہیں تو دیکھیں اور نہ چاہیں تو نہ دیکھیں۔ تجلی کے مقابلہ میں رویت ہے جو سر کی آنکھوں سے دیکھنے کا عمل ہے یہ اہلِ جنّت کو حاصل ہوگا اور وہاں رویت حق لازمی ہوگی کیونکہ تجلی کے لئے پردہ جائز ہے اور رویت کے لئے ناجائز رویت بہرصورت ہوتی ہے خواہ چاہیں یا نہ چاہیں (جیسا کہ آنکھ کھولنے پر یہ ناممکن ہے کہ کچھ نہ دیکھا جائے۔)

التخلی ۔ قربِ الٰہی میں آڑ بننے والی مصروفیات سے کنارہ کش ہو جانا، اس سلسلہ کی ایک کڑی دنیا ہے اور دوسری آخرت ان دونوں سے دستبردار ہو کر تیسری کڑی خواہش نفس کی مخالفت اور لوگوں سے علیحدگی اختیار کرنا اور آخری کڑی دل سے دنیاوی، اُخروی، نفسانی اور انسانی وسوسوں اور اندیشوں کو دور کرنے کا نام تخلی یا تخلیہ ہے۔

الشرود ۔ اس کا مطلب آفتوں، حجابوں اور بے قراری سے نجات طلب کرنا ہے کیونکہ طالبِ حق پر جو مصیبت آتی ہے وہ حجاب سے آتی ہے اس پردے اور حجاب کو کھولنے کے لئے تدبیر، تجویز اور کسی عمل کا نام شرود ہے جس کا نتیجہ سکون ہے کیونکہ طالبانِ حق کو شروع میں بے چینی ہوتی ہے اور آخر کار اطمینان و سکون۔

القصود ۔ مقصد حاصل کرنے کے لئے عزم صمیم اور صحیح ارادہ کرنا۔ اولیاء کا قصد و ارادہ حرکت اور سکون کے ساتھ مشروط نہیں کیونکہ دوست دوستی کے معاملہ میں ہر وقت پر عزم ہوتا ہے اور یہ عادت کے خلاف ہے کہ انسان خواہ متحرک ہو یا ساکن بغیر کسی ارادہ کے ہو کیونکہ اگر حرکت میں ہے تو ارادہ کا اظہار حرکت سے ہوتا ہے اور اگر سکون میں ہو تو اس کا ارادہ پوشیدہ ہوتا ہے اور اس کے آثار ظاہر ہوتے رہتے ہیں مگر اولیاء حق کو یہ مقام حاصل ہوتا ہے کہ ان کی حرکت و سکونت ہی قصد اور ارادہ کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے اور تمام صفات قصد بن جاتی ہیں اور جب مقامِ محبت حاصل ہو جاتا ہے تو سراپا قصد و ارادہ بن جاتے ہیں۔

الاصطناع اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا مومن کو تمام معاملات دنیوی سے مبرّ الذّاتِ انسانی

سے عاری اور خواہشات وصفات انسانی سے خالی کر کے مہذب بناتا ہے، اس طریقہ سے وہ ہوش وحواس کی گرفت سے آزاد ہو کر ماسوی اللہ سے بے نیاز ہو جاتا ہے یہ اصطلاح گروہِ انبیاء سے متعلق ہے۔ البتہ بعض مشائخ اولیاء کو بھی اس میں شامل کرتے ہیں۔

الاصطفاء۔ اللہ تعالیٰ کا بندہ کے دل کو خاص اپنی معرفت کے لئے منتخب کرنا تاکہ اپنی معرفت کی جلا اس کے دل میں بھر دے۔ یہ درجہ انبیاء واولیاء کے علاوہ ہر خاص وعام، فرمانبردار ونافرمان سب کے لئے عام ہے جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ثم اورثنا الکتب الذین اصطفیناہ من عبادنا فمنھم ظالم لنفسہ ومنھم مقتصد ومنھم سابق بالخیرات۔ یعنی ہم نے پھر ان لوگوں کو کتاب دی جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے منتخب کیا، چنانچہ ان میں سے بعض تو اپنے آپ پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض میانہ رو ہیں اور بعض نیک کاموں میں سبقت کرنے والے ہیں۔

الاصطلام۔ ایک لطیف آزمائش کے ذریعہ بندہ کے ارادہ کو زائل اور فنا کر کے غلبہ حق کا بندہ پر مسلّط ہو کر دل کا امتحان لینا۔ قلب ممتحن آزمایا ہوا دل اور قلب مصطلم (جڑ سے اکھاڑا ہوا دل) دونوں ہم معنی ہیں البتہ امتحان کی نسبت اصطلام خاص اور لطیف ہے۔

الرین۔ دل پر کفر وگمراہی کا ایسا پردہ جو صرف نورِ ایمان سے دور ہو سکتا ہے جیسا کہ کفار کے متعلق حق تعالیٰ نے فرمایا کلا بل ران علیٰ قلوبھم ما کانو یکسبون ایسا ہرگز نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے کفر کرتے ہیں بلکہ جو کچھ وہ کفر وشرک کیا کرتے تھے (اسی کی وجہ سے) ان کے دلوں پر ایک قسم کا زنگ یعنی پردہ پڑ گیا ہے۔ بعض کے نزدیک رین ایسا حجاب ہے جو کسی طرح زائل نہیں ہوتا کیونکہ کافروں کا دل اسلام قبول نہیں کرتا اور اگر وہ مسلمان ہو جاتے ہیں تو یہ علم الٰہی میں پہلے ہی ہوتا ہے۔

الغین۔ غین اس پردہ کو کہتے ہیں جو بذریعہ استغفار زائل ہو جاتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں خفیف اور غلیظ۔ حجاب غلیظ غافل اور کبیرہ گناہ کرنے والوں کے لئے ہوتا ہے اور خفیف حجاب سب کے لئے خواہ ولی ہوں یا نبی جس کی طرف اشارۂ نبوی ﷺ بھی ہے کہ انہ لیغان علی قلبی وانی لا ستغفر اللّٰہ فی کل یوم مائۃ مرۃ کبھی کبھی میرے دل پر ایک خفیف سا پردہ چھانے لگتا ہے تو میں اس کی مدافعت کے لئے روزانہ سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔ چنانچہ خفیف پردہ کے لئے صرف رجوع الی اللہ کافی ہے اور حجاب غلطی کے لئے توبہ شرط ہے توبہ کے معنی

گناہ سے نیکی کی طرف لوٹنا ہیں اور رجوع کا مطلب اپنے ارادہ واختیار سے دستبردار ہو کر اپنے آپ کو خدا کے سپرد کرنا ہے۔ نیز توبہ جرم سے کی جاتی ہے اور جرم عام بندوں کا خدا کی نافرمانی ہے اور خاص بندوں یعنی اولیاء کا اپنے آپ کو سمجھنا یا دیکھنا ہے۔ جو جرم سے توبہ کرتا ہے اسے تائب کہتے ہیں، جو غیروں سے الگ ہو کر خدا کی طرف لوٹے اسے انابت کہتے ہیں اور جو اپنے وجود سے بھی بے نیاز ہو کر راضی برضا ہو جائے اُسے اوّاب کہتے ہیں۔ اس سلسلہ کی مفصل تفصیل توبہ کے بیان میں کردی گئی ہے۔

التلبیس ۔ کسی چیز کو اصلیت وحقیقت کے برعکس دکھا کر وہم میں مبتلا کرنا جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے ولـلبسنا علیهم ما یلبسون (جو کچھ وہ حق و باطل میں ملا کر معاملہ کو پیچیدہ کرتے ہیں تو ہم نے بھی انھیں شبہ میں ڈال دیا) یہ صفت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور میں نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ کافر پر انعام کر کے مومن ظاہر کرتا ہے اور مومن کو نعمت سے مالا مال کر کے اسے کفر کرنے کا موقع دیتا ہے۔ جب ان میں سے کوئی شخص عمدہ عادتوں کو بری صفات سے تبدیل کر کے حقیقت کو چھپاتا ہے تو کہتے ہیں کہ وہ تلبیس کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور معنی میں یہ اصطلاح استعمال نہیں ہوتی۔ نفاق وریا اگرچہ بظاہر تلبیس معلوم ہوتے ہیں مگر ہیں نہیں کیونکہ تلبیس صرف حق تعالیٰ کے کسی فعل پر بولا جاسکتا ہے۔

الشرب ۔ عبادت واطاعت کی مٹھاس، عظمت وبزرگی کا مزہ اور اُنس ومحبت کی خوشی کا نام شرب ہے۔ لذت شرب کے بغیر انسان کوئی کام نہیں کرسکتا جس طرح جسم کے لئے پانی اور غذا میں اور روح کے لئے ذکر وعبادت میں لذّت ہے مگر یہ دونوں اسی وقت کام کرتے ہیں جب انھیں لذت حاصل ہوتی ہے۔ میرے شیخؒ فرماتے تھے کہ مرید اور عارف بغیر شرب کے معرفت اور ارادت سے بیگانہ ہوتے ہیں کیونکہ مرید کے لئے شرب ولذت حاصل ہونے سے ارادت اور طلب حق کی راہ ہموار ہوتی ہے اور عارف کو بھی خدا کی معرفت کی لذت حاصل ہو تو وہ آرام وسکون محسوس کرے گا جو مزید ترقی کا سبب ہوتا ہے۔

واللہ اعلم

الـــذوق ۔ ذوق بھی شرب کی طرح ہے البتہ شرب صرف آرام وراحت کے لئے استعمال ہوتا ہے اور ذوق رنج وراحت دونوں صورتوں میں مستعمل ہے چنانچہ ایک عارف نے کہا ہے کہ ذقت الحلاوة و ذقت البلاء و ذقت الراحة (میں نے حلاوت ومصیبت اور آرام کا مزہ چکھا) یہ درست جملے ہیں بعد میں شرب کے متعلق کہتے ہیں کہ شربت

بکاس الوصل اوبکاس الود (میں نے وصل یا محبت کا پیالہ پیا) اس طرح کی اور بھی مثالیں ہیں۔ بقول خدا کلوا واشربوا هنیئا یعنی مزے سے کھاؤ اور پیو اور جب ذوق کو استعمال کیا تو ذق انك انت العزیز الکریم فرمایا یعنی اے معزز و مکرم آپ چکھ لیں دوسری جگہ فرمایا کہ ذوقوا مس سقر یعنی دوزخ کی آگ لگنے کا مزہ چکھو۔

صوفیاء و اہل طریقت کے ہاں جو اصطلاحات رائج ہیں ان کا مختصراً تذکرہ کر دیا ہے اگر تفصیل کی جاتی تو یہ کتاب طویل ہو جاتی۔ واللہ اعلم

ستائیسواں باب

گیارھواں کشف حجاب

بسلسلہ سماع اور اس کے اقسام وانواع

ثبوت سماع

اے عزیز! خدا آپ کو سعادت مند بنائے آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ علم حاصل کرنے کے پانچ ذرائع ہیں جنھیں حواس خمسہ کہا جاتا ہے سننا، دیکھنا، چکھنا، سونگھنا، چھونا، انسان ہر قسم کا علم ان میں سے کسی ایک ذریعہ سے حاصل کر لیتا ہے مثلاً آوازوں کا علم قوت سماعت سے ہوتا ہے، دیکھنے کی صلاحیت آنکھ میں ہے، میٹھے کڑوے کا فرق زبان سے ہوتا ہے، اچھی بری بو کا پتہ ناک سے لگتا ہے اور کسی چیز کی سختی و نرمی، گرمی و سردی وغیرہ قوت حس یا لمس یعنی چھونے سے معلوم ہوتی ہیان میں سے قوتِ حس یالمس پورے بدن میں پھیلی ہوئی ہے اور باقی حواس یا ذرائع خاص مقام سے متعلق ہیں کیونکہ انسان آنکھ کے بغیر دیکھ نہیں سکتا، کان کے علاوہ سن نہیں سکتا زبان اور تالو کے سوا چکھ نہیں سکتا اور ناک نہ ہو تو سونگھ نہیں سکتا، کسی حد تک یہ کہنا جائز ہے کہ ہر ایک حس سارے جسم میں پھیلی ہوئی (جس طرح سانپ دیکھنے سے پورا جسم محتاط ہو جاتا ہے اور خوش الحانی سننے سے پورا جسم لطف اندوز ہوتا ہے) مگر معتزلہ کے نزدیک ہر ایک حس کا خاص مقام ہے تاہم قوتِ حس یا

لمس سے ان کی تردید ہو جاتی ہے کیونکہ یہ پورے بدن میں پھیلی ہوئی ہے۔ جس طرح ایک قوت پورے جسم میں پھیلی ہوئی ہے تو دوسری بھی اسی طرح سارے جسم میں پھیلی ہوئی ہو سکتی ہیں جیسا کہ اشارۃً پہلے ذکر کر دیا گیا ہے مگر یہاں اس کی تفصیل مطلوب نہیں صرف تحقیق مقصود تھی۔ قوتِ سماعت کے علاوہ دیگر چار حواس یعنی نادراتِ عالم کو دیکھنا، خوشبو کو سونگھنا، عمدہ نعمتوں کو چکھنا اور نرم و گرم کو چھونا، عقل کے لئے رہنما بن سکتے ہیں اور رہنمائی خدا کی طرف سے ہوتی ہے کیونکہ ان حواس کی بدولت عقل نے یہ معلوم کیا کہ مشاہدہ کرنے سے یہ عالم حادث معلوم ہوتا ہے خالق کائنات قدیم اور لامتناہی ہے جب کہ عالم حادث اور متناہی ہے، نیز خالق پوری کائنات پر قادر ہے اور سب کائنات سے زیادہ طاقتور ہے وہ جسم و جان بنانے والا ہے مگر کائنات کی مثل جسم و جان رکھنے والا نہیں چنانچہ ہر سو اس کی قدرت جاری ہے جو چاہے سو کرے، وہی ہے جس نے رسولوں کو صحیح اور سچی ہدایات دے کر کائنات کی رہنمائی کے لئے بھیجا۔ مگر ان رسولوں پر ایمان لانا اس وقت تک واجب نہیں ہوتا جب تک حق تعالیٰ کی معرفت حاصل نہ ہو اور رسول سے شرع و دین سے متعلق باتوں کو سن نہ لے کہ کون کون سی بات واجب (فرض) ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ سُنّت کے نزدیک سننا دیکھنے سے زیادہ قابل ترجیح اور فضیلت والا ہے۔ اگر کوئی سطح بین یہ کہے کہ سننا تو صرف خبر کی حد تک ہے جب کہ دیکھنا دیدار اور نظارہ کا سبب ہے (اور شنیدہ کے بود مانند دیدہ ہے) دیدار الٰہی کلامِ الٰہی سننے سے افضل ہے لہٰذا قوت بصارت کو سماعت پر افضل مانا جائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں یہ سن کر ہی تو معلوم ہوا کہ جنت میں دیدارِ خدا نصیب ہوگا اور عقل کے ذریعہ دیدار کے جائز ہونے میں جو حجاب واقع ہوتا ہے وہ بھی قوت سماعت کو استعمال کرنے سے دور ہو جاتا ہے کیونکہ عقل نے رسول کی خبر سُننے سے تسلیم کر لیا کہ دیدار نصیب ہوگا (ورنہ ظاہری طور پر کوئی دلیل نہیں) اور آنکھوں سے حجاب دور ہو جائے گا تاکہ وہ خدا کو دیکھ لیں اس لحاظ سے سننا دیکھنے سے افضل ہے۔ علاوہ ازیں احکام شریعت کا انحصار بھی سننے پر ہے۔ کیونکہ سننا نہ ہو تو اثبات یا نفی نہیں ہو سکتی، انبیاء پیغامِ حق سناتے اور لوگ سن کر قبول کرتے اور ان کے فرمانبردار و

جاں نثار بن جاتے، معجزہ دکھانے کے لئے بھی اس کی حقیقت بتائی جاتی ہے اور لوگ سن کر حقیقت دیکھنے کی تمنا کرتے۔ان دلائل کے باوجود اگر کوئی ''سننے یعنی سماع'' کی فضیلت سے انکار کرتا ہے تو اسرارِ شریعت اور حقائق کا انکار کرتا ہے اور سماع کے معاملہ میں وہ عمداً غفلت برتتا ہے اور اس کی حقیقت پوشیدہ رکھتا ہے۔اب میں سماع کے متعلق احکام وامور کو بیان کرتا ہوں۔

قرآن مجید کا سننا اور اس کے متعلقات

تمام سنی جانے والی باتوں سے زیادہ اہم، دل کے لئے مفید، ظاہر و باطن کے لئے باعثِ ترقی اور کانوں کے لئے لذیز کلام الٰہی ہے، سب ایمانداروں کو اس کے سننے کا حکم دیا گیا ہے اور جنوں، انسانوں کو بشمول کفار کلام الٰہی سننے کا مکلّف بنایا گیا ہے۔قرآن کے معجزات میں سے ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ طبیعت اس کے سننے اور پڑھنے سے بے چین نہیں ہوتی کیونکہ اسمیں بہت زیادہ رقت موجود ہے حتیٰ کہ کفارِ قریش رات کو چھپ کر حضور اکرم ﷺ کی نماز میں قراءت و تلاوت شوق سے سنتے تھے اور قرآن کی لطافت و رقت پر حیران ہوتے تھے جن میں سے مشہور کفار یہ ہیں نضر بن حارث جو سب سے زیادہ فصیح تھا، عقبہ بن ربیع جو بلاغت کا جادو رکھتا تھا اور ابو جہل بن ہشام جو خطابت اور دلائل میں مانا ہوا شخص تھا ان کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ ہیں۔

ایک رات حضور علیہ السلام کی تلاوت سن کر عتبہ بے ہوش ہو گیا اور بعد میں ابو جہل کو بتایا کہ یہ انسانی کلام معلوم نہیں ہوتا انسانوں اور جنوں نے گروہ در گروہ ہو کر رسول اکرم ﷺ سے قرآن سنا اور کہنے لگے کہ انا سمعنا قرانا عجباً ہم نے عجیب کلام پڑھتے ہوئے سنا (یہ جملہ انھوں نے واپس جا کر اپنے دوسرے جنوں کو سنایا) اس کی خبر بھی ہمیں قرآن نے دی اور بتایا کہ یھدی الی الرشد فامنابہ ط ولن نشرک بربنا احداًo یعنی یہ قرآن راہ راست اور ہدایت کی رہنمائی کرتا ہے لہٰذا ہم (سن کر) اس پر ایمان لائے اور (آئندہ) ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے چنانچہ قرآن کی نصیحت دوسری تمام نصیحتوں سے بہتر اس کا ہر لفظ دوسرے تمام الفاظ سے واضح اسکا ہر حکم دوسرے احکامات سے لطیف، اس کا روکنا دوسری تمام رکاوٹوں سے زیادہ مناسب، اس کا وعدہ دیگر تمام وعدوں سے زیادہ دلکش، اس کی وعید

(ڈانٹ) دوسری تمام وعیدوں سے زیادہ جامع اور جانگداز، اس کا ہر قصہ دوسرے تمام قصوں سے زیادہ مؤثر، اس کی مثالیں دوسری تمام مثالوں سے زیادہ سبق آموز جس کی وجہ سے ہزاروں جانیں اس پر قربان ہوئیں اور ہزاروں دل اس کے گرویدہ ہوئے۔ (اس کی عجیب خاصیت ہے) کہ دنیا کے عزت والوں کو ذلیل کرتا ہے اور دنیا ہی کے دھتکارے ہوئے ذلیلوں کو باعزت بناتا ہے، حضرت عمرؓ اسلام قبول کرنے سے پہلے اپنی بہن اور بہنوئی کے مسلمان ہونے کی خبر کو سن کر تلوار سونت کر سلسلہء اسلام کو ختم کرنے چلتے ہیں مگر جب بہن کے گھر پہنچ کر کلام الٰہی میں سے سورہ طٰہ کے اثر انگیز الفاظ طٰہ ما انزلنا علیك القران لتشقی الا تذکرۃً لمن یخشٰی یعنی یہ قرآن ہم نے آپ ﷺ پر اس لئے نہیں اتارا کہ آپ مشقت و تکلیف میں پڑ جائیں یہ تو ڈرنے والوں کے لئے نصیحت اور یاد کرنے والوں کے لئے نصیحت اور یاد دہانی ہے۔ اور اسی طرح کے دوسرے الفاظ سنے تو آپ کی روح کو (کفر کی تاریکی میں) روشنی نظر آئی اور آپ کا دل قرآن کے لطیف حقائق سے مانوس ہو گیا، آپ صلح کے طریقے ڈھونڈنے لگے، لڑائی کا لباس اتار کر مخالفت سے موافقت کی طرف لوٹے اور اسلام قبول کر لیا یہ صرف سننے (سماع) کی برکت تھی مشہور ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کے سامنے یہ آیات پڑھی گئیں ان لدینا انکالا وجحیما ٥ وطعاماً ذاغصۃ و عذابا الیما ٥ یعنی بلاشبہ ہمارے پاس بیڑیاں اور دوزخ ہے اور گلے میں اٹکنے والا کھانا اور دردناک عذاب ہے۔ تو آپ پر غشی طاری ہو گئی۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عمرؓ کے سامنے یہ آیت پڑھی ان عذاب ربك لواقع ٥ ما لہ من دافع (بے شک تیرے رب کا عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے جسے کوئی ٹالنے والا نہیں) تو حضرت عمرؓ بے ہوش ہو گئے اور ایک ماہ تک بیمار رہے ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن حنظلہؓ کے سامنے یہ آیت پڑھی لھم من جھنم مھاد ومن فوقھم غواش (ان کفار کے لئے دوزخ کی آگ بطور بچھونا اور اوڑھنا ہو گی) تو وہ رونے لگ گئے اور اس قدر ساکت ہو گئے کہ ان کی موت کا اندیشہ ہوا، بعدہ آپ اٹھ کھڑے ہوئے تو لوگوں نے کہا کہ بیٹھ جائیے تو آپ نے

فرمایا کہ اس آیت کی ہیبت سے میں بیٹھ نہیں سکتا۔ جب حضرت جنیدؒ کے سامنے یہ آیت پڑھی گئی یا ایھا الذین امنوا لم تقولون مالا تفعلون (اے ایمان والو وہ بات کیوں کہتے ہو جس کے مطابق تم خود عمل نہیں کرتے) تو آپ نے فرمایا کہ اے خدا! ان قلنا، قلنابك وان فعلنا، فعلنا بتوفیقك فاین لنا القول والفعل (اگر ہم کچھ کہتے ہیں تو تیرے حکم سے کہتے ہیں اور اگر کوئی عمل کرتے ہیں تو تیری توفیق سے کرتے ہیں (ایسی صورت میں) ہمارا قول و فعل کہاں رہا؟) حضرت شبلیؒ کے متعلق مشہور ہے کہ جب آپ کے سامنے یہ آیت پڑھی گئی واذکر ربك اذا نسیت (جب تو غافل ہو جائے تو خدا کو یاد کیا کر) تو آپ نے فرمایا کہ ذکر شرط بھول جانا ہے جب کہ سارا عالم اس کی یاد میں محو ہے مگر انسان بھولا ہی رہتا ہے یہ کہہ کر آپ بے ہوش ہو گئے، جب ہوش میں آئے تو کہا کہ اس دل پر تعجب ہے جو کلامِ خدا سن کر جسم سے نہ نکلے۔

ایک شیخ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے کلام الٰہی میں سے یہ آیت پڑھی واتقوا یوماً ترجعون فیه الی اللّٰہ (اُس دن سے ڈرو جس دن تم خدا کی طرف لوٹائے جاؤ گے) تو ہاتف نے آواز دی کہ آہستہ پڑھو اس کی ہیبت سے چار جن فوت ہو گئے۔ ایک درویش نے بتایا کہ میں نے دس سال سے نماز میں پڑھنے کے علاوہ نہ تو قرآن خود پڑھا اور نہ دوسروں سے سنا، لوگوں نے پوچھا کیوں؟ فرمایا کہ اس اندیشہ سے کہ پڑھنے یا سننے سے اس پر عمل کرنا ضروری ہوگا اور حجت پوری ہو جائے گی۔ ایک دفعہ میں نے حضرت شیخ ابو العباس شقانیؒ کو یہ آیت پڑھتے ہوئے پایا ضرب اللّٰہ عبدًا مملوکاً لا یقدر علی شئی (اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے غلام کی مثال دی ہے جو کسی دوسرے کا مملوک ہے اور بذاتِ خود کسی کام کرنے کا مختار نہیں) تلاوت کے ساتھ ساتھ آپ رو رہے تھے حتیٰ کہ میں نے انھیں فوت شدہ خیال کیا، میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ کیا معاملہ ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ تقریباً گیارہ سال سے میں صرف یہاں تک تلاوت کرتا ہوں آگے نہیں پڑھ سکتا اور بڑھ سکتا۔ میں نے حضرت ابو العباس سے پوچھا کہ آپ روزانہ کتنا قرآن پڑھتے ہیں انھوں نے فرمایا کہ آج سے چودہ سال پہلے تو ایک رات دن میں دو قرآن ختم کرتا تھا مگر بعد میں آج تک صرف سورۂ انفال تک پہنچا ہوں۔ ایک دفعہ حضرت

ابوالعباس نے ایک قاری سے تلاوت کرنے کو کہا تو اس نے یہ آیت پڑھی یا ایھا العزیز مسنا واھلنا الضر وجئنا ببضاعة مزجیة (اے عزیز مصر! ہمیں اور ہمارے اہل و عیال کو فاقہ کی سخت تکلیف ہے اور ہمارے پاس سرمایہ بہت تھوڑا ہے) آپ نے فرمایا اور پڑھ تو قاری نے پڑھا قالوا ان یسرق فقد سرق اخ له من قبل (کہنے لگے اگر اس نے چوری کی ہے تو اس سے پہلے اسکے بھائی نے بھی چوری کی تھی) آپ نے پھر پڑھنے کا حکم دیا تو اس نے پڑھا لا تثریب علیکم الیوم یغفر اللّٰہ لکم (آج کے دن تم پر کوئی ملامت نہیں خدا تمہیں معاف فرمائے) اس کے بعد حضرت ابوالعباس نے یوں دعا کی کہ اے خدا میں ظلم میں برادرانِ یوسفؑ سے بڑھ کر ہوں اور تو لطف و کرم میں یوسف علیہ السلام سے بڑھ کر ہے، میرے ساتھ وہ سلوک کر جو حضرتؑ نے اپنے ظالم بھائیوں کے ساتھ کیا۔

ان تمام باتوں کے باوجود متقی و گنہگار تمام مسلمان قرآن سننے کے لئے مکلّف ہیں جیسا کہ حکم حق تعالیٰ ہے واذا قرئ القران فاستمعوا له وانصتوا لعلکم ترحمون (جس وقت قرآن پڑھا جائے تو آپ اسے سنیں اور خاموش رہیں تا کہ تم پر رحمتِ حق کا نزول ہو) اس سے سماع قرآن کا بہر صورت حکم ہے خواہ قاری کسی طرح پڑھ رہا ہو۔ علاوہ ازیں فرمایا فبشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنه (میرے ان بندوں کو خوشخبری دے دیجئے جو قرآن سننے کے بعد اس بہتر کلام کی پیروی کرتے ہیں یعنی اس کے احکام پر عمل کرتے ہیں۔ نیز فرمایا الذین اذا ذکر اللّٰہ وجلت قلوبھم (کئی لوگ ایسے بھی ہیں کہ جب ان کے سامنے خدا کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل خوف الٰہی سے کانپ اٹھتے ہیں) اور الذین امنوا تطمئن قلوبھم بذکر اللّٰہ الا بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب (ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو ایمان لائے اور ان کے دل خدا کے ذکر سے مطمئن ہو جاتے ہیں اور حقیقت بھی یہ ہے کہ خدا کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے) اس طرح کی بہت سی آیات ہیں جو اس حقیقت کی تائید کرتی ہیں کہ اس کے برعکس ان لوگوں کا بدبختی کا ذکر بھی کیا جو قرآن سنتے ہیں مگر ان کے دل مطمئن نہیں ہوتے بلکہ فرمایا ختم اللّٰہ علیٰ قلوبھم وعلیٰ

سمعهم وعلیٰ ابصارهم غشاوة اللہ نے ان کے دلوں پر مہر (بدبختی) لگادی اوران کے کانوں اوران کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں یعنی کافروں کے تمام وہ ذرائع جن سے ہدایت حاصل ہوسکتی تھی بند کردیئے گئے اور فرمایا کہ قیامت میں دوزخی کہیں گے کہ لو کنا نسمع او نعقل ما کنافی اصحب السعیر (اگر ہم حق کی بات کو سنتے یا اس کو سمجھتے تو ہم دوزخ میں گرفتار نہ ہوتے فرمایا منهم من یستمع الیك و جعلنا علی قلوبهم اکنة ان یفقهوه وفی اذانهم وقرا۔ (ان میں سی کچھ لوگ ایسے ہیں جو آپ کی باتوں کو سنتے ہیں حالانکہ ان کے دلوں پر ہم نے پردے ڈال دیئے ہیں تاکہ وہ اس کلام حق کو سمجھ ہی نہ سکیں اوران کے کانوں میں بہرہ پن رکھ دیا ہے فرمایا و لا تکونوا کالذین قالون سمعنا وهم لا یسمعون (اوران لوگوں کی طرح نہ ہو جو زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم نے سُن لیا اور حقیقت یہ ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں سُنتے) ان کے علاوہ کتاب الٰہی میں بہت سی آیات ہیں جو سماع قرآن کی حقیقت کو واضح کرتی ہیں نبی کریم ﷺ سے روایت ہے کہ آپ نے ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے فرمایا اقرأ علی فقال انا اقرء ہ علیك و علیك انزل فقال علیه السلام انی احب ان اسمعه من غیری کہ تو مجھے کچھ پڑھ کر قرآن سنا، انھوں نے کہا کہ یارسول اللہ میں آپ کو پڑھ کر سناؤں! حالانکہ یہ قرآن آپ پر نازل ہوا ہے آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں دوسروں سے قرآن سننا پسند کرتا ہوں۔ یہ بات اس کا واضح ثبوت ہے کہ سننے والا قاری کی نسبت زیادہ کامل ہوتا ہے کیونکہ پڑھنے والا سوچ سمجھ کر یا بے سوچے سمجھے دونوں طرح پڑھتا ہے مگر سننے والا سوچ سمجھ کر سنتا ہے کیونکہ بولنے میں کسی حد تک تکبر پایا جاتا ہے اور سننے میں تواضع ظاہر ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ سورۃ ہود نے مجھے بوڑھا کردیا کیونکہ اس کے آخر میں یہ آیت ہے فاستقم کما امرت (جس طرح آپ کو حکم دیا گیا اس پر ثابت قدم رہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان امر الٰہی پر قائم رہنے سے عاجز ہے کیونکہ بندہ توفیق حق کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا چنانچہ جب آپ کو استقامت کا حکم ملا تو آپ نے فرمایا کہ یہ کیسے ممکن ہوگا کہ میں اللہ تعالیٰ کے احکام کو

پوری طرح بجالاؤں۔ دلی اضطراب کی وجہ سے آپ کمزور ہو گئے، رنج میں اضافہ ہوتا گیا حتیٰ کہ ایک دن کھڑے ہونے کے لئے زمین پر ہاتھ ٹیک کر سہارا لیا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرض کیا حضرت یہ کیا حال ہے؟ آپ تو ابھی جوان اور صحت مند ہیں، فرمایا سورہ ہود نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے یعنی استقامت کے حکم سے میری ہمت کمزور ہو گئی۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ''میں ضعفائے مہاجرین کی جماعت میں بیٹھا تھا جو پردہ پوشی کے لئے ایک دوسرے کے معاون تھے، قاری قرآن پڑھنے لگا اور رسول خدا اچانک ہمارے سروں پر آ کھڑے ہوئے، قاری آپ کو دیکھ کر خاموش ہو گیا آپ ﷺ نے سلام کے بعد پوچھا کہ تم کیا کر رہے تھے ہم نے کہا یا رسول اللہ ﷺ ہم قرآن سن رہے تھے آپ نے فرمایا خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری امت میں ایسے لوگ پیدا کئے ہیں جن کے ساتھ بیٹھنے کے لئے مجھے ہدایت کی گئی ہے۔ پھر آپ ہمارے درمیان گھل مل کر بیٹھ گئے آپ نے ہاتھ کے اشارہ سے حلقہ باندھ کر بیٹھنے کا فرمایا جس کے بعد ہمارے اور رسول کے درمیان کوئی ظاہری امتیاز نہیں تھا گویا ہم سب مفلس مہاجرین تھے۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا کہ اے مفلس مہاجرو! قیامت میں تمہیں مکمل کامیابی کی خوشخبری ہے تم جنت میں اپنے دولت مند بھائیوں کی نسبت آدھ دن پہلے داخل ہو گے اور دن کی مقدار پانچ سو سال ہے، اگرچہ اس روایت کے الفاظ مختلف ہیں مگر مطلب و معنی میں کوئی فرق نہیں۔

روایت ہے کہ زرارہ ابن ابی اوفی جو جلیل القدر صحابی تھے ایک مرتبہ لوگوں کی امامت فرما رہے تھے، آپ نے ایک آیت پڑھی جس کی ہیبت سے آپ فوراً فوت ہو گئے حضرت صالح مریؒ نے ایک بزرگ تابعی ابوجھی (ابوجبیر) کے سامنے ایک آیت کریمہ پڑھی جس کی جلالت سے آپ فوت ہو گئے۔ حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے کوفہ کے نواح میں ایک نیک صفت عورت کو نماز پڑھنے کے بعد بطور تبرک سلام کیا تو اس نے قرآن پڑھنے اور سنانے کی فرمائش کی میں نے قرآنی آیت پڑھی تو وہ بے ہوش ہو کر رحلت کر گئیں۔ احمد بن ابی الجواری روایت فرماتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کو جنگل میں کنوئیں کے کنارے کھڑے دیکھا قریب ہوا تو اس نے سماع کی خواہش کی تا کہ وہ بآسانی جان دے سکے تو میں نے الہام کی مدد سے یہ آیت

پڑھی ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا بلاشبہ جن لوگوں نے خدا کو اپنا رب کہا اور ثابت قدم رہے) اس نے کہا کہ احمد! خدا کی قسم آپ نے وہی آیت تلاوت کی جسے میرے سامنے اس وقت فرشتے تلاوت کر رہے تھے یہ کہہ کر وہ فوت ہو گیا۔ اس سلسلہ میں بہت سی روایات و حکایات ہیں اگر ان کا ذکر کیا جائے تو کتاب ضخیم ہو جائے گی لہٰذا اب اسی پر اکتفا کرتا ہوں وباللہ التوفیق۔

اٹھائیسواں باب

شعر کا سماع اور متعلقات

معلوم ہونا چاہئے کہ شعر سننا مباح ہے پیغمبر ﷺ اور صحابہ کرام نے اشعار پڑھے اور سُنے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ان من الشعر لحکمة بلاشبہ بعض اشعار میں حکمت ہے۔ نیز فرمایا الحکمة ضالة المومن حیث وجدھا فھوا حق بھا یعنی حکمت مومن کی کھوئی ہوئی چیز ہے جہاں ملے وہ اس کا زیادہ مستحق ہے (کہ حاصل کرلے)۔ آپ ﷺ نے فرمایا اصدق کلمة قالتھا العرب قول لبید (سب سے زیادہ سچا کلام جو اہلِ عرب نے کہا وہ لبید شاعر کا ہے) جس نے کہا کہ

الا کل شئی ما خلا اللہ باطل
وکل نعیم لامحالة زائل

سنو! اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے اور ہر ایک نعمت ضرور زوال پذیر ہے۔

عمر بن الشریدؓ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے مجھے شعر پڑھنے کا فرمایا اور پوچھا کہ کیا تجھے امیہ بن ابی الصلت کے کچھ اشعار یاد ہیں؟ اور اگر ہیں تو ہمیں سُناؤ، میں نے ایک سو اشعار سنائے۔ جب میں ایک شعر ختم کرتا تو آپ فرماتے کچھ اور سُناؤ۔ آپ نے فرمایا کہ امیہ اپنے اشعار میں تو اسلام کو تسلیم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی روایت ہیں۔

کچھ لوگ اشعار سننے کو حرام کہتے ہیں اور رات دن غیبت میں مصروف رہتے ہیں اور کچھ لوگ ہر قسم کے اشعار سُننے کو حلال کہتے ہیں اور رات دن غزل میں حسن صورت اور زلف

کی تعریف میں لگے رہتے ہیں اور سُنتے رہتے ہیں دونوں فریق ایک دوسرے کے خلاف دلائل دیتے ہیں مگر میرا مقصد ان میں سے نہ کسی کی تردید ہے اور نہ کسی کی تائید۔ لہٰذا میں نے اتنے پر اکتفا کیا۔

مشائخ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ فرمان رسول سے استفادہ کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کلام حسنہ حسن و قبیحہ قبیح (شعر ایک ایسا کلام ہے کہ جس کا اچھا (حصہ) اچھا ہے اور برا (حصہ) بُرا ہے) جس بات کا سُننا نثر میں حلال ہے مثلاً حکمت، نصائح، آیات الٰہی میں استدلال اور حق کے دلائل پر غور کرنا وغیرہ وغیرہ تو اس کا نظم میں سننا بھی حلال اور جائز ہے۔ مختصر یہ کہ جس طرح فتنہ پھیلانے والے حُسن پر نظر ڈالنا حرام ہے اسی طرح کی نظم و نثر کو بھی سننا حرام ہے اگر کوئی شخص سماع شعر کو مطلق حلال اور جائز سمجھتا ہے تو وہ کفر و بے دینی میں مبتلا ہے، اور جو شخص یہ کہے کہ میں حسن صورت میں حسن خدا کا جلوہ دیکھتا ہوں اور طلبِ حق کرتا ہوں کیونکہ آنکھ اور کان محل عبرت ہیں اور علم کا ذریعہ ہیں تو دوسرا شخص یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ میں چھوتا ہوں اور چھونے سے عبرت و نصیحت حاصل ہوتی ہے ایسی صورت میں تو شریعت کا ظاہر بالکل باطل ہو جائے گا۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ العینان تزنیان یعنی دونوں آنکھیں (غیر محرم کو دیکھنے سے) زنا کرتی ہیں چنانچہ دیکھنے، چھونے سے شرعی حکم ساقط ہو جائے گا اور یہ ظاہر گمراہی ہے جاہل لوگوں نے صوفیاء کو سماع کرتے دیکھا تو یہ سمجھا کہ یہ خواہش سے سماع کرتے ہیں حالانکہ وہ بے اختیار سماع کرتے ہیں جس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ سماع حلال ہے اور اگر حلال نہ ہوتا تو یہ صوفی لوگ سماع نہ کرتے۔ چنانچہ جہلا نے ظاہر کو اختیار کر کے باطن اور اصل کو چھوڑ دیا (جو دراصل اصلاحِ نفس کا مقصد تھا) حتیٰ کہ خود بھی ہلاک ہوئے اور اپنے متبعین کے ایک پورے گروہ کو بھی برباد کر دیا۔ حالانکہ یہ زمانہ کی بہت بڑی آفت ہے۔ اپنی جگہ پر اس کی مفصل تشریح بیان کی جائے گی۔

خوش الحانی اور ترنم کا سماع

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ زینوا اصواتکم بالقران (قرآن پڑھنے میں اپنی آوازوں کو سنوارو) خدا تعالیٰ فرماتا ہے ویزید فی الخلق ما یشاء (وہ پیدائش میں جو چاہتا ہے زیادہ کرتا ہے) مفسرین کے مطابق اس سے مُراد بہتر آواز اور ترنم ہے نیز پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا کہ جو شخص داؤد علیہ السلام کی آواز سننا چاہے وہ حضرت ابو موسیٰ اشعری کی آواز

سنے۔ احادیث میں ہے کہ بہشت میں جنتیوں کو بھی سماع حاصل ہوگا۔ جس کا ذریعہ مختلف درختوں سے مختلف سریلی آوازیں ہیں جو جنت میں نکلیں گی۔ مختلف آوازوں کے سامنے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے طبیعت کو اس سے لذت حاصل ہوتی ہے اس قسم کا سماع حیوانوں اور انسانوں میں عام ہے اس لئے کہ رُوح ایک لطیف چیز ہے اور آواز میں بھی ایک قسم کی لطافت ہے، جب ارواح ان آوازوں کو سنتی ہیں تو اپنے ہم جنسوں کی طرف مائل ہو جاتی ہے یہ دراصل اطبا کا قول ہے۔

اہلِ علم محقق بھی بہت سے دعوے کرتے ہیں اور انھوں نے سریلی آوازوں کو باہم ملانے کے لئے کتابیں بھی تصنیف کی ہیں اور الحان و ترنم کو بڑی اہمیت دی ہے ان کے نظریات کی ترجمانی آج مزامیر سے بھی ہوتی ہے جو خواہش نفس اور بیہودگی کے لئے تیار کئے گئے ہیں جن سے شیطان کی پیروی ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ کہتے ہیں کہ ایک دن اسحاق موصلی ایک باغ میں گا رہے تھے اور ایک بلبل بھی نغمہ سرائی کر رہا تھا وہ اسحاق کی خوش الحانی سن کر خاموش ہو گیا اور آخرکار گر کر مر گیا۔ اس قسم کی حکایات بہت ہیں مگر مقصد صرف یہ ہے کہ خوش الحانی سے حیوانات اور انسان دونوں لذت حاصل کرتے ہیں۔

حضرت ابراہیم خواصؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک عربی سردار کے ہاں پہنچا تو ایک حبشی غلام کو بیڑیوں اور زنجیروں میں قید دیکھا جو خیمہ کے دروازے پر دھوپ میں پڑا ہوا تھا۔ میں نے ازراہِ شفقت سفارش کا ارادہ کیا، عرب کے دستور کے مطابق امیر مہمان کے ساتھ کھانا کھاتا ہے تو جب کھانے کا وقت آیا میں نے امیر کے ساتھ کھانا کھانے سے انکار کر دیا جو عربوں کے نزدیک بہت نامناسب بات ہے کہ کوئی شخص مہمان ہوتے ہوئے کھانا نہ کھائے انھوں نے پوچھا کہ کیا وجہ ہے؟ جب کہ ہم سب آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہیں میں نے جواب دیا کہ سب کچھ صحیح ہے مگر اس غلام کو میری خدمت کے لئے مقرر کر دیں۔ امیر نے کہا آپ پہلے اس کا جرم معلوم کر لیں پھر اسے چھڑائیں، تو میں نے پوچھا۔ اس نے کہا کہ یہ غلام حدی خواں اور خوش الحان ہے میں نے اسے اونٹ دے کر اپنی زمین سے غلہ لانے کو کہا اس نے ان پر دوگنا بوجھ لاد دیا اور حدی خوانی سے ان کو مست کر کے دوڑاتا رہا حتیٰ کہ وہ پہنچتے پر ایک ایک دو دو کر کے سب ہلاک ہو گئے۔

حضرت ابراہیم فرماتے ہیں کہ مجھے سخت حیرانی ہوئی، میں نے کہا کہ آپ کی شرافت کے پیش

نظریہ سب کچھ سچ مانتا ہوں مگر دلیل چاہئے اسی دوران اونٹ پانی پینے کے لئے کنوئیں پر لائے گئے امیر نے شتربانوں سے پوچھا کہ اونٹ کتنے دن کے پیاسے ہیں جواب ملا تین دن سے، پھر اس نے غلام کو حدی خوانی کرنے کو کہا تو اونٹ پانی پینا بھول کر حدی سننے میں مست اور مگن ہو گئے اور پانی کو کسی اونٹ نے منہ نہ لگایا۔ یہاں تک کہ اچانک ایک ایک کر کے سب بھاگ گئے اور اس کے بعد امیر نے غلام کو زنجیروں سے رہا کر کے میرے سپرد کر دیا۔

یہ حقیقت ہے کہ اونٹ اور گدھا گانا سننے سے مست ہو جاتے ہیں۔ ملک خراساں میں تو شکار کا یہ طریقہ ہے کہ شکاری طشت بجا کر اور گا کر ہرن کو مست بنا دیتے ہیں اور وہ اپنی جگہ پر کھڑا رہ جاتا ہے جسے بآسانی شکار کر لیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں بھی کہیں کہیں یہی طریقہ ہے جس سے ہرن کی آنکھیں تک بند ہو جاتی ہیں اسی طرح چھوٹے بچوں کو لوری سے نیند آ جاتی ہے، طبیب ایسے بچوں کے متعلق بتاتے ہیں کہ وہ بڑا ہو کر عقلمند ہوگا۔

عجم کے ایک بادشاہ کی وفات پر اس کے دو سالہ بچہ کا معائنہ بھی حکیم بزرجمہر کی ہدایت کے مطابق خوش الحانی اور گانے سے کیا گیا جس کی وجہ سے وہ بچہ حرکت کرنے لگا اور ہاتھ پاؤں مارنے لگا تب بزرجمہر نے کہا کہ اس بچہ سے بھلائی کی امید کی جا سکتی ہے۔

غرضکہ خوش الحانی اور سریلی آواز کی تاثیر عقلمندوں کے نزدیک اس قدر مسلم ہے جس کی دلیل کی ضرورت نہیں اس کے برعکس جو شخص سریلی آواز اور خوش الحانی کو بے کار سمجھتا ہے اور بے اثر جانتا ہے وہ یا تو جھوٹ بولتا ہے اور نفاق اختیار کرتا ہے یا وہ حس ہی نہیں رکھتا جس سے وہ استفادہ کر سکے، وہ انسان اور صوفیوں کے طبقہ سے باہر ہے۔ جو گروہ اس سے روکتا ہے وہ حکمِ الٰہی کا پاس کرتا ہے۔ فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ اگر کھیل کود کے اسباب نہ ہوں اور سماع سے دل میں بدکاری کا خیال پیدا نہ ہو تو اس کا سننا مباح ہے جس کے متعلق بہت سی احادیث ہیں چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میرے پاس ایک لونڈی تھی جو گا رہی تھی کہ اتنے میں حضرت عمرؓ نے اندر آنے کی اجازت طلب کی جب اس لونڈی کو ان کے آنے کا علم ہوا تو وہ خاموش ہو گئی اور بھاگ گئی جب حضرت عمرؓ داخل ہوئے تو رسول کریم ﷺ نے تبسم فرمایا حضرت عمر نے آپ ﷺ سے دریافت فرمایا کہ یا رسول اللہ ﷺ! آپ تبسم کیوں فرما رہے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہماری ایک لونڈی کچھ گا رہی تھی جب اس نے تمہاری آواز سنی تو بھاگ

گئی۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ جب تک میں وہ بات نہ سن لوں جو آپ ﷺ سن رہے تھے تو میں یہاں سے نہیں ٹلوں گا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس لونڈی کو بلوایا تو وہ گانے لگی اور آپ ﷺ سنتے رہے۔ اس طرح بہت سے صحابہ سے ایسی ہی روایات ہیں شیخ عبدالرحمٰن سلمیؒ نے ان سب کو اپنی کتاب ''السماع'' میں جمع کر دیا ہے اور ان کے جواز کا فیصلہ دیا ہے مگر مشائخ صوفیہ کی مراد سماع سے اباحت فقہی نہیں کہ جس پر عمل کرنا نہ کرنا دونوں برابر ہوں بلکہ ان کی مراد اس سے وہ اباحت ہے جس سے اعمال میں فوائد حاصل ہوں ویسے صرف مباح کا خیال کرنا اور پیروی کرنا عوام کالانعام کا کام ہے سمجھ دار لوگوں کو ایسے کام کرنا چاہئیں جن سے فوائد دارین حاصل ہوں۔

ایک دفعہ مرو میں ائمہ اہلحدیث میں سے ایک مشہور امام نے مجھ سے کہا کہ میں نے سماع کو مباح ثابت کرنے کے لئے ایک کتاب لکھی ہے تو میں نے کہا کہ دین میں ایک بہت بڑی مصیبت پیدا ہو گئی کیونکہ اس طرح آپ نے ایک لہو ولعب کو جو تمام برائیوں کی جڑ ہے حلال کر دیا تو انھوں نے کہا اگر آپ اسے حلال نہیں سمجھتے تو نمود سماع کیوں کرتے ہیں میں نے جواب دیا کہ اس کا حکم کئی وجوہ پر ہے ایک چیز پر کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اگر اس کی تاثیر دل میں بہتر اثر کرتی ہے تو یہ حلال ہے اور اگر حرام کی طرف مائل ہونے کا سبب ہے تو حرام ہے، اگر مباح اثر ہے تو سماع بھی مباح ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس چیز کا ظاہری معاملہ فسق پر ہے اور باطنی طور پر اس کی تاثیر مختلف طریقوں پر ہے تو ایسی چیز پر کوئی ایک حکم لگانا محال اور نا مناسب ہے واللہ اعلم۔

سماع کے احکام

اختلاف طبائع کے لحاظ سے احکام سماع بھی مختلف ہیں جس طرح کہ عزائم وارادے مختلف ہوتے ہیں ایسی صورت حال میں کسی ایک چیز پر ایک حکم لگانا ظلم ہے۔

سماع کرنے والے دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک فقط معنی کو سننے والے، دوسرے جو آواز کو سنتے ہیں معانی سے کوئی مطلب نہیں رکھتے۔ ان دونوں طریقوں میں فوائد بھی ہیں اور نقصانات بھی۔ سریلی آوازوں کو سننا غلبہ معنی کی وجہ سے ہوتا ہے جو فطرت انسانی میں داخل ہے۔ چنانچہ اگر معانی حق ہیں تو سماع بھی حق ہے اور معنی باطل ہے تو سماع بھی باطل ہے اس بنا پر جس شخص کی طبیعت میں فساد ہوتا ہے وہ جو کچھ سنتا ہے وہ سب فساد بن جاتا ہے اور یہ سب معانی حضرت داؤد علیہ السلام کی حکایات میں آتے ہیں کہ جب خدا نے ان کو خلیفہ کائنات بنایا تو خوش الحانی دی، آپ کے گلے کو ساز بنا دیا پہاڑوں کو آپ کی خوش الحانی کا ذریعہ بنا دیا حتیٰ کہ وحشی جانور، پرندے پہاڑوں اور جنگلوں سے آپ کی خوش الحانی سننے کے لئے جمع ہو جاتے، بہتے ہوئے پانی رُک جاتے، اڑتے ہوئے پرندے گر پڑتے، آثار و روایات میں ہے کہ حضرت داؤد جس جنگل میں خوش الحانی کرتے وہاں کے جانور ایک ماہ تک کچھ نہ کھاتے پیتے، بچے نہ دودھ مانگتے اور نہ روتے اکثر لوگ لحن داؤدی کی لذت میں فوت ہو جاتے، حتیٰ کہ ایک روایت کے مطابق سات سو جوان لونڈیاں اور بارہ ہزار بڈھے مر گئے۔ حق تعالیٰ نے حقیقت پسند اور خواہش نفس سے سماع کرنے والوں میں امتیاز کر دیا جس سے ابلیس کا حربہ شروع ہو گیا اور وسوسہ کے ذریعہ بھکانے کا پروگرام بنایا۔ اس نے اپنے حربوں کو استعمال کرنے کی اجازت مانگی۔ تو اسے مل گئی اس بنا پر اس نے بانسری اور طنبورے بنائے اور حضرت داؤد علیہ السلام کے بالمقابل محفل سماع قائم کی حتیٰ کہ حضرت داؤدؑ کے سننے والے دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئے اہلِ سعادت حضرت داؤد کے ساتھ اور اہلِ شقاوت شیطان کے پیرو بن گئے۔ اہلِ معنی حضرت داؤدؑ کی ظاہری آواز پر مائل نہ تھے بلکہ

حقیقت پسند تھے کیونکہ وہ سب حق شناس اور حق بین تھے وہ شیطان کی محفل کو آزمائش اور مجلس داؤدی کو ذریعہء ہدایت جانتے تھے حتیٰ کہ انھوں نے دونوں گروہوں کے اصل معاملات کو معلوم کر لیا صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط دیکھ کر کنارہ کش ہو گئے اور سب تعلقات سے منہ موڑ کر حق تعالیٰ سے رشتہ جوڑ لیا۔ چنانچہ جس شخص کا حال سماع کے متعلق ایسا ہو وہ جو کچھ سنے حلال ہے۔

مدعیوں کی ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ سماع حقیقت میں جو کچھ ہے وہ بظاہر برخلاف معلوم ہوتا ہے حالانکہ یہ مشکل ہے کیونکہ ولایت کا کمال یہ ہے کہ ہر چیز کو اس کی اصل کے مطابق دیکھا جائے تا کہ مشاہدہ صحیح ہو اگر معاملہ اس کے برعکس ہوگا تو مشاہدہ مکمل نہ ہوگا۔ جب کہ حضرت رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللھم ارنا حقائق کل الاشیاء کما ھی اے اللہ ہمیں تمام اشیاء کی حقیقت ایسی ہی دکھا جس صفت پر وہ اصل میں ہیں۔ جب چیزوں کو مشاہدہ صحیح وہی ہے جو حقیقت اور اصل کو ظاہر کرے تو صحیح سماع کا معاملہ بھی اسی طرح ہونا چاہئے کہ سننا وہی مناسب ہوگا جو حقائق کو واضح کرے اور جو لوگ ظاہری آواز اور مزامیر پر خواہش نفس سے فریفتہ ہوتے ہیں وہ دراصل ظاہری آواز کو سنتے ہیں اصل مطلب کو نہیں سن سکتے۔ اگر وہ سماع کی حقیقت کے مطابق سنتے تو وہ سماع کی تمام خرابیوں سے نجات پا جاتے مگر اس کے برعکس نقصان میں اضافہ ہوتا ہے جس طرح کہ گمراہ لوگوں نے قرآن کو سنا مگر اُن کی گمراہی میں اضافہ صرف اسی وجہ سے ہوا کہ وہ حقیقتِ کلام کو نہ سمجھ سکے بلکہ صرف ظاہری الفاظ کو سن کر کہنے لگے کہ یہ تو پرانے قصے اور مثالیں ہیں جیسا کہ نضر بن حارث نے قرآن کو سن کر کہا ھٰذا اساطیر الاولین یہ تو پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح جو کاتب وحی تھا اس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ سانزل مثل ما انزل اللہ فتبارک اللہ احسن الخالقین (میں بھی ایسا کلام اتاروں گا جیسا اللہ نے قرآن اُتارا ہے۔ پس وہ ذات بابرکات بہتر پیدا کرنے والا ہے ایک گروہ نے دیدارِ الٰہی کی نفی میں اس آیت کو دلیل بنا لیا لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار (اس ذات کو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں اور وہ آنکھوں کو دیکھ سکتا ہے) ایک گروہ نے مکان اور جہت ثابت کرنے کے لئے اس آیت سے استدلال کیا ثم استوی علی العرش

(پھر عرش پر وہ اچھی طرح سے بیٹھ گیا) ایک گروہ نے اس آیت کو دیدارِ الٰہی کی دلیل بنالیا۔ جاء ربك والملك صفا صفا (اور آیا تیرا رب اور فرشتے صف در صف ہو کر) چونکہ ان کے دل محل گمراہی تھے لہٰذا کلام نے انھیں کوئی فائدہ نہ دیا۔ جب موحد نے کسی شعر کو دیکھ کر اس کے کہنے والے کے خالق کو دیکھا اور اس کے باطن کو آراستہ کرنے والے کا مطالعہ کیا تو بطور عبرت اس کے فعل کو فاعل پر دلیل بنالیا۔ غرضیکہ اس گمراہ گروہ نے کلامِ حق سن کر بھی راہ حق نہ پایا اور گروہِ صوفیا نے کلام باطل میں سماع کے ذریعہ راہ حق تلاش کرلی۔ یہ ایک حقیقت ہے جس کا انکار کھلا ہوا مکابرہ ہے۔ واللہ اعلم۔

تیسواں باب

سماع کے متعلق مشائخ کے اقوال

سماع کے متعلق مشائخ کے بہت سے اقوال ہیں مگر یہاں مختصراً لکھوں گا کیونکہ یہ کتاب ان سب کلمات کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ انشاءاللہ ان سب سے آپ کو مکمل فائدہ ہوگا البتہ توفیق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ سماع حق کا فیضان ہے جو دلوں کو حق کی طرف راغب کرتا ہے پس جس نے حقیقی معنوں میں سنا اس نے راہِ حق کو پالیا اور جس نے خواہشِ نفسی سے سنا وہ بے دین ہوگیا۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ سماع وصلِ حق کا سبب ہوگا بلکہ سننے والے کو چاہئے کہ سماع طلب حق کے لئے کرے صرف آواز کی رنگینی کے لئے نہیں تاکہ اس کا دل فیضانِ حق کا محل بن جائے چنانچہ جب حق اس کے دل میں داخل ہوگا تو وہ دلوں کو نیکی پر ابھارے گا اور جو سماع حق کا تابع ہوگا اسے مشاہدۂ حق حاصل ہوگا۔ اور جو نفس و خواہش کا تابع ہوگا وہ پردہ میں رہے گا۔ اور تاویل سے تعلق پیدا کرے گا۔ سماع حق مکاشفہ ءالٰہی کا سبب ہے اور سماع نفس حجابِ حق کا ذریعہ۔ جو زندیقی کی طرف راغب کرتا ہے زندقہ فارسی زبان کا لفظ ہے جو معرب ہے فارسی میں اس کے معنی تاویل کرنے کے ہیں اسی وجہ سے وہ اپنی کتاب کو ژند و پاژند کہتے ہیں جب لغت والوں نے آتش پرستوں کا نام رکھنا چاہا تو "زندیق" رکھ دیا کیونکہ زندیق یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ مسلمان کہتے ہیں اس کی تاویل ممکن ہے۔ تنزیل دیانت میں داخل کرتی ہے اور تاویل دیانت سے باہر نکالتی ہے۔ آج کل کے مصری شیعہ جو ان میں سے کچھ باقی ہیں وہی کہتے ہیں جو مجوسی کہتے تھے۔ چنانچہ زندیق کا نام ان کے لئے خاص ہوگیا ہے۔

حضرت ذوالنون مصریؒ کی مراد یہ ہے کہ اہل تحقیق سماع میں تحقیق کرنے والے ہوتے ہیں اور اہلِ نفس تاویل کرنے والے اسی وجہ سے وہ فسق و فجور میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔

شبلیؒ فرماتے ہیں "سماع کا ظاہر فتنہ ہے اور باطن عبرت جو اہلِ اشارہ ہے اور اشارات کو پہچانتا ہے اس کے لئے سماع عبرت حلال ہے ورنہ طلب فتنہ ہے اور مصیبت کا سامنا کرنا ہے یعنی جس کا دل پوری طرح قولِ حق میں محو نہیں اس کے لئے سماع محل آفت اور آزمائش ہے۔

ابو علی رودباری سے سماع کے متعلق کسی نے سوال کیا تو آپ نے فرمایا لیتنا تخلصا

راسا براس۔ کاش ہم سماع سے سر سبز بچ نکلیں۔ کیونکہ انسان ہر چیز کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ وہ جب کوئی حق ادا نہیں کرتا تو اسے اپنی خطا احساس ہوتا ہے اور وہ پھر سمجھتا ہے کہ کاش اسے کبھی رہائی نصیب ہوتی۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں السماع تنبیه الاسرار لما فیه من المغیبات (بھیدوں کے پیدا کرنے کا نام سماع ہے جو دراصل باطن میں پوشیدہ ہیں تا کہ ان کے ذریعہ سے حق تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر رہیں اس لئے کہ اسرار کا پوشیدہ رکھنا مریدوں کے لئے سخت قابل ملامت ہے اور ان کے سب سے بُرے صفات میں سے ہے کیونکہ گو دوست بظاہر دوست سے غائب ہے مگر دل سے حاضر ہوتا ہے اور جب غیبت آ گئی تو دوستی ختم ہو جاتی ہے۔

میرے شیخ نے فرمایا کہ السماع زاد المضطرین فمن وصل استغنی عن السماع (سماع عاجز لوگوں کا سفر خرچ ہے پس جو منزل پر پہنچ گئے انھیں سماع کی حاجت نہیں) کیونکہ وصل کی حالت میں سننے کا حکم باقی نہیں رہتا اس لئے کہ سننا خبر کا ہوتا ہے اور خبر غائب کے متعلق دی جاتی ہے جب آنکھوں سے مشاہدہ ہو گیا تو سننے کا معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔

حضرت حصریؒ فرماتے ہیں "تو اس سماع کو کیا کرے گا جو منقطع ہو جائے جب گانے والا رک جاتا ہے تو اس کا اثر بھی ختم ہو جاتا ہے چنانچہ مناسب یہ ہے کہ سماع متصل ہو جس کی تاثیر ختم نہیں ہوتی (یعنی ہر وقت ذکر حق کی آواز کانوں میں آتی رہے) اس بات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہمت مجتمع رہے منقطع نہ ہو کیونکہ بندہ جب اس درجہ پر پہنچ جاتا ہے تو تمام عالم جمادات و حیوانات اس کا سماع کرنے والے ہو جاتے ہیں۔ اور یہ درجہ بہت بڑا ہے۔ اللہ توفیق دینے والا ہے۔

سماع میں صوفیوں کا اختلاف

سماع کے متعلق مشائخ و محققین صوفیاء کے درمیان اختلاف ہے ایک گروہ سماع کو غیبت کا آلہ بتاتا ہے اور یہ دلیل دیتا ہے کہ مشاہدہ میں سماع محال ہے اور دوست کے دیدار کے وقت سننے سے بے نیازی ہو جاتی ہے کیونکہ سماع خبر کو ہوتا ہے اور خبر مشاہدہ کی حالت میں دوری، حجاب اور مشغولی ہوتی ہے۔ پس سماع مبتدیوں کا آلہ ہوتا ہے تا کہ غفلت کی پراگندگیوں سے دل کو مجتمع کر سکیں اور جو پہلے سے مجتمع ہو وہ سماع کی وجہ سے پراگندہ ہو جاتا ہے۔ ایک گروہ سماع کو حاضر کا آلہ بتاتا ہے کیونکہ محبت کلی فنا اور محویت کو چاہتی ہے جب تک محب کا کل محبوب کے کل میں مستغرق

نہ ہو جائے وہ محبت میں ناقص ہوتا ہے۔ پس جیسا کہ دل کا حصہ وصل کے مقام میں محبت ہے اور باطن کا مشاہدہ روح کا وصل اور جسم کی خدمت ہے اسی طرح ضروری ہے کہ کان کا بھی حصہ ہو جیسا کہ دیدار میں آنکھ کا حصہ ہے۔ کسی شاعر نے اپنے ہزلیہ اشعار میں بسلسلہ دوستی شراب کہا ہے کہ:۔

الا فاسقنی خمرا وقل لی ھی الخمر

ولا تسقنی سرا اذا امکن الجھر

(اے دوست مجھے شراب پلا اور مجھے کہہ دے کہ یہ شراب ہے اور مجھے شراب مخفی طور پر نہ پلا جب کہ ظاہر پلانا ممکن ہے)

یعنی اے دوست شراب اس صورت میں پلا کہ میری آنکھ دیکھ لے اور ہاتھ چھو لے، زبان چکھ لے، ناک سونگھ لے مگر اس وقت قوتِ سامعہ یعنی کان محروم رہے گا لہٰذا یہ کہہ دے کہ یہ شراب ہے تا کہ کان بھی اپنا حصہ پالے۔ حتیٰ کہ میرے تمام حواس اس سے مل جائیں اور لذت گیر ہو جائیں۔

یہ بھی کہتے ہیں کہ سماع حضوری کا آلہ ہے کیونکہ غائب، غائب ہوتا ہے اور منکر بھی، انجان اس کا اہل نہیں ہوتا۔ سماع کی دو قسمیں ہیں ا۔ بالواسطہ ۲۔ بلاواسطہ۔ جو کسی گویّے سے سنا جاتا ہے وہ غیبت کا آلہ ہوتا ہے اور جو خدا کی طرف سنا جاتا ہے وہ حضوری کا آلہ کہلاتا ہے اسی بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ مخلوق اس لائق نہیں کہ ان کی کوئی بات سنی جائے یا ان کی بات بیان کی جائے سوائے بزرگان اور خالص لوگوں کے کسی سے سماع نہ کیا جائے۔ واللہ اعلم

اکتیسواں باب

بسلسلہ سماع صوفیاء کے مراتب

صوفیوں میں سے ہر ایک کا سماع کے معاملہ میں ایک خاص مقام و مرتبہ ہے جس کے ذریعہ وہ سماع سے لطف اندوز ہوتا ہے جیسا کہ توبہ کرنے والے کے لئے سماع، معاون توبہ ہوتا ہے اور اس سے ندامت حاصل ہوتی ہے، مشتاق دیدار کے لئے سبب دیدار، یقین کرنے والے کے لئے تاکید، مرید کے لئے تحقیق کا ذریعہ، محب کے لئے تعلقات منقطع کرنے کا باعث اور فقیر کے لئے سماع ماسوی اللہ سے ناامیدی کی بنیاد بن جاتا ہے۔ دراصل سماع مثلِ آفتاب ہے جو تمام چیزوں پر روشنی ڈالتا ہے مگر اس روشنی سے استفادہ ہر چیز اپنی صلاحیت واہلیت کے مطابق کرتی ہے۔ سُورج کسی کو جلا دیتا ہے اور کسی کو جلا دیتا ہے۔ کسی کو نوازتا ہے تو کسی کو بھسم کر دیتا ہے۔ سماع کے متعلق تین فرقے ہیں ا۔ مبتدی ۲۔ متوسط۔ درجہ اور تیسرے نمبر پر کامل ہیں ان میں سے ہر ایک کا مفصل تذکرہ کیا جائے گا تاکہ حقیقت اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔ انشاءاللہ تعالیٰ

سماع کے متعلق معاملات

معلوم ہونا چاہئے کہ سماع فیضانِ حق ہے اور انسانی جسم کی ساخت وترکیب متضاد عناصر سے ہوئی ہے اس وجہ سے مبتدی کی طبیعت شروع میں خدا کے معاملات میں نہیں لگتی مگر جب امور الٰہی اور اسرار ربانی کا سلسلہ جاری رہتا ہے تو طبیعت کو سوز وگداز حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ایک جماعت سماع سے بے ہوش ہو جاتی ہے اور ایک جماعت ہلاک ہو جاتی ہے اور کوئی شخص ایسا نہیں رہتا جو حدِ اعتدال سے نہ گزر جائے۔ یہ حقیقت ہے اور ہمارا مشاہدہ ہے کہ ملک روم میں لوگوں نے ''انکلیون'' نامی ایک عجیب چیز تیار کی ہے جسے یونانی عجائب وغرائب کے مجموعہ والی چیز کو کہتے ہیں۔ یہ دراصل ایک باجہ ہے، جہاں ہفتہ میں دُو دن بیماروں کو ان کی بیماری کے مطابق بجا کر سنایا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کو مارنا مقصود ہوتا ہے تو اسے اس جگہ پر زیادہ دیر ٹھہرایا جاتا ہے تاکہ وہ ساز سُن سُن کر ہلاک ہو جائے۔ اگرچہ موت کا وقت معین ہے مگر اس کے اسباب تو برحق ہیں اگرچہ اس باجہ کو طبیب سُنتے ہیں مگر ان کو کچھ نہیں ہوتا، کیونکہ وہ ان کی طبیعت کے بالکل موافق ہوتا اور مبتدیوں کے طبیعت کے مخالف ہے۔

میں نے ہندوستان میں ایک ایسا زہر دیکھا ہے جس میں ایک کیڑا پیدا ہوتا ہے جس کی غذا ہی وہ زہر ہے کیونکہ وہ ہمہ تن زہر ہی ہو جاتا ہے۔ ترکستان میں اسلامی سرحد پر واقع ایک شہر میں پہاڑ کو آگ لگ گئی اور وہاں سے نوشادر اُبل رہا تھا اس آگ میں ایک چوہا تھا جو باہر نکلا تو فوراً مر گیا۔ ان مثالوں سے مراد یہ واضح کرنا ہے کہ مبتدیوں کی بے چینی فیضانِ الٰہی کے وارد ہونے کی صورت میں اس وجہ سے ہوتی ہے کہ ان کا جسم اس کے بالکل مخالف ہوتا ہے اور اس حالت کے متواتر قائم رہنے سے مبتدی کو سکون حاصل ہونے لگتا ہے۔ جیسا کہ جبرائیل علیہ السلام وحی لے کر آئے تو رسولِ خدا ﷺ کو شروع میں اضطراب ہوا مگر جب انتہا پر پہنچ گئے تو جبرائیلؑ کے تاخیر کرنے پر آپ ﷺ غمگین ہو جاتے جس کے بہت سے شواہد موجود ہیں۔ یہ حکایات بسلسلہ سماع مبتدیوں کے لئے دلیل راہ ہیں اور منتہیوں کے لئے باعثِ آرام و سکون۔

مشہور ہے کہ حضرت جنیدؒ کے ایک مرید کو سماع میں کافی اضطراب ہوتا اور دوسرے مرید اسے سنبھالتے۔ جب اس چیز کی شکایت کی گئی تو آپ نے مرید سے فرمایا اگر آئندہ تو نے سماع میں بے قراری کا مظاہرہ کیا تو میں تجھے ہم نشین نہیں ہونے دوں گا۔

ابو محمد حریریؒ فرماتے ہیں کہ اس شخص کو میں نے سماع کی حالت میں دیکھا تو اس کے ہونٹ بند تھے اور ہر بال سے بے قراری کا چشمہ اُبل رہا تھا ایک دن اس کے ہوش و حواس معطل تھے مگر حقیقت معلوم نہ ہو سکی کہ آیا وہ دورانِ سماع اچھی حالت میں تھا یا مرشد کی حرمت اس پر غالب تھی۔

روایت ہے کہ ایک شخص نے سماع میں ایک نعرہ مارا تو مرشد نے کہا کہ خاموش رہ، اس نے سر اپنے زانو پر رکھا، جب لوگوں نے دیکھا تو وہ مر چکا تھا۔ شیخ ابو مسلم فارس بن غالب فارسی سے میں نے سنا ہے کہ ایک درویش دورانِ سماع بہت بے چین ہو جاتا تھا، کسی شخص نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ بیٹھ جاؤ! وہ بیٹھتے ہی فوت ہو گیا۔ حضرت دراج، ابن القرطی کے ساتھ دجلہ کے کنارے بصرہ اور رملہ کے درمیان جا رہے تھے راستہ میں ایک محل کے نیچے پہنچے تو دیکھا کہ ایک شخص چھت پر بیٹھا ہوا سامنے لونڈی سے گانا سُن رہا ہے لونڈی یہ شعر پڑھ رہی تھی:-

فی سبیل اللّٰہ و دکان منی لک یبدل
کل یوم تتلون غیر ھذا بک اجمل

میں تو تجھ سے خدا کے لئے محبت کرتا تھا اور اس کے ساتھ

تیرا ہر روز ایک نئے انداز اور رنگ میں بدلنا کیا بھلا معلوم ہوتا ہے۔

میں نے ایک جوان کو اس محل کے نیچے گدڑی اور لوٹا لئے کھڑا دیکھا اس نے کہا کہ اے لونڈی تجھے خدا کی قسم یہ شعر دوبارہ پڑھ کیونکہ میری زندگی صرف ایک سانس رہ گئی ہے اور اس کے سُننے سے ختم ہو جائے گی۔ لونڈی نے جب دوبارہ پڑھا تو جوان نے نعرہ مارا اور مر گیا لونڈی کے مالک نے کہا تو آزاد ہے اور خود نیچے اتر کر جوان کے کفن دفن کی تیاری کرنے لگ گیا سب بصرہ والوں نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھی۔ اس کے بعد وہ آدمی کھڑا ہوا اور کہا کہ اے اہلِ بصرہ! میں فلاں بن فلاں ہوں میں نے سب ملکیت راہِ خدا میں وقف کر دی ہیں اور غلاموں کو آزاد کر دیا ہے یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا اور کسی کو اس کا پتہ نہ چل سکا۔ اس حکایت سے مطلب یہ ہے کہ مرید کا سماع کے وقت ایسا حال ہونا چاہیے کہ وہ بدکاروں کو بدکاری سے نجات دے جب کہ آج گمراہوں کا ایک گروہ بدکاروں کے سماع میں حاضر ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم حق کی وجہ سے سماع کرتے ہیں فاسق لوگ ان کے ہم خیال ہوتے ہیں اور سماع کے سلسلہ میں فسق و فجور میں زیادہ حریص بن جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ خود بھی ہلاک ہو جاتے ہیں اور اپنے متعلقین کو بھی تباہ کر دیتے ہیں۔

حضرت جنیدؒ سے لوگوں نے پوچھا کہ اگر ہم بطور عبرت گرجا میں چلے جائیں اور صرف کافروں کی ذلت کا مشاہدہ کریں اور اسلام کی نعمت پر شکریہ کریں تو کیا جائز ہے؟ آپ نے فرمایا اگر تم گرجا میں اس انداز میں جاؤ کہ جب باہر نکلو تو کچھ کافروں کو مسلمان بنا کر اپنے ساتھ لے آؤ تو جاؤ ورنہ نہیں۔ پس عبادت خانہ والا اگر شراب خانہ میں چلا جائے تو شراب خانہ بھی اس کا عبادت خانہ بن جاتا ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں بغداد میں ایک بزرگ کے ساتھ جا رہا تھا کہ ایک گویّے کی آواز سنی جو یہ گا رہا تھا

منیٰ ان تکن حقا تکن احسن المنی

ولا فقد عشنا بھاز منا وغدا

آرزو اگر حق ہے تو بہتر آرزو ہے ورنہ ہم نے اس آرزو میں ایک زمانہ بسر کر لیا ہے جو گزر چکا ہے۔ اس درویش نے نعرہ مارا اور رحلت کر گیا۔

ایسا ہی ایک واقعہ ابو علی رودباریؒ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے ایک درویش کو گویّے کی آواز میں مصروف دیکھا میں نے بھی اس آواز پر کان لگائے کہ اس کا گانا سنوں تو وہ غمناک آواز میں یہ گا رہا تھا کہ:۔

امد کفی بالخضوع

الی الذی جا ربا لا صغاء

(میں فروتنی سے اس شخص کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوں جو سننے کی سخاوت کرتا ہے)

اس درویش نے نعرہ مارا اور مر گیا۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابراہیم خواصؒ کے ساتھ پہاڑی راستہ پر چل رہا تھا تو میں نے خوشی میں آ کر یہ شعر پڑھا۔

صح عند الناس انی عاشق،

غیر ان لم یعرفوا اعشقی لمن

لیس فی الانسان شئی حسن

الا واحسن منه صوت الحسن

لوگوں کو یہ تو صحیح طور پر معلوم ہے کہ میں عاشق ہوں مگر انھیں یہ علم نہیں کہ میں کس کا عاشق ہوں انسان میں تو کوئی چیز اچھی نہیں سوائے اسکی آواز کے۔

مجھ سے حضرت ابراہیم خواصؒ نے کہا کہ دوبارہ پڑھو، میں نے دوبارہ پڑھے تو آپ نے وجد کی حالت میں زمین پر پاؤں مارے میں نے غور سے دیکھا تو آپ کے قدم پتھر میں اس طرح گڑے ہوئے تھے جیسے کہ موم میں ہوں پتھر میں نہیں آپ بے ہوش ہو کر گر پڑے، جب ہوش میں آئے تو فرمایا کہ میں باغِ بہشت میں تھا لیکن تو نے نہیں دیکھا۔ اس قسم کی بہت سی حکایات ہیں مگر یہ کتاب ان کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ میں نے بچشم خود ایک درویش کو آذر بائیجان کی پہاڑیوں میں چلتے ہوئے جلدی جلدی یہ اشعار پڑھتے دیکھا جو ساتھ ساتھ آہ وزاری بھی کرتا چلا جا رہا تھا۔

واللہ ماطلعت شمس ولا غربت

الا وانت فی قلبی ووسواسی

ولا جلست فی قوم احدثهم

الا وانت حدیثی بین اجلاسی

ولا ذکرتك محزونا ولا طربا

الا وحبك مقرون بانفاسی

ولا هممت بشرب الماء من عطش
الا رأیت خیالا من فی الکاس
فلو قدرت علی الاتیان زرتکم
مکبا علی الوجه و مثیا علی الراس

خدا کی قسم مجھ پر کوئی دن ایسا نہیں گذرا مگر تو میرے دل میں اور میرے خیالات میں بسا ہوا ہوتا ہے میں نے کسی مجلس اور قوم میں تیری بات کے علاوہ کوئی اور بات نہیں کی، میں نے تیرا ذکر خوشی وغم کی حالت میں اس طرح کیا ہے کہ تیری محبت میرے ہر سانس میں ملی ہوئی ہوتی ہے۔ میں نے پیاس کی حالت میں ہمیشہ اس طرح پانی پیا ہے کہ پیالے میں تیرا تصور وخیال رہا اگر میں آپ کے پاس آنے کی طاقت رکھتا تو منہ اور سر کے بل چل کر تیری زیارت کے لئے حاضر خدمت ہوتا۔ ان اشعار کے سماع سے اس درویش کی حالت نازک ہوگئی۔ تھوڑی دیر پتھر سے پشت لگا کر سہارا لیتے ہوئے بیٹھا اور فوت ہوگیا۔ خدا اس پر رحمت فرمائے۔

ہوس انگیز اشعار کے سماع کی کراہت

مشائخ کا ایک گروہ قصائد، اشعار اور غنا کے ساتھ اس طرح پڑھنا کہ حروف مخارج کی حدود سے تجاوز کر جائیں سننا مکروہ سمجھتا ہے، یہ گروہ نہ صرف خود پرہیز کرتا رہا ہے بلکہ اپنے مریدوں کو بھی منع کرتا رہا ہے جس میں کافی حد تک مبالغہ ہے۔ ان کے چند گروہ ہیں اور ہر گروہ کے نزدیک ایک خاص علت ہے۔ ایک گروہ سماع کے حرام ہونے کے لئے کئی روایتیں پیش کرتا ہے، اس سلسلہ میں وہ سلف صالحین کے پیروکار ہیں جیسا کہ حضرت رسول کریم ﷺ کا حضرت حسان بن ثابتؓ کی لونڈی کو گانے سے ڈانٹ کر روکنا اور تنبیہ کرنا۔ حضرت عمرؓ کا ایک گانے والے صحابی کو کوڑے لگانا حضرت علیؓ کا حضرت معاویہ پر اس وجہ سے اعتراض کرنا کہ ان کے پاس گانے والی لونڈیاں تھیں اور حضرت حسنؓ کو اس حبشی عورت کے دیکھنے سے منع کرنا جو گانا گا رہی تھی اور فرمایا کہ وہ شیطان کی سہیلی ہے اس طرح کی اور بہت سی روایات ہیں نیز یہ گروہ کہتا ہے کہ موجودہ اور گذشتہ زمانہ کی تمام امت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے کہ یہ مکروہ ہے حتیٰ ایک گروہ تو اسے مطلقاً حرام کہتا ہے۔ اس معنی میں حضرت ابوالحارث بنانی رحمتہ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میں سماع کا بہت

شوقین تھا ایک رات میرے حجرے میں ایک شخص آیا اس نے مجھ سے کہا کہ طالبانِ حق کی ایک جماعت مجتمع ہوئی ہے اور وہ آپ کے دیدار کی مشتاق ہے اگر آپ قدم رنجہ فرمائیں تو کرم ہوگا۔ میں نے کہا چلو میں آتا ہوں۔ پھر میں اس کے پیچھے چل دیا۔ وہ مجھے ایک ایسے گروہ کے پاس لے گیا جو حلقہ باندھے بیٹھا تھا اور ان کا شیخ ان کے درمیان تھا ان سب نے میری عزت کی اور ممتاز جگہ پر مجھے بٹھا دیا۔ اس شیخ نے مجھ سے کہا اگر اجازت ہو تو کچھ اشعار سنواؤں؟ میں نے اجازت دے دی۔ دو شخصوں نے خوش الحانی کے ساتھ ہم آواز ہو کر ایسے اشعار گائے جو شاعروں نے فراق میں کہے تھے وہ سب وجد میں کھڑے ہو گئے نعرے اور لطیف اشارے کرنے لگے میں ان کے حال پر حیرت زدہ ہو کر رہ گیا اور بڑا محظوظ ہوا یہاں تک کہ صبح نمودار ہو گئی اس وقت اس شیخ نے مجھ سے کہا، اے شیخ! آپ نے مجھ سے دریافت نہ فرمایا کہ میں کون ہوں؟ اور کس گروہ سے تعلق رکھتا ہوں؟ میں نے کہا تمہاری حشمت مجھے یہ دریافت کرنے میں مانع رہی۔ اس نے کہا میں عزازیل ہوں جسے اب ابلیس کہتے ہیں اور یہ سب میرے فرزند ہیں اس جگہ بیٹھنے اور گانے سے مجھے دو فائدے تھے ایک یہ کہ میں خود جدائی اور فراق کی مصیبت میں مبتلا ہوں اور نعمت کے دنوں کو یاد کرتا ہوں دوسرے یہ کہ متقی لوگوں کو راہ سے بھٹکا کر غلط راستہ پر ڈالتا ہوں۔ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میرے دل سے سماع کا ارادہ اور اس کا شوق جاتا رہا۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت امام شیخ ابوالعباس اشقانی رحمتہ اللہ علیہ سے سنا ہے وہ فرماتے تھے کہ میں ایک دن ایسے اجتماع میں شریک تھا جس کے کچھ لوگ سماع میں مشغول تھے اور ان کا سردار ان کے درمیان رقص کر رہا تھا اور ان میں دوڑتا پھر رہا تھا۔ وہ اس سے محظوظ ہو رہے تھے اور کچھ لوگ ایسے تھے جو اس اندیشہ کے پیش نظر، کہ مریدین اس بلا و بیہودگی میں مبتلا نہ ہو جائیں ان کی تقلید نہ کرنے لگیں۔ معصیت کے کنارے پر کھڑے ہو کر توبہ کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑ دیں ان کی نفسانی خواہشات کی تقویت کا موجب نہ بنے ہوس کا ارادہ ان کی صلاحیتوں کو فسخ نہ کر دے کیونکہ یہ لوگ سماع نہیں کر رہے تھے بلکہ فتنہ و بلا کا سامان پیش کر رہے تھے، اس لئے وہ ان کے ساتھ شریک نہ تھے۔

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ فرماتے ہیں کہ انھوں نے اپنے ایک مرید سے ابتدائے توبہ کے وقت نصیحت فرمائی کہ اگر تم دین کی سلامتی اور توبہ پر استقامت چاہتے ہو تو اس سماع سے

دور رہنا جو صوفی لوگ سنتے ہیں۔ نہ ان میں شریک ہونا اور نہ ان کے ساتھ بیٹھنا جب تک کہ تم جوان ہو۔ جب تم بوڑھے ہو جاؤ تو ایسے فعل سے باز رہنا جس سے لوگ گنہگار ہوتے ہیں۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ سماع والوں کے دو گروہ ہیں۔ ایک لاہی دوسرا الٰہی۔ لاہی سراسر فتنہ ہیں اور وہ خدا سے نہیں ڈرتے۔ دوسرا الٰہی وہ مجاہدہ و ریاضت میں رہتے اور مخلوق سے کنارہ کش ہو کر اپنے آپ کو فتنوں سے بچاتے ہیں یہ لوگ خدا کی حفاظت میں ہوتے ہیں۔ مگر ہم نہ اس گروہ سے ہیں اور نہ اس گروہ سے۔ ہمارے لئے یہی بہتر ہے کہ ہم اسے چھوڑ دیں اور ایسی باتوں میں مشغول ہونا جو ہمارے وقت کے موافق ہو زیادہ بہتر ہے۔

ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ جب عوام کے لئے سماع میں فتنہ ہے اور ہمارے سننے سے لوگوں کے اعتقاد میں تذبذب واقع ہوتا ہے اور ہمارے درجے سے لوگ غافل و محجوب ہیں اور وہ ہماری وجہ سے گناہ میں مبتلا ہوتے ہیں تو ہمیں لازم ہے کہ ہم عوام پر شفقت کریں اور خاص لوگوں کو نصیحت کریں کہ دوسروں کی خاطر وہ اس سے باز رہیں۔ یہ طریقہ بہت اچھا ہے۔

ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ "ومن حسن اسلام المرء ترك مالا يعنيه" اسلام کے نیک خصائل میں سے یہ ہے کہ لایعنی اور بے کار چیزوں کو چھوڑ دے۔ لہٰذا ہم ایسی چیزوں سے ہاتھ اٹھاتے ہیں اور اس سے دور ہیں کیونکہ لایعنی چیزوں میں مشغول ہونے سے وقت ضائع ہوتا ہے۔ حالانکہ دوستوں کے نزدیک ان کا اپنا وقت بڑا عزیز ہوتا ہے اسے ضائع نہ کرنا چاہیے۔

خاص لوگوں کا ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ سماع خبر ہے اور اس کی لذت مراد کو پانا ہے یہ بچوں کا کام ہے کیونکہ مشاہدے میں خبر کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس لئے مشاہدے سے ہی تعلق رکھنا چاہیے۔ لہٰذا سماع کے احکام یہ ہیں جسے میں نے اختصار سے بیان کر دیا ہے۔ اب مشائخ کے وجد، وجود اور تواجد کو بیان کرتا ہوں وباللہ التوفیق

بتیسواں باب

وجد، وجود، اور تواجد کے مراتب

واضح رہنا چاہئے کہ وجد وجود، دونوں مصدر ہیں وجد کے معنی اندوہ وغم اور وجود کے معنی پانے کے ہیں۔ جب دونوں کا فاعل ایک ہو تو بجز مصدر کے فرق کے اور کوئی فرق نہیں باقی رہتا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے "وجد، یجد، وجود اور وجدانا" اور جیسے "وجد، یجد، وجدا" جس کے معنی اندوہگیں کے ہیں۔

نیز جب تونگری کے معنی میں ہوگا تو "وجد، یجد، جدۃ" مستعمل ہوگا اور غصہ کے معنی میں ہوگا تو "وجد، یجد، موجدۃ" مستعمل ہوگا۔ یہ سب مصادر ہیں نہ کہ افعال و مشتقات اور اہل طریقت کے نزدیک وجد اور وجود سے اُن دو حالتوں کا اثبات ہے جو سماع میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک غم واندوہ اور دوسرا حصول مراد کی کامیابی کی حالت کا اظہار کرتا ہے۔ غم و اندوہ کی حقیقت، محبوب کا گم ہونا اور مراد کا نہ پانا ہے اور حصولِ مراد کی حقیقت، مراد کا پانا ہے۔ حزن و وجد کے درمیان فرق یہ ہے کہ حزن اس غم کو کہتے ہیں جو اپنے نصیب میں ہو اور وجد اس غم کو کہتے ہیں جو محبت کے طریقہ پر دوسروں کے نصیب میں ہو۔ یہ تمام تغیرات طالب کی صفت ہیں "الحق لا یتغیر" حق تغیر پذیر نہیں ہوتا اور وجد کی کیفیت، لفظ وعبارت میں بیان نہیں کی جاتی کیونکہ وہ معائنہ میں غم والم ہے اور غم والم کی کیفیت لکھی نہیں جا سکتی۔

وجد ایک باطنی کیفیت ہے جو طالب ومطلوب کے درمیان ہوتی ہے کیونکہ کشف میں باطنی حالت کا بیان اور اس کے وجود کی کیفیت وکیت کا نشان واشارہ صحیح نہیں ہو سکتا اس لئے کہ مشاہدہ میں یک گونہ خوشی ہے اور خوشی، طلب سے حاصل نہیں ہوتی ہے اور وجود ایک طلب ہے جو محبوب سے محبّ کو ملتی ہے اور اس کی حقیقت کا اظہار واشارہ ناممکن ہے۔ میرے نزدیک وجد، دل کو غم والم پہنچنے کا نام ہے خواہ وہ خوشی سے ہو یا غم سے، تکلیف سے ہو یا راحت سے اور وجود دلی غم کا آلہ ہے۔ اس سے مراد سچی محبت ہے۔ واجد کی صفت بحالت جوش اور شوق، حرکت ہوگی یا بحالتِ کشف، مشاہدہ کی حالت کے موافق سکون ہوگی۔

لیکن آہ وفغاں کرنے، گریہ وزاری کرنے، غصہ کرنے راحت پانے، تکلیف اٹھانے

اور خوش ہونے کی صورت میں مشائخ طریقت کا اختلاف ہے کہ آیا وجد مکمل ہوتا ہے یا وجود؟ مشائخ فرماتے ہیں کہ وجود مریدوں کی صفت ہے اور وجد عارفوں کی توصیف۔ چونکہ عارفوں کا درجہ مریدوں سے بلند ہوتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ ان کی صفت بھی ان سے بلند تر اور کامل تر ہو۔ جو چیز حاصل ہونے اور پانے کے تحت آتی ہے وہ مدرک ہوتی ہے، موصوف وصفت ایک ہی جنس کے ہوتے ہیں اور یہ کہ ادراک حد کا اقتضاء کرتی ہے اور حق تعالےٰ بے حد ہے لہٰذا بندہ کا پانا بجز مشرب وعمل کے نہ ہوگا اور جس نے نہ پایا وہ طلبگار ہوتا ہے اور اس میں طلب منقطع ہوتی ہے۔ اور وہ اس کی طلب سے عاجز ہوتا ہے اور وجدان حق کی حقیقت ہوتی ہے۔

ایک گروہ یہ کہتا ہے وجد، مریدوں کی سوزش ہے اور وجود محبوں کا تحفہ۔ مریدوں سے محبوں کے درجہ کی بلندی مقتضی ہے کہ طلب کی سوزش سے، تحفہ مکمل اور زیادہ آرام دہ ہے اس کی وضاحت اس حکایت میں ہے کہ:۔

ایک دن حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ اپنے حال کے جوش میں حضرت جنید بغدادیؒ کے پاس آئے انھوں نے ان کو غمگین دیکھا تو عرض کیا کہ اے شیخ! کیا بات ہے؟ حضرت جنیدؒ نے فرمایا "من طلب وجد" جس نے چاہا پالیا۔ حضرت شبلیؒ نے عرض کیا "لا بل من وجد طلب" نہیں بلکہ جس نے پایا وہ طالب ہوا۔

اس کے معنی میں مشائخ فرماتے ہیں کہ ایک نے وجد کا پتہ دیا دوسرے نے وجود کا اشارہ کیا۔ مگر میرے نزدیک حضرت جنید کا قول معتبر ہے اس لئے کہ بندہ جب جان لیتا ہے کہ اس کا معبود، اس کی جنس کا نہیں ہے تو اس کا غم طویل ہو جاتا ہے۔ اس کتاب میں اس بحث کا تذکرہ اس سے پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔

مشائخ طریقت کا اس پر اتفاق ہے کہ غلبہء وجد سے غلبہء علم اقویٰ ہوتا ہے کیونکہ جب قوت، وجد کے غلبہ کو ہوتی ہے تو واجد خطر کے محل میں ہوتا ہے اور جب قوت، علم کے غلبہ کو ہوتی ہے تو عالم امن کے محل میں ہوتا ہے۔

خلاصہء کلام یہ ہے کہ طالب حق، ہر حال میں علم وشریعت کا فرمانبردار رہے کیونکہ جب وجد سے مغلوب ہو جاتا ہے تو اس سے خطاب اٹھ جاتا ہے اور جب خطاب اٹھ جاتا ہے تو ثواب و عتاب بھی اٹھ جاتا ہے۔ جب ثواب وعتاب اٹھ جائے تو عزت وذلت بھی اٹھ جاتی ہے۔ اس

وقت اس کا حکم دیوانوں اور پاگل جیسا ہوتا ہے۔ نہ کہ اولیا اور مقربین جیسا؟ جب بندے کے غلبہ حال پر، علم کا غلبہ ہو تو بندہ اَوامر ونواہی کی پناہ گاہ میں ہوتا ہے اور عزت کے محل میں مقیم۔ اور وہ ہمیشہ صاحبِ شکر ہوتا ہے اور جب غلبہ علم پر حال کا غلبہ غالب ہو تو بندہ حدود سے خارج ہو کر اپنے نقص کے محل میں خطاب سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس وقت یا تو معذور ہوگا یا مغرور؟ بعینہ یہی معنی حضرت جنیدؒ کے قول کے ہیں۔ اس لئے کہ دو ہی راستے ہیں ایک علم سے دوسرے عمل سے۔ اور جو عمل، علم کے بغیر ہو اگرچہ بہتر ہو مگر وہ جہل ونقص ہے۔ اور وہ علم جو عمل کے بغیر ہو بہر طور موجب عزت وشرف۔ اسی بنا پر حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''اہلِ ہمت کا کفر، آرزو رکھنے والے اسلام سے بزرگ تر ہے''۔ مطلب یہ ہے کہ اہل ہمت پر کفر کی کوئی صورت نہیں بنتی اگر غور کیا جائے تو اہلِ ہمّت جو کفر کے ساتھ ہوا آرزو والے ایماندار سے زیادہ کامل ہوتا ہے۔

حضرت جنیدؒ نے حضرت شبلیؒ کے بارے میں فرمایا شبلی مست ہے اگر وہ مست مستی سے افاقہ پا جائیں تو ایسے ڈرانے والے ہوں کہ کوئی بھی ان سے فائدہ، حاصل نہ کر سکے۔

ایک مرتبہ حضرت جنید، حضرت محمد بن سیرین اور حضرت ابوالعباس بن عطار حمہم اللہ ایک جگہ جمع تھے قوال نے چند اشعار گائے دونوں باہم وجد کرنے لگے اور حضرت جنید ساکن بیٹھے رہے۔ وہ کہنے لگے اے شیخ، اس سماع میں آپ کا کوئی حصہ نہیں؟ حضرت جنید نے اللہ تعالیٰ کا یہ قول پڑھا ''تحسبها جامدة وهي تمر مر السحاب'' تم ان کو جامد وساکن خیال کرتے ہو حالانکہ وہ گزرنے والے بادلوں کی مانند گزر جاتے ہیں۔

بحالتِ وجد، تواجد تکلف ہے تواجد یہ ہے کہ ''حق کے انعام وشواہد کو دل پر پیش کرنا اور وصل وآواز کی فکر کرنا'' یہ کام جوانمردوں کا ہے۔

ایک گروہ اس میں محض رسموں کا پابند بنا ہوا ہے جو ظاہری حرکتوں کی تقلید کرتا، باقاعدہ رقص کرتا اور ان کے اشاروں کی نقل اتارتا ہے یہ حرام محض ہے۔ ایک گروہ محقق وثابت قدم ہے اس میں محض مراد، مشائخ کے درجات اور ان کے احوال کی طلب ہے نہ کہ خالی رسموں کی تقلید اور حرکتوں کی پیروی، نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''من تشبه بقوم فهو منهم'' جس نے جس قوم کی مشابہت کی وہ انھیں میں سے ہے۔ اور یہ بھی ارشاد ہے کہ ''اذا اقرأ تم القرآن

فابکوا فان لم تبکوا افتباکوا ''جب تم قرآن پڑھو تو روؤ پھر اگر رو نہ سکو تو رونے کی شکل بنالو؟ یہ حدیث مبارک تواجد کی اباحت پر شاہد و ناطق ہے۔ اسی لئے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں ہزار میل جھوٹے قدم چلتا ہوں تاکہ ان میں سے کوئی ایک قدم تو سچا ہو جائے۔ واللہ اعلم بالصواب

تینتیسواں باب

رقص اور اُس کے متعلقہ امور

واضح ہو کہ شریعت و طریقت دونوں میں رقص کی کوئی اصل نہیں ہے اور تمام عقلاء کا اتفاق ہے کہ لہو اور کھیل ہے خواہ بکوشش ہو خواہ بیہودگی سے ہو لغو و باطل ہے۔ کوئی ایک بزرگ بھی اسے پسند نہیں کرتا۔ نہ اس میں کسی نے غلو کیا ہے۔ اس بارے میں اہلِ حشو کا ہر قدم یا ثبوت جو بھی ہے وہ سب بطلان پر مبنی ہوگا۔ مثلاً اگر وہ یہ کہیں کہ وجد کی حرکتیں اور اہلِ تواجد کے معاملات رقص کی مانند ہوتے ہیں۔ یہ باطل ہے بیہودہ لوگوں کا ایک گروہ اس میں ان کی تقلید کرتا اور غلو برتتا ہے۔ انھوں نے اسے اپنا مذہب بنالیا ہے۔ میں نے عام لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ مذہبِ تصوف اس کے سوا ہے ہی نہیں جسے وہ اختیار کیے ہوئے ہیں اور ایک گروہ تو اصلیت ہی کا منکر ہو گیا ہے۔ الغرض رقص، شرعاً اور عقلاً تمام لوگوں کے لئے برا ہے اور یہ محال ہے کہ بزرگ لوگ ایسا کریں۔ البتہ جب اہلِ دل میں کوئی سبکی یا خفت نمودار ہوتی ہے اور باطن پر اس کا غلبہ ہوتا ہے اور وقت میں تقویت پیدا ہو جاتی ہے تو حال اپنا اضطراب ظاہر کرتا ہے اس وقت ترتیب و رسوم اور باقاعدگی مفقود ہو جاتی ہے ایسے اضطراب میں جو کیفیت نظر آتی ہے نہ تو وہ رقص ہے نہ پاؤں کی جھنکار اور نہ اس میں طبع کی پرورش بلکہ یہ اضطراب تو ایسا ہوتا ہے کہ جان کو گھلا دیتا ہے۔ یہ بات سراسر بعید ہے کہ اس اضطراب کو رقص کہہ دیا جائے۔ حالانکہ اضطراب ایسا حال ہے جسے زبان و گفتار میں نہیں لایا جا سکتا۔ ''من لم یذق لا یدری النظر فی الاحداث'' جس نے اس کا مزہ نہ چکھا وہ ظاہری اطوار کو نہیں جان سکتا۔

نوعمروں کو دیکھنا اور ان سے مجالست کرنا منع ہے۔ اور اسے جائز رکھنے والا کافر ہے اس سلسلہ میں جو بھی دلیل دی جائے وہ بطالت و جہالت کا ثبوت ہے۔ میں نے جاہلوں کے ایک گروہ کو دیکھا۔ وہ اہلِ طریقت پر ایسی ہی تہمت دھرتے ہیں پھر ان کا انکار کرتے ہیں اور ایک گروہ ایسا بھی دیکھا

ہے جس نے اسے اپنا مشرب بنالیا ہے۔ تمام مشائخ نے اسے آفت جانا ہے۔ یہ اثر حلولیوں نے باقی رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان پر لعنت برسائے۔

واضح رہنا چاہئے کہ کپڑے پھاڑنا صوفیاء کرام کے درمیان مشہور عادت ہے۔ بڑے بڑے اجتماع میں جس میں مشائخ کبار موجود ہوتے صوفیوں نے کپڑے پھاڑے ہیں۔ میں نے علماء کے گروہ کو دیکھا ہے جو اس کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ درست کپڑے کو پھاڑنا جائز ہے اور یہ محال ہے کہ کسی فساد سے جس سے ان کی مراد اصلاح ہو اسے درست کہا جائے۔ تمام لوگ درست کپڑے کو پھاڑتے اور کاٹتے ہیں پھر اسے سیتے ہیں۔ مثلاً آستین، دامن، چولی وغیرہ ہر ایک کو کاٹ کاٹ کر سیتے اور درست کرتے ہیں۔ اس میں کوئی فرق نہیں کہ کوئی کپڑے کو سو ٹکڑے کرے پھر انھیں سئے اور کوئی پانچ ٹکڑے کرے اور سئے۔ باوجودیکہ ہر وہ ٹکڑا جسے پھاڑا گیا اسے سی دیا جائے۔ اس سے ایک مومن کے دل کی راحت ہے اس سے جو گدڑی تیار ہوتی ہے وہ ان کی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ اگرچہ طریقت میں کپڑا پھاڑنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ البتہ بحالتِ سماع، درست کپڑا نہیں پھاڑنا چاہئے کیونکہ یہ اسراف کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن اگر سامع پر ایسا غلبہ طاری ہو جائے جس سے خطاب اٹھ جائے تو وہ بے خبر اور معذور ہے۔ جب کسی کا یہ حال ہو جائے اور کوئی اس کی وجہ سے کپڑے پھاڑے اس کو جائز ہے۔ اہل طریقت کے کپڑے پھاڑنے کے سلسلہ میں تین قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو درویش خود اپنے کپڑے پھاڑے یہ بحالتِ سماع، غلبہء حال کے حکم میں ہوگا۔ دوسرے وہ لوگ جو مرشد و مقتداء کے حکم سے کپڑے پھاڑیں مثلاً کوئی استغفار و توبہ کی حالت میں کسی جرم کے سبب کپڑے پھاڑے اور وجد و سکر کی حالت میں کپڑے پھاڑے ان میں سب سے مشکل تر وہ کپڑے پھاڑنا ہے جو سماع میں کرتے ہیں؟ یہ دو قسم کے لوگ ہیں ایک مجروح و زخمی دوسرے صحیح و درست۔ مجروح کی دو شرطیں ہیں۔ یا کپڑے کو سی کر اسے دے دیں یا کسی اور درویش کو دے دیں۔ یا تبرک کے طور پر پھاڑ کر تقسیم کر دیں، لیکن جب کپڑا درست ہو تو یہ دیکھنا چاہئے کہ کپڑا پھاڑنے والے یا اتار کر پھینک دینے

والے سامع درویش کی کیا مراد ہے۔ اگر قوال کو دینا مراد ہے تو اسے دے دیا جائے اور اگر مراد جماعت کو دینا ہے تو انھیں دے دیا جائے اور اگر کوئی مراد ظاہر نہ ہو بلکہ یونہی اتار کر پھینک دیا ہے تو مرشد کے حکم کے مطابق عمل کیا جائے اگر وہ جماعت کو دینے کا حکم دے تو پھاڑ کر ان میں تقسیم کر دیا جائے۔ اگر کسی درویش یا قوال کو دینے کا حکم دے تو اسے دے دیا جائے۔ لیکن اگر قوال کو دینا معروف ہو تو درویش یا اصحاب کے مراد کی موافقت شرط نہیں ہے۔ لیکن اگر انفاق مقصود ہو تو پھر درویش کا کپڑا قوال کو نہ دیں کیونکہ یہ نااہل کو دینا ہوگا اور جو کپڑا درویش نے یا تو حالت اختیار میں دیا ہوگا یا حالتِ اضطرار میں۔ اس میں دوسروں کی موافقت کی کوئی شرط نہیں ہے اور اگر جماعت کے ارادے سے کپڑے کو علیحدہ کیا یا کسی مراد کے بغیر، تو اس صورت میں مراد کی موافقت شرط ہے اور جب جماعت کپڑا اچھینکنے میں متفق ہو تو مرشد کو لازم نہیں کہ وہ درویشوں کے کپڑے قوالوں کو دے۔ لیکن یہ جائز ہے کہ کوئی محب اپنی طرف سے کوئی چیز قوال پر قربان کر دے اور ان کے کپڑے درویشوں کو لوٹا دے یا پھاڑ کر سب کو تقسیم کر دے۔ اگر کپڑا مغلوبی کی حالت میں گر پڑا ہے تو اس میں مشائخ کا اختلاف ہے۔ اکثر کے نزدیک اس حدیث کی موافقت میں قوال کو دے دیا جائے کہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس نے قتل کیا وہی مقتول کے سامان کا حقدار ہے۔ اگر قوال کو نہ دیں تو طریقت کے حکم سے باہر نکلتا ہے۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے اور یہ بات میرے نزدیک بھی محمود ہے کیونکہ بعض فقہا کا یہی مشرب ہے کہ مقتول کا سامان بادشاہ کی اجازت کے بغیر قاتل کو نہ دیا جائے یہی حکم طریقت میں مرشد کا ہے۔ کہ بغیر مرشد کے حکم کے وہ کپڑا قوال کو نہ دیں۔ اگر مرشد چاہے کہ قوال کو نہ دیا جائے اور کسی کو دے دیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

آداب سماع

واضح رہنا چاہئے کہ آدابِ سماع میں شرط یہ ہے کہ جب تک ضرورت نہ ہو سماع نہ کرے اور اسے اپنی عادت نہ بنائے۔ لیکن کبھی کبھی سماع کرے تا کہ اس کی عادت دل سے نہ جائے۔ لازم ہے کہ بوقت سماع، کوئی مرشد اس مجلس میں موجود ہو اور یہ کہ مقام سماع، عوام سے خالی ہو اور یہ کہ قوال صاحبِ عزت ہوں اور دل مشاغل سے خالی طبیعت لہو و کھیل سے نفرت

کرنے والی ہوتو یہ شرط ہے تکلف کو اٹھا دیا جائے اور جب تک سماع کی قوت ظاہر نہ ہو تو نہ سُنے اس میں مبالغہ شرط نہیں۔ اور جب سماع کی قوت ظاہر ہوتو یہ شرط نہیں ہے کہ اس قوت کو اپنے سے دور کرے بلکہ جیسا اقتضاء ہو ویسا کرے اگر وہ ہلائے تو ہلے اور اگر ساکن رکھے تو ساکن رہے۔ طبعی قوت اور وجد کی سوزش کے درمیان فرق محسوس کرے۔ سامع پر لازم ہے کہ اس میں اتنی قوتِ دید ہو کہ دار وارِدِ حق کو قبول کر سکے اور اس کا حق ادا کر سکے اور جب وارِدِ حق کا غلبہ دل پر ظاہر ہو تو اسے بتکلف اپنے سے دور نہ کرے۔ جب سامع کی قوت برداشت جاتی رہے تو بتکلف جذب نہ کرے اور لازم ہے کہ بحالتِ حرکت کسی سے مدد کی توقع نہ رکھے اگر کوئی مدد کرے تو منع بھی نہ کرے اور اس کی مراد اور اس کی نیت کو نہ آزمائے کیونکہ اس میں آزمانے والے کو بہت پریشانی اور بے برکتی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کسی کے سماع میں دخل نہ دے اور اس کا وقت پراگندہ نہ کرے۔ نہ اس کے حالات میں تصرف کرے۔ لازم ہے کہ اگر قوال اچھا کلام سُنائے تو اس سے یہ نہ کہے کہ تم، اچھا کلام سنایا اور اگر ناپسندیدہ ہو تو بُرا بھی نہ کہے اور اگر وہ ایسا ناموزوں شعر جس سے طبیعت کو ناگواری ہو تو یہ نہ کہے کہ اچھا کہو اور دل میں اس سے غصہ نہ کرے۔ اسے درمیان میں نہ دیکھے بلکہ سب حوالہ حق کردے اور درست ہو کر سُنے اگر کسی گروہ کو حالت سماع میں دیکھے اور اسے اس سے فائدہ نہ ہو تو یہ شرط نہیں ہے کہ اپنے صحو کے سبب ان کے سکر کا انکار کرے۔ لازم ہے کہ اپنے وقت کے ساتھ آرام سے اس سے ان کو فائدہ ہوگا۔ صاحب وقت کی عزت کرے تاکہ اس کی برکتیں اسے پہنچیں۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں اسے زیادہ محبوب رکھتا ہوں کہ مبتدیوں کو سماع کی اجازت نہ دیں تاکہ ان کی طبعیت میں یکسوئی رہے کیونکہ پراگندگی میں برے خطرے اور بڑی آفتیں ہیں۔ اس لئے کہ چھتوں سے اور اونچی جگہوں سے عورتیں بحالتِ سماع ان کو دیکھتی ہیں۔ اسی سبب سے سامعین کو شدید حجابات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

لازم ہے کہ نوخیز لڑکوں کو بھی درمیان میں نہ بٹھائیں اور ایسا کبھی نہ ہونے دیں۔

اب میں اُن جاہل صوفیوں سے جنھوں نے ان باتوں کو اپنا مذہب بنا رکھا ہے اور صداقت کو درمیان سے ہٹا دیا ہے خدا سے استغفار کرتا ہوں کیونکہ اس قسم کی آفتیں ہم جنسوں سے مجھ پر گزر چکی ہیں اور حق تعالیٰ سے توفیق و مدد کا خواستگار ہوں تاکہ میرا ظاہر و باطن ہر قسم کی آفتوں

سے محفوظ رہے۔ میں اس کتاب کے پڑھنے والوں کو وصیت کرتا ہوں کہ اس کتاب کے احکام اور ان کے حقوق کی رعایت ملحوظ رکھیں۔"

وبیده التوفیق۔ والحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علٰی رسوله محمد واله واصحابه اجمعین وسلم تسلیما کثیراً کثیراً۔

الحمدللہ علٰی احسانہ کتاب مستطاب السلوک الی المحبوب ترجمہ کشف المحجوب آج مؤرخہ ۲۵ر جون ۱۹۷۰ء مطابق ۲ر ربیع الاخر ۱۳۹۰ھ تمام ہوئی مولیٰ تعالےٰ مترجم، طابع وناشر اور سب کے لئے توشہ آخرت بنائے آمین بجاہ سید المرسلین صلوات اللہ وسلامہ علیہ وعلیہم اجمعین۔

غلام معین الدین نعیمی اشرفی

الحمدللہ

۷ر رجب المرجب

۱۷ اکتوبر ۹۹

قطعۂ تاریخ طباعت

کتاب مستطاب ''کشف المحجوب''

اثرِ خامۂ عنبر شامہ

حضرت سیّد علی ہجویریؒ المعروف حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

سعیدِ گلشنِ فکر و نظر

۲۰۰۰ء

رضاء الدین صدیقی کو طارق
بیانِ و ذکرِ اہلِ حق ہے مرغوب

کتابِ معرفت افروزِ داتاؒ
گرامی نام جس کا کشفِ محجوب

خُدا کے اولیا کے جو ہیں شیدا
یہ تصنیفِ علیؒ اُن کی ہے محبوب

اِسے چھاپا نفاست سے رضا نے
یہ اُس کا کارنامہ ہے بہت خوب

اشاعت میں ہے اِس کی کار فرما
نجابت کا بھی جوش و جذبۂ خوب

طباعت کا ہے سن اس کا ''ادب'' سے
''چلی ہے بادِ فیضِ کشفِ محجوب''

۷+۱۴۱۴=۱۴۲۱ھ (محترمی محمد رضاء الدین صدیقی زید مجدہٗ کی نذر)

طارق سلطانپوری (لاہور) ۲۰۰۰ ۵ ۷